مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی اِرتقا

خواجہ احمد فاروقی

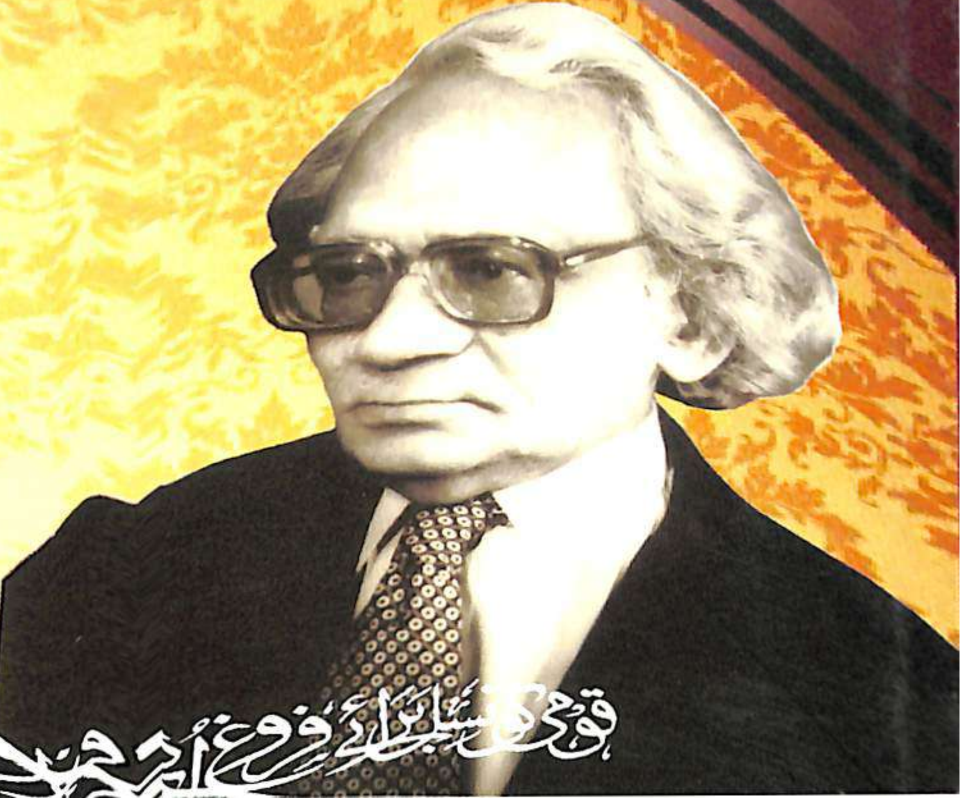

قومی کونسل برائے فروغ اُردو

مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی اِرتقا

خواجہ احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

E
1

مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی اِرتقا

مصنف

خواجہ احمد فاروقی

مرتب

فرحت فاطمہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2013
تعداد	:	550
قیمت	:	-/193 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1691

Maktoobat-e-Urdu Ka Adbi Wa Tareekhi Irtiqa
Author : Khawaja Ahmed Farooqi
Compiled by : Farhat Fatima

ISBN :978-81-7587-875-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

زبان اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے اور کتابیں اظہار خیال اور علم کا سرچشمہ ہیں۔ بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔

قومی اُردو کونسل کا بنیادی مقصد اُردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کروا کر انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کرنا ہے۔ قومی اُردو کونسل نے مختلف علوم و فنون پر جو کتابیں شائع کی ہیں اردو ادب کے قارئین نے ان کی بھرپور انداز میں پذیرائی کی ہے۔

ادب کے شائقین کی سہولتوں کا خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ قارئین اس علمی و ادبی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اور ان اعلیٰ معیار کی کتابوں کے اس قیمتی ادبی سرمایہ کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جا سکے اور زمانہ کی دست بُرد سے بھی اس کو محفوظ رکھا جا سکے۔

مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالے میں مرزا رجب علی بیگ سرور سے مولانا ابوالکلام آزاد تک ان مکتوباتی رُجحانات سے بحث کی گئی ہے جو اردو نثر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اس طرح تاریخی پس منظر کے ساتھ پورے مکتوباتی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اور مکتوباتی ادب میں جو عہد بہ عہد ترقی ہوئی ہے وہ بھی ظاہر ہوگئی ہے اور اس طرح نہ صرف اردو نثر کی تاریخ دوبارہ مرتب ہوگئی ہے بلکہ اس کے پیچھے جو ذہنی فضا ہے وہ بھی ظاہر ہوگئی ہے۔ یہ مقالہ مکتوبات اُردو کی تاریخ میں ایک مستند اضافہ ہے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا شمار اُردو کے دیدہ ور نقاد محقق اور بے مثل انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔

قومی اُردو کونسل نے اپنے منصوبوں میں ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابوں کی اشاعت کی طرف خاص توجہ صرف کی ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کے علمی وادبی ذوق کی تسکین کا باعث بنے گی اور ایک اہم علمی ضرورت کو بھی پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں کوئی کمی نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلی اشاعت میں اس کو دور کیا جا سکے۔

ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین
ڈائرکٹر قومی اُردو کونسل

کاوشِ گفتار

زیرِ نظر تحقیقی مقالہ " مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا" میرے والد خواجہ احمد فاروقی صاحب کی تحقیق ہے۔ موضوع کے اعتبار سے جس محنت، دیدہ ریزی اور غور و فکر سے مکتوباتِ اردو کے ادبی اور تاریخی ارتقا کو پیش کیا گیا ہے یہ ایک اہم علمی کاوش ہے۔

اس مقالہ میں جس طرح ادبی، علمی اور تجزیاتی نقطۂ نظر سے تخلیقی رویوں اور فنی رجحانات کا مطالعہ تاریخی تناظر میں کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر اتنی گہرائی اور فنکارانہ انداز سے روشنی نہیں ڈالی گئی۔

انگریزی ادبیات کے وسیع مطالعہ کی وجہ سے مغربی ادب کے رُجحانات کے اثرات کی نشاندہی بھی بڑے متوازن زاویۂ نظر سے کی گئی ہے۔ اس مقالہ کو ۹ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

یہاں ان ۹ ابواب کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ اس لیے میں نے مختصر طور پر اس مقالہ کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مکتوباتی ادب تاریخ نثر کا ایک اہم جزد ہے اس کا دائرہ نثر سے ملا ہوا بھی ہے اور اس سے الگ بھی ہے اسی لیے مکتوبات میں نثر کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں اردو نثر کے تاریخی پس منظر میں پورے مکتوباتی ادب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور شکوہ الملک ثانی سے ابوالکلام آزاد تک اُردو انشا نے جو تمام ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اُن مکتوباتی رجحانات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ جو اُردو نثر میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

کوئی فن اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا یہ ناممکن تھا کہ اردو نثر اپنے ماحول کے اثرات قبول نہ کرتی اور اس کے اسالیب فارسی کے رنگ میں نہ رنگ جاتے چنانچہ مرزا رفیع سوداؔ اور میر عطا حسین تحسین نے جو قافیہ پیمائی شروع کی وہ رجب علی بیگ سرور اور بے خبر کے زمانے تک جاری رہی۔

شروع میں اردو مکاتیب بھی فارسی کے سانچے میں ڈھل گئے۔ کیونکہ فارسی عام طور پر رائج تھی۔ اردو کے بعض ابتدائی مکتوبات میں فارسی کی تقلید پائی جاتی ہے۔ اور جن انشا پردازوں کی پیروی کی گئی ہے۔ ان میں ظہوری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ (فورٹ ولیم کالج سے پہلے) "نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفّیٰ اور مسجّع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروّج تھی"۔

اردو انشا نے بھی فارسی کے گہرے اثرات قبول کئے رجب علی بیگ سرور کو مقفّیٰ نگاری اور رنگین بیانی کا بڑا اہتمام منظور تھا اور ان کے جو خطوط ہیں اس میں یہ رنگ پوری طرح پایا جاتا ہے۔ لیکن سرور کے یہاں تکلفات کے ساتھ سادگی بھی ملتی ہے۔ یہ سادگی عزیزوں اور دوستوں کے خطوط میں زیادہ نمایاں ہے۔ سرور کے خطوط تاریخی معلومات کا خزانہ ہیں۔ ان میں لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

اردو میں خط نویسی کی ابتدا کب ہوئی یہ یقین کے ساتھ بتانا ناممکن ہے لیکن اردو انشا کی تاریخ اتنی مختصر بھی نہیں ہے جتنی کہ مولانا احسن مارہروی نے قرار دی ہے۔ انھوں نے تاریخ نثر اردو میں لکھا ہے۔ "کہ اردو زبان میں خط نویسی کی ابتدا مرزا غالبؔ نے کی ہے"۔ [1]

غالبؔ سے پہلے کا زمانہ جو مولانا احسن مارہروی مؤلف تاریخ نثر اردو کے نزدیک اردو انشا میں تاریکی کا دور تھا۔ اس کی تاریخی کڑیاں پہلے اور بعد کے زمانے

---

[1] تاریخ نثر اردو (نمونہ منثورات) ص ۵۴۰

سے ملائی گئی ہیں۔ اس طرح نثر کی تاریخ میں جو خلا فورٹ ولیم کالج سے مرزا غالب تک نظر آتا تھا وہ بڑی حد تک بھر گیا ہے اور مکتوباتی ادب میں جو عہد بہ عہد ترقی ہوئی ہے وہ بھی ظاہر ہو گئی ہے۔

اردو کے بالکل ابتدائی اور تشکیلی دور میں جو غیر مطبوعہ مواد دستیاب ہوا ہے وہ بارہویں صدی عیسوی کے دو پروانے منشاتِ شاکر (قلمی) اور مکتوباتِ شکوہ الملک ثانی (قلمی) مل جاتے ہیں۔ ان میں کھڑی بولی کی آمیزش اور فارسی کا اثر ہے۔ ان خطوں کی ادبی اہمیت نہیں لیکن لسانی اہمیت ہے۔ اردو انشاء میں سب سے قدیم کتاب جو دریافت ہوئی ہے وہ منشاتِ شاکر (قلمی) ہی ہے جو ۱۷۶۴ء سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس سے سلطنتِ مغلیہ کی کمزوری اور امرا کی خود غرضانہ زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کی دکنی زبان میں فارسیت غالب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یہی ہے کہ یہ سب سے قدیم کتاب ہے۔

سب سے قابلِ قدر نمونہ نواب شکوہ الملک ثانی کے اُردو خطوط (قلمی) ہیں جو ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ نواب شکوہ الملک ثانی کے خطوط (قلمی) کی تازگی حیرت انگیز ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ وہ درباری ماحول کی پیداوار ہیں۔ یہ مکتوب دکنی انشاء کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ ان میں اور ہریانی زبان کے نمونوں میں بڑی یکسانیت ہے جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اُردو شمال سے دکن میں آئی ہے۔ دکن سے شمال کو نہیں گئی۔

منشاتِ شاکر (قلمی) اور مکتوباتِ شکوہ الملک ثانی (قلمی) کو پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ رجب علی بیگ سرور اور غالب سے پہلے شاکر اور شکوہ الملک ثانی کے علاوہ تپشؔ، راسخؔ، قتیلؔ، یاسؔ آروی اور تاثیر عظیم آبادی اردو انشاء کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ اور انھوں نے اردو میں خطوط بھی لکھنا شروع کر دیے تھے۔ ان حالات میں تاریخ نثر اردو کے مصنف کے

اس بیان سے اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ "انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے اردو خطوط نویسی کا وجود نہیں ملتا۔ جس کی ابتداء مرزا غالب نے کی تھی۔"[1]

اس مقالہ میں سرور کی ایک عرض داشت کی تاریخ متعین کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سرور نے بے خبر اور غالب سے بھی پہلے ۱۸۲۷ اور ۱۸۳۷ء کے درمیان اردو میں مکتوب نگاری شروع کردی تھی اس طرح سرور کو غالب کے مقابلے میں تاریخی اوّلیت حاصل ہوجاتی ہے۔

مشاہیر انشاء پردازوں کے مکاتیب کا تجزیہ کرکے ان خطوں کی تاریخی، سوانحی، فنی اور ادبی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے اور خطوط سے کاتب کی نفسیات اور سیرت کا بھی اندازہ لگایا ہے۔ دُنیا میں ہر چیز میں تبدیلی آتی رہتی ہے خطوں میں جو تبدیلی آئی ہے اس تبدیلی کو خطوں کے اسلوب سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو مکتوب نگاری کے سلسلے میں جو ادبی تلاش و تحقیق کی گئی ہے۔ اس میں شاکر اور شکوہ الملک ثانی، تپش، راسخ، قتیل، یاس، اور تاثیر کے اُردو خطوط کے علاوہ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوں کے ۹ بیش قیمت مجموعے بھی ملے ہیں۔ جن کے اقتباسات مقالہ میں درج ہیں۔ یہ خطوط ایک خاص تہذیبی پس منظر کو پیش کرتے ہیں ان خطوں میں قید خانہ کی مصیبتوں کا ذکر ہے غدر کے حالات ہیں ان خطوں کے اسلوب میں ندرتِ ادا کا جو انداز ہے وہ ایک خاص تہذیب کی پیداوار ہے۔

ان خطوں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ زمانی بیگم کے چند خطوط سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ان میں دہلی کی پریشانیوں کا تذکرہ ہے غم و اندوہ کی کہانی ہے۔ ان خطوط پر فارسی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔

---

[1] تاریخ نثر اردو ص ۶۰۹

مرزا غالب کی شخصیت اور سیرت کے نئے پہلوان کے غیر مطبوعہ اور خطوط کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب نے محمد شاہی روش، ماضی کی پرانی روایات اور قدیم لوازم نامہ نگاری کو چھوڑ کر اردو انشاء میں ایک نیا اسلوب قائم کیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے۔

ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالے "محب ہند" میں فارسی انشاء کے تکلفات پر سخت اعتراضات کیے تھے اور خطوں میں باتیں کرنے پر زور دیا تھا۔ غالب نے اس رجحان کو جو پہلے سے موجود تھا ادبی کمال تک پہنچا دیا۔ مرزا غالب نے اردو شاعری ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں دیا۔ جدید نثر کی بنیاد بھی اپنے ہاتھوں سے رکھی ہے۔ ان کے خطوں میں ان کی رنگا رنگ شخصیت اور عصری و ادبی تاریخ پوری طرح جھلکتی ہے۔ ان مکاتیب میں وہی شگفتگی اور بلند نظری ہے جو ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔

غالب کی انشاء کے اثرات مجروح، علائی، مفتی محمد عباس، قدر بلگرامی اور جنون بریلوی کے غیر مطبوعہ خطوں پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں اس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے رنگ میں لکھنے کی سب نے کوشش کی لیکن کامیابی کسی کو نہیں ہوئی۔

اس مقالے میں داغ اور مشتری کے گراں قدر خطوط کو بھی پہلی دفعہ پیش کیا گیا ہے۔

مہدی افادی کے اُن نادر مکاتیب سے بھی استفادہ کیا ہے جو انھوں نے اپنی بیگم کے نام لکھے تھے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے غیر مطبوعہ خطوط کی تعداد ۴۶ سے زیادہ ہے۔ ان کے متعلق زیادہ تر معلومات ان کے خطوط سے ہی حاصل ہوئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، نواب صدر یار جنگ، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی،

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور حامد حسن قادری کے غیر مطبوعہ خطوط سے مختلف اسالیب کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد لی گئی ہے۔

اس مقالہ میں خطوں کی قدر و قیمت متعین کرنے میں رجب علی بیگ سرور سے مولانا آزاد تک اُن مکتوباتی رُجحانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو اُردو نثر میں بڑی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

مکتوبات کی یہ دنیا زندگی سے بھرپور، بڑی دلچسپ اور دل نشین ہے۔ ان خطوں کی مدد سے تاریخ ادب اور نفسیات کے بہت سے گوشے اُجاگر ہو سکتے ہیں۔ مگر مکتوبات کے ذریعے پوری شخصیت کے سارے پہلو واضح نہیں ہوتے لیکن شخصیت کے کچھ اہم حصے ضرور سامنے آجاتے ہیں۔ خطوط سے تاریخ کے خشک واقعات کو بھی جاندار بنایا جا سکتا ہے۔ ان خطوں کے ادبی فارم سے مذہبی لٹریچر، ناول، افسانہ اور تنقید پر اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں اور ان میں اضافے بھی ہوئے ہیں۔ یہی خطوط کی اصلی قدر و قیمت ہے۔

فاضل مقالہ نگار کی رائے میں "مقالے سے اندازہ ہوگا کہ اس طرح نہ صرف اردو نثر کی تاریخ دوبارہ مرتب ہو گئی ہے بلکہ اس کے پیچھے جو ذہنی فضا ہے وہ بھی سامنے آگئی ہے۔"

امید ہے کہ اس ادبی اور وسیع موضوع کے علمی طریق کار سے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے نئی نئی راہیں سامنے آئیں گی۔

والد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع ہو جائے۔ انھوں نے اس مقالہ پر نظرِ ثانی کی اور کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد اس کو ابو جعفر زیدی صاحب جو دہلی کے مشہور کاتب تھے اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کتابت کا کام کرتے تھے اُن کے پاس کتابت کے لیے بھیج دیا۔ کافی عرصہ تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کتابت کتنی ہوئی ہے اور کس مرحلہ پر ہے۔ اس درمیان میں والد صاحب اپنی علالت کی وجہ سے صاحبِ فراش

ہوگئے لیکن اپنی کتاب کی فکر سے غافل نہ تھے۔

ایک رات تین بجے وہ چونک کر اٹھے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری کتاب پرزے پرزے ہو کر ہوا اور آندھی میں اُڑی جارہی ہے۔ تم زیدی صاحب کو بلاؤ اور معلوم کرو کہ میری کتاب کا کیا ہوا؟

اس فکر میں وہ صبح تک سو نہیں سکے۔ صبح کو زیدی صاحب کو بُلایا گیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ فاروقی صاحب کی کتاب کے لیے پریشانی بالکل بجا ہے۔ دراصل کتابت کیلئے کاغذ کو بار بار موڑنا پڑتا ہے اور موڑنے سے اس مقالہ کا کاغذ جگہ جگہ سے کٹ رہا ہے۔ اس لیے میں نے کام روک دیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ والد صاحب سے اس بارے میں کچھ نہ کہیں میں آپ کو فوٹو اسٹیٹ کروا کر کاغذات بھیجوں گی۔ اس کے بعد آپ کتابت کیجئے گا۔ زیدی صاحب والد صاحب کو اطمینان دلا کر چلے گئے۔

اس کے بعد زیدی صاحب کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے کتابت کا کام اتنی آہستہ روی سے ہوا کہ والد صاحب کی زندگی میں کتابت مکمل نہ ہو سکی۔ بلکہ ان کے انتقال کے کافی عرصہ بعد کتابت کا کام مکمل ہوا اور ان کی یہ خواہش کہ اس مقالہ کو کتابی شکل میں دیکھ سکیں پوری نہ ہو سکی۔

والد صاحب نے اپنی کتابوں کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی اس کتاب کی اشاعت بھی ہے۔

کتاب کی اشاعت اور طباعت اور قارئین تک اس کی رسائی ایک وقت طلب مرحلہ ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ صاحب کی ادب نواز اور قد آور شخصیت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ جن کے لیے اُردو کی خدمت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اُن کے بے پایاں مہر و خلوص کے سبب اس کتاب کی اشاعت کا مرحلہ طے ہوا۔

میں جناب حمید اللہ بھٹ صاحب کی بطور خاص ممنون اور شکر گزار

رہوں گی لیکن اپنی ممنونیت کے اظہار کے لیے شکریہ کا مختصر سا لفظ ان کی عنایت بے نہایت کا بدل نہیں ہو سکتا۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے جناب حمید اللہ بھٹ صاحب کی موجودگی میں اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔

اب نئے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام صاحب جو ہمہ وقت اُردو ادب کی خدمت میں سرگرم رہتے ہیں۔ ان کی مہربان اور قدر شناس شخصیت کے پرخلوص تعاون کے سبب یہ کتاب منظر عام پر آسکی ہے۔

پروفیسر صاحب کی خصوصی توجہ اور نوازش کی وجہ سے میں اُن کی بے حد ممنون اور مشکور رہوں کہ ان کے مخلصانہ رویّہ سے میری ایک دیرینہ تمنّا پوری ہو رہی ہے۔

اس موقع پر اپنے عزیزوں اور محسنوں کے تعاون کا اعتراف ناگزیر ہے میری بہن نزہت نعیم اور بھائی اشرف فاروقی، عزیزہ رضیہ اور منظور احمد کے تعاون اور حوصلہ افزائیوں سے منزل آسان ہوئی۔ عزیزہ رضیہ نے پروف ریڈنگ میں میری مدد کی۔ منظور احمد نے اس کتاب کے سلسلہ میں قدم قدم پر بڑی محنت اور لگن سے ہر کام کو انجام دیا۔ ان سب کی محبتوں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے راہوں کو ہموار کیا۔

فرحت فاطمہ
دہلی

مقدمہ

اس تحقیقی مقالے کا عنوان "مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا" ہے۔ اس میں مرزا رجب علی بیگ سرور سے مولانا ابو الکلام آزاد تک ان مکتوباتی رجحانات سے بحث کی گئی ہے جو اُردو نثر میں سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں. اس طرح تاریخی پس منظر کے ساتھ پورے مکتوباتی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے. اور غالب سے پہلے کا زمانہ جو مولانا احسن مارہروی مؤلف تاریخِ نثرِ اُردو کے نزدیک اُردو انشا میں تاریکی کا دور تھا اس کی تاریخی کڑیاں پہلے اور بعد کے زمانے سے ملائی گئی ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ نثر کی تاریخ میں جو خلا فورٹ ولیم کالج سے مرزا غالب تک نظر آتا تھا، وہ بھر گیا ہے اور مکتوباتی ادب میں جو عہد بعہد ترقی ہوئی ہے وہ بھی ظاہر ہو گئی ہے۔

اس مقالے میں بارھویں صدی عیسوی کے پروانے، منشآت شاکر (قلمی) اور مکتوباتِ شکوہ الملک ثانی (قلمی) کو پیش کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ رجب علی بیگ سرور اور غالب خلا کی پیداوار نہیں ہیں۔ ان سے قبل شاکر اور شکوہ الملک ثانی کے علاوہ تپش، راسخ، قتیل، یاس آروی اور تاثیر عظیم آبادی اس میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ حد یہ ہے کہ سرور کو بھی غالب پر تاریخی تقدم حاصل ہے۔ اس کا اندازہ سرور کی ایک عرضداشت کی تاریخ متعین کر کے لگایا گیا ہے۔

ضمناً ہم نے شاکر اور شکوہ الملک ثانی کے رقعات کے لسانی تجزیے سے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اُردو دہلی سے دکن گئی ہے۔ دکن سے شمال کو نہیں گئی۔

ان صفحات میں اکابر انشا پردازوں کے خطوں کا تجزیہ کر کے ان کی سوانحی،

فنی اور ادبی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اور مکتوب سے کاتب کی نفسیات اور سیرت کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ خطوں کا آرٹ جامد اور ساکن نہیں ہے۔ دنیا کی ہر چیز کے ساتھ یہ بھی بدلا ہے۔ اس تبدیلی کو خطوں کے مقصد، مزاج اور اسلوب سے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ادبی تلاش میں ہمیں شاکر، شکوہ الملک ثانی، تپش، راسخ، قتیل، یاس اور تاثیر کے علاوہ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوں کے نو (۹) گرانقدر مجموعے ملتے ہیں جن کے اقتباسات اصل مقالے میں مناسب مقامات پر ملیں گے۔
ان کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ زمانی بیگم کے چند خطوط سے بھی بحث کی گئی ہے۔ مرزا غالب کی شخصیت کے بعض نئے پہلو نادر اور غیر مطبوعہ مواد کی مدد سے اجاگر کیے گئے ہیں اور ان کی انشا کا اثر مجروح، علائی، مفتی محمد عباس، قدر بلگرامی اور جنون بریلوی کے غیر مطبوعہ خطوں پر معلوم کیا ہے۔

اس مقالے میں داغ اور مشتری کے بعض نادر خطوں کو پہلی دفعہ استعمال کیا گیا ہے۔ نیز مہدی افادی کے ان گرانمایہ خطوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنی بیگم کے نام لکھے تھے۔ مختلف اسالیب کا اندازہ کرنے میں ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد، نواب صدر یار جنگ، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریاآبادی اور حامد حسن قادری کے غیر مطبوعہ خطوں سے بھی مدد ملی ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے متعلق بیشتر معلومات ان غیر مطبوعہ خطوں پر مبنی ہے جن کی تعداد ۴۶ سے زیادہ ہے۔

اس مقالے میں ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ خطوں کے ادبی فارم سے مذہبی لٹریچر، ناول، افسانہ اور تنقید میں کیا اضافے ہوئے ہیں۔

مقالے کے مندرجات سے اندازہ ہوگا کہ اس طرح نہ صرف اُردو نثر کی تاریخ دوبارہ مرتب ہوگئی ہے بلکہ اس کے پیچھے جو ذہنی فضا ہے وہ بھی سامنے آگئی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

دہلی — ۴؍جولائی ۱۹۵۲ء

سرگذشت

نام :

خواجہ احمد فاروقی خلف مولوی حسن احمد مرحوم ابن مولوی اسداللہ ابن مولوی مظہر اللہ ابن مشیر الدولہ محقق الملک، نوراللہ خاں بہادر مناظر جنگ ۔

ولادت :

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء بمقام بچھراؤں ضلع مراد آباد (یوپی)

تعلیم :

بی۔اے۔انگریزی ادب؛ تاریخ یورپ؛ تاریخ عہدِ مغلیہ فارسی ادب کے ساتھ۔
ایم۔اے۔انگریزی؛ سالِ اول؛ ایم اے، فارسی۔ ایم۔اے اردو عربی کے ساتھ۔
پی۔ایچ۔ڈی۔اردو؛ مکتوبات اردو کا تاریخی و ادبی ارتقاء۔ دہلی یونیورسٹی۔ تاریخ پی ایچ ڈی۔ از پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم ؎

ہزار شکر کہ پی۔ایچ۔ڈی ہوئے خواجہ
بڑا صلہ ہے بڑی نعمت خدائے احد
یہ فی البدیہہ کہا قادری نے سالِ نشاط
کہ ڈاکٹر ہوئے کیا خوب خواجہ احمد

۱۹۵۳ء

موجودہ منصب :

(۱) پروفیسر ایمی ریٹس تا حیات دہلی یونیورسٹی ۱۹۸۵ء

(۲) سینئر فیلو انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، ہند -

دوسرے عہدے :

۱- پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ سبکدوش: یکم نومبر ۱۹۸۲ء
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

۲- ڈین، آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۴ء تک

۳- چیئرمین بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک۔

۴- راک فلر ریسرچ اسکالر مغربی یورپ میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک -

۵- ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے دس کان سن یونیورسٹی، امریکہ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک۔

۶- ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے روس کی ماسکو لینن گراڈ اور تاشقند یونیورسٹیوں میں ۱۹۶۷ء

۷- اُردو کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے فرانس میں ۱۹۶۰ء

۸- اُردو کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مغربی جرمنی میں ۱۹۷۱ء

۹- اردو کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے راجستھان یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی میں کام کیا۔

تصنیفات اور تالیفات :

"میر تقی میر، حیات اور شاعری"، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند ۱۹۵۴ء۔ اس کتاب کو ۱۹۵۷ء میں ساہتیہ اکادمی کے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کو یوپی گورنمنٹ نے بھی اعلیٰ ادبی انعام سے نوازا۔"

"کلاسیکی ادب" تنقیدی مضامین۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء۔ مرزا شوق لکھنوی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۰ء مقدمہ از حضرت نیاز فتح پوری "مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا" مکتوباتی ادب کا جائزہ تحقیقی مقالہ۔

"نئی شاعری" مطبوعہ آگرہ، چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ سندھیا حکومت نے

ادبی انعام کا مستحق قرار دیا۔ ۱۹۷۰ء

"ذوق و جستجو" مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۷ء۔ میر ادبی انعام ملا۔

"اُردو میں وہابی ادب" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء بین الاقوامی کانگریس آف اورینٹل اسٹ این آربر امریکہ کا مقالہ۔

"دستنبو" فارسی سے انگریزی میں ترجمہ۔ مطبوعہ ایشیا پبلشنگ ہاؤس دہلی، نیویارک ۱۹۷۰ء۔ پروفیسر بیشم اور ڈاکٹر پرسیول اسپیر کے تبصرے۔

"چراغِ رہ گذر" مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء۔ یوپی اردو اکادمی کا انعام ملا۔

"یادِ یارِ مہربان" مطبوعہ دہلی ۱۹۷۵ء۔

"یادنامہ" پریس میں۔

"مسز اندرا گاندھی، ان کی باتوں میں گلابوں کی خوشبو۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۸۶ء

"غدر کی کہانیاں" نیشنل بک ٹرسٹ۔ آدان پردان منصوبہ کے تحت۔

"میڈیا" مطبوعہ ساہتیہ اکادمی،

"آکسفورڈ مصوّر انگریزی اردو ڈکشنری" مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۰ء۔

مخطوطات کی ترتیب وتدوین:

"تذکرہ سرور یا عمدۂ منتخبہ ۹۹۶ شاعروں کا تذکرہ۔ مؤلفہ سرور متوفی ۱۹۲۴ء۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۱ء۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام معنون کیا گیا۔

"کربل کتھا" فضلی کی قدیم نثر۔ مطبوعہ دہلی مارچ ۱۹۹۶ء مع مقدمہ و فرہنگ و حواشی۔

"گنج خوبی" از میر امن دہلوی مورخہ ۱۸۰۲ء مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۶ء تنقیدی مقدمہ کے ساتھ۔

"مرزا غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط، تفتہ کے نام" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۰ء۔

"خدنگ غدر" جنگِ آزادی کا روزنامچہ۔ از معین الدین حسن مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء مع مقدمہ۔

دیوانِ بقا۔ میر کے معاصر بقا اکبرآبادی کا کلام مطبوعہ دہلی مع مقدمہ۔

دیوانِ میر سوز، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء

دیوانِ قائم، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۴ء

دِلّی اُردو اخبار، ۱۸۴۰ء کا پورا فائل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء

قدیم دلّی کالج نمبر ۱۹۵۲ء

انشائے اردو ۱۸۳۸ء کی لکھنوی قدیم نثر، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء

قانون النساء انیسویں صدی کا قلمی نسخہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء

ارمغانِ آصف، آصف علی کی تحریریں مع مقدمہ، مطبوعہ دہلی مئی ۱۹۶۱ء وغیرہ وغیرہ

مندرجہ ذیل کتابوں کے لئے خاص ابواب لکھے

انگریزی میں انڈین لٹریچر، مطبوعہ آگرہ باب اردو زبان وادب ۱۹۵۹ء میں چھپی۔

دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء۔

معاصر ہندوستانی ادب، ساہتیہ اکادمی باب: اُردو

جامع تاریخ ہند ۱۸۱۸ء تا ۱۸۵۷ء جلد ۱۱ باب اردو مطبوعہ ۱۹۰۵ء۔

انڈین لٹریچر جلد ۱۶، شملہ کے انڈین انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ باب: اُردو۔

جامع تاریخ ہند، بابر سے اورنگ زیب تک۔ اردو سے متعلق باب۔

اس کے علاوہ اسلامک کلچر انڈین پن۔ اسٹیٹس مین، ٹائمس آف انڈیا وغیرہ میں علمی وادبی وتاریخی مضامین شائع ہوئے۔

نگار، اُردو، ہمایوں، جامعہ، اردو ادب، معارف، بُرہان، آج کل وغیرہ کے لیے مضامین ان کے علاوہ ہیں جن کی تفصیل پیش کرنا دشوار ہے۔

انعام واکرام:

سندھیا گورنمنٹ، ساہتیہ اکادمی، یوپی اُردو اکادمی، یوپی گورنمنٹ، بہار اردو اکادمی، میر اکادمی نے ادبی انعامات دیے اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ۱۹۸۶ء میں خلعتِ اعزاز عنایت کی۔

بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت :

دہلی یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ میونخ جرمنی ۱۹۵۷ء، منعقدہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء اور این. آربر امریکہ ۱۹۶۷ء میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔

ایشیائی علوم کے کنونشن منعقدہ بوسٹن، امریکہ ۱۹۶۲ء۔

اشاریت کی بین الاقوامی ایسوسی ایشن پیرس ۱۹۵۸ء۔

۱۹۶۹ء میں کنوینر اور سکریٹری کی حیثیت سے غالب سے متعلق بین الاقوامی سمپوزیم کی ترتیب و تنظیم۔

ایشیائی ادبیات کے مذاکرہ مغربی برلن ۱۹۷۱ء

۱۹۸۰ء میں وڈبرک کالج کے مکالمہ سی اوک انگلستان میں شرکت۔

جولائی ۱۹۸۰ء میں یونیورسٹی آف بڈاپسٹ میں سرسید احمد خاں پر مقالہ پڑھا۔

۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف سیلون کے تعلیمی فورم میں شرکت کی۔

۱۹۸۲ء میں مستشرقین اور اسلام کے بین الاقوامی سمپوزیم، اعظم گڑھ میں شرکت کی اور مقالہ پڑھا۔

خصوصی اور توسیعی خطبات :

۱۹۶۱ء میں شکاگو یونیورسٹی کے زیر اہتمام سوامی وویکانند لکچر دیا۔

۱۹۶۸ء میں اکاڈمی آف سائنس پراگ چیکوسلواکیہ میں خطبہ۔

۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۷ء میں بون اور برن میں اقبال پر لکچر۔

۱۹۶۱ء وسکانسن یونیورسٹی امریکہ میں خصوصی لکچر: نیشلزم اور اردو شاعری نیز اسلام پر تین لکچر۔

اپریل ۱۹۸۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہندوستانی علوم کے مرکز سینٹ اینتنی کالج آکسفورڈ میں توسیعی خطبہ۔

مئی ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی آف لیڈز، لیڈز انگلستان میں خصوصی لکچر۔

جون ۱۹۸۴ء میں بین الاقوامی پن سمپوزیم یوگوسلاویہ میں شرکت -

خطبات، جو ہندوستان میں دیے گئے :

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، ڈائمنڈ جوبلی لکچر، عثمانیہ یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، گورکھ پور یونیورسٹی، میسور یونیورسٹی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، سے رنڈا ہاؤس کانووکیشن ایڈریس -

علمی وادبی انجمنوں سے تعلق :

لائف ممبر کل ہند انجمن ترقی اردو -

معتمد تنظیمی کمیٹی، انٹرنیشنل سمپوزیم بہ سلسلہ جشن صد سالہ غالب ۱۹۶۹ء

جنرل سکریٹری انڈو پاکستان کلچرل کانفرنس -

افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۶۱ء

سکریٹری شعبہ عربی، فارسی ۳۰ ویں کل ہند تعلیمی کانفرنس -

وائس چیرمین ادارہ مطالعاتِ اقبال، حیدرآباد -

رکن مجلسِ ادارت، اسلامک کلچر حیدرآباد -

فکر و نظر۔ نوائے ادب ۱۹۷۵ء

مشیر ادبی ساہتیہ اکادمی، گیان پیٹھ، غالب اکیڈمی -

ممبر مجلس انتظامیہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۵ء-

ممبر مجلس ادارت، اردو انسائیکلو پیڈیا ترقی اردو بورڈ، حکومتِ ہند -

ممبر فلم ایوارڈ کمیٹی حکومتِ ہند ۱۹۶۳ء -

ممبر ادبی بورڈ مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد -

ممبر یوپی اردو اکادمی، ممبر دہلی اردو اکادمی، رائل ایشیاٹک سوسائٹی امریکن اورینٹل سوسائٹی -

ممبر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۶ء -

ممبر مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کی گردآوری کمیٹی، ساہتیہ اکادمی صدر

ڈاکٹر ذاکر حسین۔
ممبر حضرت امیر خسروؒ انٹرنیشنل سمینار۔
ممبر، ترویتی، عثمانیہ، آگرہ، علی گڑھ، گورکھپور، لکھنؤ، الہ آباد، اودے پور، کانپور، اور میرٹھ یونیورسٹیوں کے بورڈ آف اسٹیڈیز اور ریسرچ۔

نشریات :

نئی دہلی، واشنگٹن، تاشقند، ماسکو اور لندن (بی بی سی) سے۔

علمی سفر :

امریکہ، انگلستان، روس، مغربی جرمنی، فرانس، وے ٹی کن، ہالینڈ، یونان، سوئٹزرلینڈ، ناروے، چیکوسلواکیہ، یوگوسلواکیہ، اسپین، ایران، مصر، شام، عراق، اردن، ترکی، سعودی عربستان، جاپان، کناڈا، سری لنکا وغیرہ۔

پتہ :

۷۔ یونیورسٹی روڈ، دہلی یونیورسٹی ان کلیو، دہلی ۱۱۰۰۰۷

ضمیمہ :

(۱) گزیٹیر آف انڈیا جلد دوم کے لیے خصوصی مقالہ ۱۹۷۳ء
(۲) حج بیت اللہ کے لیے روانگی ۲۴ ستمبر ۱۹۸۱ء
(۳) اکسفورڈ یونیورسٹی (۱۹۸۴ء) اور لیڈز یونیورسٹی (۱۹۸۴ء) میں توسیعی لکچرز
(۴) ترقی اردو بورڈ، تہذیب الاخلاق ٹرسٹ اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کی رکنیت ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۶ء۔
(۵) بین الاقوامی پی ای، این کے ادبی سمپوزیم سراجیوو یوگوسلاویہ میں شرکت ۱۹۸۴ء
(۶) دہلی یونیورسٹی میں تاحیات پروفیسر ایمی ری ٹس مقرر ۱۹۸۶ء۔
(۷) الہ آباد یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل نے ۱۳ جنوری ۱۹۸۶ء کو سفارش کی ہے کہ خواجہ احمد فاروقی کو ڈی لیٹ کی اعزازی ڈگری دی جائے۔
(۸) جامع تاریخ ہند جلد گیارہ میں اردو پر خصوصی مقالہ (۱۹۸۵ء)

(۹) میمونہ وحید کو عثمانیہ یونیورسٹی نے "خواجہ احمد فاروقی، حیات اور خدمات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عنایت کی۔

(۱۰) دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۸۶ء سے خواجہ احمد فاروقی گولڈ میڈل شروع کیا۔

(۱۱) دہلی اردو اکادمی نے ۱۹۸۷ء میں ارمغانِ فاروقی مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی شائع کی۔

وہ کتابیں جو خواجہ احمد فاروقی کے نام معنون کی گئیں:

۱۔ نظیر اکبرآبادی (انگریزی) از پروفیسر محمد حسن۔ مطبوعہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۷۲ء

۲۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں۔ از پروفیسر گوپی چند نارنگ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۶۰ء

۳۔ مثنوی و مثنویات، از پروفیسر وہاب اشرفی، مطبوعہ مکتبہ اُردو پٹنہ، ۱۹۸۲ء

۴۔ چند تصویر بتاں، مطبوعہ مکتبہ شاہراہ دہلی، جون ۱۹۶۶ء

۵۔ تلمیحاتِ غالب، مطبوعہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی، جون ۱۹۷۲ء

۶۔ عبدالحلیم شرر، از پروفیسر جعفر رضا۔ مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

۷۔ مومن شخصیت اور فن، از پروفیسر ظہیر احمد صدیقی۔ مطبوعہ دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۷۲ء

۸۔ مضامین پریم چند، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، مطبوعہ یونیورسٹی پبلیشرز، علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۹۔ ہجویاتِ میر، مطبوعہ نسیم پبلیشرز لکھنؤ ۱۹۷۷ء

۱۰۔ مطالعۂ ولی، از ڈاکٹر شارب ردولوی، مطبوعہ، نصرت پبلیشرز لکھنؤ، ۱۹۷۳ء

۱۱۔ یادِ وطن۔ مرتبہ پنڈت لکشمی نرائن تابش، دہلی

وہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے جو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے متعلق لکھے گئے:

۱۔ بیگم فریدہ وقار، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن، ایم فل کا مقالہ ۱۹۸۲ء

۲۔ بیگم میمونہ وحید، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن، پی ایچ ڈی کا مقالہ ۱۹۸۶ء

۳۔ شمشاد بیگم، شری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی، ایم فل کا مقالہ ۱۹۸۶ء

۴۔ بیگم راشدہ مسعود، الٰہ آباد یونیورسٹی۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ

۵۔ خواجہ احمد فاروقی بزبان انگریزی، مطبوعہ کیپٹل ٹائمس میڈیسن وسکانسن امریکہ، مورخہ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۲۶ء۔

۶۔ خواجہ احمد فاروقی بزبان ہینگرین۔ لائف اور لٹریچر۔ بڈاپسٹ، ہینگری یورپ مورخہ، ۲؍اگست ۱۹۸۰ء

مکتوباتِ اُردو کا اَدبی و تاریخی اِرتقا

فہرستِ مضامین

تمہید ـــــ فن انشا کی اجمالی تاریخ ص ۱ تا ۴۶

(الف) خطوط کی اہمیت نفسیاتی، سوانحی، ادبی، معاشرتی اور تاریخی خطوں کی خامی۔

(ب) نامہ و نامہ بر زمانے کا اثر آرٹ پر۔ ڈاک کی اہمیت۔ ڈاک کا نظام۔ اس کی مختصر تاریخ عربوں کے زمانے میں غزنوی، خلجی، تغلق، سوری اور مغل بادشاہوں کے عہد میں۔ انگریزوں کے دور میں۔ خبر رسانی کی نئی ایجادات کا اثر خطوط پر۔ نامہ و نامہ بر۔

(ج) فنِ انشا کی اصل اور ابتدا قبل ازیں اسلام رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں۔ زمانۂ راشدین بنو امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں، دیلمیوں، سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں۔

(د) انشائے فارسی کا آغاز کاتب یا دبیر۔ دبیر کے فرائض۔ عروضی کی نظر میں۔ صاحبِ "مناظر الانشا" کی نظر میں۔ اقسامِ مکاتیب۔ آداب۔ ایران کی کتب انشا۔ منشاتِ فارسی جو تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ قواعد انشا سے متعلق کتابیں۔ اعجاز و ایجاز پر زور۔ ذاتی خطوط کے مجموعے۔

(ر) ہندوستان اور فارسی انشا ہندوستان میں فارسی انشا کی ترقی کے اسباب۔ ہندوستان کی مشہور کتبِ انشا۔ خسرو کی رسائل الاعجاز۔ محمود گاوان کی ریاض الانشا۔ رقعات ابوالفضل۔ رقعاتِ ظہوری۔ رقعاتِ عالم گیر۔ رقعاتِ نعمت خان عالی۔ رقعاتِ بیدل۔ رقعاتِ قتیل۔ رقعاتِ غالب۔ انشائے خلیفہ۔ انشائے بہار عجم۔

(س) فارسی طرزِ انشا اور اس کا اُردو پر اثر ایران اور ہندوستان کے تعلقات۔ نادر شاہ کا حملہ اور اس کا اثر۔ ایران اور ہندوستان کا طرز۔ فارسی خطوں میں تکلف و تصنع۔ اس

مرصع کاری کا اثر اُردو انشا پر۔ فارسی کی تقلید کے مثبت اور منفی پہلو۔

(ط) فارسی کا زوال ــ دیوانی بنگالہ کی تفویض۔ سر جان شور کی رائے۔ فارسی کا زوال اور اُردو کی ترقی۔

(ع) انگریزی مکتوب نگاری اور اس کے اسالیب ــ کیا غالب کی مکتوب نگاری انگریزی سے متاثر ہے۔ انگریزی حکومت کا قیام اور استحکام۔ اُردوے جدید پر اثر۔

(ف) انگریزی انشا کی مختصر تاریخ ــ عہد نشاۃ الثانیہ۔ مذہبی اصلاح کا دور ۱۷ ویں صدی۔ ۱۸ ویں صدی۔ ۱۹ ویں صدی۔ ۲۰ ویں صدی۔ اُردو انشا پر انگریزی کا اثر۔

بابِ اوّل ــــ انشائے اُردو

رجب علی بیگ سرور سے پہلے

ص ۴۷ تا ۷۹

(الف) اُردو کا تشکیلی دور ــ بارھویں صدی عیسوی کا ایک پروانہ۔ بارھویں صدی عیسوی کا دوسرا پروانہ۔ ان کی نقلیں۔ ان کی لسانی اہمیت۔ ابتدا میں اُردو دہلی سے دکن گئی ہے۔ دکن سے شمال کو نہیں گئی ہے۔ صوفیائے کرام اور اُردو نثر۔

(ب) دکن میں اُردو کی ترقی ــ فرشتہ کا بیان۔ اوراق مجموعہ مکتوبی بزبان دکنی (قلمی) دکن کے چند تمثیلی خطوط۔ منشاتِ منشی محمد شاکر (قلمی) ۱۷۹۸ء سے پہلے لکھی گئی۔ نوابانِ کرناٹک کے خطوط۔ مکاتیبِ اعظم جاہ قلمی میں نواب شکوہ الملک ثانی کے اُردو خطوط (۱۸۲۲ء) ان کے نمونے۔ ان خطوں کی اہمیت۔ یہ انشا اردو کے ابتدائی اور فطری رجحانات سے قریب ہیں۔

(ج) شمالی ہند اور اُردوئے معلیٰ ــ دارالخلافہ کی تبدیلی۔ اکبر آباد اور شاہ جہاں آباد۔ شاہ جہاں کا اُردو خط۔ اورنگ زیب۔ میر جعفر زٹل کے اُردو رقعات برزخی دور کے ترجمان ہیں۔ محمد شاہ۔ مرزا رفیع سودا کے دو اُردو خطوط (؟) فورٹ ولیم کالج مستشرقین کے اُردو خطوط۔ گارساں دتاسی اور ڈیوڈ اکٹرونی۔ اُردو میں منظوم خطوط۔

احسن مارہروی کے اس نظریے کی تردید کہ خط نویسی کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ سرور اور غالب سے پہلے کے مکتوب نگار۔ مرزا جان طپش (سالِ وفات غالباً ۱۸۱۴ء)

راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۸۲۲ء) یاس آروی (متوفی ۱۸۴۵ء)۔ تاثیر عظیم آبادی (متوفی ۱۸۵۹ء)۔ دہلی اُردو اخبار کے خطوط (۱۸۴۰ سے ۱۸۴۱ء تک)۔ مرزا قتیل (متوفی ۱۸۲۴ء) کے اُردو خطوط۔

خلاصۂ بحث ــــ (۱) مکاتیب سرور تاریخ ادب کا حادثہ نہیں ہیں اور نہ وہ خلا میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ ارتقا کی اس زنجیر کی ایک اہم کڑی ہیں جس میں منشات شاکر اور مکاتیب شکوہ الملک ثانی شامل ہیں۔ (۲) سرور اور غالب سے پہلے کا زمانہ مکتوبات کی تاریخ میں تاریک دور نہیں ہے۔

بابِ دوم

رجب علی بیگ سرور اور ان کے مقلدین

ص ۷۷ تا ۱۴۴

(الف) رجب علی بیگ سرور ۱۸۶۸ - ۱۷۸۷ء ــــ اٹھارھویں صدی کی اُردو نثر۔ اُردو نثر کی ترقی۔ اُردو سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی۔ (۱۸۳۲ء) خط نویسی میں غالب کی تاریخی اولیت کی تردید ایک اور پہلو سے۔ رجب علی بیگ سرور (۱۸۶۸ - ۱۷۸۷ء) سرور کی ایک اہم عرضداشت۔ اس کی تاریخ کا تعین۔ سرور کی تاریخی اولیت غالب کے مقابلے میں، انشائے سرور کی اہمیت۔ حالاتِ عصر۔ فرقہ وارانہ فسادات۔ مولوی امیر علی کا حال اور مآل۔ تصانیفِ سرور۔ سرورِ سلطانی۔ گلزارِ سرور۔ شبستانِ سرور۔ سوانحات۔ زوالِ بصارت۔ مراسم و تعلقات۔ اسلوبِ نگارش۔ سرور کا اثر۔

(ب) واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوں کے مجموعے ــــ مخزنِ اسرارِ سلطانی قلمی۔ رقعاتِ اہلیہ واجد علی شاہ قلمی۔ تاریخی غزالہ مطبوعہ۔ تاریخ نور قلمی۔ انشائے راحتِ روح مطبوعہ۔ تاریخ ممتاز قلمی و مطبوعہ۔ تاریخ بدر مطبوعہ۔ بیگماتِ اودھ کے خطوط مطبوعہ۔ ان خطوں کا موضوع۔ تاریخی معلومات۔ واجد علی شاہ کے عہد کی معاشرت۔ واجد علی شاہ کی معزولی۔ دادخواہی کے لیے وفد۔ غدر۔ فورٹ ولیم میں نظربندی۔ قید و بند کے مصائب۔ غدر اور لکھنو۔ برجیس قدر۔

احمداللہ شاہ۔ حضرت محل۔ بیگمات کی مصیبتیں۔ ان خطوط کی ادبی قدر و قیمت۔ طرزِ نگارش۔ القاب۔ زبان و بیان۔ شیدا بیگم اور حور بیگم کے منظوم خطوط۔

(ج) فارسی انشا کے اردو تراجم —— اس دور کی اُردو انشا پر فارسی کے اثرات۔ رقعات ابوالفضل۔ انشائے خلیفہ۔ رقعات عالم گیر۔ انشائے ہرکرن۔ انشائے مادھو رام اور انشائے صفدر کے اُردو ترجمے۔

(د) اُردو میں خطوط نگاری سکھانے کی قدیم کتابیں —— دستور النثر قلمی۔ دستور الہدایت قلمی۔ انشائے خردافروز۔ غلام امام شہید (متوفی ۱۸۷۶ء) کی انشائے بہارِ بے خزاں (مطبوعہ)۔ سموط درر۔ رقعاتِ اصغر اکبرآبادی۔ ان خطوں میں فارسی کی کورانہ تقلید ہے اور جو فنی شعور کارفرما ہے وہ بھی جامد اور رسمی قسم کا ہے۔

بابِ سوم

بے خبر اور غالب ص ۱۴۵ تا ۲۵۲

(الف) خواجہ غلام غوث بے خبر (۱۸۲۴-۱۹۰۵ء) —— غالب سے پہلے کا مکتوباتی ادب اور اس کی فنی روایتیں۔ خواجہ غلام غوث بے خبر (۱۸۲۴-۱۹۰۵ء) کے خطوں کا پس منظر۔ ان کے خطوں کی بے تکلفی۔ بے ساختگی اور شوخی۔ صنعت طرازی بھی ہے لیکن اس میں ثقالت اور معمائیت نہیں ہے۔ بے خبر اور غالب کے اسلوب کا فرق، بے خبر کی حیثیت سرور اور غالب کے درمیان برزخ کی سی ہے۔ بے خبر کا درجہ۔

(ب) مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) —— غالب نے محمد شاہی روشوں کو سب سے پہلے ختم نہیں کیا۔ غالب کا تقدم تاریخی نہیں ادبی ہے۔ غالب کی اُردو نگاری کا آغاز۔ حالی، مہر اور عرشی کی رائیں۔ ان سے اختلاف۔ غالب نے ۱۸۴۸ء سے پہلے بھی اُردو میں خط لکھے ہوں گے۔ فارسی ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ لنگی والا خط اور اس کی تاریخ۔ تفتہ کے نام خط اور اس کی تاریخ۔ اُردو نگاری کے اسباب۔ غالب کے خطوں کی ادبی اہمیت۔ قدیم لوازمِ مراسلت میں اجتہاد۔ القاب۔ کاتب کا تعارف۔ تاریخ کتابت۔ مکالمہ۔ غالب کی ظرافت اور طنز۔ جدت ادا۔ تشبیہات اور تلمیحات۔

تصویرکشی وصورت گری۔ سہل ممتنع ۔ تزک و تذکرہ کا لطف ۔

غالب کی سیرت کے خط و خال ۔ معاصرین سے تعلقات ۔ غالب اور نواب شمس الدین ۔ غالب اور نواب یوسف علی خاں ۔ غالب اور شہید ۔ غالب اور آزردہ ۔ غالب اور آزردہ کے دو نایاب اور غیر مطبوعہ خطوط ۔ غالب اور حامیانِ قتیل ۔ غالب کی بشریت ۔

غالب کے خطوط تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں لیکن ادبی خطوط میں بہت سے تحقیقی اغلاط ہیں ۔

غالب کی انشا کا اثر ۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی رائے پر بحث ۔ غالب کے طرز کی مقبولیت ۔ مجروح ۔ علائی ۔ آزردہ ۔ مفتی سید محمد عباس ۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی ۔ اور قاضی عبدالجلیل جنوں کے غیر مطبوعہ خطوط میں غالب کا اثر ۔ ان کے نمونے ۔

(ج) بہادر شاہ ظفر ـــــ ظفر اور شاہ زمانی بیگم کے خطوط ۔ ان میں تحریف ۔ ان کا طرزِ تحریر ۔ اس دور کی انشا پر غالب کا احسان ۔

(د) امیر مینائی اور داغ دہلوی ـــــ امیر مینائی (۱۹۰۰-۱۸۳۲ء) کے خطوں کا پس منظر ۔ انیسویں صدی کی معاشرت ۔ لکھنؤ کے زوال کے بعد رام پور کی ترقی ۔ امیر کا اسلوب بیان ۔ امیر ۔ غالب اور سرسید کی درمیانی کڑی ہیں ۔ ان کے خطوں کی اہمیت ۔

داغ دہلوی (۱۹۰۵ - ۱۸۳۱ء) کے خطوں کی صرف سوانحی اہمیت ہے ۔ ادبی نہیں ۔ داغ کے غیر مطبوعہ خطوط ۔ داغ کے مراسم معاصرین سے ۔ داغ کے تعلقات نقاب اور حجاب سے ۔ طوائف اور اردو انشا ۔ مشتری کے نادر خطوط نساخ کے نام جو ۱۸۶۸ء کے قریب لکھے گئے ۔

بابِ چہارم

سرسید اور ان کے رفقا، ص ۲۵۳ تا ۳۸۰

(الف) سرسید اور ان کے رفقا ـــــ سرسید کی تحریک زمانے کے نئے مطالبات ۔ سائنسی ایجادات ۔ عقلیت کی ترقی ۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا ۔ سرسید (۱۸۹۸ - ۱۸۱۷ء)

کے خطوط۔ ان کی سیرت۔ خیالات و نظریات کا آئینہ ہیں۔ سرسیّد کے دو نادر خط۔ یورپ کا اثر۔ تاریخی معلومات۔ اُردو ہندی کی نزاع۔ جدید اردو شاعری۔ اسلوبِ تحریر۔ جدید نثر کی ابتدا۔ فارسی کی تقلید سے آزادی۔ انگریزی کا اثر۔ تصویر کا دوسرا رُخ۔ سرسیّد کے اغلاط۔

نواب محسن الملک (متوفی ۱۹۰۷ء) اور وقار الملک (متوفی ۱۹۱۷ء) یہ ادبی شخصیتیں حقیقتاً غیر ادبی ہیں۔

حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء)۔ حالی کی ادبیات۔ سرسیّد کی شخصیت کے عوارض ہیں۔ حالی کی سیرت اور شخصیت۔ ادبی نکات۔ حالی کا نظریۂ شاعری۔ خطوں کا ادبی حسن۔

ڈاکٹر عبدالحق کا نظریہ خطوں کے بارے میں۔ ان کی انشا اور سیرت پر تبصرہ ۴۶ غیر مطبوعہ خطوں کی روشنی میں۔ ان کا اسلوب۔ حالی کے رنگ کی ارتقائی صورت اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔

(ب) محمد حسین آزاد۔ نذیر احمد۔ اکبر اور اقبال ـــــ محمد حسین آزاد متوفی ۱۹۱۰ء۔ سرسیّد کی تحریک اور ان کے اسلوب کو سب نے کلیتاً قبول نہیں کیا۔ آزاد نے علیحدہ روش اختیار کی۔ خطوں میں ان کی ادبی زندگی کی جھلک۔ آبِ حیات۔ دربارِ اکبری۔ دیوانِ ذوق کے متعلق مواد۔ طریقۂ تصنیف و تالیف۔ ادبی انہماک۔ آزاد کا اسلوب۔ سرسیّد اور آزاد کے اسالیب کا فرق۔ آزاد کی شخصیت۔

نذیر احمد (متوفی ۱۹۱۲ء)۔ موعظۂ حسنہ کی حیثیت اور نوعیت۔ اس کا پس منظر۔ بیسویں صدی کا ماحول۔ خیالات و نظریات۔ نذیر احمد کورانہ تقلید کے قائل نہیں تھے بلکہ مشرق اور مغرب کا آمیزہ تیار کرنا چاہتے تھے۔ علمی بحثیں۔ اسلوب۔ مولوی سید احمد صاحب فرہنگِ آصفیہ۔ مولوی بشیر الدین اور خواجہ حسن نظامی کے خطوں میں دہلی کا روزمرہ۔

اکبر الہ آبادی۔ ان کے خطوں میں انیسویں صدی کی تہذیبی کشمکش ہے لیکن نہ طرزِ ادا کی ندرت ہے اور نہ بے تکلفی کا جادو۔ ان کی اہمیت نفسیاتی اور سوانحی ہے۔ اکبر کی مجہول روحانیت۔ آلام و اوہام۔ اکبر کے خانقاہی مزاج کا اثر ادب پر

اکبر اور اقبال کے تعلقات ۔

ڈاکٹر اقبال ۔ سرسید۔ حالی۔ اکبر اور اقبال کے خیالات کا بنیادی فرق ۔ اقبال کے خطوں کی اہمیت ۔ یہ ان کے دل و دماغ کی سرگزشت ہیں اور ان سے ان کی شاعری اور فن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ ان کا نظریۂ فن ۔ ان کا نظامِ فکر۔ ایک جدید معاشرتی نظام کی تلاش ۔ سیرت و شخصیت ۔ عطیہ کے نام خطوط اور ان کی اہمیت ۔

بابِ پنجم

شبلی اور مہدی — ص ۳۸۱ تا ۴۷۳

(الف) شبلی اور مہدی ۔ شبلی —— سرسید کی شکست اور ریخت کے بعد تزئین بیان کی طرف توجہ ۔ شبلی کا باطنی تضاد ۔ شبلی کے تعلقات فیضی بہنوں سے ۔ فن پر مفصل بحث ۔ حدیث دیگراں سے سر دلبراں ۔ شبلی کی سیرت ۔ شبلی اور سرسید کی تحریک ۔ شبلی کی شخصیت ۔ معاصرین سے تعلقات ۔ بعض مباحثہ انگیز پہلو ۔ اسلوبِ نگارش ۔ قدیم و جدید میں مفاہمت ۔ مہدی افادی —— "قدیم و جدید کی بہترین شعاع" ہیں ۔ مہدی کے تعلقات شبلی ۔ میر ناصر علی اور ریاض کے ساتھ ۔ مہدی کی نامہ طرازی ۔ شوخ نگاری ۔ لذتیت ۔ انگریزی کا اثر ۔ مہدی کے خطوط اپنی بیگم کے نام ۔

(ب) ریاض خیرآبادی اور نیاز فتحپوری —— اس زمانے کے دو رجحان ایک ماضی کی طرف لے جاتا ہے دوسرا مستقبل کی طرف ۔ ریاض خیرآبادی اور شاد عظیم آبادی کے خطوط ماضی کی یاد دلاتے ہیں ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے خطوں میں مغربی سادگی اور فکر کاری ہے جو ماضی سے زیادہ مستقبل کی چیز ہے ۔ نیاز فتحپوری کے خطوں میں عاقلانہ حزم و احتیاط ۔ سیرت ۔ خود پوشی اور خود نمائی/شخصیت پرتہ بہ تہ نقاب ۔ اسلوبِ بیان ۔ شعریت و جمالیت ۔

بابِ ششم

مولانا محمد علی اور مولانا حسین احمد مدنی ص ۴۴۷ تا ۴۸۸

مولانا محمد علی —— تاریخی ماحول ۔ کانگریس کا قیام ۔ تقسیمِ بنگال ۔ جنگِ بلقان ۔ میثاقِ لکھنؤ ۔ رولٹ ایکٹ ۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم ۔ تحریکِ عدم تعاون ۔ مولانا محمد علی کی سیرت اور شخصیت ۔ خطوں کے آئینے میں ۔ طرزِ تحریر ۔ ان کے خطوں میں جو ادبی خوبیاں ہیں وہ اتفاقی ہیں ۔ ان کو ہیجانی زندگی میں آرائش و اہتمام کا موقع ہی نہیں ملا ۔ مولانا حسین احمد مدنی کے علمی، فقہی اور سیاسی خطوط ۔ ان میں بھی ادب و انشا کا لطف اگر ہے تو وہ ضمنی ہے ۔ وہ محض ایک مذہبی اور سیاسی شخصیت کے سمجھنے میں مفید ہیں ۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے خطوط ۔

بابِ ہفتم

مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ کے خطوط ص ۴۸۹ تا ۵۰۲

ابوالکلام آزاد —— غبارِ خاطر کی شان نزول ۔ ان خطوں کا موضوع ۔ یہ خطوط فکر کا دریچہ ہیں ۔ واردات و سوانح کا آئینہ نہیں ۔ انفرادیت ۔ قید و بند کی زندگی ۔ فلسفۂ حیات ۔ "خوش رہنا اخلاقی ذمہ داری ہے" ۔ چاء کا ذکر ۔ آزاد اور غالب ۔ اسلوب ۔ کاروانِ خیال ۔ مولانا آزاد کے متفرق خطوط ۔ ان کا طرزِ نگارش ۔ نواب صدر یار جنگ ۔ اسلوب میں صناعانہ پختگی ہے لیکن ابوالکلام آزاد کی سی بلند خیالی اور نازک کاری نہیں ہے ۔

بابِ ہشتم

سجاد ظہیر اور ڈاکٹر تاثیر ص ۵۰۳ تا ۵۴۰

بیسویں صدی کے ادب کا پس منظر ۔ ترقی پسند تحریک (۱۹۳۶ء) ۔

E
3

سنہ ۱۹۳۹ء کی دوسری عالم گیر جنگ ۔ سجاد ظہیر کی نقوشِ زنداں میں رنجِ گراں نشیں کی ترکات ۔ اور عمر گریز پا کی حکایت جسم کی محبوس مجبوریاں ۔ ذہنی اتحاد کی کمی ۔ ان خطوں پر تنقید ۔ پریم چند اور جوش ملیح آبادی کے متفرق خطوط ۔ پطرس اور ڈاکٹر تاثیر کے خطوط ۔ زندگی کے ولولوں سے تابندہ ہیں ۔ ان میں جدید اسلوب کی وسعت ہے ۔ اس کا کچاپن نہیں ہے ۔

بابِ نہم

مکتوباتی ادب کا جائزہ

ص ۵۲۱ تا ۵۴۳

اُردو انشا کے رجحانات اور اس کی عہد بعہد ترقی ۔ خطوں کے اسالیب اور پیرائے ۔ ان کے فارم سے مختلف کام ۔ مکتوبات کی قدر و قیمت ۔

تمہید — فنِ انشا کی اِجمالی تاریخ

(الف) خطوط کی اہمیت

خطوط کی اہمیت: نفسیاتی، سوانحی، ادبی، معاشرتی اور تاریخی

مکتوباتی ادب تاریخ نثر کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کا دائرہ نثر سے ملا ہوا بھی ہے اور اس سے الگ بھی ہے۔ مکتوبات میں نثر کی خوبیاں بھی ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ انکشافِ ذات یا اظہارِ حال کا شوق انسان کے خمیر میں داخل ہے۔ اسی وجہ سے ادب کے وہ اصناف جن کے ذریعے ہم کسی شخصیت کے پورے خط و خال دیکھ سکیں ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہیں گے۔ ذاتی خطوط اور خودنوشت سوانح عمری کے ذریعے سے، ہم مصنف کی روزمرہ کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، اس کے اعمال و اشغال کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کی زندگی معلوم کر کے دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی ذات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسروں کی محبّت و نفرت، ان کا رنج و غم، ان کی کامیابی، ناکامیابی ہمارے لیے کوئی غیر چیز نہیں ہے۔ انسانی فطرت ہر جگہ ایک ہی سی ہے۔ اس آئینے میں ہمیں دوسروں کی صورت کے ساتھ اپنی صورت بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے اچھے خطوط اور

اچھی خودگزشت وہی سمجھی جائے گی جس میں زندہ شخصیت یا فردیت پورے طور پر جلوہ گر ہو۔ ہڈسن نے لکھا ہے کہ شخصی اور انفرادی تجربہ ادب کی جان ہے۔ شخصیت کا اظہار جتنا خطوں میں ہوتا ہے اتنا اور کسی ذریعے سے نہیں ہوتا۔ شخصیت ہے بھی بڑی پیچیدہ چیز۔ محبوب کی زلفِ خم بہ خم سے زیادہ پُر اسرار۔ اس کی تعمیر میں تاریخ و تمدن، شعور و لاشعور، ماحول اور وراثت کے ہزاروں عوامل کام کرتے ہیں۔ اس لیے انسانی شخصیت کی نقاب کشائی آسان نہیں ہے۔ لیکن بے تکلف خطوں میں جہاں مصلحت کی دراندازی اور عاقلانہ حزم و احتیاط نہ ہو اس حقیقت کا جلوہ نظر آجاتا ہے۔ اسی لیے وہ ادب میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

خطوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان سے ہم تاریخی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈائری، خود نوشت اور خطوط سے جتنے مستند تاریخی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں اتنے کسی اور ذریعے سے نہیں معلوم ہو سکتے۔ [انگلستان کے عہد اعادۂ شاہی کی تاریخ PEPYS اور اٹھارویں صدی کے فرانس کو ST. SIMON کی تحریروں کے بغیر سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اسی طرح سلاطینِ ترکی اور شاہانِ صفویہ کے تعلقات منشاتِ السلاطین یا منشات فریدون کے بغیر واضح نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ براؤن نے ان کو تاریخِ ادبیاتِ ایران میں بہت فراخ دلی سے استعمال کیا ہے[1]۔] لیکن ان چیزوں سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب لکھنے والے کا مشاہدہ وسیع ہو۔ اس میں قوتِ نقد و تمیز موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ بے لوث، غیر جانب دار اور بے تعصب ہو۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی خطوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جب ان کے لکھنے والے دوسروں کا ذکر کرتے ہیں تو خود ان کے "خلوت کدۂ ذات" کا حجاب بھی اٹھ جاتا ہے اور اس "حدیثِ دیگراں" سے "سرِ دلبراں" بآسانی معلوم

---

[1] تاریخِ ادبیاتِ ایران ۔ ج ۴ ۔ ص ۶۶۔ ۶۷

کیا جا سکتا ہے۔ خون گشتہ تمناؤں اور چھپی ہوئی آرزوؤں کا ذکر ان کے ذہن اور دماغ کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر دیتا ہے اور اس طرح ان کے اعمال و عواطف کے بہت سے سربستہ راز کھل جاتے ہیں۔

انسان کے کاموں سے جہاں اس کی شخصیت سے متعلق کچھ اندازہ ہوتا ہے وہاں گمراہی کا بھی اندیشہ ہے۔ بونا پارٹ بہت بڑا جنرل تھا لیکن وہ محض جنرل ہی نہیں تھا۔ اگر ہم نے اسے محض فوجی سرگرمیوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی تو ہماری ناکامیابی یقینی ہے۔ وہ LETIZIA کا بیٹا، جوزافین کا شوہر اور ST. HELENA کا قیدی بھی تھا! انسان اتنا اپنے کاموں میں نہیں جتنا خیالوں میں رہتا اور بستا ہے۔ دراصل سوتے جاگتے میں اس کے خیالات، اس کی امیدوں اور مایوسیوں کی روداد، اپنی ذات کے متعلق اس کی رائے، گرد و پیش کی چیزوں کے بارے میں اس کے تاثرات، یہ ہیں وہ چیزیں جو ہمیں اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ خطوں کے ذریعے ہم چہرے کی رنگت دیکھ سکتے ہیں، نگاہوں کو پہچان سکتے ہیں، نبض کی رفتار معلوم کر سکتے ہیں، دل کی دھڑکن سن سکتے ہیں، اسی لیے وہ "روسو کے اعترافات" سے زیادہ اہم ہیں۔ اور سوانحی مواد اخذ کرنے کا سب سے مفید ذریعہ ہیں۔

خطوں کی خامی

خطوں کے ذریعے پوری شخصیت کے خط و خال نظر نہیں آتے لیکن وہ شخصیت کا ایک اہم جزو ضرور ہیں۔ اول تو لکھنے والے کے سارے خطوط ہم تک نہیں پہنچے۔ دوسرے بعض لوگ خلوت میں بھی نقاب ڈالے رہنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے، خط عارضی لمحوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں وقتی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ ان پر بھروسہ کرنا چاہیے لیکن تمام تر بھروسہ کرنا غلط ہے۔ یہ ہمارے دوسرے ذرائع کو تقویت پہنچاتے

ہیں اور واقعات کے خشک ڈھانچے میں زندگی کی روح بھر دیتے ہیں۔ اور دراصل بڑے مکتوب نگار بھی وہی ہیں جو ان عارضی لمحوں کو جاوداں بنا سکیں اور جو ان لمحوں کو "زمان و مکاں سے چرا کر" ان کی خیر و برکت کو عام کر دیں۔

"اگر سڑکیں نہ ہوتیں تو خطوط بھی نہ ہوتے۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان میں مکاتیب نگاری کا جذبہ سڑکوں کی تعمیر کے بعد بیدار ہوا۔ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ خطوط بھیجنے میں سہولت پیدا ہو گئی اور ڈاک کا باقاعدہ سلسلہ قائم ہو گیا۔ ہمارے آبا و اجداد زمان و مکان پر وہ تصرف نہیں رکھتے تھے جو آج ہمیں حاصل ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں خطوط پالکی کے ذریعے بھیجے جاتے تھے[1] اور ان کی سست رفتاری ظاہر ہے۔ جارج سوم کا انتقال ۲۹ جنوری ۱۸۲۰ء کو ہوا ہے لیکن بمبئی میں اس کا اعلان ۲۳ مئی سے قبل نہ ہو سکا۔ ڈاک کے ابتدائی نظام نے ہمارے بزرگوں کو جو ایک خاص تمدن اور تہذیب کے حامل تھے اور ہم سے زیادہ اطمینان اور فرصت کے سامان رکھتے تھے ایسے خطوط لکھنے کی طرف رجوع کیا جس کی طوالت اور صنع طرازی کی مثال موجودہ دور میں تقریباً ناپید ہے۔ یہ خطوط اس تہذیب کا آئینہ ہیں اور تاریخ کی بیسیوں ضخیم جلدیں زمانے کی وہ عکاسی نہیں کر سکتیں جو خطوط کا ایک مختصر سا مجموعہ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ تاریخ ہزار حقیقت سہی لیکن پھر بھی تجرید اور نظریت سے بالکل علیحدہ نہیں ہے۔

(ب) نامہ و نامہ بر

زمانے کا اثر آرٹ پر

ہر زمانہ ایک مخصوص آرٹ کا حامل ہوتا ہے۔ مادی حالات اس کی

[1] عنوان رسل و رسائل؛

1 Sahibs by Hilton Brown (1948)

نیز Chow Chow by Lady Folkland عنوان پالکی کا سفر

ظاہری شکل وصورت کی ترتیب دیتے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ تصور محبوب کے لیے وقت تھا اور روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ادب میں بھی تکلفات روا تھے خطوط کی طوالت اور ان کی ظاہری آرائش اور صنعت گری درحقیقت کوئی غیر فطری بات نہیں تھی لیکن دورِ حاضرہ نے زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ زمین سکڑ گئی ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ شہری معاشرت نے دل و دماغ پر تسلط جما لیا ہے۔ انسان کی مصروفیتیں بڑھ گئی ہیں اور اس کے مشاغل میں اضافہ ہو گیا ہے اس لیے تھیٹر کی طرح مکاتیب نگاری بھی بہ حیثیت آرٹ کے زوال پذیر ہو رہی ہے۔ تار اور لاسلکی نے اختصار پسندی کو فروغ دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ شادی جیسے بڑے اور اہم مسائل بھی تار کے ذریعے طے پا جاتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں ایک عجیب و غریب شادی ہوئی۔ ایک دن مس ایرنا بیربی کو لاس انجلیز میں سارجنٹ کک کا انگلستان سے تار ملا جس میں لکھا ہوا تھا:

"مس بیربی میں آج سے تمھیں اپنی جائز منکوحہ بیوی سمجھوں گا۔"

مس بیربی نے فوراً کک کو انگلستان تار بھیجا۔

"سٹینلے کک میں آج سے تمھیں اپنا شوہر سمجھوں گی۔"[1]

یہی اختصار خطوں میں بھی نظر آتا ہے۔ راجرز نے ایک خط لیڈی ڈفرن کو لکھا تھا۔ "کیا آپ بدھ کو میرے ساتھ کھانا کھائیں گی؟" اس کے جواب میں لیڈی ڈفرن نے صرف " ? 9 .WON'T " لکھ کر بھیج دیا تھا۔[2] اسی طرح علامہ شبلی نے ایک مرتبہ مہدی حسن افادی الاقتصادی کو ایک کارڈ کے ذریعے اپنے الہ آباد آنے کی اطلاع دی جس پر صرف ان کا نام "شبلی" لکھا ہوا تھا۔ یہ کارڈ مہدی مرحوم کی زبان میں ورق الزیادہ سے کم نہ تھا۔[3] لیکن اس سے بھی زیادہ اختصار خود مہدی نے برتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے عرصے سے کوئی خط نہیں بھیجا تھا، مہدی مرحوم نے

---

[1] ہمایوں لاہور: دسمبر ۱۹۴۲ء۔

[2] Best English Letters by First Earl of Birkenhead p. 954

[3] مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۲۲۵۔

کارڈ پر صرف علامتِ استفہام (؟) لکھ کر روانہ کر دی[1]۔ اس خاموشی میں بھی ہزار گویائیاں چھپی ہوئی ہیں۔

ڈاک کا نظام اور اس کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ آمد و رفت اور خبر رسانی کی موجودہ سہولتوں نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ وقت اور فاصلے کا سوال ہی معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت کی خبر آپ کو اسی وقت دنیا کے ہر گوشے میں معلوم ہو سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ آپ اس "واقعۂ غائب" کا اسی وقت مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں لیکن قدیم زمانے میں بھی باوجود محدود ذرائع کے ڈاک کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ قدیم ایران اور روما میں سوار ایک جگہ سے دوسری جگہ خطوط لے جاتے تھے۔ منگولوں نے بھی پیام رسانی کے محکمے کو بڑی ترقی دی تھی[2]۔ مشہور سیاح مارکو پولو چین میں خانِ اعظم کا انتظام دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں پیرس یونی ورسٹی نے اپنا ڈاک کا انتظام علیحدہ قائم کیا تھا۔ انگلستان میں بھی چودھویں صدی عیسوی میں خطوط بھیجنے کا یہی طریقہ رائج تھا کہ سوار ایک مقام سے دوسری جگہ خطوط منتقل کرتے تھے۔ اور اس کام میں اپنے جانتے بڑی پھرتی برتتے تھے۔ انگریزی میں Post haste کے معنی اسی وجہ سے "انتہائی جلدی" کے ہیں۔ جیمس اوّل کے زمانے میں طریقۂ ڈاک کی اصلاح ہوئی اور ۱۶۵۰ء میں یہ کوشش کی گئی کہ خطوط ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ آئیں اور جائیں۔

ڈاک کی مختصر تاریخ

ہندوستان کے بادشاہوں نے ڈاک کا اتنا مکمل انتظام کیا تھا کہ سمرقند اور کشمیر کے تازہ پھل روزانہ دستر خوان پر موجود ہوتے تھے۔ اس کا سلسلہ محمد بن قاسم فاتحِ سندھ

---

[1] مکاتیبِ مہدی، ص ۲۷ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹےنیکا "پوسٹ"

سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے پاس ہر تیسرے روز حجاج ابن یوسف کے خطوط آتے تھے اور سندھ سے عرب سات دن میں ڈاک پہنچ جاتی تھی۔

عہدِ غزنوی میں دو قسم کی ڈاک رائج تھی۔ ایک وہ جو سواروں کی معرفت منزل بہ منزل پہنچتی اور جسے فیل تاشان کہتے تھے اور دوسری وہ جو پیادوں کی معرفت روانہ ہوتی تھی اور جسے مسرّان کہتے تھے۔

دورِ خلجیہ میں باقاعدہ ایک محکمہ برید قائم کیا گیا تاکہ سلطان علاؤ الدین خلجی کو منٹ منٹ اور پل پل کی خبریں پہنچتی رہیں۔ آمد و رفت میں جلدی کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ خسرو خاں نے پالکی میں بیٹھ کر دولت آباد سے دلّی تک کی مسافت صرف سات دن کے اندر طے کی تھی۔ غیاث الدین تغلق کے زمانے میں دلّی سے دکن ہفتے میں دو بار ڈاک آتی جاتی تھی۔ محمد تغلق نے اس انتظام کو اتنی ترقی دی کہ سیستان سے خطوط ملتان ہو کر پانچ روز میں دار الخلافہ پہنچ جاتے تھے۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ ڈاک کا گھوڑا ہر چوتھے کوس پر بدل دیا جاتا تھا۔ پیادہ ڈاک کے لیے یہ انتظام تھا کہ گاؤں میں منار بنا دیئے گئے تھے جہاں ڈاکیہ گھنٹی لیے موجود ہوتا تھا۔ یہ آواز دوسرے نامہ بر کے لیے تیاری کا اعلان ہوتی تھی۔ ان ہی انتظامات کی وجہ سے بادشاہ کو دولت آباد میں روزانہ تازہ گنگا جل مل جاتا تھا حالانکہ دلّی اور دیوگر کا فاصلہ چالیس روز سے کم کا نہ تھا۔

اس زمانے میں طبل کی آواز سے تار کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کی بھی ایسی ہی علامتیں مقرر تھیں جیسی کہ آج تار برقی کی ہیں۔ نقارے کے ذریعے بادشاہ کی موت، صلح، جنگ اور حملہ وغیرہ کی اہم خبریں سنائی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ فیروز تغلق اڑیسہ کے جنگل میں راستہ بھول گیا اور چھ مہینے تک مفقود الخبر رہا۔ اس زمانے کے خطوط کا اتنا بڑا انبار ہو گیا تھا کہ وہ ایک اونٹ پر لاد کر دلّی لائے گئے۔

شیر شاہ سوری نے ڈاک کا نہایت مکمل انتظام کیا۔ اس کے پاس روزانہ بنگال، پنجاب، راجپوتانہ اور مالوہ سے خبریں آتی تھیں۔ اس نے ۱۷۰۰ سرائیں اور چوکیاں

اسی غرض کے لیے تعمیر کروائیں۔ اب یہ نظام اتنا مکمل ہو گیا کہ ایک سوار نے ۰۰۰ میل کا سفر ایک روز میں طے کیا۔ اکبر کے زمانے میں پانچ دن کے اندر آگرے سے احمد آباد خط پہنچ جاتے تھے۔

جہانگیر کی نفاست پسندی اور رنگین مزاجی ہر چیز میں نظر آتی ہے۔ اس کے لیے روزانہ تازہ پھل کشمیر اور وسطِ ایشیا سے آتے تھے۔ کبوتروں کے ذریعے پیام رسانی کا سلسلہ بھی اسی کے زمانے میں عام ہوا۔ یہ کبوتر تین تین مہینے کی مسافت تین گھنٹے میں طے کر لیتے تھے۔ شاہجہاں کے زمانے میں کابل، قندھار، بنگال اور دکن سے برابر خبریں آتی تھیں۔ اورنگ زیب نے تو ڈاکیہ کے اوقات تک مقرر کر دیئے تھے[1]

خبر رسانی کی نئی ایجادات کا اثر خطوط پر

انگریزوں نے ہندوستان کے وسائلِ آمد و رفت اور خبر رسانی میں نئی ایجادات کو سامنے رکھ کر اصلاح کی۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں پہلی ریل نکلی۔ تار کا سلسلہ قائم ہوا۔ اور تمام ہندوستان کے لیے ڈاک کا ٹکٹ مقرر کر دیا گیا۔ ان تبدیلیوں نے دورِ جدید کا آغاز کیا۔ اور ہندوستان کا تعلق بیرونی دنیا سے استوار کر دیا اور سماجی زندگی کی دوبارہ تنظیم ان نئی اصلاحات کی بنیاد پر کی گئی۔

ان تبدیلیوں نے مکاتیب نگاری کے فن کو ایک طرح کا نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکیے کا تھیلا آج پہلے سے زیادہ بھرا ہوتا ہے۔ اس میں اخبار، رسالے، سرکلر، تجارتی لٹریچر، کارڈ، لفافے سب ہی کچھ ہوتے ہیں لیکن ان میں کتنے خط ایسے ہوتے ہیں جن میں غالب کی سی رعنائیِ خیال یا اس کی جھلک بھی پائی جاتی ہو۔ اس کی وجہ وہی زمانہ، ضرورت اور نقطۂ نظر کا فرق ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانوں کے زمانے میں ڈاک کا انتظام۔ اسلامک کلچر حیدر آباد دکن جولائی ۱۹۴۴ء۔ ص ۲۶۹ تا ۲۸۲۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارہ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں

نامہ و نامہ بر: ٹیلی فون اور تار وغیرہ نے قلم روشنائی اور کاغذ کا استعمال کم کر دیا ہے۔ بقول تنخصے لارڈ ابروین نے جنگ کریمیا کے نو مہینوں میں جتنا کاغذ خرچ کیا اتنا لارڈ آکسفرڈ اور مسٹر لائڈ جارج نے مل کر ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں خرچ نہ کیا ہوگا۔ بہرکیف اس میں شک نہیں کہ ایک زمانے میں خط آج سے زیادہ لذت کی چیز تھی اور نامۂ محبوب کا تو کہنا ہی کیا کہ اس کی دلفریبیِ عنوان کے لیے جان تک نذر کر دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی اور اردو شعرا کا ایک محبوب موضوع نامہ اور نامہ بر[1] بھی رہا ہے۔

---

[1] خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

آں پیک نامور کہ رسید از دیار دوست — آورد حرزِ جاں ز خطِ مشکبارِ دوست
خوش می دہد نشان و جلال و جمالِ یار — خوش می کند حکایتِ عز و وقارِ دوست

یہ شعر بھی لطف سے خالی نہیں ہے:

من و ایں مہربانی ہائے او قاصد چہ می گوئی
مساز از خویشتن حرفے کہ می فہم زبانش را

غالب کا یہ رشک بھی ملاحظہ ہو:

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگزارد کہ گویم نام را

آتش کا شعر ہے:

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست

(ج) فنِ انشا کی اصل اور ابتدا

اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا لیکن فارسی کی ہوا میں سرسبز ہُوا۔ اس لیے اُردو مکتوب نگاری کے تمام مدارج و منازل طے کرنے کے لیے مختصراً یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ انشائے فارسی کا دامن کتنا وسیع ہے اور اس کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہیں۔

فنِ انشا عربی الاصل ہے اور اتنا وسیع اور مختلف النوع ہے کہ اگر اس کے متعلق تمام مواد یکجا جمع کیا جائے تو ایک اچھا خاصا کتب خانہ سجایا جا سکتا ہے۔ عربی میں اس کو علم الترسیل کہتے ہیں۔ مفاتیح العلوم کے بیان کے مطابق[1] انشا سے مراد وہ خط ہے جو پہلے پہل تیار ہوتا ہے اور میر منشی کے سامنے اضافہ اور تصحیح کے لیے پیش ہوتا ہے۔

قبل از اسلام

خط و کتابت تمدن کی نشانی ہے۔ عرب کی قبل از اسلام حکومتیں یمن حیرہ و شام، تمدن اور نظام سے تہی دست نہ تھیں، اس لیے قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ وہاں خط و کتابت کا بھی سلسلہ ہوگا لیکن اقوامِ متمدنہ کے کسی مراسلے کا ہمیں علم نہیں ہے۔ تاریخ صرف دولت حیرہ کے ایک کاتب عدی بن زید کا نام بتاتی ہے[2]۔ رہے بدو اور عرب خاص کر خانہ بدوش لوگ، یہ اُمّیِ محض تھے۔ یہ نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔

اسلام سے کچھ پہلے حجاز میں کتابت کا برائے نام رواج ہو گیا تھا۔ جو شخص دوسروں کے خط وغیرہ لکھا کرتا تھا اسے کاتب کہتے تھے۔ عرب کے فصحا و اشراف خود نہیں لکھتے تھے بلکہ کاتبوں سے لکھواتے تھے۔ حمیری زبان کے کاتبوں اور تجارتی خطوط

---

[1] آبِ حیات، ص ۴۹ [2] بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : انشا

[3] ادب العرب، حصّہ اوّل، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸

لکھنے والوں کا بھی ذکر ملتا ہے[1]۔ ہمارے پاس جاہلیت کے بھی مراسلات نہیں ہیں اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کا طرز کیا ہوگا۔ تحقیقِ جدید نے البتہ ایک طویل وصیت نامہ بہم پہنچایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر اس طرح شروع ہوتی تھی۔ باسمک من فلاں الی فلاں۔ اما بعد۔

افتابِ اسلام کے طلوع ہونے کے بعد اس فن نے ایسی ترقی کی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے نقوشِ سلیمانی میں لکھا ہے:

"جہاں تک میرا علم ہے خطوط کی نگہداشت اور یادداشت کو جو کثرت اور وسعت مسلمانوں کے دَور میں ہوئی وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔"

رسول اکرمؐ کے زمانے میں

رسول اکرمؐ کے زمانے میں قرآن پاک کی کتابت اور عجمی ممالک میں تحریری تبلیغ کے لیے چند صحابہ مقرر کیے گئے۔ جو لوگ کتابت قرآن پر مامور تھے، ان کا بڑا مرتبہ تھا اور وہ کاتب[2] الوحی کہلاتے تھے۔ مسلمانوں نے پہلے خود رسول مقبولؐ کے خطوط کو محفوظ رکھا۔ روایتوں میں ان کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ بہت سے عالموں نے ان کو الگ کرکے کتابیں لکھی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں[3] مراسلت و مکاتیب کا ایک باقاعدہ محکمہ قائم کیا گیا اور مرکزی حکومت کی دیکھا دیکھی صوبوں میں بھی اسی قسم کا نظام قائم ہوگیا۔ علامہ شبلی نے الفاروق میں لکھا ہے کہ صوبوں میں کاتب ایک بہت بڑا عہدہ دار ہوتا تھا جو میر منشی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ معاویہ کے زمانے میں دیوان الخاتم قائم کیا گیا جہاں خطوط کی نقلیں رکھی جاتی تھیں اور ان کی روانگی کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں امام مالک کا خط ہارون الرشید کے نام اور امام لیث کا خط

---

[1] مقدمہ رقعاتِ عالمگیری، ص ۲ [2] صبح الاعشیٰ

[3] الفاروق: شبلی نعمانی

امام مالک کے نام تاریخی جواہر پاروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ عربی زبان کے ادبا میں ابواسحاق صابی ابن العمید خوارزمی بدیع الزماں ابوالعلا معری امام غزالی وغیرہم کے مکاتیب شہرت کا خلعت پا چکے ہیں۔

زمانہ راشدین

زمانہ راشدین[1] میں کاتب دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک کاتب مراسلات دوسرے کاتب حساب دیوان۔ لیکن عہد اموی میں پانچ طرح کے ہو گئے۔ ان میں سے ایک کاتب مراسلات کو کاتب السر یعنی Private Secretary کہتے تھے۔ خلفا بلیغ ترین منشی کو کاتب مقرر کرتے تھے کیوں کہ سیاسی معاملات میں بہترین انشا، کی ضرورت ہوتی ہے۔

صدر اسلام اور عہد اموی کے مراسلات میں صرف مطالب ضروریہ پر توجہ دی جاتی تھی۔ ان خطوط میں عبارت آرائی اور مبالغہ بالکل نہیں ہوتا تھا لیکن وہ فصاحتِ الفاظ، جزالتِ عبارت اور بلاغتِ اسلوب سے مملو ہوتے تھے۔ اگر مکتوب الیہ غیر عرب ہوتا تھا تو عبارت نہایت سہل اور مختصر ہوتی تھی جیسا کہ جناب رسالت مآبؐ کے خطوں سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے خسرو پرویز اور ہرقل کے نام لکھے تھے اور اگر مکتوب الیہ عرب ہوتا تھا تو عبارت نہایت بلند اور متین ہوتی تھی جیسا کہ آپ کے ان مراسلات مبارکہ سے ظاہر ہے جو آپ نے بنی نہد اور اہل حضرموت وغیرہ کے نام بھیجے تھے۔ اس زمانے میں ایجاز و اختصار پر بہت زور دیا جاتا تھا لیکن عہد اموی کے آخر میں عبدالحمید کاتب نے سب سے پہلے طوالت کی بدعت کی۔ خط کے آغاز اور خاتمے میں کسی قسم کا تفنن نہیں تھا۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مراسلے کا طرز یہ تھا کہ شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پھر من محمد رسول اللہ الی فلاں بعد ازاں السّلام علیکم یا السلام علی من

---

[1] ادب العرب، حصہ اوّل، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸

اتبع الہدیٰ۔ اس کے بعد خدا کی مختصر سی حمد و ثنا مثلاً انی احمد الیک اللہ الذی لا الہ ہو، پھر اما بعد اور اصل مطلب۔ خاتمہ پر اکثر السلام علیکم ورحمۃ اللہ یا السلام علی من اتبع الہدیٰ۔ کاتب کے لیے صیغہ واحد متکلم اور مخاطب کے لیے اگر ایک شخص ہے تو واحد حاضر ورنہ تثنیہ اور جمع کے صیغے جیسا موقع ہوتا تھا استعمال ہوتے تھے۔

زمانہ راشدین اور صدر عہد اموی میں خطوط نویسی اسی نہج پر رہی لیکن ولید بن عبدالملک کے زمانے میں بہت کچھ تکلف و تصنع شروع ہو گیا تھا۔ عمر و بن عبدالعزیز کے زمانے میں طریقہ سلف کی پیروی ہونے لگی لیکن مروان بن محمد کے عہد میں عبدالحمید بن یحییٰ نے طرز خاص کی بنیاد ڈالی[1]

عبدالحمید بن یحییٰ شام کا رہنے والا اور ابو العلا سالم کا شاگرد تھا۔ شروع میں یہ لڑکے پڑھایا کرتا تھا اور شہر شہر معاش کی تلاش میں پھرا کرتا تھا لیکن جب مروان ابن محمد نے اسے اپنا کاتب خاص مقرر کیا تو اس کی فصیح و بلیغ انشا پردازی کی شہرت تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئی۔ یہ فن کتابت کا استاد اوّل مانا جاتا ہے۔ اس نے خطوط نویسی میں بہت سے تکلفات داخل کیے۔ اسی وجہ سے اس فن میں اس کا نام ضرب المثل ہو گیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے فتحت الرسل بعبد الحمید وختمت بابن الحمید[2]۔

بنو امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں

بنو امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں یہ محکمہ مراسلت "دیوان الانشا" کہلانے لگا۔ دیوان کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دیو کی جمع ہے اور چونکہ منشی دیودں کی طرح ہر معاملے سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اس لیے ان کو "دیوان" کہا گیا۔ یہ لطیفہ صحیح ہو یا غلط لیکن اس سے منشی یا کاتب کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔

---

[1] ادب العرب، حصہ اوّل، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸ ۔ [2] ایضاً، ص ۲۴۰ تا ۲۴۱

غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں

دیلمیوں، سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں کی حکومتوں میں اہل قلم ادیبوں کو اپنے خطوط اور مراسلات کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ نقوشِ سلیمانی میں ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے اس کے دو سبب بیان کیے ہیں ایک تو یہ کہ چونکہ ان عجمی بادشاہوں کی زبان فارسی اور ان کی حکومت کی زبان عربی تھی اس لیے ان بادشاہوں کو ایسے محکمۂ اشاعت کی ضرورت ہوئی جہاں ایسے اہلِ قلم موجود ہوں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں۔ اس ضرورت نے "مانگ پیدا کی اور مانگ نے شئے مطلوبہ"۔ اس طرح فنِ انشا کو ترقی ہوئی اور ایسے منشی پیدا ہوئے جو بڑی محنت اور جانکاہی سے شاہی فرمان اور مراسلے تیار کرتے تھے چونکہ یہ مراسلے بڑی محنت سے تیار ہوتے تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کے خونِ جگر کا کوئی قطرہ ضائع نہ ہونے پائے۔ انشا ایک خاص فن بن گیا تھا اس لیے اس کے سیکھنے سکھلانے کے لیے لائق منشیوں کی تحریروں کی ایک ایک سطر اس کی قدر جاننے اور پہچاننے والے جمع کرنے لگے۔

(د) انشائے فارسی کا آغاز

فارسی انشا کی ابتدا

۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں نے دولتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔ بغداد میں خاک اُڑنے لگی اور خراسان سے شام تک سارا عالم تہ و بالا ہو گیا۔ مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اُڑ گیا حکومت کے ساتھ عربی کا اقتدار بھی جاتا رہا اور اس کی جگہ فارسی نے لے لی۔ اگرچہ مامون الرشید کے زمانے سے فارسی کو اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور مختلف عجمی حکومتوں نے اس کو دفتری زبان بنا کر اس کی عزت اور توقیر بڑھائی تھی لیکن دراصل حملہ تاتار نے

سیاسی انقلاب سے بڑھ کر علم میں انقلاب پیدا کیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے صحیح طور پر فارسی انشا کی ابتدا ہوئی۔[۱] یہ تبدیلی معمولی تبدیلی نہیں تھی۔ حکومت کے ساتھ اس فن کے جاننے والوں کے نام بھی بدل گئے۔ اب دوات دار دبیر اور منشی کے الفاظ زیادہ مقبول تھے۔

کاتب دبیر یا منشی

جب تک مسلمانوں میں وزارت[۲] کا مستقل عہدہ قائم نہیں ہوا تھا۔ دبیر کاتب یا منشی ہی کو سب سے زیادہ تقرب سلطانی حاصل تھا۔ چونکہ وہ بادشاہ کا رازدار اور دستِ راست ہوتا تھا اس لیے ضروری تھا کہ وہ عالی حوصلہ معزز بادشاہ کا ہم قوم اور جملہ علوم کا ماہر ہو۔ اسے مشاہیر کے عمدہ اقوال اور ضروری آیات واحادیث حفظ یاد ہوں اور وہ پوری انتظامی قابلیت اور اہلیت رکھتا ہو۔

دبیر کے فرائض عروضی کی نظر میں

چہار مقالہ عروضی (سنہ تصنیف تقریباً ۵۶-۱۱۵۵ء) میں لکھا ہے کہ:

"دبیر باید کہ کریم الاصل شریف العرض دقیق النظر عمیق الفکر ثاقب الرائے باشد واز ادب وثمرات آں قسم اکبر وخط وافر نصیب او رسیدہ باشد واز قیاساتِ منطقی بعید و بیگانہ نباشد ومراتب ابناء زمانہ شناسد ومقادیر اہل روزگار داند وبحطام دنیاوی ومزخرفات آں مشغول نباشد۔"[۳]

عروضی نے آگے چل کر لکھا ہے:

"سخن دبیر بدیں درجہ نرسد تا از ہر علم بہرہ ندارد واز ہر استاد نکتہ یاد

---

[۱] نیز ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین بابت ماہ مئی ۱۹۴۳ء: انشائے فارسی از ڈاکٹر سید عبداللہ۔

[۲] یہ عہدہ بنو عباس کے زمانے میں قائم ہوا۔ خاندانِ برامکہ ایک عرصے تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہا، اور دار الانشا بھی اسی خاندان کے ماتحت ہو گیا۔

[۳] چہار مقالہ (لاہور) ص ۳۳

بگیرد واز ہر حکیم لطیفۂ نشنود واز ہر ادیب طرفۂ اقتباس نہ کند...."[1]

ایسے ہی دبیر کے فرائض کی فہرست بھی بہت طویل تھی۔ مثلاً اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ سلاطین کے خطوط پڑھے۔ ان کا فوراً جواب لکھے۔ ڈاک کے انتظامات کی نگرانی رکھے۔ جاسوسوں کا انتخاب کرے۔ باطنیوں پر نظر رکھے۔ اور عام حالات سے جو سلطنت کے لیے نقصان دہ یا فائدہ مند ہوں، کامل طور پر باخبر رہے۔

زمانے کا انقلاب دیکھیے کہ وہ منشی جس کے یہ مراتب تھے ہندوستان میں ہر پڑھے لکھے اور اٹھارہویں انیسویں صدی میں ہر خواندہ ہندو کا لقب ہو گیا۔[2] صاحب مناظر الانشا[3] نے لکھا ہے :

"منشی کے است کہ اورا کیفیت راسخہ باشد کہ بہ سبب آں قادر بود برادائے معنی مقصود بطریقیکہ نزد بلغا پسندیدہ باشد"

اسی کے ساتھ اس نے شکایت کی ہے کہ آج ہر وہ شخص جو معمولی لکھا پڑھا ہے اسے بھی لوگ منشی کہنے لگے ہیں۔ خواجہ محمود گاوان کے نزدیک حقیقتاً منشی کہلانے کا مستحق وہ ہے جو نحو صحیح رکھتا ہو۔ تراکیب بلغاء کا متتبع ہو اور علم لغت صرف نحو معانی بدائع اچھی طرح جانتا ہو۔[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے کاتب کی ذمہ داریاں منشی کے مقابلے پر زیادہ سخت تھیں اور اس میں ان خوبیوں کا ہونا ازبس ضروری تھا جو صاحب الدیوان کے شایان شان تھیں۔[5] اسی لیے اس کے عہدے کو اشرف المناصب الدنیا بعد الخلافۃ کہا گیا ہے۔

---

[1] چہار مقالہ (لاہور) ص ۲۴۔۲۵

[2] بلوکمن CONTRIBUTIONS بحوالہ ڈاکٹر سید عبد اللہ اورنٹیل کالج میگزین، مئی ۱۹۴۰ء

[3] محمود گاوان (۸۸۶ہجری/۱۴۸۱عیسوی) کی تصنیف ہے جو دولت بہمنیہ کا قابل وزیر تھا۔

[4] مناظر الانشا، ص ۱۰۱ – ۱۰۷

[5] صبح الاعشا، ج ۱، ص ۶۹ تا ۸۰

اقسامِ مکاتیب

جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے انشا ایک فن ہے اور اس کی تمام جزئیات سے ماہرین فن نے پوری بحث کی ہے۔ مراسلات کی حسب ذیل قسمیں مناظر الانشا سے ماخوذ ہیں:

(۱) منشور فرمان یا فتح نامہ بادشاہ کے خط کو کہتے ہیں۔
(۲) مثال بادشاہ سے کم تر درجے کے لوگوں کے خطوں کو کہتے ہیں۔ مثلاً شاہزادگان امراء و وزراء وغیرہ۔
(۳) اگر لکھنے والا برابر درجے کا ہے تو ایسے خط کو مکتوب کہیں گے۔
(۴) اگر مکتوب نگار کم مرتبہ ہے تو اس کے خط کو عریضہ کہیں گے۔

فرمان اور منشور کی دو قسمیں ہیں اور ہر ایک کے ارکان مقرر ہیں۔ ایسے ہی مثال مکتوب، عریضہ اور رقعہ کے بھی الگ الگ حصے اور اجزا قرار دیئے گئے ہیں۔ ہم اوراق کی تنگ دامانی کی وجہ سے اس تفصیل کو قلم انداز کرتے ہیں[1]

عہدِ مغلیہ میں بھی خطوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔

(۱) شقہ فرمان یا احکام۔ وہ خط جو بادشاہ کسی شہزادے، افسر یا بیرونی حکمراں کو لکھے۔
(۲) نشان۔ وہ خط جو شاہی خاندان کا کوئی شخص اپنے عزیز کے علاوہ کسی کو لکھے۔
(۳) عرضداشت۔ وہ خط جو کوئی شاہزادہ بادشاہ کو یا کوئی دوسرا شخص بادشاہ یا شہزادے کو لکھے۔
(۴) فتح نامہ۔ صوبے دار کا خط بادشاہ کے نام۔
(۵) حسب الحکم۔ وہ خط جو وزیر حسب الحکم بادشاہ اپنی طرف سے تحریر کرے[2]

آداب

ایسے ہی فرطِ ادب کی وجہ سے بادشاہ کے نام کے بجائے ظل اللہ یا خلیفۃ اللہ

۱-۲ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مناظر الانشا سرکار مغلوں کا نظام حکومت مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام انشا۔

فی الارض لکھا جاتا تھا اور مرنے کے بعد فردوس مکانی یا خلد منزل یا جنت آشیاں۔ اسی طرح شہزادوں کے خطاب بھی مقرر تھے مثلاً داراشکوہ کے لیے شاہ بلند اقبال اور شجاع کو شاہزادۂ جہان و جہانیان لکھتے تھے۔

ایران کی کتب انشا

فنِ انشا عرب سے ایران اور ایران کے رستے ہندوستان آیا۔ ایران میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) منشاتِ فارسی جو تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔

منشاتِ فارسی جو تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں

بعض وہ اہم واقعات جو بڑی بڑی تاریخوں میں نہیں ملتے، خط و کتابت کی معمولی نگارشات میں مل جاتے ہیں جو خود نوشت ہونے کی وجہ سے علمائے تاریخ کے لیے نہایت معتبر اور مستند ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ خطوط بالارادہ تاریخ کے طور پر نہیں لکھے جاتے بلکہ یوں ہی معمول کے طور پر بلا اس خیال کے لکھے جاتے ہیں کہ وہ کبھی معرضِ تشہیر میں آئیں گے اس لیے وہ بہت سی تاریخوں سے زیادہ معتبر اور صداقت گزیں ہیں۔ رقعاتِ عالم گیر تاریخِ اورنگ زیب کے لیے بہترین ماخذ ہیں اور سرکار[۱] اور سری رام[۲] نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ایسے ہی ڈاکٹر براؤن نے اپنی جلد چہارم[۳] میں منشات السلاطین کی مدد سے سلاطینِ ترکی اور شاہانِ صفویہ کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

مکاتیب کے ایسے مجموعے بہت سے ہیں جن سے اُس زمانے کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ہم صرف چند کے نام لکھتے ہیں:

(۱) ترسیل منصوری[۴]۔ یہ شاہانِ ماضی کے فرامین کا مجموعہ ہے جس کو منصور بن

---

[۱] سرکار: تاریخ اورنگ زیب۔

[۲] A BIBLIOGRAPHY OF MUGHAL INDIA PP 90-107

[۳] LITERARY HISTORY OF PERSIA. VOL. IV

[۴] ریو۔ انشائے فارسی، ص ۸۱۰۔

محمد علی شیرازی (۱۰۲۲ھ) نے ترتیب دیا ہے۔

(۲) نسخہ جامعہ مراسلات اولی الالباب[1]۔ اس کو ابوالقاسم ابوعلی حیدر نے شاہ عباس صفوی ثانی کے زمانے میں مرتب کیا۔ یہ مستند تحریروں اور فرمانوں کا مجموعہ ہے جس کے مطالعے سے ارلپ ارسلان سلجوقی سے لے کر عہدِ صفویہ تک مفید عصری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

(۳) انشائے طاہر وحید[2] بن مرزا حسین خاں قزوینی۔ یہ خطوط شاہ عباس ثانی کے نام سے ملّا طاہر وحید نے دارا، مراد، اورنگ زیب، شاہ جہاں اور میر جملہ وغیرہ کو تحریر کیے تھے۔ ہر خط میں تصنع، طمطراق اور فضیلت فروشی پائی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ پُرگوئی اور قدرتِ بیان بھی غضب کی ہے اسی لیے یہ فنِ انشا میں ایک خاص طرز کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ انشائے طاہر وحید ایک عرصہ تک ہندوستان میں نمونہ کی کتاب رہی ہے۔ اس لیے بے محل نہ ہوگا اگر اس کے ایک خط کا اقتباس جو اورنگ زیب کے نام ہے، پیش کیا جائے۔

"جواہر زواہر نیا بش بیش از قیاس و لالی متالی ستائش لاتناہی اساس کہ کفہ زبان و میزان بیان از کشیدن آن قاصر و بازوے توان از تعقل آن فاتر باشد نثار سرائے کبریائے مالک الملکی کہ مقرنس چرخ کبود از شہرستان عظمت و جلال او کاخی و شجرۂ بدیع الازہار وجود از گلشن وسیع الفضائے قدرت او شاخے ست .....

نظم

ساختہ از لطف سپئے خاکیاں   چار حد باغچۂ کن فکاں
دیدہ ام این باغ پر از رنگ و بو   یک گل رعنایت شب و روز او

بعد از حمد جناب کبریا و بسط بساط نعت سید انبیا و منقبت زبدۂ اصفیا بر مرأت ضمیر قدسی تخمیر اعلیٰ حضرت رفیع المنزلت گردون بسطت ..... ریاض ہمیشہ بہار سلطنت گورگانی حدیقۂ طراز گلستان خلد نشان جہانی ....

---

[1] ریو ص ۳۸۹

[2] اس کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے بعض نے ۱۱۰۵ھ اور ۱۱۰۸ھ لکھی ہے۔ ریو نے ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) مانی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے ۱۰۷۷ لکھی ہے۔

بسلطان اورنگ زیب منطبع می گردانند کہ[1].....

قواعد انشا سے متعلق کتابیں

(ب) ان کے علاوہ ایران میں کچھ کتابیں ایسی بھی لکھی گئی ہیں جو قواعد انشا سے متعلق ہیں اور مبتدیوں کے لیے نہایت ضروری اور اہم ہیں۔ ماقبل دور منگولیہ میں چہار مقالہ جو احمد بن عمر بن علی النظامی العروضی السمرقندی کی تالیف ہے اسی غرض سے لکھا گیا تھا۔ اس کا مقالہ دبیری اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہے۔ ہم اس مقالے سے دو واقعات ترجمہ کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں انشا کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اعجاز و ایجاز اس کا طرۂ امتیاز تھا۔

اعجاز و ایجاز بہ زور

محمود غزنوی نے بغرا خان حاکم ماوراء النہر کو خط لکھا اور کہا کہ اپنے ملک کے علماء سے دریافت کر کے اس سوال کا جواب دیں کہ نبوت کیا ہے اور ولایت کیا ہے۔ دین کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ احسان کیا ہے اور تقوی کیا ہے۔ امر معروف کیا ہے اور نہی منکر کیا ہے اور صراط کیا ہے۔ میزان کیا ہے۔ عدل اور شفقت کیا ہے۔ بغرا خان نے علماء کو بلایا کہ جواب لکھیں۔ انھوں نے چار ماہ کی مہلت مانگی۔ جب یہ خبر محمد بن عبداللہ کاتب کو جو بغرا خان کا دبیر تھا پہنچی تو اس نے کہا کہ میں اس کا جواب دو لفظوں میں لکھتا ہوں۔ قلم اٹھایا اور سوال کے نیچے یہ عبارت لکھ دی:

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ۔"

علماء انگشت بدنداں رہ گئے اور غزنی میں بھی اس جواب کی بڑی تعریف کی گئی[2]

---

[1] انشائے طاہر وحید (لکھنؤ) ص ۱۵

[2] چہار مقالہ عروضی، مقالۂ اوّل درکیفیت دبیری

عروضی نے ایک اور خط کو بھی سراہا ہے اور اس کے ضمن میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے۔ گور خاں ختائی نے سلطان عالم سنجر بن ملک شاہ سے لڑائی کی اور اس کو شکست دے کر تمام ماورالنہر پر قبضہ کر لیا۔ گور خاں نے بخارا کا علاقہ الپتگین برادر زادۂ خوارزم شاہ کے سپرد کر دیا اور اسے حکم دیا کہ تمام ملکی اور سیاسی معاملات میں وہ خواجہ امام احمد سے جو بخارا کا امام ہے مشورہ کر لیا کرے۔ جب گور خاں چلا گیا تو الپتگین نے ظلم شروع کر دیا۔ بخارا کے لوگ داد خواہی کے لیے گور خاں کے پاس گئے۔ گور خاں نے یہ خط اسے فارسی زبان میں لکھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الپتگین بداند کہ میان ما اگرچہ مسافت دور است رضا و سخط ما بدو نزدیک است۔ الپتگین آن کند کہ احمد فرماید و احمد این فرماید کہ محمد فرمودہ است۔ والسلام۔"

عروضی اس خط کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے: "ومن مثل این کم دیدہ ام"[1]
اس کے علاوہ ملا حسین واعظ کاشفی (المتوفی سنہ ۹۱۰ھ) نے ایک کتاب صحیفۂ شاہی لکھی تاکہ مبتدیوں کو کتابت کے سلسلے میں مناسب الفاظ اور موزوں اشعار کا استعمال آجائے۔

ذاتی خطوط کے مجموعے

(ج) ان کے علاوہ کچھ ذاتی خطوط کے مجموعے بھی ہیں جو در اصل سوانح نگاری کی جان ہیں۔ رشید الدین فضل اللہ (۱۳۱۸ - ۱۲۴۷ء) صاحب جامع التواریخ کے خطوط منشآت رشیدی کے نام سے موجود ہیں۔ یہ اس فاضلِ دہر کی زندگی کا مرقع ہیں جو اباقا کا شاہی طبیب اور غازان کا وزیر اعظم تھا۔ اور جو ستر برس کی عمر میں بادشاہِ وقت کے حکم سے بے گناہ قتل کیا گیا۔[2] یہ خطوط ندرت اور بلاغت کے اعتبار سے بھی اہم ہیں۔
ذاتی خطوط کے مجموعوں میں رقعاتِ جامی کا ذکر بھی ضروری ہے جس کے کمالات کے دولت شاہ میر علی شیر اور سام مرزا وغیرہ سب ہی معترف ہیں۔ ان خطوط سے مولانا

---

[1] چہار مقالہ (لاہور ایڈیشن) ص ۴۷   [2] براؤن، ج سوم، ص ۸۶ - ۸۷

عبدالرحمٰن جامی کی سیرت[1] پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ فہرست کسی طرح بھی جامع اور مانع نہیں ہے لیکن ہندوستان کے مقابلے پر یہ سرمایہ نہایت قلیل ہے۔ جتنی توجہ فنِ انشا پر ہندوستان میں دی گئی اور جتنی کتابیں اس فن اور موضوع پر یہاں لکھی گئیں اس کی مثال ایران میں نہیں ملتی۔

(۳) ہندوستان اور فارسی انشا

ہندوستان میں فارسی انشا کی ترقی کے اسباب

ہندوستان ایشیا کے اہل علم کا مرکز بنا ہوا تھا اور سترھویں صدی عیسوی تک ایران کے بڑے بڑے فضلا، ہندوستان ہی کھنچ کر آئے تھے۔ ایران کی تاریخ میں ایسے دَور بھی آگئے ہیں جب وہاں کے اربابِ علم وفضل یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ع

مے من صافی و اربابِ مروت بے ذوق

لیکن ہندوستان کی شاہانہ قدردانی اور سخن فہمی کی تاریخ میں ایسے باب مشکل سے ملیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خسرو، محمود گاوان، ابوالفضل، فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی، ظہوری، عالمگیر، بیدل، غالب جیسے درخشندہ ستاروں کا ایک سلسلہ ملتا ہے جنھوں نے انشا کے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ وہ عام دسترس سے باہر ہے۔

ابوالفضل

راجہ ٹوڈرمل نے فارسی کو رائج کرکے دیوان خانے کے تمام عملہ کو اس کے حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ اس وقت سے ہندوؤں میں بھی بڑے بڑے انشا پرداز ہونے لگے۔ اس سلسلے میں اولین تخم ریزی سکندر لودی کے وقت میں ہوئی لیکن اس کا نتیجہ اکبر و جہانگیر کے زمانے میں برآمد ہوا۔ پروفیسر عبدالغنی نے اکبر کے ذیل میں لکھا ہے کہ منشی کا عہدہ نہایت اہم تھا اور ان ہی لوگوں کو ملتا تھا جو فاضلِ عصر اور خوشخط ہوتے تھے[2] سلطنت کے اقتدار کا اندازہ بھی منشیوں کی تحریر اور طرزِ ادا سے لگایا جاتا تھا۔ عہدِ اکبری میں ابوالفضل تمام انشا پردازوں کا سرتاج تھا۔

---

[1] براؤن، ج سوم، ص ۵۰۷ تا ۵۰۹۔

[2] ملاحظہ ہو تاریخ ادب فارسی در عہدِ شاہانِ مغلیہ، ج ۲، ص ۲۵۴۔

چندربھان برہمن

جہانگیر کے عہد میں ہمیں ہرکرن بن ماتھر داس کنبو نام ایک جید انشا پرداز ملتا ہے۔ اس کے بعد چندربھان برہمن کا نام جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ اکبرآباد کا رہنے والا اور افضل خاں شیرازی وزیر شاہ جہاں کا ملازم تھا۔ اسی کی سفارش سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد شاہزادہ داراشکوہ کا مصاحب ہوگیا۔ سلطنت شاہ جہاں کے انتیسویں سال سرکار شاہی میں نوکری مل گئی اور خطاب رائے اور منصب مناسب سے سرفراز ہوا۔ اورنگ زیب نے بھی نوازشات خسروانہ جاری رکھیں اور اس کا تقرر خدمات نمایاں پر ہوتا رہا۔ ۱۰۷۳ھ / ۱۶۶۲ء میں انتقال کیا[1]۔ اس کا مجموعہ "انشائے برہمن" تاریخی معلومات کا گنجینہ ہے۔

منشی طالع یار

ایک اور قابلِ ذکر اور فاضلِ عصر منشی طالع یار تھا جو پہلے ہندو تھا لیکن بعد میں مسلمان ہوگیا۔ اس کا مجموعہ خطوط ہفتِ انجمن نام سے سرجادو ناتھ سرکار کے پاس موجود ہے۔ طالع یار رستم خاں اور راجہ جے سنگھ کا سکریٹری تھا۔ اس نے ۱۶ر جنوری ۱۶۷۵ء کو انتقال کیا۔ اس زمانے میں ہندوؤں نے اس فن میں کمال حاصل کیا اور بہت سے خطوط طلبہ اور مبتدیوں کے استفادے کے لیے یا اپنے کمالِ فن کے اظہار کے لیے جمع کیے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں سب کا ذکر ممکن نہیں ہے۔

ہندوستان کی انشائے فارسی کی کتابوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ہم صرف چند اہم کتابوں کے خصوصی ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہندوستان کی مشہور کتبِ انشاء — خسرو کی رسائل الاعجاز

فارسی دانانِ ہند میں حضرت امیر خسرو دہلوی کا لوہا ایرانیوں نے بھی مانا ہے۔ ان کی رسائل الاعجاز ہندوستان میں فنِ انشا کی اولین کتابوں میں نہایت اہم ہے۔ اس میں خطوں کے نمونے اور منشیوں کے لیے قواعد و ضوابط بھی درج ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو 'ہماری زبان' دہلی، ج ۴، نمبر ۱۱ و معارف اعظم گڑھ ج ۳۳، نمبر ۱ و ۲ و ۳۔

محمود گاواں کی ریاض الانشا

ہندوستان کی کتابوں میں ریاض الانشا بھی نہایت اہم ہے جو خواجہ جہاں عماد الدین محمود بن شیخ محمد گیلانی وزیر سلطان محمد شاہ نے لکھی ہے۔

رقعات ابوالفضل و فیضی

ابوالفضل کے رقعات (۱۵۵۱-۱۶۰۲ء) حشمتِ معنی، شوخی اشارت، کرسی نشینیِ تراکیب، پاکیِ زبان، کثرتِ مترادفات، دقّت و اغلاق اور گوناگوں لفظی و معنوی صنائع کے لیے مشہور ہیں۔ ایک خط میں ستّر سطروں میں صرف یہ لکھا ہے کہ خط آیا خوشی ہوئی۔ انشائے ابوالفضل میں یہ فضیلت فروشی ہے مگر نسبتاً کم۔ انداز پُرشکوہ اور جملے طویل ہیں بعض جگہ اس کی دانش آرائی پر نظم قربان ہے۔ رقعات ابوالفضل کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ پٹنہ میں موجود ہے اس میں ابوالفضل کے وہ خطوط ہیں جو اس نے حکیم ہمام، حکیم ابوالفتح اور شیخ محمد علی کو لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ ابوالفضل کی سیرت کا آئینہ دار ہے۔

فیضی (المتوفی ۱۵۹۵ء) کے وہ خطوط جو اس نے دکن سے اکبر اعظم کو لکھے تھے ان کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے[۱]۔ پٹنہ میں اس کے ایسے مکاتیب موجود ہیں جو اس نے اپنے دوستوں اور بے تکلف ساتھیوں کو لکھے ہیں اور جن کا انداز سلجھا ہوا صاف واضح اور سلیس ہے۔ اس میں جزئیات نگاری اور شادابیِ خیال بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ذیل کا خط اس زمانے کی عام روش سے مختلف ہے۔ یہ فیضی نے اکبر اعظم کو بدایونی کی سفارش کے لیے لکھا ہے:

"عالم پناہا درین ولا دو خویش ملّا عبدالقادر از بداؤں مضطرب گریان و بریان رسیدند و نمودند کہ ملّا عبدالقادر چند گاہ بیمار بود و از موعدے کہ بدرگاہ داشتہ مختلف شدہ و او را گمانِ بادشاہی بخدمت تمام بردہ اند نا عاقبتش کجا انجامد و گفتند کہ امتداد بیماری او را بعرض اشرف نرسیدہ۔ شکستہ نواز! ملّا عبدالقادر اہلیت تمام دارد و علومِ رسمی آنچہ ملایان ہندوستان می خوانند خواندہ۔ پیش خدمت

---

[۱] ریو: ج ۳ - ص ۹۳۸

ابوی کسب فضیلت کردہ و قریب بسی و ہفت سال می شود کہ بندہ او را می دانم و با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشائے عربی و فارسی و چیزے از نجوم ہندی و حساب یاد داشت در ہمہ وادی وقوف در نغمہ ولایت و ہندی و خبرے از شطرنج صغیر و کبیر دارد[1] ...."

رقعاتِ ظہوری

اُردو کے بعض ابتدائی مکتوب نگاروں نے فارسی کی تقلید کی ہے اور جن انشا پردازوں کی پیروی ان کے لیے سرمایہ افتخار رہی ہے ان میں ظہوری (متوفی ۱۷ - ۱۶۱۶ء) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس کے رقعات میں تلمیحات و توجیہات، تشبیہات و استعارات کی کثرت و ندرت ہے۔ تصنع اور مقفیٰ نگاری ہے۔ عبارت دشوار اور شرح طلب ہے بقول شخصے:

آب چاہ ہزار بابل از دائرہ یک حرفش کشیدہ

مآثرِ رحیمی میں لکھا ہے:

"و عالی بنائے سخن را کہ بہ جہت مرور و دہور ایام و عدم کدخدائے منہدم گردیدہ بود تعمیر کردہ پایۂ آن را بدستیاری معمار فکر زرین فرق فرقد سائی گردانید"

پنج رقعۂ ظہوری

پنج رقعۂ ظہوری کو بعض لوگوں نے ارادت خاں واضح سے منسوب کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کتاب نے اُردو نثر نگاری پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے:

"اس وقت کے (فورٹ ولیم سے پہلے) اُردو نثر نگار ظہوری اور پنج رقعہ کی ایسی پیچیدہ اور مغلق عبارت لکھنے کے شائق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔"[2]

موصوف نے آگے چل کر لکھا ہے:

"نظم کا عام رواج تھا۔ یہاں تک کہ خطوط بھی نظم میں لکھے جاتے تھے۔"

بانکی پور کے ایک مجموعۂ مکاتیب میں شاہ جہاں کا ایک منظوم خط نور الدین جہانگیر

---

[1] بدایونی ج ۳ - ص ۲۰۳ - [2] تاریخ ادب اُردو (عسکری) نثر ص ۱ -

بادشاہ کے نام ہے، اس میں جہانگیر کا جواب بھی درج ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خرم (شاہ جہاں) نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اُردو میں بھی فارسی کی تقلید میں منظوم مراسلہ نگاری کا سلسلہ اکبر الہ آبادی اور مضطر خیر آبادی تک ملتا ہے۔

رقعاتِ عالمگیر

بادشاہوں کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ موجود اور محفوظ ہے لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اپنی سلاست اور متانت کے اعتبار سے یادگار ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے سادہ سلیس جملے ہیں لیکن نہایت بلیغ اور پُر زور ہیں۔ یہ خطوط اپنی سادگی کے اعتبار سے شاہی مراسلات میں منفرد اور ممتاز ہیں۔ اورنگ زیب کا حلقۂ مراسلت بہت وسیع تھا اس لیے اس کے خطوں میں گوناگوں جذبات و کیفیات اور واقعات و جزئیات کا ذکر ہے۔ اس نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی فرقِ مراتب سے قطعِ نظر نہیں کیا ہے اور یہ بلاغت کی اہم شرط ہے۔

رقعاتِ نعمت خانِ عالی

نعمت خانِ عالی (متوفی ۱۷۰۹ء) کے خطوط اورنگ زیب سے مختلف ہیں۔ ان میں ابداعِ سخن، اختراعِ معانی، صنائعِ لفظی و معنوی اور طنز و ظرافت کی کثرت ہے۔

رقعاتِ بیدل

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۷۲۱ء) کے خطوط دقیق اور مغلق ہیں لیکن انھوں نے اُردو انشا اور نظم پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ غالب نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ

"(فورٹ ولیم کالج سے پہلے) نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفیٰ اور مسجع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروج تھی۔"

رقعاتِ قتیل

مرزا قتیل کے فارسی رقعات میں رنگینیِ معنی اور دل نشیں الفاظ کے ساتھ ایک قسم

کی روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ شیخ رحمت اللہ نے ثمراۃ البدائع کے دیباچے میں لکھا ہے:

"رقعاتش چون دلق سالکان مالک تجرید از آلائش تکلف مبرا است"[1]

رقعاتِ قتیل

مرزا قتیل[2] کا مجموعہ رقعات معدن الفوائد کے نام سے ۱۸۱۶ء (۱۲۳۲ھ) میں چھپ چکا ہے۔ جامع مکتوبات قتیل کے شاگرد خواجہ امام الدین معروف بہ خواجہ امامی ہیں۔ ان رقعوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عبارت کے صحت وسقم، محاوروں اور ترکیبوں کے حسن و قبح اور اغلاط و مذمومات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حالاتِ زمانہ اور سوانح و وقائع کا بھی کافی ذخیرہ اس میں ملتا ہے۔ قتیل فارسی و عربی کے علاوہ ترکی بھی جانتے تھے اور لوگوں سے اس زبان میں خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"رقیمہ مسرت طراز بزبانِ ترکی کہ عبارتش روح امیر علی شیر نوائی تازہ می کرد، بمقدم شہر حال رسیدہ دل را بہجت تازہ و روان را راحت بے اندازہ ارزانی داشت"[3]

رقعاتِ قتیل میں اُردو کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں مثلاً امام باڑہ، ہنڈوی، دوپٹہ، ڈاک، گھڑی، پستول، بعض جگہ ترکی کے بھی جملے کے جملے ہیں۔

غالب کے فارسی کے رقعات

خواجہ الطاف حسین حالی نے مرزا غالب کی فارسی نثر کو ظہوری سے بہتر بتایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کے فارسی رقعے نازک خیالی، شوخی اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے ممتاز ہیں اور ان کے کمال فن کے شاہد عادل ہیں۔

انشائے خلیفہ، انشائے بہارِ عجم

آخر زمانے کی کتابوں میں انشائے خلیفہ شاہ محمد قنوجی اور انشائے بہارِ عجم بہت مشہور

---

[1] ثمراۃ البدائع، ص ۲۔ [2] پروفیسر حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخ اُردو میں لکھا ہے کہ مرزا قتیل فرید آباد کے رہنے والے تھے۔ دیوالی سنگھ نام تھا (داستان۔ ص ۱۶۲) لیکن مالک رام ایم۔اے کا خیال ہے کہ قتیل کا اصلی وطن بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب تھا اور اصلی نام دیوالی سنگھ تھا نہ کہ دیوالی سنگھ (نگار، جولائی ۱۹۴۲ء)
[3] رقعاتِ قتیل، ص ۱۱۔

ہیں۔ اوّل الذکر میں معمولی رقعات کے علاوہ "مراسلات تہنیت آمیز اور مکاتبات تعزیت انگیز" بھی درج ہیں اور آخری فصل میں القاب و آداب اور آئینِ نامہ نگاری سے بحث کی گئی ہے [1]

ہندوستان میں اس موضوع پر ایسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جو انشا کے عام اصول و قواعد سے بحث کرتی ہیں مثلاً خسرو دہلوی کی رسائل الاعجاز اور محمود گاواں کی مناظر الانشا۔ بعض کتابیں ایسی ہیں جن میں مبتدیوں کی تعلیم کے لیے پورے پورے خط بطور نمونے کے درج ہیں مثلاً بدائع الانشائے یوسفی (سنہ ۹۴۰ھ) انشائے ہرکرن (سنہ ۱۰۴۰ھ) انشائے جامع القوانین انشائے خلیفہ شاہ محمد قنوجی ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) وغیرہ۔ ایسے خطوط کے مجموعے بھی ہیں جو پیشہ ور لوگوں اور بے تکلف دوستوں کو لکھے گئے ہیں اور جن میں القاب کا خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے مثلاً خلاصۃ المکاتیب جو سبحان رائے بٹالوی معاصر اورنگ زیب عالم گیر کی تصنیف ہے۔

ہندوستان کے فارسی مکتوب نگاروں کی یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں ہے اس میں بہت سے ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ فارسی انشا کا ایک مجمل خاکہ سامنے آجائے اور اردو سے اس کا جو رابطہ ہے وہ ذہن نشیں ہو جائے۔

(س) فارسی طرزِ انشا اور اس کا اردو پر اثر

خلاصۃ المکاتیب میں لکھا ہے:

"و آنچناں جہد کند کہ مضامین را از تکلف اغراق بری دارد ..... و عبارت سلیس قریب الفہم بایضاح تمام بنحویکہ نزدیک خاص و عام مستحسن افتد بہ تحریر در آید"

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ باستثنائے چند تمام فارسی انشا پردازوں نے مغلق اور رنگین

---

[1] انشائے خلیفہ مطبوعہ کانپور ۱۸۶۵ء

عبارت لکھنا باعثِ افتخار سمجھا جس میں اشعار کی فراوانی تشبیہ و استعارہ کی بھرمار اور رنگین و خوبصورت الفاظ کی کثرت ہوتی تھی۔ اس معاملے میں ہندوستان ہی کی خصوصیت نہیں، ایران نے بھی تکلفات اور تصنعات برتنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی[۱]

ایران اور ہندوستان کے تعلقات

دونوں ملکوں میں بڑا ربط و اتحاد تھا اور فضلائے ایران برابر ہندوستان آتے رہتے تھے اور ان کی تقلید ہی ہندوستانیوں کا سرمایۂ نازش تھی۔ اس لیے اگر ایک کو بُرا کہا جائے تو لازمی طور پر دوسرے پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے لیکن عہدِ اورنگ زیب کے وسط سے یہ ربط و اتحاد کم ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ ایرانیوں کی سرپرستی اور ان کی آمد و رفت بھی گھٹ گئی۔ ایران کے بادشاہ نے جانشینی کی لڑائی کے زمانے میں دارا اور مراد سے سازش کی تھی اور دکن کے حکمرانوں کو بھی بھڑکایا تھا۔ اورنگ زیب کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد سنہ ۱۶۶۱ء میں ایران کا سفیر شاہ کی طرف سے مبارکباد دینے کے لیے آیا لیکن دونوں بادشاہوں کا دل ایک دوسرے سے صاف نہیں ہوا اور سنہ ۱۶۶۶ء تک برابر مغل سلطنت کو ایرانی حملے کا اندیشہ رہا۔ محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے زمانے میں یہ تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے۔

نادر شاہ کا حملہ اور اس کا اثر

شہنشاہِ دہلی نے ایران سے سفارتی تعلقات قطع کر لیے اور ایران کے مفروروں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ جب نادر شاہ نے اسے خطوط بھیجے تو اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کے ایلچیوں کو نظربند کر لیا۔ انھیں وجوہ سے نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دلی کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ اب تعلقات میں وہ استواری ممکن نہیں تھی جو ہمایوں کے زمانے میں تھی، اس لیے کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ جھلملانے لگا تھا اور انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک فارسی کی وہ گرم بازاری بھی نہیں رہی تھی جو اس سے قبل تھی[۲]

---

[۱] پروفیسر غنی ج ۳ ص ۲۷۸۔

[۲] نکات الشعرا۔ میر ص ۹-۲ نیز تذکرۂ ہندی گویان (مصحفی) ص ۲۴۰

ایران اور ہندوستان کا طرز

اس انحطاط و جمود کے زمانے میں جبکہ ایران سے نئے لوگوں کی آمد و رفت بھی کم سے کمتر ہوگئی۔ دقت نگاری اور لغت بازی نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ نعمت خانِ عالی، عبدالقادر بیدل اور ارادت خاں وغیرہ معمولی بات بھی بغیر پیچ دیئے نہیں کہتے۔ لفظ و معنی کے شکنجے میں فشارِ آغوشِ حسین کی یہ کیفیت بعض وقت لطف دیتی ہے لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ فارسی نثر سرتاپا تصنع اور معمہ بن کر رہ گئی۔ رقعاتِ بیدل کا پڑھنا دماغی جمناسٹک سے کم نہیں ہے۔ حزیں لکھتا ہے کہ :

"نظم ناصر علی و نثر بیدل بفہم نمی آید اگر مراجعت ایران دست دہد ۔ برائے ریشخند بزم احباب رہ آوردے بہتر ازیں نیست[1]۔"

اس زمانے میں فرامین و عرضداشت کی عبارتیں بالعموم دقت و اغلاق، دانش آرائی اور مقفیٰ نگاری کا نمونہ ہوتی تھیں۔ تمام اوصاف اسم تفضیل کے صیغے میں لکھے جاتے تھے۔ القاب و آداب مقرر تھے۔ پیروی و تقلید ادبی شعار تھا۔

خطوں میں تکلف اور تصنع

ابوالفضل کی انشا شمع راہ بنی ہوئی تھی۔ صنائع لفظی و معنوی پر زور دیا جاتا تھا۔ مرجز مقفیٰ اور مسجع نثر عام طور پر پسند کی جاتی تھی اور فارسی نویس بالعموم اسی قسم کی نثر لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی تکلف اور تصنع خطوط میں بھی رائج تھا اور یہی مرصع کاری پڑھے لکھے آدمیوں کا تمغائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ لوگ اپنی عبارت کی زینت اور شوکت کے لیے عربی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے اور ان الفاظ نے رفتہ رفتہ رسمی اور اصطلاحی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ خطوں کے لیے مرحمت نامہ فیض آگیں، امتیاز نامہ، تلطف قرین، گرامی نامہ تلطف شمامہ، رقیمہ کریمہ، نمیقہ انیقہ، مفاوضہ صداقت مشحون، مکاتبہ اخلاص مضمون قسم کے الفاظ مقرر تھے۔ وصول مکاتیب کے لیے کوئی نہ کوئی اس وضع کا فقرہ لکھا جاتا تھا۔ پرتو ورود یافت، نزول اجلال فرمود،

---

[1] نگارستانِ فارسی ص ۲۱۲۔

مسرت افزائے دل اتحاد منزل گردید موجب انشراح سینہ بے کینہ گردید۔ ترقیم کے لیے بھی الفاظ بندھے ٹکے تھے مثلاً نگارش پذیر خامہ رحمت شمامہ گردیدہ بود۔ تحریر پذیر قلم بہجت تصویر شدہ بود۔ ادراکیہ اس طرح لکھتے تھے مضمون عطوفت مشحون بیرایۂ ایضاح یافت یا ارشاد فیض بنیاد مطلع فرمود یا برحقیقت مندرجہ آگاہی دست داد۔ گزارش حال بھی اس انداز سے ہوتی تھی کہ واقعات این سرزمین موجب شکر و ستائش ایزد جہان آفرین است یا گزارش حالات این نواحی مستوجب حمد الٰہی ست۔ خلاصہ یہ کہ مقدمہ القاب سے لے کر اظہاریہ اور خاتمۂ مکتوب تک ایک ڈھرا بندھا ہوا تھا اور اس کی خلاف ورزی گناہ سمجھی جاتی تھی۔ کوئی فارسی نویس اس دائرے سے نکلنے کا خواہش مند نہیں تھا جو ابوالفضل ظہوری طاہر وحید جلالائے طباطبائی اور بیدل نے کھینچ دیا تھا بلکہ اپنے پیشرو کے نشانہائے قدم پر چلنا سعادت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ یہ رنگینان اور نقش طرازیان بقول آزاد کے ایسی ہی تھیں جیسے :

> "ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جزو اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا یا کسی دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بیشک دونوں نے بڑا کمال کیا مگر اس قلعہ کے ایوان میں کون سا بادشاہ ملک رانی کرے اور اس جہاز میں کون سا لشکر سمندر پار اُترے۔"

<u>اس مرصع کاری کا اثر اُردو انشا پر</u>

ناممکن تھا کہ اُردو نثر اپنے ماحول کے اثرات قبول نہ کرتی اور اس کے اسالیب فارسی کے رنگ میں نہ رنگ جاتے چنانچہ مرزا رفیع سودا اور میر عطا حسین تحسین نے جو قافیہ پیمائی شروع کی وہ کم و بیش رجب علی بیگ سرور اور بے خبر کے زمانے تک جاری رہی۔ اور جس طرح سہ نثر ظہوری اور پنج رقعہ وغیرہ کی عبارتوں میں استعاروں کی بھرمار اور متواتر اضافتوں کی ترکیبیں بکثرت پائی جاتی ہیں ایسی ہی اُردو کے ابتدائی دور میں

نظر آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے اُردو میں قابلِ قبول علمی شان پیدا نہ ہوسکی اور شروع میں اُردو مکاتیب بھی فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی۔ حد یہ ہے کہ پرائیویٹ خطوں میں بھی فارسی کے طرز پر بھاری بھرکم القاب ہوتا۔ اس کے بعد متعلقین کی خیریت اور عافیت جوئی ہوتی پھر استعاروں اور کنایوں کے پردے میں کچھ اظہارِ مطلب ہوتا۔ اور اس کے بعد عربی اور فارسی کے دُعائیہ جملوں پر خط ختم کر دیا جاتا۔

رجب علی بیگ سرور کو مقفیٰ نگاری اور رنگین بیانی کا بڑا اہتمام منظور تھا۔ بیٹے کو ایک خط بڑی پریشانی میں لکھا ہے۔ اس میں اس روش کی پابندی نہ ہوسکی تو معذرت کی ہے اور لکھا ہے :

"یہ دو سطریں انتشارِ طبیعت میں لکھی ہیں کوئی چست فقرہ نہ نکلا۔"[۱]

ایسی ہی معذرت ایک اور خط میں ہے :

"یہ خط پریشانی میں اناپ شناپ بے ناپ تول لکھا ہے۔"[۲]

اصل یہ ہے کہ بغیر اس ناپ تول کے خط خط ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور علم و فضل کا سب سے بڑا ثبوت یہ ادبی مرصع کاری ہی تھی۔ غالب نے اس محمد شاہی روش کا مذاق اُڑایا ہے اور لکھا ہے :

"ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو۔ مجتہد العصر کے مسودہ کو اصلاح [illegible] اب اور کیا لکھوں۔ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کرو مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا۔ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے ..... کیوں سچ کہیو اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی۔ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے ......"[۳]

۱؎ انشائے سرور، ص ۵۳ ۲؎ ایضاً ص ۴۷

۳؎ اُردوئے معلیٰ، ص ۱۸۶۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی فسانۂ آزاد میں اس پُرتکلف انشا پردازی پر اعتراضات کیے ہیں اور جا بجا طنز کے نشتر چبھوئے ہیں[۱]۔

فارسی کی تقلید کے مثبت اور منفی پہلو

لیکن اس وقت اُردو فنِ انشا کو روائتیں فارسی ہی سے مل سکتی تھیں۔ کوئی فن اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی خارجی حالات و اسباب سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارا ذہن اور دماغ۔ چنانچہ اُردو انشا بھی فارسی کے حُسنِ مستعار سے چمکی۔ مولوی غلام امام شہید نے انشائے بہارِ بے خزاں (۱۸۶۹ء) میں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو میں بڑی اہم کتاب ہے اور جس میں خط نگاری کے آئین و ارکان سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں لکھا ہے:

"خط کتابت کا دستور اُردو میں اب تک جاری نہیں ہوا۔ پھر اب اگر کوئی زبان اُردو میں اس کا رواج دیا جاے تو جس طرح نظم اور نثر فارسی کے طور پر جاری ہوئی اسی طرح خط و کتابت کا بھی فارسی کے طور پر جاری ہونا ضروری ہوگا اور فارسی میں جو خط لکھنے کے قاعدے مقرر ہیں ناچار اُردو میں بھی اس کا تابع ہونا پڑے گا۔"[۲]

اس فارسی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کے اصلی خط و خال ہی چھٹ گئے اور وہ پودا جو کھلے میدانوں میں پرورش پا رہا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دفعتاً ایک خوبصورت اور گرم کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں حرارت کی زیادتی سے وہ مداری کے درخت کی طرح بڑھ گیا۔ لیکن یہ اُردو ادب کی خوش قسمتی تھی کہ غالب جو فارسی کا عاشق و شیدائی تھا اس نے اُردو کے قدیم طرزِ انشا پر ایک ضرب کاری لگائی اور سجع و قوافی کی سنگلاخ زمین ہی سے آبِ رواں کا ایک چشمہ نکالا جو اب تک ہماری پیاس بجھاتا ہے۔ اس طرح ظہوری اور بیدل کا طلسم زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا لیکن اُردو کو فارسی سے چند اہم روایات مل گئیں جن سے ہمارے فن کاروں نے مفید کام لیا۔ اس طلائی جدول سے اُردو کی رونق بڑھ گئی ہے اور اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

---

[۱] فسانۂ آزاد، ج اول، ص ۲۷۵ - ۲۷۷۔
[۲] انشائے بہارِ بے خزاں، تیسرا ایڈیشن، مطبوعہ ۱۸۷۳ء، ص ۳۲۔

(ط) فارسی کا زوال

حکومت مغلیہ کے انحطاط و زوال کے بعد رفتہ رفتہ فارسی کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور فارسی کے بڑے بڑے شاعر مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل[1]، خاں آرزو[2]، مرزا معز فطرت[3]، قزلباش خاں امید[4]، مرزا گرامی[5] اور رائے آنند رام مخلص[6] بھی اُردو میں شعر کہنے لگے۔

مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان میں لکھا ہے:

"بہ مقتضائے رواج زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے این کہ رواج شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زمانہ بہ پایہ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ ازو بہتر گردیدہ[7]۔"

لیکن زبان بڑی سخت جان ہوتی ہے۔ حکومتوں کے انقلاب اس کی مملکت پر بہت دیر میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ مرکز کے کمزور ہو جانے کے بعد جو صوبے داریاں اور نوابیاں قائم ہوئیں وہاں بھی فارسی بدستور قائم رہی۔ حد یہ ہے کہ مرہٹوں اور سکھوں کے یہاں بھی فارسی ہی کو معاملات و مراسلات کا ذریعہ ٹھہرایا گیا۔ دکن و اودھ میں فارسی کی کاروباری حیثیت بدستور باقی رہی بلکہ ۱۸۳۲ء تک ہندو اور مسلمان دونوں فارسی جاننا شائستگی کی نشانی سمجھتے تھے۔ لارڈ مٹکاف اپنی یادداشت مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۳۲ء میں لکھتے ہیں:

"فارسی زبان کا عوام میں بہت رواج ہے اور ملک کے تقریباً سب طبقے اس سے روشناس ہونے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ زبان شیریں جامع سلیس اور آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں تمام زبانوں کی نسبت زیادہ سمجھی جاتی ہے۔"

---

[1] تذکرہ نکات الشعرا۔ ص ۲۔ [2] ایضاً۔ ص ۳۔ [3] ایضاً۔ ص ۴۔
[4] ایضاً۔ ص ۷۔ [5] ایضاً۔ ص ۸۔ [6] ایضاً۔ ص ۹
[7] تذکرہ ہندی گویان۔ ص ۲۴۸۔

دیوانی بنگالہ کی تفویض

شاہ عالم اور کلایو کے درمیان جو دیوانی بنگالہ کی تفویض کی شرائط طے ہوئی تھیں ان میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ فارسی قائم رہے گی لیکن ۱۸۳۲ء میں اردو سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی اور ۱۸۴۴ء تک فارسی زبان عدالتی زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی لیکن اس کے بعد منسوخ کردی گئی۔

فارسی کا زوال اور اردو کی ترقی

سرجان شور (۱۷۹۸-۱۷۹۳ء) نے لکھا ہے کہ فارسی کا اثر دن بدن کم ہو رہا ہے اور فریقین کو مقدموں کی کارروائی سمجھنے میں زحمت ہوتی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ انگریز افسروں اور مجسٹریٹوں کو دقت ہوتی تھی اس لیے یہ لسانی تبدیلی ضروری قرار دی گئی۔ جب حکومت کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ملکی زبانیں حریف بن گئیں تو فارسی زوال پذیر ہوگئی اور رفتہ رفتہ اردو نے اس کی جگہ لے لی۔ ذوق و ظفر کے زمانے میں فارسی ادبی حلقوں سے بھی نکالی جا چکی تھی اور ہندوستان میں رہ کر فارسی کو کما حقہٗ حاصل کرنے کے بہت کم مواقع رہ گئے تھے[1]۔ ان حالات کا فارسی انشا پر بھی اثر پڑا اور دراصل فارسی میں مراسلہ نگاری اسی دن ختم ہوگئی جب مرزا اسداللہ خاں غالب نے ناتوانی اور ہجوم آلام کی وجہ سے فارسی کو ترک کرکے اردو میں گل افشانیاں شروع کیں۔ اور آنے والی نسلوں کو شمع راہ دکھلائی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرزا غالب اردو خط نویسی کے موجد ہیں۔ لیکن ادبی حیثیت سے ضرور ان کو تقدم حاصل ہے۔

(ع) انگریزی مکتوب نگاری اور اس کے اسالیب

غالب نے مراسلہ کو مکالمہ کیوں بنایا اور اپنی تحریر کو گفتگو کا رنگ کیوں دیا۔ یہ بہت دلچسپ مسئلہ ہے اور اس پر آئندہ صفحات میں بحث ہوگی لیکن یہاں اس کا اشارہ ضروری ہے کہ بعض اساتذۂ تنقید کا خیال ہے کہ غالب کی انشا انگریزی سے متاثر ہوئی ہے[2]۔

---

[1] قتیل و غالب (اسد علی انوری) ص ۱۰۲ نیز انشائے راحت روح۔ دیباچہ آخر۔
[2] غالب۔ مہر۔ دوسرا ایڈیشن۔ حاشیہ از مولانا آزاد۔

کیا غالب کا اسلوب انگریزی سے متاثر ہے؟

ہم اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اس کی حمایت میں مضبوط تاریخی شواہد موجود نہیں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس وقت فضا میں انگریزی اثرات کارفرما تھے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہو چکا تھا اور اس نے آسان نثر کی تحریک ایسے موقع پر شروع کی تھی کہ اس کو بہت ہی قلیل عرصے میں رواج عام حاصل ہو گیا۔ ارباب نثر اردو کے مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے[۱] کہ "فورٹ ولیم کالج نے خطوط غالب کے لیے جگہ ہموار کردی" ۱۸۱۰ء سے اردو میں اخبارات بھی شائع ہونے لگے اور طباعت و اشاعت کی سہولتوں نے اردو کا دائرۂ اثر بڑھا دیا اور انگریزی حکومت کے قیام و استحکام نے انگریزی اثرات کو نمایاں کر دیا۔

انگریزی حکومت کا قیام و استحکام

۱۸۱۳ء میں پہلی مرتبہ گورنمنٹ نے ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے منظور کیا۔ اس کے تین برس کے بعد کلکتہ میں ایک کالج راجہ رام موہن رائے کی مدد سے قائم ہوا۔ ۱۸۲۳ء میں الگزینڈر ڈف نے ایک کالج کھولا جس میں انگریزی علم و ادب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی تھا۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان باقاعدہ ذریعۂ تعلیم قرار دے دی گئی اور ۱۸۳۶ء میں پریس کو آزادانہ واقعات نگاری اور رائے زنی کا بھی اختیار مل گیا۔

اردوئے جدید پر اثر

یہ واقعات ایسے نہ تھے کہ اردو انشا پردازی اور اس کے اسالیب متاثر نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردوئے جدید کی شمع انگریزی ہی کے نور سے روشن ہوئی ہے اس لیے اگر اس مقام پر انگریزی مکاتیب نگاری کا بھی جائزہ لے لیا جائے تو بے محل نہ ہوگا تاکہ اردو انشا کا وہ پس منظر جو فارسی اور انگریزی کے ملے جلے رنگوں سے تیار ہوا ہے وہ واضح ہو جائے۔

۱۔ ارباب نثر اردو۔ از سید محمد۔

(ف) انگریزی انشا کی مختصر تاریخ

زمانے کے دستبرد نے ہزاروں نوادرات کو ضائع کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ آج چاسر، لو اور شیکسپیر کے خطوط کا پورا گنجینہ موجود نہیں ہے ورنہ ان میں سے بہت سے خطوط ادبیات کی جان ہوتے۔ عہدِ ایلزبتھ کے جو تھوڑے بہت خطوط موجود ہیں ان سے کم از کم اس دور کی خصوصیات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ دور بالکل منفرد اور علیحدہ ہے اور جہاں تک مکاتیب نگاری کا تعلق ہے اس کا آیندہ ادوار سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ اس کی تقلید کبھی نہیں کی گئی۔ زبان و بیان کا کرّ و فر اور تزک و احتشام اس زمانے کی خصوصیت ہے۔ Essex ملکہ ایلزبتھ کو لکھتا ہے۔

> "علیا حضرت ایک ایسے شخص سے جو رنج و کلفت میں مسرت محسوس کرتا ہو۔ جس کے جذبات کو عشق نے گھلا دیا ہو اور جس کا آبگینۂ دل افکار و آلام نے پاش پاش کر دیا ہو اور جس کو اپنے آپ سے نفرت ہو اور ہر اس چیز سے جو اسے زندہ رکھنے والی ہو۔ کسی خدمت کی توقع رکھ سکتی ہیں؟"

یہ زمانہ تلاطمِ جذبات اور عمل و حرکت کا تھا۔ کبھی کبھی قلم میں وہی برش اور کاٹ پیدا ہو جاتی ہے جو لوگوں کی شمشیروں میں تھی۔ سر فلپ سڈنی کے خطوط اس کی غمازی کرتے ہیں۔

مذہبی اصلاح کا دور

اس زمانے میں مذہبی اصلاح کی تحریک نے زندگی کے نظام میں ہلچل ڈال دی تھی۔ مقررہ خیالات اور نظریوں پر بھی نظرِ ثانی ہو رہی تھی خصوصاً اخلاقی نظام دوبارہ ترتیب دیا جا رہا تھا۔ سر ہنری سڈنی اور Lord Strafford کے خطوط جو انھوں نے اپنے لڑکوں کو لکھے ہیں بالکل کسی پادری کا وعظ اور تدبیر و مصلحت کا دفتر معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ناصحانہ مقولے لاطینی محاورے اور فلسفیانہ بحثیں ہیں۔ جس خط کو بھی اٹھا کر دیکھیے اس میں رسمیت، ظاہری زیب و زینت، بوجھل فقرے اور پُرشکوہ الفاظ کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔

۱۷ ویں صدی

سترھویں صدی میں یہ سب باتیں ختم کردی گئیں۔ اس سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ اس کے بعد خطوں میں سادگی، بے ریائی، بے ساختگی اور روزمرّہ کا لطف پیدا ہو گیا۔ نقصان یہ ہوا کہ سنجیدگی متانت اور شان وشوکت جاتی رہی۔ پرانا طرز تعلیمی اور ہدایتی تھا اور یکسر دلچسپ اور تفریحی۔ James Howell (1595 - 1666) کے خطوط اس تغیّر وتبدّل کی جلوہ گاہ ہیں۔ ہوول میں نہ Donne کی سی روحانیت تھی اور نہ Raleigh کا سا استدلال۔ اسے خطوں میں باتیں کرنا خوب آتی تھیں۔ ہرچند کہ اس کی باتیں بوجھل اور بعض جگہ بناوٹی ہیں لیکن اس فن کا امام وہی ہے۔ اس کی گفتگو ایک نہر کی مانند ہے جو خود بینی اور زعمِ باطل کی جھاڑیوں اور کلاسکی تلمیحات کی پہاڑیوں سے گزرتی ہے لیکن وہ ہے نہر رواں —— سراب نہیں ہے۔ ہوول کے یہاں اٹھارھویں صدی کے مکاتیب نگاروں کی سی نفاست اور لطافت نہ سہی لیکن ان کا پیشرو اور مورث اعلیٰ وہی ہے۔

۱۸ ویں صدی

اٹھارھویں صدی بھی عجیب وغریب خصوصیات کی حامل تھی۔ مذہبی جھگڑے تقریباً ختم ہو چکے تھے اور انقلاب فرانس کی آندھی ابھی چڑھتی نہیں تھی۔ یہ درمیانی وقفہ رواداری اور آرام وعیش کا تھا۔ زندگی خوش آیند امکانات اور توقعات کی آغوش میں مسکرا رہی تھی۔ ذوقِ عمل ابھر رہا تھا۔ ہر چیز کے بلند سے بلند معیار قائم کیے گئے تھے۔ نظر کہیں ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ اور انتہائی رفعت پر اپنا آشیانہ تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب بلند پروازیاں رسمی قسم کی تھیں۔ اسی لیے اس تہذیب میں تصنّع کا رنگ غالب تھا۔ گویا مٹی کا ایک خوشرنگ گلدستہ تھا جس کو بنایا اور گھڑا گیا تھا۔ اور جس کی ایک ایک پتّی خوش رنگ لیکن مصنوعی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کا ادب جذبات سے معرّا ہے۔ خطوط کے گرد چاہے کیسا ہی حصار بنایا جائے۔ جذبات اپنا گزر کرہی لیتے ہیں لیکن مجموعی طور پر اس زمانے کے خطوط عام ادبیات کے مسموم اثر سے نہ بچ سکے۔ پوپ اور بولنگ برک کے بعض خطوط

Pliny کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں اور مکاتیب سے زیادہ ان پر مقالات کا دھوکا ہوتا ہے۔ سرسید کے بعض خطوں میں بھی یہی نقص ہے۔ پوپ کی شاعری میں نفرت غصہ اور حسد کے جذبات نے جوش پیدا کر دیا ہے۔ دوستوں کے خطوط میں ان کی گنجائش کم ہے اس لیے اس کے مکاتیب شاعری کے مقابلے میں پھیکے ہیں۔

ایڈیسن (۱۷۱۹-۱۶۷۲ء) کو بعض اوقات کچھ بھی لکھنا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی خوب لکھتا تھا۔ اس کے خطوط میں Spectator والی شخصیت جھلکتی ہے (۱۷۲۹-۱۶۷۲ء) Steele کے خطوں میں ایڈیسن کی سی تفصیل نہیں ہے لیکن سادگی اور شگفتگی ہے۔ سوئفٹ (۱۷۴۵-۱۶۶۷ء) اس کے بالکل برعکس ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی خط ایسا ہو جس پر اس کی قابلیت کی مہر ثبت نہ ہو۔ اس کا اندازِ تحریر ایک عمدہ قسم کا شیشہ ہے جس کے ذریعے ہر چیز اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے یہاں تصنّع اور آب و رنگ بالکل نہیں ہے۔ وہ جو کچھ اثر مرتب کرتا ہے وہ اپنے موضوع اور نفسِ مضمون کے ذریعے ——— یہ بات دوسرے مکاتیب نگاروں کے یہاں تقریباً مفقود ہے۔ بعض وقت تو Swift بالکل شمشیر برہنہ ہو جاتا ہے اور اس کی تحریر سے ایک قسم کی بے دردی اور قساوت ٹپکنے لگتی ہے۔ وہ Miss Waring کو انکار کا خط لکھتا ہے:

> "کیا تم ۳۰۰ پونڈ سالانہ سے بھی کم آمدنی میں گھر چلانے کی ذمہ داری لیتی ہو۔ کیا تمھاری طبیعت مجھ سے اور میرے مذاق سے اتنی ہم آہنگ ہے کہ وہ میرے طریقۂ رہائش کی پابندی اور میری آرزوؤں کو پورا کر سکے اور کیا تم ان طریقوں پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگی جو میں وقتاً فوقتاً تمھاری ذہنی تربیت کے لیے تجویز کروں گا تاکہ ہماری رفاقت ایک دوسرے کے لیے خوشگوار بن سکے ..."

لیکن Swift کے یہاں جذبات بھی ہیں۔ وہ آخری خط جو اس نے Mrs. Whitway کو لکھا ہے دنیائے ادب میں درد و تاثیر کے اعتبار سے عدیم النظیر چیز ہے۔

عورتوں میں "حنابندِ عروسِ ادب" لیڈی میری ورٹلے مانٹیگ (۱۷۶۲-۱۷۰۹ء) کا[1]

---

[1] Law, Life & Letters Vol. I p-53 دیز مجموعہ مکتوبات از لیڈی میری ورٹلے، دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۶ء

نام سرِ فرد درج کرنے کے قابل ہے۔ اس کے خطوط میں ایک قسم کا مردانہ پن اور شگفتگی ہے جو بالعموم نسوانی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اس کے قلم میں بے پناہ روانی ہے۔ الفاظ اور جملوں کا در و بست اتنا صحیح ہے کہ ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اس کے خطوں میں چبھتے ہوئے فقرے، دلچسپ لطیفے اور پُرلطف تبصرے ہوتے ہیں۔ ایک چالیس سالہ خوبرو دوشیزہ کے بارے میں لکھتی ہے :

"اس نے انگلستان کے تمام امرا کے پیام کو انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اس کی پاکیزگیٔ ضمیر یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بغیر محبت کی حرارت محسوس کیے ہوئے ان سے شادی کر لے۔ وہ بے شوہر کے رہی۔ یہاں تک کہ ایک شخص مسٹر اسمتھ نے جن کی عمر صرف ۸۲ برس کی ہے اس کو ایسا مسحور کیا کہ وہ اپنی موجودہ حالت کو بدلنے پر آمادہ ہو گئی۔"[1]

لیڈی میری کا سب سے بڑا وصف اس کی صاف گوئی ہے۔ وہ جب کبھی عامیانہ بات بھی کہتی ہے تو صاف۔ لگی لپٹی نہیں رکھتی۔ اس کے یہاں ظرافت کا چٹخارہ بھی ہے۔ کنواری لڑکیاں عام طور پر ازدواجی زندگی کی ناکامی پر ہنستی ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتی ہے۔

"شادی شدہ عورتیں بڑی بے وقوف سی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کیے پر پچھتاتی ہیں اور واقعی ہمارے پاس معذرت کے لیے کوئی عذر بھی نہیں بجز یہ کہ شادی بہت عرصہ پہلے کی گئی تھی اور اس وقت کہ جب ہم جوان تھے۔"

میری کے خطوط نقاشی سے مبرّا نہیں ہیں۔ ان سے نکتہ سنجی، باریک بینی اور دقیقہ رسی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ہر جگہ طبیعت کی یکسانی اور یک رنگی نمایاں ہے۔

لارڈ چسٹر فیلڈ[2] (۱۶۹۴-۱۷۷۳ء) کے خطوط نصیحتوں کا دفتر ہیں۔ بار بار ایک ہی بات کو دہرایا گیا ہے اور ایک ہی موضوع تعلیم پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ان کی بے نمکی جب ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے تو Stanhope غریب تو جو اکثر ان کا مخاطب ہے دیکھ کر اور بھی سہم جاتا ہوگا۔ یہی بے لطفی مولوی نذیر احمد کے بعض خطوں میں ہے۔

---

1) Character Commentaries by Lytton Strachey p. 25

2) Letters written by Lord chesterfield to his Son Selected by Charles Sayle

اٹھارہویں صدی کی مکاتیب نگاری کا انتہائی نقطۂ عروج ہوریس والپول[1]
(۱۷۱۷ء-۱۷۹۷ء) کے خطوط میں ملتا ہے۔ اس کے مکتوبات میں سیر بین کا سا لطف پوشیدہ ہے۔ ان میں تنوع ہے۔ مضامین کی فراوانی ہے۔ دلکش استعارے، خوبصورت تشبیہیں اور لفظی گل کاری ہے لیکن ایک جگہ بھی روزمرّہ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس کے خطوط پڑھتے چلے جائیے، شاید ہی کوئی مقام ایسا ملے گا جہاں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود نہ ہوں۔ والپول لکھنے کے معاملے میں نہایت بوالہوس واقع ہوا تھا۔ تحریر کا شوق اس کی فطرت کا جزو تھا اور اس کی فطرت بھی عجیب تھی۔ اس پر تہ بہ تہ نقاب پڑے ہوئے تھے اور بالکل نیچے والپول کی اصل شخصیت تھی۔ اس کے خطوط نہایت دلکش ہیں لیکن کہیں کہیں آورد کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ والپول نہایت ذکی الحس شخص تھا۔ اس کے تیر و نشتر سے تیز جملے جو جگر میں پیوست ہوتے چلے جائیں، حریفوں کا مذاق، دوستوں سے لڑائی، بات بات پر غصّہ، یہ سب اس کے شدّتِ احساس کی علامتیں ہیں۔ وہ بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ احساس بھی اس کے یہاں قوی ہے۔ پُر نویسی میں صرف والیٹر اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور تخیئل کی فراوانی میں بائرن کے علاوہ اور کوئی اس کا حریف نہیں ہوسکتا۔

گرے (۱۷۱۶ء-۱۷۷۱ء) کو ادب سے محبت تھی۔ اس نے جو کچھ لکھا وہ اسی محبت کی خاطر لکھا۔ اس کے لفظ لفظ میں اس کی شخصیت جھلکتی ہے۔ جس چیز پر اس نے لکھا ہے اسے اپنا لیا ہے۔ اس کی انفرادیت خوشبو کی مانند ہے جو تحریر کے گلہائے رنگا رنگ میں بسی ہوئی ہے۔ اس کا انداز بیان بے عیب ہے اور بلا کی دلربائی ہے اور رعنائی کا حامل ہے۔ اس کی ہمدردیاں وسیع تھیں۔ ادبی فیصلے جچے تلے تھے اور مذاق نہایت صاف ستھرا تھا۔ اس کے خطوط میں ہلکی سی ظرافت ہے۔ یہ تبسّم زیر لب ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے اور اس وقت نظر آتا ہے جبکہ ہمیں اس کی ذرا بھی توقع نہیں ہوتی۔ گرے کے خطوط ذرا توجہ سے پڑھیے

[1] The Independent Review, May, 1904

تو اس میں گریۂ پنہاں کے بھی مناظر نظر آئیں گے۔ گریۂ تبسم کے اس امتزاج خاموش نے خطوط میں دلکش سوز پیدا کر دیا ہے۔ سیمول جانسن (۸۴-۱۷۰۹ء) کے بعض مراسلے حشمت معنی اور طمطراق کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس کا وہ خط جو ارل آف چیسٹر فیلڈ کے نام لکھا گیا ہے، تاریخ ادب میں بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔

کوپر (۱۸۰۰-۱۷۳۱ء) کے خطوط[1] صابن کے بلبلے ہیں ان کو دیکھ کر ہم حیرت بھی کرتے ہیں اور تعریف بھی۔ لیکن چھوتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا ٹوٹ نہ جائیں۔ وہ اندر سے خالی اور مضمون سے عاری ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کہنے پر بھی خوب کہا ہے اور بعض جگہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ تاہم یہ ضرور جی چاہتا ہے کہ مکتوب نگار کے پاس کچھ کہنے کو ہوتا چاہیے وہ اس سے کم دلکش انداز ہی میں کیوں نہ کہتا۔ کوپر کے خطوں میں تضاد ہے یعنی روکھے پھیکے بے مزہ اور بے جان ہیں۔ ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸ ویں صدی کا ہنگامۂ نا و نوش دفعتاً قبرستان کی خاموشی میں تبدیل ہو گیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں مسز کارلائل (۱۸۶۶-۱۸۰۱ء) نے بھی خطوط لکھے ہیں لیکن یہ کبھی توقع نہیں تھی کہ وہ پبلک کے سامنے آسکیں گے۔ اگر اس کی توقع ہوتی تو وہ اپنی تحریروں کی زہرناکی کم کر دیتی یا کم از کم ان پر شکر کا غلاف چڑھا دیتی۔ اس کی قوت مشاہدہ بڑی زبردست ہے۔ جزئیات سے خوب بحث کرتی ہے اس کے خطوں میں اشارات و کنایات کا طلسم نہیں ہے بعض اوقات تو اس کے خیالات ملبوس سے یکسر معری نظر آتے ہیں۔

والپول، گرے اور کوپر کے خطوط کے بعد بائرن شیلی اور کیٹس کے خطوط پڑھیے تو ایک دھکا سا لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کشتی جو اب تک دریا کی پرسکون موجوں پر بہہ رہی تھی دفعتاً سمندر کے تھپیڑوں سے دو چار ہو گئی ہے۔ ہر چیز بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ زمین نئی ہے آسمان نیا ہے۔ سوچنے اور بات کرنے کا ڈھنگ نرالا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانا شہر کھود کر پھینک دیا گیا ہے اور نیا بسایا گیا ہے جس کے باشندے بھی نئے ہیں اور ان کی بولی بھی کچھ اور ہے۔

(1) The Correspondence of William Cowper arranged by Thomas Wright in Four Vols.

بائرن کے خطوط[۱] میں زندگی کی قوت اور حرارت ہے۔ وہ ہمارے دل و دماغ پر وہی اثر کرتے ہیں جو سمندر کی پرکیف ہوائیں کرتی ہیں۔ اس کی تحریر میں زور اور اثر ہے لیکن زیب و زینت کا اہتمام نہیں ہے۔ اس کے جملے بعض اوقات خیالات کے پیچ و خم میں تھک کر رہ جاتے ہیں۔ الفاظ بھی ان جذبات کی پوری عکاسی نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود اس کے مکاتیب میں دلکشی اور دلربائی ہے اس لیے کہ اس کے خطوط میں Childe Harold والا فلسفی نظر نہیں آتا بلکہ Don juan والا رنگین مصنف نظر آتا ہے۔ بالکل اس دنیا کا انسان جس میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ اور شاید برائیاں اچھائیوں سے زیادہ ہیں۔ اس کے خطوط صرف اس کی ذات کا آئینہ ہیں۔ ہر خط کا محور خود بائرن ہے۔ اس کے خیالات، اس کی کتابیں، اس کی اُمیدیں، اس کی مایوسیاں یہی اس کے خطوط کا موضوع ہیں۔ بائرن کے وہ خطوط جو وینس سے متعلق ہیں دائرۂ متانت سے خارج ہیں۔ یہاں قوتِ بیان کا اعجاز نظر آتا ہے۔ بائرن کبھی دوستی نہیں کر سکتا۔ اس کے خطوط میں اس کے سوا سب کچھ ہے۔

شیلی کے خطوط میں اس کی شاعری کی طرح بلند پروازی اور نازک کاری ہے۔ یہ آب و رنگ صرف شاعرانہ کمال ہی کے بعد پیدا ہو سکتا ہے۔ مکاتیبِ غالب کی مرصع کاری بھی شاعری کی مرہونِ احسان ہے۔ اسی لیے رچرڈ گارنٹ Garnett نے شیلی کو "شہ مکتوب نگاران انگلستان" کہا ہے۔

کیٹس (۱۸۲۱-۱۷۹۵ء) کی شاعری لاشخصیت کی آئینہ دار ہے لیکن اس کے خطوں سے ہم اس کے کردار و خیالات کا کالبد تیار کر سکتے ہیں۔ وہ نہایت حسّاس شخص تھا۔ ایک موقع پر لکھتا ہے: "میں ہر بات کو انتہا تک لے جاتا ہوں۔ معمولی سی پریشانی تھوڑی سی دیر میں Sophocles کے غور و فکر کا موضوع بن جاتی ہے" لیکن اس کے مراسلے کوئی بڑی معیاری حیثیت نہیں رکھتے البتہ Hazlitt کے

---

(۱) The Letters of Lord Byron Edited by Mathilde Blind (1887) London

عاشقانہ خطوط بلند مرتبے کے مالک ہیں۔ Lamb[1] کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم رقصاں رہتا ہے۔ اس کا قلم ظرافت کی گلکاریاں کرتا ہے لیکن اس کے مذاق میں سوقیت نہیں ہے۔ دوسروں کے ناہموار روانہ جملوں اور بیہودہ اعتراضات پر اس نے کبھی مسکرانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کولرج کے نام اس کے خطوط عجیب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرشتہ جسے سیاحی کا شوق ہے، بہشت کو خطوط لکھ رہا ہے۔ بہن سے اسے عشق تھا۔ اس کے خطوط اس محبت کا مظہر ہیں۔ ان میں سنجیدگی و شگفتگی نامعقول و معقول کا دلچسپ امتزاج ہے۔

انیسویں صدی

انیسویں صدی میں ملکہ وکٹوریہ کے خطوط[2] چند ادبی معائب کے باوجود پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان میں قواعد کی فاحش غلطیاں اور بے ربط جملے ہیں لیکن ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے اپنا دل نکال کر خطوں میں رکھ دیا ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوجاتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے بیک وقت انگلستان کے آئین و دستور کو سنبھالے ہوئے ہیں اور بادشاہ کے اختیارات خصوصی کو بھی پامال نہیں ہونے دیتی۔

انیسویں صدی کے انگلستان کی تاریخ بہت سی تبدیلیوں اور تغیرات کی آماجگاہ ہے۔ ۱۸۱۵ء میں نپولین کی فوجوں کو شکستِ فاش ہوچکی تھی اور لڑائی کے بعد کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ صنعتی انقلاب شروع ہوچکا تھا اور زراعت کے میدان میں بہت سی مفید تبدیلیاں ہوچکی تھیں۔ انسان دوستی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعزیری قوانین کو نرم کردیا گیا۔ مذہبی آزادی دے دی گئی۔ غلامی کا انسداد ہوگیا۔ ڈاکخانے کے محکمے میں بھی اصلاحات کی گئیں اور پینی پوسٹ کا نیا طریقہ رائج کیا گیا۔ اس کی وجہ سے اس زمانے میں خطوط بہت لکھے گئے۔ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس نے اس معاملے میں سبقت نہ کی ہو۔ ان خطوں[3] سے

---

(1) The Letters of Charles Lamb - Edited by Alfred Ainger Macmillan, 1888

(2) The Letters of Queen Victoria in three Vol. 1908

(3) English Letters of the 19th Century by James Aitken

لوگوں کی محبت و نفرت، اُمید و بیم، اطمینان اور مایوسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ کے وہ صفحات جو ان اصلاحات اور تبدیلیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ وہ ان خطوں میں افراد کا حقیقی تجربہ اور ان کا ذاتی معاملہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے اگر اس زمانے کو سمجھنا ہے تو ڈزرائیلی رامرٹ ساودے برانتے گلیڈسٹن طامس ارنلڈ چارلس ڈکنس اور لارڈ کرزن کے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے۔ گلیڈسٹن کے خطوط طویل ضرور ہیں لیکن ادبی محاسن سے خالی نہیں ہیں۔ ان میں بلا کا خلوص اور متانت پائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی

بیسویں صدی کے خطوں میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس (۱۹۳۰-۱۸۸۵ء) کے خطوط پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے اور اولڈس ہکسلے نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ لارنس اول و آخر ایک فن کار تھا۔ اس کی ادبی صلاحیت اس کی قسمت بن گئی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں اس لیے لکھتا ہوں۔ اگر میرا جی نہیں چاہتا تو نہیں لکھتا۔ اسی کا مقولہ تھا آرٹ میرے لیے۔ لارنس کے خطوں میں اس کا دھڑکتا ہوا دل اور اس کی جیتی جاگتی زندگی پوری طرح نظر آتی ہے۔ اس کے خطوں کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی نئے اور غیر ملک کو دریافت کر رہے ہیں۔ یہ احساس اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا زمین و آسمان عام انسانوں سے مختلف ہے۔ اس کی ذہنی دنیا میں شدت اور تابناکی ہے وہ عام طور پر نظر نہیں آتی۔ جب وہ مہلک بیماریوں میں مبتلا تھا اور موت نے اس کے اوپر قبضہ کر لیا تھا اس وقت بھی وہ غالب کی طرح مسکرا سکتا تھا۔ اس میں زندگی تھی اور یہ اس کی ہر سطر میں نظر آتی ہے۔

اُردو انشا پر انگریزی کا اثر

انگریزی نے اُردو انشا پر کیا اثر ڈالا، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ یہاں اتنا ذکر کر دینا کافی ہے کہ انگریزی حکومت کے قیام و استحکام کے بعد اُردو منازلِ ارتقا طے کرتی ہوئی اس سطح امتیازیہ کے قریب قریب پہنچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر

(1) The letters of Queen Victoria in three Vols 1908

(2) English letters of the 19th Century by James Aitken.

زبانیں اپنا سکہ جما رہی تھیں[1]۔ اُردو میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ ہزاروں انگریزی کے لفظ اُردو میں جذب ہوگئے۔ انگریزی محاورے اور انگریزی اسالیب اُردو میں ڈھال لیے گئے۔ انگریزی کہاوتوں کا اُردو میں ترجمہ ہوگیا۔ مغربی علوم و فنون کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں۔ اخبارات و رسائل نکلے۔ ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری ہوا جو تاریخِ اُردو کا عہد آفریں واقعہ ہے۔ اب تنقید، سیرت، مقالے، تذکرے، تاریخ غرض ہر قسم کی انشا پردازی انگریزی وضع پر شروع کی گئی۔ شاعری بھی متاثر ہوئی اور ۱۸۷۴ء سے جدید شاعری کی ایک مستقل صنف اُردو میں قائم ہوگئی۔ کس طرح ممکن تھا کہ اُردو خط نویسی ان اثرات سے محفوظ و مامون رہتی چنانچہ اُردو مکتوب نگاری کے دورِ دوم میں انگریزی اثرات نمایاں ہوگئے اور القاب آداب خاتمہ اور پیرایۂ بیان تک بدل گیا۔ خط کو جنابِ من یا پیارے دوست سے شروع کرنا اور ہمیشہ آپ کا یا صادق اور مخلص پر ختم کرنا بالکل انگریزی طریقہ ہے۔ غالب کے انگریزوں سے مراسم تھے لیکن اس نے مکاتیب میں جو جدت طرازیاں کی ہیں وہ صرف مبدءِ فیاض کا کرم تھا۔ انگریزی اثرات سے انھیں براہِ راست کچھ واسطہ نہیں، یہ بالواسطہ اثرات انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے یہاں تک کہ آج اُردو مکاتیب و مراسلت میں وہ کافی نمایاں ہیں۔

---

[1] افاداتِ مہدی۔ اُردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ۔

(1) LETTERS OF D.H. LAWRENCE (1932).

بابِ اوّل

انشائے اُردو۔ رجب علی بیگ سرورؔ سے پہلے

(الف) اُردو کا تشکیلی دور

اُردو کی ابتدا کا مسئلہ بڑا مباحثہ انگیز ہے۔ یہاں اس تمام بحث کو پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اُردو ہند آریائی زبان ہے اور شمالی ہند میں اس کا ارتقا عہد اپ بھرنش سے شروع ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں جب ترک پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوئے تو شورسینی اپ بھرنش کا رواج تھا اور اس نے راجپوتی درباروں میں عزت کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان کی بعض جدید بولیوں کا ہیولیٰ اسی آب و ہوا میں صورت پذیر ہوا تھا۔

<u>اُردو کا تشکیلی دَور</u>

محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد لاہور جو مغربی اور مشرقی پنجاب کے سنگم پر واقع ہے ایک نئے تمدّن کا مرکز بن گیا تھا۔ اس وقت کی آویزش و آمیزش سے بعض دلچسپ لسانی نتائج بھی ظہور میں آئے۔ البیرونی کی کتاب الہند میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو آج تک اُردو میں رائج ہیں[۱]۔ مسعود سعد سلمان نے "ہندوی" میں ایک دیوان

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین لاہور، مئی سنہ ۱۹۳۲ء، مقالہ قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ۔

بھی مرتب کیا جو غالباً امیر خسرو کے زمانے تک ملتا تھا[1] اس کی زبان کیا تھی، یہ یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن ظنِ غالب یہ ہے کہ وہ "لاہوری زبان" تھی جس کا ذکر خسرو نے ہندوستان کی زبانوں کے سلسلے میں کیا ہے۔

اُردو کی بنیاد لاہوری زبان پر نہیں بلکہ اس "دہلوی زبان" یا کھڑی بولی پر قائم ہے[2] جس کا ذکر امیر خسرو کی مثنوی نہ سپہر میں ہے[3]۔ دہلی کے قریب ہریانی، برج بھاشا، کھڑی بولی اور میواتی (راجستھان کی ایک بولی) کئی زبانیں رائج تھیں۔ ترک دہلی فتح کرنے سے پہلے پنجاب میں رہ چکے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اہلِ پنجاب کی زبان سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے لیکن "خسرو کی تقسیم زبان سے جس لسانیاتی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان پنجاب سے فارسی آمیز یا جدید پنجابی بولتے دہلی میں داخل ہوئے ہیں۔ دہلی میں اور اس کے پاس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف پرانی ہریانی اور دوسری طرف پرانی کھڑی بولی بولی جاتی تھیں۔ چونکہ کسی قدیم زمانے میں مشرقی پنجاب خود انھیں دونوں بولیوں کے زیرِ اثر پیدا ہوئی تھی اس لیے پنجابی بولنے والوں کو برج کی بہ نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ قریب دکھائی دی۔ انھوں نے اس کی صوتیات اور صرف ونحو کو پنجابی سے ملتا جلتا پایا۔ اس طرح ان کی نظر انتخاب (غیر شعوری طور پر) برج کی بجائے انھیں بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے اور جس کی ابتدائی شکل کو انھوں نے اپنے پنجابی لب ولہجے اور محاورے سے متاثر بھی کیا۔ اُردو کی تہہ میں جو بنیادی بولی ہے اس کا تعلق تو نواحِ دہلی ہی سے ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سلاطینِ دہلی کے عہد میں اس پر اہلِ پنجاب کی زبان کا گہرا اثر رہا ہے جس کی وجہ سے دو تین صدیوں تک اس کا اپنا کینڈا متعین نہ ہو سکا۔ اس خام اور غیر متعین زبان کو مسلمان

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال بحوالہ پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۳۴

[2] و [3] تاریخ زبانِ اُردو از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ص ۱۳۶۔
نیز تاریخ ہند الیٹ اینڈ ڈوسن، ص ۵۶۲، جلد ۳ ضمیمہ۔

دکن لے گئے تھے جہاں کچھ عرصے بعد اجنبی زبانوں کے ماحول میں اس کا اپنا معیار قائم ہوجاتا ہے[۱]۔" مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل اپ بھرنش یا قدیم ہندی جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں تھا رائج تھی اور برج بھاشا کھڑی بولی اور ہریانی نے کوئی ادبی شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ دہلی کے گرد و نواح میں لسانی اعتبار سے بالکل سناٹا تھا۔ حال ہی میں ناگری پرچارنی سبھا نے چتوڑ کے راول سمر سنگھ اور اجمیر کے پرتھوی راج کے شاہی پروانوں کا پتہ لگایا ہے۔ راول سمر سنگھ کے پروانے راجستھانی زبان میں ہیں لیکن پرتھوی راج کے پروانوں کی زبان پر دلّی اور ہریانہ کا اثر ہے اور اس میں پرانی کھڑی بولی کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ذیل میں بارہویں صدی عیسوی کا ایک پروانہ نقل کیا جاتا ہے:

"شری شری دلین مہاراجم دھیراجم۔ ہندوستانم راجم دھانم سمبھری نریس پورب دلی شش‌ست شری شری مہانم راجم دھیراجم شری پرتھوی راج سوساتھم اجارج اشی کیش دھنم تری اپرن۔ تم نے کا کاجی نم کے دوا کی آرام چنوجین کے دیح میں راکڑ روپیہ ... ۵ نرسے آبانی گوڑے کا پرچہ سیوائے آدیں گے۔ کھجانم سے انم کو کوئی معاف کریں گے۔ جین کو نیز کے اندھکاری ہودیں گے۔ سنی دوبے حکم کے بذمنٹ راسمنت ۱۱۴۵ درشے اساڑھ سری ۱۲"[۲]

ترجمہ: مشری شری مہاراج دھیراج پرتھوی راج جی (حکمراں) ہندوستان دلّی پوربی ہندوستان کے مہاراج دھراج سنبھری راجاؤں کی راجدھانی نے اچاریہ رشی کیش دھن ونتری کو (دیا) تم نے کا کاجی کی دوا کر کے انھیں اچھا کیا ہے جس کے سبب ... ۵ نقد اور ہاتھی گھوڑے کا خرچہ تمھیں شاہی خزانے سے بھیجا جائے گا۔ اس حکم کے پولے ہونے میں جو کوئی رکاوٹ پیدا کریں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ بنومنت کے ذریعے یہ حکم ہوا۔

سمبت ۱۱۴۵ اساڑھ سری ۱۳۔

---

[۱] تاریخ زبانِ اُردو۔ ڈاکٹر مسعود حسن خاں۔ ص ۱۳۸ و ۱۳۹۔ [۲] مشر بندھو حصہ اول۔ ص ۱۲۶ و ۱۲۷۔ نیز ہندی بھاشا اور اس کے ساہتہ کا وکاس۔ ہری اودھ

اس پروانے میں کھڑی بولی کے افعال اور فارسی الفاظ کی پیوند کاری توجہ کے قابل ہے۔
مہاراجہ پرتھوی راج، شہاب الدین غوری کے درمیان آخری لڑائی ۱۱۹۲ء میں ہوئی۔ اس میں راول سمر سنگھ بھی شریک تھا۔ اس سے پرتھوی راج کی راجکماری پرتھا بائی کی شادی ہوئی تھی۔ راول اس لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی وفا شعار بیوی پرتھا بائی نے ستی ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کو اس وقت جو چتوڑ میں تھا، ایک خط لکھا ہے اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

بارھویں صدی عیسوی کا دوسرا پروانہ

"سری حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے۔ اور ان کے سنگ رشی کیش جی بھی بیکنٹھ کو پدھارے ہیں۔ رشی کیش جی ان چار لوگوں میں سے ہیں جو دلی سے میرے سنگ دہیز (جہیز) میں آئے تھے۔ اس لیے ان کے بنسجوں (کنبہ والوں) کی خاطری (خاطر داری) راکھنا۔ نے (اور) باجے مارا چباری گران (نوکر چاکر) منشان (آدمیوں) کی خاطری راکھجو۔ ای (یہ) مارا جیو کا چاکر ہے۔ جو تھا سو (تم سے) کدی (کبھی) حرامخوری نیوے گا (حرام خوری نہیں کرے گا) ماگھ سدی دواشی سمت ۱۲۴۸ بکرمی[۱] (مطابق جنوری ۱۱۹۲ء)۔

اہمیت

ان خطوط کی ادبی اہمیت نہیں لیکن لسانی ضرور ہے۔ رنواس اور مخدرات میں فارسی عربی الفاظ کی کثرت اور دیگر تاریخی شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ غوری سے پہلے بھی اتحاد پسندی کے قدیم رجحان کو تقویت پہنچانے کے سامان بکثرت موجود تھے۔ ان کے ذریعے انشا کی تاریخ کے بعض تاریک گوشے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ اور تاریخی تسلسل کا وہ سرشتہ بھی جو اب تک نظروں سے اوجھل تھا، سامنے آ جاتا ہے۔ یہ وہی خام زبان ہے جو دکن میں جا کر معیاری بن گئی۔

۱۱۹۲ء کے بعد اجمیر دہلی علی گڑھ ہانسی اور سرستی یہ تمام مقامات ترکوں کے قبضے میں آ گئے اور ۱۲۰۶ء میں ان کی بادشاہت بھی دلی میں قائم ہو گئی۔ اس وقت سیاست

---

[۱] کویتا کومدی از رام نریش ترپاٹھی، ج اول، ص ۱۰۸

کے علاوہ اسلامی تصوف اور ہندو باطنیت کے میدان میں بھی بڑی سرگرمی کا اظہار ہو رہا تھا۔ بھگتی کی تحریک اسلام کے اثر سے وجود میں آئی تھی اور اس نے ہندوستان گیر زبان کے تصور کو بھی پیدا کیا تھا۔ عوامی مذہبی ضروریات کی بدولت یہ دہلوی زبان یا کھڑی بولی رفتہ رفتہ نکھرتی گئی اور فقیروں سپاہیوں اور بیوپاریوں کے ذریعے پنجاب دکن اور پورب کے علاقوں میں بھی رواج پا گئی۔

د۔ صوفیائے کرام اور اُردو نثر

صوفیائے کرام نے اُردو کی ترویج و اشاعت میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ ان کی تحریک عوامی تحریک تھی اور ان کے مخاطب ہندو اور مسلمان دونوں تھے اس لیے ان کی لسانی کوششیں بھی بہت مقبول ہوئیں[۱]۔ اس سلسلے میں حضرت چراغ دہلوی (متوفی ۷۵۷ھ) کی خیر المجالس اپنی قدامت اور صحت کے اعتبار سے بہت اہم ہے جس میں بہت سے فقرے اُردو کے ملتے ہیں۔ ۷۵۸ھ میں حضرت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر لکھا اور پروفیسر حامد حسن قادری کا خیال ہے کہ "حضرت اشرف کی کتاب اُردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر ہے"[۲]۔

ان کے بعد شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۱۳۹۲ء) کے رسالے حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز (متوفی ۱۴۲۱ء) کا رسالہ معراج العاشقین[۳] سید محمد عبداللہ حسینی کا ترجمہ نشاط العشق اور شاہ میراں جی (متوفی ۱۴۹۶ء) کی جل ترنگ اور گل باس لکھی گئیں۔ یہ سب کتابیں پندرھویں اور سولھویں صدی کے درمیانی زمانے میں تصنیف کی گئیں اور ان سے نثر اُردو کی قدامت کا بہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔

(ب) دکن میں اُردو کی ترقی

یہ رسالے اور مقولے جو خال خال ملتے ہیں ان کی حیثیت تبرکات ادبی سے زیادہ

---

[۱] اُردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند

[۲] داستانِ تاریخ اُردو۔ ص ۱۹

[۳] طبع کردہ انجمن اُردو ہند

نہیں ہے۔ ابھی اُردو بن رہی تھی اور اس کا شمار شائستہ زبانوں میں نہیں تھا۔ یہ صرف بات چیت اور لین دین کی زبان تھی۔ لیکن دکن کے بادشاہوں نے اپنی قدر دانی سے اس زبان کا مرتبہ بڑھایا۔ سلاطین بہمنی نے اُردو کو سرکاری زبان بنا دیا، اور ابراہیم عادل شاہ اوّل (۱۵۵۸ - ۱۵۳۴ء) اور ثانی (۱۶۱۷ - ۱۵۸۰ء) نے فارسی کو ہٹا کر اُردو کو اس مسند پر بٹھایا۔[۱] گول کنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں شعرائے اُردو کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ اور ہزارہا روپیہ انعام و اکرام کا ملتا تھا۔ مولانا شمس اللہ قادری نے لکھا ہے کہ:

"اس زمانہ میں زبان اُردو دکن میں عموماً اور مسلمانان دکن میں خصوصاً اس قدر عام ہو گئی تھی کہ بات چیت لین دین اور خط و کتابت یہ تمام باتیں اسی زبان میں ہوا کرتی تھیں۔"[۲]

لیکن مضبوط اور مستند تاریخی شہادت کی غیر موجودگی میں خط و کتابت کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اور نہ اس زمانہ کے طرز و اسلوب کے بارے میں کوئی آخری رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

مجموعہ مکتوبی بزبان دکنی (قلمی)

کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں ایک قلمی کتاب ہے جس کے سر ورق پر "اوراق مجموعہ مکتوبی" لکھا ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اس نسخہ پر نہ تاریخ ہے اور نہ مصنف کا نام اس لیے اس کی اہمیت اور صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن عبارت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط دکنی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا موضوع تصوف ہے اور اکثر جگہ سوال و جواب کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ نمونہ یہ ہے:

"جان تو کہ اے عزیز اول کچھ نہ تھا۔ نہ آسمان تھا نہ زمین تھی نہ عرش تھا نہ کرسی تھی نہ چاند تھا نہ تارے تھے نہ سورج تھا نہ کچھ تھا اور ذات سبحانہ امین تھا اس حد تک کہ صفتاں کا ظہور بھی نہ تھا۔ ایسا مدہوش تھا نہ اپنی خبر رکھتا تھا نہ غیر کی۔

---

[۱] تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص ۲۷ [۲] اردوئے قدیم، ص ۹۳
[۳] اوراق مجموعہ مکتوبی (قلمی) حبیب گنج

سوال : کس واسطے کہ خبر نہیں رکھتا تھا۔
جواب : کیا واسطے کہ خبر رکھنا صفات سوں تعلق ہے ہور او تو اس مرتبے میں
اپنی ذات سوں امین ایسا مشغول تھا جو کسی صفت کا گنجائش نہ تھا
جس وقت صفت کی گنجائش نہیں تو خبر رکھنا بھی ممکن نہیں۔
سوال : صفتاں قدیم ہے یا جدید۔
جواب : قدیم ہے ظہور انوں کا ذاتی مرتبے میں مخفی ہے جون کہ شراب راکھ
میں ہور عطر پھول میں "
خاتمہ پر لکھا ہے۔"..... (کرم خوردہ) قاسم کی مدد سوں مراقبے کے معنی دکنی زبان
سوں کیا ہے۔ مبتدی کو آسان ہووے"
(مشتمل بر صفحات ۲۴ مع مضمون دیگر)

دکن کے چند تمثیلی خطوط

دکن نے اُردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور قابل قدر ادبی سرمایہ جمع کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ اور آصفیہ لائبریری میں کوئی نسخہ اس زمانے کے خطوط کا محفوظ نہیں ہے۔ اس زمانے کے فرضی و تمثیلی خطوط البتہ ملتے ہیں۔ ان سے کم سے کم اس زمانے کے طرز و اسلوب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لطیف حیدر آبادی[1] نے ایک مذہبی نظم ظفر نامہ لکھی ہے جس کو اس نے ۱۰۹۵ھ (۱۶۸۳ء) میں مکمل کیا۔ اس نظم میں ماہیار کا خط عمر علی کے نام ہے جبکہ اوّل الذکر قید ہو گیا تھا۔ وہ اپنی مجبوری کا ذکر اپنے آقا سے کرتا ہے۔ پہلے دو شعر یہ ہیں

سیادت پناہ صاحب و قبلہ گاہ　　مددگار تمنا اچھوں نت الہ
کہ مخفی نماند بریو راز　　کتا ہوں سنو سربسر کھول راز

اسی طرح عشرتی[2] کی چت لگن میں بھی ایک خط ہے۔ عاشق غم ناک اپنے بے پروا دوست

---

[1] اُردو شہ پارے، ج ۱، ص ۲۵۴۔
[2] عشرتی عادل شاہی دربار سے وابستہ تھا۔ بعد انقراض سلطنت اورنگزیب نے اس کی سرپرستی کی۔ ملاحظہ ہو اُردو شہ پارے، ج ۱، ص ۲۸۰۔

کو لکھا ہے :

لکھیا دوست کے لہوسوں یو ناما تجے　　جو تج بن دیسیا ان قیامت مجے

لیکن اس قسم کے خطوط ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔

منشات منشی محمد شاکر (قلمی)

اٹھارھویں صدی کے لکھے ہوئے دکنی کے کچھ خطوط البتہ ملتے ہیں جن میں عصری حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس زمانے کے طرز و اسلوب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اُردو خطوط کا ایک مخطوطہ[1] ہے جس کا نمبر ۱۴ متفرق ۲۶۲ ہے۔ یہ تمام خط اور تحریریں منشی محمد شاکر نے لکھی ہیں۔ موخرالذکر ایسٹ انڈیا کمپنی میں مسٹر بولٹس کے سکریٹری کی حیثیت سے ملازم تھا۔ بولٹس ڈچ[2] تھا۔ وہ ۱۷۴۰ء کے قریب پیدا ہوا اور پندرہ برس کی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی (بنگال) کا ملازم ہو گیا۔ ۱۷۶۴ء میں اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس لیے کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اس سے یہ شکایت تھی کہ وہ نجی تجارت کرتا تھا۔ ۱۷۶۸ء میں اسے ہندوستان چھوڑنا پڑا[3]۔ یورپ جا کر اس نے آسٹریا میں ملازمت کر لی۔ اس کا انتقال پیرس میں ۱۸۰۸ء میں ہوا۔ بولٹس کا نام انشا کی تاریخ ہی میں نہیں صحافت کی تاریخ میں بھی یاد رہے گا۔ ۱۷۶۶ء میں اس نے کاؤنسل ہاؤس کلکتہ کے دروازے پر یہ نوٹس لگایا تھا۔

"مسٹر بولٹس پبلک کو اطلاع کرتا ہے کہ وہ ہر اس شخص کی مدد کرنے کو تیار ہے جو طباعت و اشاعت کا کام اپنے ذمّہ لے۔ اس لیے کہ پریس کے بغیر تجارتی کاموں میں بڑی دشواری ہوتی ہے"[4]

یہ ہندوستان میں اخبار کے اجرا کی پہلی کوشش تھی جو ناکام رہی۔ اس لیے کہ ایک ہی سال بعد بولٹس کا اقتدار ختم ہو گیا۔

---

[1] ہندوستانی مخطوطات کی فہرست۔ انڈیا آفس مرتبہ بلوم ہارٹ، ۱۹۲۶ء

[2] BUCKLAND : DICTIONARY OF INDIAN BIOGRAPHY.

[3] روداد سلکٹ کمیٹی۔ ۱۸ اپریل ۱۷۹۶ء، ج اول، ص ۱۸۹-۱۹۰

[4] MR. BOLTS By HOLLWORD.

منشآت شاکر کے خاتمے پر لکھا ہے :

" مالک الکتاب صاحب مہربان مستر بولٹس دام اقبالہ تحریر فی التاریخ ۲۰ شہر صفرالمظفر روز چہارشنبہ مرتب یافتہ خط خام سراج الدین حاصوری "

اصل کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے :

" عنوان شیریں بیان روشن اور معنی فن تعریف وحسن منشی کا ہے کہ وسکی بزرگ قدرت کا قلم صفحہ دفتر رخسار محبوبان صبر کا لینے والا کا صورت کی نقش موں اور خاکی و خط موں دسطر ابرو حلقہ چشم کا نقش ہے "

<u>مندرجات منشات شاکر</u>

اس کے مندرجات کی مختصر فہرست یہ ہے :

(۱) دو خط جن میں خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ وہ خطوط جو میر محمد قاسم بردوان کے فوجدار اورنگ آباد کے میر محمد اشرف الدولہ اور ایران کے محمد شاہ طہماسپ قلی کو لکھے گئے ہیں۔ اس پر ۱۷۶۲ء درج ہے۔

(۲) ایسٹ انڈیا کمپنی کے احکامات کے جوابات محمد اسحاق محمد جان اور مرزا محمد مراد کی طرف سے۔ مورخہ ۱۷۶۲ء

(۳) متفرق خطوط (الف) مکتوب بنام مہاراجہ جگت رام رائے۔

ب ۔ مکتوب من جانب عبد السلام ۔

ج ۔ خطوط بنام امیر بیگ خاں فوجدار ہگلی، مہتاب رائے، مہاراجہ سروپ چند، خواجہ محمد واحد فخر التجار، راجہ موہن لال، راجہ رام نرائن، راجہ مانک چند۔

(۴) خطوط کرنل کلایو کی طرف سے خواجہ محمد اشرف کے نام۔ راجرڈ ریک گورنر کلکتہ کی طرف سے حضرت قبلہ گاہ کے نام۔ ارکاٹ فیکٹری کے گماشتہ خواجہ محمد مراد کی طرف سے اس کے چچا کے نام۔ مدراس کے مہام محمد ارحم کے خط کا جواب۔

دیگر مراسلات مسٹر جان کک کی طرف سے حسن الدین خاں کے نام ۔ مرزا نورالدین محمد کی طرف سے بیگم اورنگ آباد کے نام شش ہزاری منصب پر جاگیر

کی بازیافت کے لیے۔
مرزا حسین علی صوبے دار کی طرف سے اس کی بیگم کے نام
مسٹر میکڈوون کی طرف سے لالہ کنج بہاری کے نام
نواب الملک کی طرف سے رائے دلپت سنگھ کروڑی پرگنہ فتح سنگھ کے نام۔
کرنل کلایو کی طرف سے برج بلبھ کے نام۔ مورخہ ۲۴-۳۳-۱۷ء
مرزا رستم علی فوجدار مدناپور کی طرف سے راجہ ساہو کے نام۔
سیناکول کے مہاراجہ انند نرائن کی طرف سے راجہ چھتر سین کے نام۔
مسٹر رسل کی طرف سے محمد علی خاں صوبے دار کاٹ فیکٹری کے نام۔
ایک خط راجہ اندر نرائن زمیندار بہرام پور کے نام۔

(۵) اس مجموعے میں شاہ عالم بادشاہ کے فرامین بھی ہیں جو زیادہ تر ملازمت اور جاگیرات سے متعلق ہیں۔

(۶) متفرق تحریرات جن میں عرضیاں بھی شامل ہیں۔

(۷) سراج الدولہ نواب بنگال کے دو پروانے ایڈمرل چارلس واٹسن کے نام۔

(۸) شاہ عالم بادشاہ کے فرامین مورخہ ۱۷۶۱ء۔ ان میں میر خان فوجدار میر شکار کے نام بھی ایک فرمان ہے جس میں حکم ہے کہ باز شکرے چیلیں کبوتر طوطے اور بلبلیں فوراً بھیجی جائیں۔

(۹) متفرق عرضیاں پروانے وغیرہ۔

(۱۰) آخر میں چند تاریخی لطیفے اور قصے درج ہیں۔

یہ خطوط عصری اور تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کی حالت روز بروز گر رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندوستانی امرا، اور جاگیردار آپس میں لڑ رہے تھے اور ان کے سامنے مستقبل کا کوئی صحیح نقشہ نہیں تھا۔ اُردو کی مقبولیت بڑھ رہی تھی اور فارسی زوال پذیر تھی۔ ادبی اعتبار سے یہ خطوط زیادہ اہم نہیں ہیں۔ بعض جگہ مدعا اور مقصد کسی طرح دائرہ آگہی میں نہیں آتا۔

ان کی قدامت البتہ اہم ہے۔

یہ خطوط مکتوب نگاری کے اتالیق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی میں ایسے بے شمار مجموعے فارسی طرز پر مرتب کیے گئے ہیں۔

اس ابتدائی دور کی داستان نامکمل رہے گی اگر نوابان کرناٹک کے قلمی مجموعۂ مکاتیب کا خصوصی ذکر نہ کیا جائے۔ یہ خطوط ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے لیکن ان کی تاریخی اہمیت اور قدامت اس کی مقتضی ہے کہ ان کو جلد سے جلد شائع کیا جائے۔

نوابان کرناٹک کے خطوط (غیر مطبوعہ)

ارکاٹ کے نواب محمد علی کا ذکر کرناٹک کی لڑائیوں کے سلسلے میں اکثر جگہ آیا ہے۔ صلح نامۂ الہ آباد کی رو سے جو انگریزوں اور شاہ عالم کے مابین ہوا تھا لارڈ کلایو نے محمد علی کو خود مختاری دلوا دی تھی اور اس نے والاجاہ اوّل کا لقب اختیار کر لیا تھا[1]۔ لیکن سری رنگا پٹم پر قبضے کے بعد انگریزوں کو کرناٹک پر اعتبار نہیں رہا۔ اس موقع پر ان کو بہت سے ایسے خطوط ملے جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی اور اس کے بیٹے عمدۃ الامرا اور ٹیپو سلطان (۱۷۸۵ - ۱۸۰۲ء) میں گہرا ساز باز تھا۔ کرنل CLOSE اور مسٹر ویب WEBBE نے ان خطوں کو بغور دیکھا اور وہ لوگ بالآخر ۱۸ مئی ۱۸۰۱ء کو اس نتیجے پر پہنچے[2] کہ نوابین کرناٹک نے دشمنانِ کمپنی سے ساز باز کر کے انگریزوں کا اعتماد بالکل کھو دیا ہے اور اب وہ اس کے مستحق نہیں رہے کہ ان کو اپنا دوست یا حلیف سمجھا جائے۔ محمد علی والاجاہ اوّل ۸۰ برس کی عمر میں ۱۲ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عمدۃ الامرا والاجاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ جس کی تاریخ وفات ۱۵ جولائی ۱۸۰۹ء ہے۔ اس موقع پر انگریزوں نے عمدۃ الامرا کے بیٹے اور جانشین علی حسین سے کہا کہ تم سلطنت ہمارے سپرد کر دو اور اس کے عوض میں تمھیں ایک معقول وظیفہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملتا رہے گا اور اعزاز و اکرام

---

[1] تزک والاجاہی، ص ۳۰، مدراس یونی ورسٹی۔ نیز
CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA VOL V CHAPTER XXI

[2] WELLESLEY'S DESPATCHES II - 515

باقی رہے گا۔ اس غیرت مند نے اسے قبول نہ کیا۔ اس کے بعد یہی شرائط امیر الامرا کے بیٹے اور عمدۃ الامرا کے بھتیجے عظیم الدولہ بہادر کے سامنے پیش کی گئیں۔ اس نے یہ سب شرطیں مان لیں۔ اس طرح ۱۸۰۱ء میں کرناٹک کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا اور لارڈ ولزلی نے عظیم الدولہ اور اس کے وارثوں کے لیے سلطنت کی آمدنی کا ۱/۵ حصہ مقرر کر دیا۔[1]

عظیم الدولہ والاجاہ ثالث کا انتقال ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد اعظم جاہ مسند نشین ہوا۔ اس نے اپنے عزیز بھائی عظیم جاہ کو دیوان مقرر کیا۔ جس نے بڑی لیاقت اور ہوشیاری سے سلطنت کے کاموں کو انجام دیا۔ اعظم جاہ کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا غلام غوث خاں اعظم الامرا ۱۸۲۵ء میں والاجاہی مسند پر بیٹھا۔ اس کی عمر کم تھی اس لیے اس کے چچا عظیم جاہ کو مختار سلطنت کر دیا گیا جو ۱۸۴۳ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ کسی نے قطعۂ تاریخ کہا ہے :

انکہ نواب عظیمے و عظیم است بجاہ
کز نسیم خروش غنچہ دولت بشگفت
شد چو او نائب مختار سروش غیبی
لفظ مختار بسال سن مختاری گفت[2]

(۱۲۴۱ھ (۱۸۳۵ء))

مکاتیب اعظم جاہ (قلمی)

ہمارے پیش نظر قلمی مکتوبات کا جو مجموعہ ہے اس کا نام "مکاتیب اعظم جاہ" ہے اس میں شاہی خاندان سے متعلق مراسلات ہیں۔ اعظم جاہ کے بیٹے اعظم الامرا نے ایک تذکرہ صبح وطن لکھا ہے جو ۱۸۴۳ء میں مدراس سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی ابتدا میں نوابان کرناٹک کے متعلق لکھا ہے :

"مخفی نماند کہ ریاست الکہ کرناٹک از نواب والاجاہ جنت آرام گاہ بخلف الرشید شان نواب عمدۃ الامرا بہادر مرحوم سپس بہ برادر زادۂ شان نواب رحمت مآب

---

[1] Cambridge History of India Vol V PP. 361-362

[2] سوانحات ممتاز۔ محمد کریم مدراس یونی ورسٹی، ص ۲۰۲۔

عظیم الدولہ بہادر مرحوم کی خلف الرشید نواب امیر الامرا بہادر مرحوم بود من بود
بفرزند گرامی شان نواب رضوان نواب اعظم جاہ بہادر مرحوم و ایشان بیادگار
شان یعنی محرر این دوستی نامہ رسید" لہ

ہم نے اعظم الامرا کے تذکرہ صبح وطن اور محمد کریم کی سوانحات ممتاز حصۂ دوم کی مدد سے ایک شجرہ تیار کیا ہے جس سے گزشتہ اور آئندہ مطالب کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور مختلف نوابوں کا باہمی رشتہ واضح ہوجائے گا۔

انوار الدین خاں شہامت جنگ
۱۷۴۴ - ۱۷۴۹ء

- نواب شکوہ الملک اول نصیر الدولہ بہادر نصرت جنگ
  - نواب شکوہ الملک ثانی نصیر الدولہ دلیر جنگ
    - سعید النسا بیگم (نواب بیگم) —— زوجہ ——> عظیم الدولہ والاجاہ ثالث
- محمد علی خاں والاجاہ اول ۱۷۴۹ - ۱۷۹۵ء
  - امیر الامرا
  - عمدۃ الامرا والاجاہ ثانی ۱۷۹۵ - ۱۸۰۱ء
    - عظیم الدولہ والاجاہ ثالث ۱۸۰۱ - ۱۸۱۹ء
      - عظیم جاہ نائب مختار ۱۸۲۵ - ۴۲ء اور امیر ارکاٹ ۱۸۶۷ - ۷۴ء
      - اعظم جاہ والاجاہ رابع ۱۸۱۹ - ۱۸۲۵ء
        - غلام محمد غوث خاں بہادر اعظم الامرا والاجاہ ۱۸۲۵ - ۵۵ء

مکاتیب اعظم جاہ کا مخطوطہ فارسی میں ہے اور دو جلدوں میں ہے لیکن اس میں چند نادر اور گراں قدر اردو خطوط بھی ہیں۔ ہم جلد اول کا سب سے قدیم اردو خط نقل کرتے ہیں جو ۱۸۲۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے اس زمانے کے تہذیبی وظائف پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور امرا کی حیثیت صرف سیاسی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی ادارے

لہ تذکرہ صبح وطن از نواب والاجاہ امیر الہند اعظم الامرا مختار الملک سراج الدولہ محمد غوث خاں بہادر جنگ متخلص بہ اعظم، مطبوعہ دسمبر ۱۸۴۳ء (مدراس)

کی بھی تھی۔

نواب شکوہ الملک ثانی کے اُردو کے خطوط

ہمارا خیال ہے کہ یہ خط نواب شکوہ الملک ثانی نصیر الدولہ دلیر جنگ نے اپنی بیٹی نواب بیگم کے نام لکھا ہے جو عظیم الدولہ والاجاہ ثالث کی بیوہ تھی۔ محمد علی والاجاہ اوّل کی بیوی بھی نواب بیگم کہلاتی تھی لیکن اس کا انتقال ۱۷۶۶ء میں ہو چکا تھا۔ اور یہ خط ۱۸۲۲ء میں لکھا گیا ہے۔ زیر بحث مکتوب میں والاجاہ اوّل کی بیرونی کے مشاہیر کا ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ اس کی اولاد کا کوئی شخص اس کا لکھنے والا نہیں ہو سکتا۔ اس خط کی اندرونی شہادت نیز دوسروں کے خطوں کے القاب اور مطالب واضح کرتے ہیں کہ اس کا کاتب نواب شکوہ الملک ثانی ہے۔ ہم نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ تمام خطوں کو سامنے رکھ کر صرف ایک خط رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے۔

نمونے

نقل رقعہ ہندی نواب صاحب بنام نواب بیگم در باب استدعائے تصفیہ بحث عظیم جاہ رقوم بست و یکم ربیع الاول ۱۲۳۸ھ مقدسہ (۱۸۲۲ء)

"اگرچہ یہ میرے تئیں عادت ہے کہ ہر یک نصیحت کی بات جو اپنے باپ سے سُنا ہوں ہر یک اپنے بھانجے بھتیجے اور بچے جو میرے سات نزدیک قرابت رکھتے ہیں ہر یک موقع پر اونوں سے ظاہر کرنا۔ چنانچہ تم کو بھی یاد ہوگا کہ ایک روز کوئی سالگرہ کی رسم میں نواب عظیم الدولہ بہادر مرحوم مغفور میرے تئیں اپنے ہمراہ زنانہ میں لے آئے۔ بعد ادائے رسم کے نواب اعظم جاہ بہادر و نواب عظیم جاہ بہادر تسلیم کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر تسلیم کرنے لگے تب میں نے کہا کہ یک روز تمھارے بڑھ دادا[1] کو میں تسلیم پیچھے ہٹ کر کیا۔ تب مجھے فرمائے کہ ہماری صحبت میں رہ کر اتنا گدھا (کذا) ہوا ہے۔ ابی تک نہیں معلوم کیا کہ پیچھے ہٹ کر تسلیم کرنا عیب ہے۔ ابکہی جا کھڑے رہ کر تسلیم کر تب سے میں پیچھے ہٹ کر تسلیم نیں کیا تمہے بھی تسلیم پیچھے ہٹ کر نکرو۔

---

[1] مراد محمد علی والاجاہ اوّل (متوفی ۱۷۹۵ء)۔

تب نواب عظیم الدولہ بہادر مرحوم و مغفور[۱] یہ بات سن کر خوش ہوئے اور کہے کہ دادا[۲] کی ایسی باتاں[۳] کہا کرو بہتر ہے۔ اس بات کو بھی ایسا ہی ماجرا گزرا کہ نواب اعظم جاہ بہادر[۴] بائیں والان زہ کے نیچے تشریف رکھے تھے اور نواب عظیم جاہ بہادر بڑے بھائی کے بالادست اور زہ کے اوپر بیٹھے تھے۔ ان کا ایسا بیٹھنا مجھے بے موقع معلوم ہوا۔ اس وقت مجھے کہنا مناسب نیں لگا کہ تم وہاں سے اُٹھ کر ایدھر آ بیٹھو۔ اس واسطے میں اپنے پر جو گزرا سو قصہ بیان کیا کہ ایک روز میں نواب صاحب[۵] کے حضور نواب عمدۃ الامرا بہادر مرحوم[۶] کے سیدھے ہات طرف بیٹھا تھا۔ نواب صاحب مجھے فرمائے اتنا بڑا ہوا ہے اتنا نیں سمجھا کہ بڑے بھائی کے بالادست نا بیٹھنا۔ اس واسطے میں اُٹھ کر بادیں طرف بیٹھا۔ اتنا کہنے سے نواب عظیم جاہ بہادر ناخوش ہوئے۔ البتہ تماری[۷] خدمت میں شکایت کئے ہوں گے اور تم کو بھی بُرا لگا ہوگا۔ اب قائل ہوں کہ نکہنا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ بوڑھا اور بالا برابر ہے جیسا کہ بالے کو سمجھ اور دریافت نیں ہے ویسا ہی بوڑھے کو بھی سمجھ نیں رہتی کہ ساٹی بنہاٹی مشہور ہے۔ بفضلہ میں تو ستر برس کا ہوں۔ اب کہاں بد میرے میں باقی۔ غرض میں اپنے قصور اور سہو پر قائل ہوں۔ تم بھی عفو کرو اور نواب عظیم جاہ بہادر کو بھی میرے سے راضی اور خوش کرد اور زیادہ کیا لکھوں[۹]۔"

دوسرا رقعہ بھی نواب شکوہ الملک ثانی کا ہے۔ اس کا خطاب اور آپ بیتی[۸] کا ٹکڑا

---

۱ وفات ۱۸۱۹ء۔ ۲ عظیم الدولہ کا دادا یعنی والاجاہ اوّل۔ ۳ قدیم دکنی لٹریچر میں یہ جمع عام ہے۔ ۴ اس وقت اعظم جاہ تخت نشین تھا اور وہ عظیم جاہ سے بڑا تھا۔

۵ محمد علی خاں والاجاہ اوّل۔ ۶ والاجاہ ثانی ۱۷۹۵-۱۸۰۱ء

۷ عظیم جاہ نے اپنی ماں نواب بیگم سے شکایت کی ہوگی۔

۸ شکوہ الملک ثانی کی تاریخ ولادت ۱۷۵۲ء ہے۔

۹ مکاتیب نواب اعظم جاہ (قلمی) جلد اول، ص ۳۷ - ۳۹۔

ہمارے مذکورہ صدر نتائج کو تقویت پہنچاتے ہیں :

"نورچشمی راحت جاں سعادت مند دوجہان گل سرسبد دودمان شرف بخش خاندان نواب بیگم سلمہا اللہ تعالی۔

آپ نے صبح کو میرے آدمی کی زبانی پیام بھجوائے کہ ہم سگے بچے ہمارے تئیں کبھی عیدی اس بوڑھے نے نہیں دیا۔ اے سوتیلے بچے انہہ کو عیدی دیا۔ بس ہمارے سے انہہ پر زیادہ پیار ہے۔ اماں جان البتہ تمہاری بہ نسبت انہہ بچوں پر زیادہ پیار ہوا چاہیئے کس لئے کہ اے بچے میرے پر احسان کئے ہیں کہ میرے تئیں پڑھہ دادا بنائے ہیں اور تم فقط میرے بچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے میں مع اولاد و آل ساتھ اس خوبی و اخلاق کے بہ ترقیات عمر و دولت ابدالآباد سلامت رکھے۔ اور خوش و خرم برکت سے اقطاب و اوتاد سے پان دان اور پچاس روپے تماری خدمت میں بھجوایا ہوں۔ پاندان آپ بیٹی کو۔ اور پچاس روپے عیدی آپ کی نواسی کو عنایت فرمایا۔ زیادہ عمر و دولت زیادہ ہووے۔[1] مرقومہ شوال ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء)

(نقل رقعہ نواب صاحب قبلہ بنام نواب بیگم درجواب پیام مرسلہ شان)"

نواب بیگم کے دو بیٹے اعظم جاہ اور عظیم جاہ اور ایک بیٹی عظیم النسا بیگم تھی جو عام طور پر صاحبزادی بیگم کہلاتی تھی۔ اس کی شادی نجم الملک عبدالصمد خاں بہادر سے ہوئی۔ اس کے ایک لڑکی ہوئی جس کا نام احمد النسا بیگم عرف صاحبزادی نورالبصر رکھا گیا۔ شکوہ الملک ثانی نے اسی "نواسی" کا ذکر کیا ہے۔ نورالبصر کو اس کی نانی نواب بیگم نے پالا تھا اور وہ اس سے بڑی محبت کرتی تھی[2]

ذیل میں ایک اور رقعہ کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ یہ ۱۸۱۶ء کا لکھا ہوا ہے اور شکوہ الملک ثانی نے اپنی بیٹی نواب بیگم کو لکھا ہے :

"نورچشمی راحت جاں سعادت مند دوجہاں گل سرسبد دودمان شرف بخش

---

[1] مکاتیب نواب اعظم جاہ (قلمی) جلد اول، ص ۱۴۱۔ ۳۴۲ [2] سوانحات ممتاز، ج ۲، ص ۷۰ (مدراس یونی ورسٹی)

E
7

خاندان نواب بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ۔ اس دعا کا عمل میرے تئیں حضرت چچا صاحب قبلہ سے جو عنایت ہوا اور دعا کو دو کاغذ کے اوپر لکھوا کر بھیجا ہوں۔ ایک تمہارے واسطے اور ایک نواب عظیم جاہ کے واسطے۔ با اوّل و آخر درود صبح و شام کو ایک ایک دفعہ پھڑنا۔ زیادہ عمر و دولت زیادہ ہووے۔"[1]

سنہ ۱۸۲۶ء ہی کا ایک اور رقعہ ملاحظہ ہو :

"نورچشمی راحت جاں سعادت مند دو جہاں گل سرسبد دودمان شرف بخش خانداں نواب بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ۔

آپ نے اپنی چھوٹی پوتی[2] کی کھانسی کا احوال جو کہلا بھیجے اس واسطے میرے تجربہ میں جو دوا آئی اور آتی ہے لکھ بھیجا ہوں کہ اگر کھانسی بہ سبب سردی کے ہے تو ایک گچی یا آدھی گچی بہار (کذا۔ مراد بھر) دوائی برش ( ) شاہ زیرہ و میٹھی لکڑی کہ ہر ایک ادا (کذا) ماشہ ہوئے۔ دونوں کو ملا کے پیس کر شیرہ چھان لے کے اد کو لے اس بدرقہ سے پلا دینا۔ تین چہار وقت میں بفضلہ صحت حاصل ہوتی ہے میرے تئیں۔ بچوں کو بھی اکثر اتفاق اسی کے کھلانے کا ہوتا ہے۔ آپ اپنے حکما سے دریافت فرمانا اگر اونہوں (کذا) مناسب سمجھتے ہیں تو بفضلہ کھلوانا۔ زیادہ عمر و دولت زیادہ ہووے۔[3]"

اس مجموعہ میں جتنے خطوط ہیں ان کے القاب مختصر ہیں۔ ایک خط صاحبزادے عالی قدر نے نواب بیگم کو لکھا ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

"آداب تسلیمات غلامی کے بجالا کر عرض کرتا ہے کہ غلام کو تشفی کے ارشادات جو کچھ کہ صادر ہوئے غلام سرفراز ہوا۔[4]"

نواب شکوہ الملک مقررہ القاب لکھتے ہیں لیکن خط کے درمیان میں "اماں جان" سے

---

[1] مکاتیب نواب اعظم جاہ (قلمی)، ج اوّل، ص ۳۸۵۔ [2] یہ اشارہ امۃ الولی ولی النسا بیگم کی طرف ہے۔ عظیم جاہ کے زمانۂ حکومت میں یعنی ۱۸۲۳ء میں شفیع النسا بیگم سے شادی کی تھی۔ امۃ الولی اس کی بیٹی تھی۔

[3] مکاتیب اعظم جاہ، ج ۱، ص ۳۸۸ (قلمی)۔ [4] ایضاً، ص ۴۰۳۔

پکارتے ہیں بعض رقعوں میں یہ لفظ دو دو جگہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

"نورچشمی راحت جاں .... سلمہا اللہ تعالیٰ اماں جان قدیم سے میرا دستور یہ ہے کہ کسی ایک قرض واجبی میرے ذمہ پر ہووے اس کے ادا کرنے میں ہرگز قصور نہیں کرتا ہوں ..... اماں جان یہ غلام نبی خان فرزند بدر السلام خاں مرحوم کے اندو میں ناحق و ناروا میرے تئیں حیران کر رہے ہیں کہ ہمیشہ اپنے باپ کا قرض دینا ہی کر کے عرضیاں اس کے تقاضے کی لکھ رہے ہیں اور ہر دفعہ میں یک تقریر تازہ لکھتے ہیں۔"[1]

ان خطوں کی اہمیت

یہ خطوط صاف اور کھلی ہوئی فضا میں لکھے گئے ہیں ان میں صبح ازل کی صباحتوں کا لطف ہے اور نسیم صبح کی مہربانیوں کا کیف۔ ان میں وہ صنع طرازیاں نہیں ہیں جو شمالی ہند کی انشا میں آگئی تھیں۔ اسی لیے ان کا لب و لہجہ اردو کے ابتدائی رجحانات سے قریب ہے۔ زبان و بیان کی وہ قدامت اور کہنگی جس میں خلوص کا عنصر شامل ہو اتنی ناگوار نہیں ہوتی جتنی انشا و ادب کی وہ رنگینی جو خلوص سے عاری ہو۔

(ج) شمالی ہندوستان میں اُردو کی ترقی

سلطنتِ مغلیہ کے قائم ہونے سے پہلے دہلی میں ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا۔ زمانے کی ہوائیں اس کے بیج دکن تک اڑا لے گئی تھیں اور وہاں انھوں نے جڑ پکڑ لی تھی۔ یہ دراصل شورسینی اپ بھرنش کا ورثہ تھا۔ جو دہلی کی زبان کو ایک نئی شکل میں ڈھال رہا تھا۔

اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں ۵۹-۱۶۲۷ء

اکبر نے دہلی کو چھوڑ کر آگرہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کا لسانی اثر یہ ہوا کہ دہلوی زبان کو نقصان پہنچا اور آگرہ متھرا کی زبان یعنی برج بھاشا ترقی کرنے لگی۔ جہانگیر کے زمانے میں برج بھاشا کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ وہ شمالی ہندوستان کی سب سے اہم ادبی زبان بن گئی اور مغلوں

[1] مکاتیب اعظم جاہ، ص ۳۰۴-۳۰۵۔

کے محلوں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔[1] شاہ جہاں برج بھاشا کے ماحول میں پلا بڑھا تھا۔ اور اس کی ماں راجپوت تھی۔ جہانگیر کو اس کی حسرت رہی کہ وہ ترکی پڑھ لے لیکن وہ اس زبان سے نا آشنا ہی رہا۔ شاہ جہاں نے آگرہ (اکبر آباد) کو چھوڑ کر پھر دہلی (شاہ جہاں آباد) کو دار السلطنت بنایا اور اس طرح دہلوی زبان (کھڑی بولی) کو دوبارہ ترقی کرنے کا موقع ملا۔ دربار کے ساتھ برج بھاشا کی روایات بھی دہلی آئیں اور کھڑی بولی کے ساتھ آمیزش اور فارسی کے ساتھ پیوند نے اُردو کی ترویج میں مدد دی اور اس نے ترقی کر کے اُردوئے معلیٰ کا لقب اختیار کر لیا۔ اُردو کے پہلے غزل گو پنڈت چندر بھان برہمن[2] (المتوفی ۱۰۷۳ھ / ۱۶۶۲ء) نے بھی اسی زمانے میں اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھلائے۔ اسی عہد میں اُردو زبان بات چیت سے گزر کر منثورات اور منظومات میں بھی بیش از بیش استعمال ہونے لگی۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ بھی ضرورت کے وقت اس میں خط و کتابت سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔

شاہ جہاں کا شقہ ہندی

جب شجاع اور اورنگزیب برسرِ پیکار تھے تو شاہ جہاں (۱۶۲۷-۵۹ء) نے ایک شقہ شجاع کو لکھا۔ یہ کسی طرح اورنگزیب کے ہاتھ پڑ گیا۔ اسی بنا پر وہ بادشاہ کو ایک عرضداشت میں لکھتا ہے جو دستور العمل آگہی میں موجود ہے۔

"آں فرمانِ عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است[3]"

اس سے کم از کم اُردو کی روز افزوں مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ عالمگیر کے رقعات میں بھی بہت سے الفاظ اُردو کے پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بازار سے لے کر شاہی محلات تک لوگ اُردو بولتے اور لکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ شاہ جہاں

---

[1] تاریخ ہمایونی میں لکھا ہے کہ جب اکبر نے سلیم (جہانگیر) کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر اور سلیم دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلے تو راجہ نے کہا "ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری۔ ہم باندگلام ہے" اکبر نے فوراً جواب دیا "تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی۔ تم صاحب سردار ہے"۔ (بحوالہ تاریخ ادب فارسی در عہدِ سلاطین مغلیہ، ج سوم مرتبہ محمد عبد الغنی۔ نیز داستانِ تاریخ اُردو، ص ۲۵)۔ [2] شاہ جہاں اسے "ہندوئے فارسی داں" کہا کرتا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عمل صالح۔ مراۃ الخیال اور ہماری زبان دہلی، ج ۴، نمبر ۱، ص ۴۔ [3] دستور العمل آگہی۔ یہ بھی واضح رہے کہ اُردو کے واسطے ہندی کا لفظ امیر خسرو کے زمانے سے غالب کے زمانے تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ دیوانِ امیر خسرو۔ سیر الاولیا، و خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد۔

کا یہ خط دستیاب نہیں ہوتا لیکن صغیر بلگرامی نے اسے دیکھا تھا۔ جلوۂ خضر میں لکھا ہے :

"شاہ جہاں کی ایک تحریر اُردو داراشکوہ کے نام دیکھی ہے جو اس وقت یاد نہیں"[1]

اورنگ زیب

اورنگ زیب کے زمانے میں (۱۶۵۹ء-۱۷۰۷ء) اُردو نے ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ عبدالواسع ہانسوی نے اُردو ہندی الفاظ کا ایک لغت غرائب اللغات کے نام سے مدون کیا اور فطرت، بیدل، قبول وغیرہ شعرائے فارسی نے اُردو میں شعر کہنے شروع کیے۔

میر جعفر کی پیوند کاریاں برزخی دور کی ترجمان ہیں

اسی زمانے میں میر جعفر[2] (۱۶۵۹ء-۱۷۱۳ء) نے اُردو کے پیوند سے فارسی نثر میں گلکاریاں کیں۔ یہ نہ فارسی ہے نہ اُردو لیکن اس برزخی دور کی ترجمان ضرور ہے۔ زٹل کے یہاں نثر کے مختلف اقسام موجود ہیں اور بعض جگہ ہزلیات میں مہذب ظرافت بھی ہے۔ اس نے رقعات نثر لکھے ہیں جن میں تلازمے اور کی شوخیوں کا وہ عالم ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عدالتی تحریریں بھی خاص رنگ میں ہیں[3]۔ گفتگو نامہ میں اُردو کے محاورات اور ضرب الامثال کا محل نہایت خوبی کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ شرارت نامہ کو شاہی یادداشتوں اور تزک کے طور پر مرتب کیا ہے۔ میر جعفر نے منظوم رقعے بھی لکھے ہیں جو اس کی کلیات میں موجود ہیں لیکن یہ سب فرضی و تمثیلی ہیں نہ کہ اصلی و حقیقی۔ اس نے فارسی کی زمین میں اُردو کا قلم لگایا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں (رقعہ در شکوہ برسات)۔

"التماس فقیر حقیر.... خستہ حال.... پرکندہ بال و جگر کھوچن بے زبان و سخت زبوں یعنی میر جعفر چرخ چوں کرب کروں (کذا) آنکہ نواب صاحب

---

[1] جلوۂ خضر، ج اوّل، ص ۵۵۔ صغیر کے یہاں شجاع نہیں داراشکوہ ہے۔

[2] قاموس المشاہیر (جلد اول، ص ۱۷۱) میں لکھا ہے کہ جعفر نارنول کے سید تھے۔ شاہزادہ اعظم بسر عالم گیر کی ملازمت میں داخل تھے۔ ریختہ میں ایک شاہ نامے کے مصنف ہیں۔ شاہ فرخ سیر کی تخت نشینی کے موقع پر ایک ہجو آمیز نظم لکھنے کی وجہ سے بحکم بادشاہ مذکور ۱۷۱۳ء میں قتل کیے گئے۔

[3] سالنامہ یادگار ۱۹۳۴ء اردو شمالی ہند میں از درد کاکوری نیز یو۔پی میں اُردو مطبوعہ رسالہ کنول آگرہ (از انتظام اللہ شہابی، ص ۱۸) [4] تذکرۂ خندۂ گل (آسی) ص ۶۳۔

پناہ اودہ ماندگان سلامت چون گھڑ گھڑاہٹ الرعد فی العام و کڑکڑاہٹ البرق فی البھرام بر سراست وہنگام گھٹا گھور صبح وشام شور دارد و ..... آوان لرزہ العمارات وگر پڑنہ الکھنڈرات وٹوٹ اچھپر والبوچھار فی النظراست .... لہذا ملتمس دارد کہ امروز نرت بھرت دریں موسم بوند باند موسلدھار بھیگا بھاگ وتواتر اجھڑ والبوچھار فیض صاحب تک شامل ومددگار بندہ شود بندہ کود پھاند بلی پار رود کشتی جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است ڈبکون ڈبکوں می کند۔ ازیک توجہ پار کن۔ دوہرہ

یہ ندیا ادھک گہری تھاہ نہیں اس بیچ سچا
ناوں نی کا ٹوٹ گیا لیویں کھینچ"[۱]

محمد شاہ (۴۸-۱۹۷۱ء) کے عہد میں اُردو نے اچھی خاصی ترقی کرلی تھی۔ اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بڑی وسعت کے ساتھ شروع ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں فضل علی فضلی نے دہ مجلس یا کربل کتھا لکھی جو ملاحسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس کا دیباچہ تذکرہ شعرائے ہند میں منقول ہے اور اس کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اُردو اب عوام کی ضروریات میں شامل ہوگئی تھی۔

"صد حیف وصد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سے بے سمجھوں کو سمجھا کر رلاوے۔"

فضلی نے یہ ترجمہ خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے فائدے کے لیے کیا تھا۔ اس زمانے میں اُردو روز بروز ترقی کر رہی تھی اور اب اس میں سخن آرائی ننگ و عار نہیں رہی تھی۔

سودا

جن لوگوں نے اُردو کو ادبی زبان بنایا اُن میں مرزا رفیع سودا کا نام نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خود کہتے ہیں:

---

[۱] کلیاتِ جعفر زٹلی، ص ۴

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا
پسندِ خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو کوئی کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے درِ عدن مجھ سے

انھوں نے اپنے دیوان مرتبہ کا دیباچہ اُردو میں لکھا ہے جس کی عبارت اس زمانے کے فارسی انداز کے مطابق پیچ دار ہے لیکن سوداؔ کے زمانے میں نثر اُردو کا معیار قائم نہیں ہوا تھا۔ نظم کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے کی جو نثر ملتی ہے اس میں فارسی اسلوب کار فرما ہے۔ اس کے دیباچے میں بھی جو فارسیت نمایاں ہے وہ دراصل زمانے کا اثر ہے۔ سودا کی طبیعت کا نتیجہ نہیں ہے۔ انھوں نے فارسی کو ہمیشہ کم التفاتی سے دیکھا۔ خود فرماتے ہیں :

"زبانِ فرس پہ کچھ منحصر سخن تو نہیں "

ایک اور جگہ لکھتے ہیں : " احقر بزبان امور فارسی چنداں ربطے ندارد "۔ ڈاکٹر سکینہ کا خیال ہے کہ مرزا رفیع سودا نے دو خط بھی اُردو میں میر تقی میرؔ کے نام لکھے تھے[1]۔ ایک نظم میں اور ایک نثر میں۔ افسوس ہے کہ یہ کلیات میں موجود نہیں[2]۔ شیخ چاند نے سودا پر بہت محققانہ کتاب لکھی ہے لیکن انھیں بھی ان خطوں کا پتہ نہ چل سکا[3]۔

سوداؔ کی تصانیفِ نثر کے بعد مثنوی شعلۂ عشق کا خلاصہ محمد حسین کلیم کا ترجمہ خصوص الحکم شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن پاک (۱۷۹۰ء) اور عطا حسین کی نوطرزِ مرصع (۱۷۹۸ء) قابلِ ذکر ہیں۔

ابھی انشا کا آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ لوگ نو عروس نظم ہی کے خط و خال پر مٹے ہوئے تھے۔ اسی لیے جو کچھ ترقی کے لیے کوششیں کی گئیں وہ نظم میں۔ نثر کے حال پر کسی کو خاص توجہ نہیں ہوئی۔ بقول مولف تاریخِ ادب اُردو نثر بیچاری ایک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ یہ موقع فورٹ ولیم کالج نے بہم پہنچایا۔ جو ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو انگریزوں کو اُردو پڑھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

---

[1] تاریخ ادب اُردو (عسکری) ص ۱۱۱۔ طبع ثانی۔ [2] کلیات سوداؔ میں جو منظوم خط ہے وہ میرؔ کے نام نہیں۔
[3] سودا۔ شیخ چاند، ص ۹۶۔ نیز ص ۲۳۸۔

"ادھر یہ جو چنچال لڑکا (یعنی اُردو) شعرا کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیاں سے سب کے دل بہلاتا رہا۔ ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں میر شیر علی افسوس نے باغ اُردو اور ۱۸۰۵ء میں آرائش محفل لکھی اور میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء میں باغ و بہار آراستہ کیا۔"

<u>فورٹ ولیم کالج</u>

فورٹ ولیم کالج صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک لسانی تحریک بھی تھا۔ اس نے اس فرسودہ اور پیچیدہ طرز کو ختم کر دیا جس میں عالم تحریر کا مدعا ہی عنقا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کالج کے مصنفین نے آسان نثر کو رواج دیا اور سلامتی پسند طبیعتوں پر نہایت اچھا اثر ڈالا۔ ۱۸۳۲ء میں اُردو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لی گئی اور ۱۸۳۵ء میں پریس کو آزادی بھی مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو انشا کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ اخبارات میں مراسلات کے مستقل عنوانات قائم ہو گئے اور یورو پین حضرات بھی اُردو میں خطوط لکھنے لگے۔

<u>مستشرقین کے اُردو خطوط: گارسن دتاسی، ڈیوڈ آکٹرلونی</u>

تذکرہ یورو پین شعرائے اُردو کے مولف کا بیان ہے کہ "مشہور مستشرق گارسن دتاسی بڑے فخر کے ساتھ اُردو میں خط و کتابت کرتا تھا۔ اس کے اُردو خطوط پیرس کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہیں[۱]۔" اسی طرح ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا بیان ہے کہ ڈیوڈ آکٹرلونی ڈائس سومبر (DAVID OCHTARLONEY DYCE SOMBRE (1808-1851)) کو اُردو انشا سے بڑی محبت تھی اور وہ اپنے احباب سے اُردو میں خطوط لکھنے کی فرمائش کرتا تھا[۲]۔

---

[۱] تذکرہ یورو پین شعرائے اُردو از محمد سردار علی، ص ۷، (حیدرآباد)۔ افسوس ہے ان خطوں کی نقلیں باوجود کوششوں کے ہمیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔

[۲] INDO-EUROPEAN POETS OF URDU & PERSIAN BY Dr. R. B. Saxena PP. 92-93

اُردو میں منظوم خطوط

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں اُردو انشا نظم کی گرفت سے آزاد نہ ہوئی تھی اور اس کا ایک علیحدہ اسلوب قائم نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے سوداؔ[1]، مرزا جان تپشؔ دہلوی[2] اور انشاؔ[3] نے منظوم خطوط لکھے ہیں جن کا سلسلہ تسنیم لکھنوی، مضطر خیر آبادی اور ڈاکٹر اقبال مرحوم تک جاری رہتا ہے لیکن سرورؔ، بے خبرؔ اور غالبؔ سے پہلے اُردو مکتوبات کے جو نثری نمونے ملتے ہیں وہ تاریخ کی اہم کڑیاں ہیں اور وہ کسی طرح بھی قلم انداز نہیں کی جا سکتیں۔

مولانا احسن کا نظریہ

ان مضبوط تاریخی شہادتوں اور مثالوں کی روشنی میں مولانا احسن مارہروی کے اس بیان سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے کہ" اردو زبان میں خط نویسی کی ابتدا مرزا غالبؔ نے کی ہے[4]۔ سرورؔ اور مرزا غالبؔ سے بہت پہلے تپشؔ دہلوی، راسخؔ عظیم آبادی اور یاسؔ آروی نے اُردو میں خطوط لکھے ہیں۔

مرزا جان تپشؔ

مرزا جان تپشؔ کے متعلق نساخؔ نے سخن شعرا میں لکھا ہے "تپش یا طپش تخلص مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان ولد مرزا یوسف بیگ، سید جلال الدین بخاری کی اولاد میں تھے۔ مولد و مسکن ان کا دلی، وہاں سے آکر لکھنؤ میں مرزا جہاں دار شاہ کی رفاقت میں تھے۔ بعد ازاں بنگالہ میں آکر مدت تک شہر ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ کی رفاقت میں رہے۔ سنسکرت میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ کسب سخن خواجہ میر دردؔ سے کیا تھا۔ شعر اچھا کہتے تھے[5]"۔

ذیل میں مرزا جان تپشؔ (سال وفات غالباً ۱۲۳۰ھ-۱۸۱۴ء) کا ایک خط درج کیا جاتا ہے جو ہمیں قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کی عنایت سے حاصل ہوا ہے اور انھوں نے اسے دیوانِ راسخؔ کے ایک پھٹے ہوئے قلمی نسخے سے نقل کیا ہے۔

۱؎ کلیاتِ سوداؔ مطبوعہ نول کشور۔ ۲؎ کلیاتِ تپشؔ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ۔ ایک منظوم عرضی بارلو صاحب کے نام ہے۔ دوسرا منظوم خط سعادت یار خاں رنگینؔ کے نام ہے۔ ۳؎ ملاحظہ ہو نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۵۱ء انشا۔ ۴؎ تاریخ نثر اُردو (نمونۂ منثورات) از احسن مارہروی، ص ۳۰-۵۴۔
۵؎ سخن شعرا۔ نساخؔ۔

رقیمۂ مرزا جان متخلص بہ تپش متضمن بر طلب جناب منشی کفیل الدین[1] صاحب و جناب ممدوح در شدت بیماری بودند۔ فقیر حسب املائے ممدوح بہ حکم آں کہ المامور مجبور بہ تحریر جواب آں رقعہ جسارت نمودہ رقعہ مرزائے موصوف این است۔
" ہوالودود تعالیٰ شانہ شفاکم اللہ تعالیٰ شوق دیدن ہا از حد گزشت و تعلق خاطر متحیر بہ وحشت گشت۔ حیرانم این حال تا چند نمک پاشی سینہ فگارم خواہد بود و طول انتظار تا کے بر آشفتہ دماغم (کذا) خواہد افزود۔ بس معمول فقیر کے تکئے میں تشریف لائیے۔ کیا کہیں اگر تقیدات دنیائے دوں نہ رہتے تو ہم آپ اکثر مخل اوقات شریف وہیں ہوا کرتے۔ بہر کیف یہ کہدیجئے کہ کل کے مسہل میں مزاج کیسا رہا اور اس کا لینا تجویز سے کسی حاذق کے اتفاق ہوا۔ اغلب کہ جناب مستطاب موحد[2] مجب الاحیا معین الضعفا نے ارشاد فرمایا ہوگا۔ بس اس قیاس پر یقین ہوئے۔ انشا اللہ تعالیٰ دی شب در مجلس اکھاڑہ کہ جو کے (کذا) صاحب عالی قدر اخلاص پرور منشی صاحب الفت و عنایت فرجام متخلص بہ آرام و شیخ صاحب ستودہ مناقب، مونس دل ہائے پُرشور و شین شیخ غلام حسین مدھم اللہ تعالیٰ۔ بہ حضور صفوت معمور مہاراج فتوحات مزاج دام اقبالہ لذت یاب مجلس نشاط بودند زماں زماں متذکر ذکر خیر گامی و نفس نفس یاد آور شوخ طبعان سامی بودند فقیر حقیر ہر ساعت بہ ایں عبارت لطیف الاشارت متلذذ می گردید بہ اتفاق اخوی مرزا ابوالقاسم خاں زاد اللہ منقۂ بہ تصور لقائے شریف می طپید۔ خوب یہ تو سب کچھ ہوا سو ہوا لیکن خوبلے (کذا)۔ (غالباً چوبلے)۔ صاحب کے کاشانے مہماں خانے میں جو کل پرسوں تک شبستانِ

---

[1] کفیل الدین باشندہ کلکتہ۔ ان کا ذکر دیوانِ راسخ میں ہے۔ راسخ مدتوں کلکتہ میں رہے تھے اور تپش بھی وہیں مقیم تھے۔ [2] موحد تخلص قاضی سراج الدین علی خاں۔ طبیب بھی تھے یا نہیں اس کا علم نہیں۔ راسخ کے دیوان میں ان کا ذکر ہے۔

عیش و طرب در پیش ہے اس میں ہر طرح افتاں و خیزاں خرام بروش صبا خواہ بزور
پائے موج ہوا اپنے تئیں پہنچائے گا اور منتظروں کو زیادہ وحشت نہ دلائے گا
تا لطف صحبت جوں کا توں حاصل ہوئے اور اشکِ حسرت دستِ اُمید
نہ دھوئے تم جانو تمہارا کام باقی والسلام"

اس خط کی اہمیت صرف اس کی قدامت میں ہے۔ اُردو انشا ابھی فارسی کے شکنجے سے نہیں نکلی ہے اور اس میں اسلوبی نفاست پیدا نہیں ہوسکی ہے۔

راسخ عظیم آبادی، متوفی ۱۸۲۲ء

راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۳۸ھ - ۱۸۲۲ء) کا جواب ملاحظہ ہو:

"گرامی نامہ کہ حرف حرفش در حیرت بر رخ اندیشہ می کشود مضمونش رنج افزائے من دردمند سقیم گردید جناب سامی نے لکھا ہے کہ جس طرح آپ جانیے بستر کی لت (کذا) اپنے تئیں چاق چوبند کرکے اٹھائیے اور بہ دستور معمول فقیر کے تکیے میں تشریف لائیے۔ بعد اس کے مرقوم قلم سحر رقم یوں ہے کہ کیا کہیں اگر تقیدات دنیائے دوں نہ رہتے تو ہم آپ آکر مخل اوقات شریف وہیں ہوا کرتے۔ فہم قاصر مجھ نافہم کا سمجھنے میں اس عبارت کے قاصر ہے۔ آپ اپنے تئیں فقیر اور دولت خانے کو اپنے تکیا قرار دے کر پابندی تقیدات دنیاے دوں کی ظاہر کی۔ فقیر آزادی شعار دام تقیدات دنیائے میں کب آتے ہیں۔ طریق وحدت کے سالک پردہ تعین کا ہر لحظہ درمیان سے اٹھاتے ہیں ..... "

فارسی اور اُردو کی یہ پیوندکاری جو تپش اور راسخ کے خطوں میں ملتی ہے اس کا سلسلہ کم و بیش سرسید تک قائم رہا ہے۔ موخرالذکر کے ابتدائی خطوں میں بھی فارسی کے جملے کے جملے ہیں۔

یاس آروی متوفی ۱۸۴۵ء

انور علی یاس آروی (متوفی ۱۲۶۲ھ - ۱۸۴۵ء) شاگرد راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۳۸ھ - ۱۸۲۲ء) کا بھی ایک اُردو خط ملتا ہے جو نسبتاً بہت صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس کی

تاریخِ کتابت معلوم نہیں لیکن یاس کا سنہ وفات صحیح معلوم ہے اس لیے یہ خط صریحاً ۱۸۲۲ء سے پہلے کا ہے ــــ بنام رائے کشن داس

"رائے صاحب۔ معدن اخلاق سلامت۔ اگر مفارقت کا قلق کہیے تو ہرگز سرانجام نہیں ہو سکتا ہے ناچار اس سے دست بردار ہو کر عرض کرتا ہوں کہ وقت تحریر تک زندہ ہوں۔ اور ایسے جینے سے شرمندہ ــ

ماندہ ام ازیاد دور و زندہ ام　　زیں گنہ تا زندہ ام شرمندہ ام

بہر صورت آپ کی جان و مال کو دعا کرتا ہوں۔ خدا جلد آپ کو پھر یہاں لائے اور آپ کا جمال ہم کو دکھائے۔ یہ دعا بھی کرتا ہوں اور اپنے نصیب سے بھی ڈرتا ہوں۔

ہے جی میں اس کی کاکل پُرخم کو دیکھئے　　اس آرزو کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

زیادہ کیا لکھوں۔ سیوان کے جواب میں بہت توقف ہوا۔ آیا ہو تو جلد عنایت کیجئے گا۔ انور علی" [1]

یہ خط بقول مختار الدین آرزو جن سے قاضی محمد سعید کو ملا' یاس آروی کے مجموعہ خطوط فارسی میں شامل ہے جو خانقاہ پھلواری کے کتب خانہ میں ہے۔

تاثیر عظیم آبادی متوفی ۱۸۵۹ء

شاد عظیم آبادی کے پوتے ارشاد احمد نے "ندیم گیا" مورخہ جنوری ۱۹۴۲ء میں ایک مضمون نواب جلال الدین حسین خاں تاثیر (عظیم آبادی) کے عنوان سے لکھا تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ تاثیر (متوفی ۱۲۷۶ھ - ۱۸۵۹ء) نے بقول خیال عظیم آبادی غالب سے پہلے اُردو میں خط و کتابت شروع کر دی تھی[2] ممکن ہو کہ ایسا ہو لیکن مقالہ نگار نے اس دعوے کے ثبوت میں جو تحریریں پیش کی ہیں وہ کافی نہیں ہیں۔ ایک جون ۱۸۵۳ء کی ہے جو خط نہیں معلوم ہوتی۔ دوسری ناتمام اور مختصر ہے۔ اس لیے اطمینان بخش نہیں۔ یہ یکم جولائی ۱۸۴۱ء کی ہے۔ اس کو ہم بلفظہ نقل کرتے ہیں ــــ بنام سید اظہار حسین خاں پدر شاد

---

[1] ندیم گیا' مئی ۱۹۴۴ء۔ بہار میں اُردو نوشتہ قاضی محمد سعید' ص ۵ و ۶۔

[2] ندیم گیا' جنوری ۱۹۴۲ء ' ص ۱۱۔

"عباس[1] سلمہٗ میں پورنیہ بخیریت تمام آپہنچا۔ تم لوگ اچھے ہوگئے۔ محسن[2] صاحب کو دعا کہہ دینا۔ الخ بھائی اب تو میری صحت چنداں خراب رہنے لگی ہے .....
دعاگو تاثر۔ مورخہ یکم جولائی ۱۸۴۱ء"

دہلی اُردو اخبار کے خطوط

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں اُردو میں خط لکھے جانے لگے تھے اور خط کے فارم میں سیاسی معاشی اور تعلیمی مسائل پر بھی رائے زنی ہونے لگی تھی۔ دہلی اُردو اخبار[3] کی ۲۶ جنوری ۱۸۴۰ء، ۱۸ اپریل ۱۸۴۱ء، ۲۵ اپریل ۱۸۴۱ء، ۲۳ مئی ۱۸۴۱ء، ۶ ۵ ستمبر ۱۸۴۱ء اور ۲۸ نومبر ۱۸۴۱ء کی اشاعتوں میں بہت دلچسپ خطوط شائع ہوئے ہیں جن میں اہلکاران شاہی کی بدانتظامی اور مشرقی و مغربی تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

شاکر اور شکوہ الملک ثانی سے سرور اور غالب تک اس قطرے کو گوہر بننے میں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ مطالعہ بہت مفید اور دلچسپ ہے۔ ان تاریخی شہادتوں اور مثالوں کی روشنی میں نہ صرف غالبؔ کی بلکہ سرور اور بے خبر کی بھی تاریخی اوّلیت ختم ہوجاتی ہے اور وہ تاریک راہیں جہاں اب تک قدم نہیں گئے تھے، کھل جاتی ہیں۔ اسی ارتقائی زنجیر کی ایک کڑی مرزا قتیل ہیں۔ مرزا غالب کے خطوں سے بہت پہلے مرزا قتیل (المتوفی ۱۸۲۴ء) کے شاگرد خواجہ امام الدین نے ان کے خطوط کو نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں معدن الفوائد کے نام سے شائع کیا (۱۸۲۶ء) اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قتیل نے اُردو میں بھی رقعے لکھے ہیں۔ خواجہ امامی جامع المکاتیب نے دیباچے میں لکھا ہے:

"ایں سبے سروپا (امامی) از ابتدا مرتبہ وصول ہر رقعہ کوچک و خط طویل را بمنزلۂ شان نزول سورۂ اخلاص و سورۂ رحمان شمردہ .... وازیں سبب کہ

---

[1] شاد نے اپنے والد کا نام عباس یا محمد عباس لکھا ہے۔ ممکن ہے اظہار حسین بھی ان کا نام ہو۔
[2] عباس جدّ خیال عظیم آبادی۔ [3] نیشنل آرکائوز آف انڈیا لائبریری۔ دہلی اُردو اخبار، ۱۸۴۰ء و ۱۸۴۱ء۔ [4] تاریخ نثر اُردو از احسن مارہروی، ص ۵۳۰

اجزائے کتاب مرقع تصاویر رقعات عربی و ترکی و فارسی و ہندی نتیجہ طبع
جناب ممدوح (مرزا محمد حسن متخلص بہ قتیل) بشمول نظم ضروری المقام است
درخطبہ ہم رعایت این براعت الاستہلال بکار رفت یعنی حمد بزبان عرب و
نعت بزبان ترک و منقبت بزبان فارس و تعریف اصحاب بزبان ہند
بانضمام نظم طراز تحریر پذیرفت۔ و نظر بر فوائد مندرجہ مکاتیب نسخہ
"معدن الفوائد" قرار یافت تا طالبان فن بمطالعہ آن فائدہ ہا بردارند و
دعائے خیرے درحق این کثرمرث زبان آرند[1]"

پروفیسر حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں جو نمونہ قتیل کی عبارت کا نقل کیا ہے (بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ مبارک جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا.....) وہ مرزائے ممدوح کی نہیں ہے بلکہ خواجہ امامی کی ہے۔ امامی نے قتیل کی لکھی ہوئی ترکی نعت کو اُردو میں منتقل کیا ہے لیکن ہمیں مرزا قتیل کا ایک رقعہ ملا ہے جس کو ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اس میں ترکِ نون کی صنعت کو برتا گیا ہے۔

"جس کا جی چاہے ہمارے پاس آوے گھر ہے اس کا اور کوئی آتا آتا ایک بارگی
رہ جاوے تو ہم کو کیا غرض۔ اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی آیا کرے تو
یہ بات بہت مشکل ہے۔ اس واسطے کہ یہ عاصی پر معاصی ایسا عہد کر کر بیٹھا ہے کہ
اس گوشہ کے بیچ اس طرح جما رہے کہ اگر ہزار بار دورہ کامل فلک ہشتم کا
جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر سے گزر جائے تو بھی اس جگہ سے اُٹھ کر
جو بہت جاوے تو اس دوسرے حجرہ تک جاوے۔ سو بھی دیکھا جائیے۔[2]"

اس بحث سے ہمارا مقصد ترقی زبان و ادب کے معاملے میں دہلی کی تاخیر یا دکن کی تقدیم کو ثابت کرنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ موضوع دراصل ہمارے دائرۂ تحقیق سے خارج ہے لیکن اُردو انشا کے سلسلے میں جو غیر مطبوعہ مواد ہمیں ملا ہے اس سے یہ ضرور

---

[1] رقعاتِ قتیل، ص ۷، مطبوعہ باہتمام مقبول الدولہ بہادر۔
[2] بحر الفصاحت، ص ۱۰۲، نیز جلوۂ خضر، ج ۲، ص ۹۸۔

ثابت ہوتا ہے کہ مکاتیب رجب علی بیگ سرور تاریخ ادب کا ایک حادثہ نہیں ہیں اور نہ وہ خلا میں وجود پذیر ہوئے ہیں بلکہ وہ ارتقا کی اس زنجیر کی ایک اہم کڑی ہیں جس میں "منشات شاکر" اور "مکاتیب شکوہ الملک ثانی" شامل ہیں۔ اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سرور ہی نہیں بلکہ غالب سے پہلے کا زمانہ مکتوبات کی تاریخ میں تاریک دور ہے اور اس سے پہلے کوئی مکتوب نگار ایسا نہیں جو قابلِ ذکر ہو[1] یہی نہیں بلکہ ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ مصنفینِ فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء - ۱۸۲۰) سے مرزا غالب تک (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹) اُردو نثر میں کچھ کام ہوا ہی نہیں۔ اور جو کچھ ہوا ہے وہ تبرکاتِ ادبی سے زیادہ وقیع نہیں ہے لیکن یہ نظریے محمد شاکر اور نواب شکوہ الملک راسخ یاس کے خطوط کی رنگا رنگی اور ہمہ گیری سے بخوبی دور ہو جاتے ہیں۔ کرناٹک کے خطوط اپنی فطری سادگی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ دکن کی خود مختاری نے فارسی کے زور اور اثر کو اس شدت سے محسوس نہیں کیا جتنا دلی نے۔ دوسرے دکنی بادشاہوں نے نہ صرف ہندوؤں سے خصوصی تمدنی و معاشرتی تعلقات قائم کیے بلکہ کئی بار اُردو کی حمایت میں باقاعدہ تحریک شروع کی[2] اسی لئے دکن کی اُردو انشا میں ہندی عناصر زیادہ قوی ہیں اور اس میں وہ سادگی ہے جو قبائے گل میں ہوتی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ سرور یا غالب مکتوباتی ادب کی اضطراری یا ناگہانی شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ ارتقائی زنجیر کی کڑی ہیں جس کا سلسلہ شاکر شکوہ الملک تپش اور راسخ سے جا کر ملتا ہے۔

---

[1] تاریخ نثرِ اُردو (احسن مارہروی) ص ۵۳۰۔

[2] داستانِ تاریخ اُردو میں لکھا ہے: "حسن بہمنی نے سلطنت کی دفتری و کاروباری زبان کے لیے بجائے فارسی کے ہندی کو پسند کیا۔" (ص ۳۲) "تاریخ فرشتہ مطبوعہ ۱۲۸۱ھ میں ابراہیم عادل شاہ کے بارے میں لکھا ہے: "دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد و برہمنہ را صاحبِ دخل گردانید" (ص ۲۷)

باب دوم

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ اور اُن کے مقلّدین

(الف) مرزا رجب علی بیگ سرورؔ

اٹھارھویں صدی عیسوی میں اُردو نثر

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں اُردو نثر کا آفتاب پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ لوگ نوعروسِ نظم ہی کے خط و خال پر مٹے ہوئے تھے۔

> " شمالی ہند میں اس کی عدم ترقی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں فارسی کا رواج تھا۔ درباری اور تعلیم یافتہ شرفا کی زبان وہی تھی۔ مراسلے، کتابوں کی تقریظیں اور دیباچے یہ سب فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اُردو شعرا کے تذکرے جن میں ان کے حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفّیٰ اور مسجع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروّج تھی۔ اس وقت کے اُردو نثر نگار ظہوری اور پنج رقعہ کی ایسی پیچیدہ اور مغلق عبارت لکھنے کے شائق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مروجہ اقسامِ نثر یعنی مرجز، مقفّیٰ، مسجع اور عاری اُردو میں بھی بے تکلف اختیار کی گئی تھیں اور جب کبھی کوئی بات نثر میں لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پُر تکلف

عبارت میں لکھی جاتی تھی۔ نظم کا عام رواج تھا یہاں تک کہ خطوط بھی نظم میں لکھے جاتے تھے۔ نظم کا یہ عام رواج اور مقبولیت نثر کو بھی نظم بنائے ہوئے تھا۔ نثر بچاری ایک گوشہ میں گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔[1]

یہ موقع فورٹ ولیم کالج نے بہم پہنچایا جو مئی ۱۸۰۰ء میں صاحبان نوآموز کو اُردو پڑھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ کالج کے مصنفین کی "موج خرام ناز" عجب گل کتر گئی کہ آج تک اس کی خوشبو سے مشام ادب معطر ہے۔ انھوں نے قدیم اسلوب بیان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ صفائے گفتگو کی طرح ڈالی اور آئندہ مصنفین کے لیے نئی شاہراہیں کھول دیں۔ ادبی ارتقا کے اصول سے اگر روگردانی نہ برتی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ بے خبر اور غالب کے خطوں کی صفائی کا نقشِ اوّل مصنفینِ کالج کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

اُردو نثر کی ترقی، اردو سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی

اُردو نثر نویسی کی یہ تحریک جو انگریزی اثرات کا لازمی نتیجہ تھی ایسے مناسب وقت شروع کی گئی کہ بہت جلد اسے عام مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کا آفتابِ اقبال غروب ہو رہا تھا اور فارسی دن بہ دن انحطاط پذیر ہو رہی تھی۔ ۱۸۳۲ء میں اُردو سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی اور ۱۸۴۲ء تک فارسی عدالتی زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی لیکن اس کے بعد منسوخ ہو گئی۔ پریس کی آزادی (۱۸۳۵ء) اور اخبارات کی ترقی نے اُردو نثر کو اور فروغ بخشا اور وہ ہماری زندگی کا جزو بن گئی۔ خطوط کا جو تعلق انسانی زندگی سے ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اس لیے ناممکن تھا کہ اُردو نثر کا یہ ہمہ گیر رواج خطوں پر اثرانداز نہ ہوتا۔

مولانا احسن مارہروی نے تاریخ نثر اردو میں لکھا ہے کہ اُردو زبان میں خط نویسی کی ابتدا مرزا غالب نے کی ہے۔[2] صفحہ ۲۰۹ پر لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے اول اُردو میں خطوط نویسی کا وجود نہیں

---

[1] تاریخ ادب اُردو، باب ۱۵، ص ۱

[2] تاریخ نثر اُردو (نمونہ منثورات)، ص ۵۲۰

ملتا جس کی ابتدا مرزا غالب نے کی ہے۔ رجب علی بیگ سرور اور غلام امام شہید وغیرہ کی تصانیف میں بھی دو ایک اُردو خط نظر آتے ہیں مگر ان کو اطفال دبستان کے لیے فرضی و تمثیلی خطوط کہا جا سکتا ہے نہ واقعی اور اصلی۔"

خط نویسی میں غالب کی تاریخی اوّلیت کا نظریہ غلط ہے

مولانا مرحوم نے جو کچھ غالب اور سرور کے متعلق کہا ہے اس سے ہم متفق نہیں ہو سکتے یہ سمجھنا بھی بڑی تاریخی غلطی ہوگی کہ مرزا غالب اُردو کے پہلے مکتوب نگار ہیں۔ صفحاتِ ماقبل میں جو کچھ غالب سے پہلے کے مکتوب نگاروں کے متعلق لکھا جا چکا ہے اور جو کچھ صفحات مابعد میں ان کے متعلق لکھا جائے گا وہ اس نظریے کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے۔ غالب کو البتہ محاسن ادبی کے اعتبار سے تقدم اور افضلیت ہے۔

مرزا غالب کی اُردو مراسلت کے آغاز کی کوئی صحیح تاریخ متعین نہیں ہو سکی ہے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن مہر نیم روز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس وقت بضرورت ان کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔"[1] غلام رسول مہر نے حالی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور یہ طے کیا ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے[2]۔ مولانا عرشی نے اس پر محاکمہ کیا ہے اور فیصلہ حالی کے حق میں صادر کیا ہے[3] لیکن جناب مہر کو اپنی رائے پر اصرار ہے۔ انھوں نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں بھی یہی لکھا ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے پیشتر بھی متفرق اُردو خطوط لکھتے رہے ہوں گے[4]۔

پروفیسر حامد حسن قادری نے بھی "انشائے بے خبر" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کا کوئی خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا نہیں ہے[5] لیکن "لنگی والے" خط[6] سے قطع نظر جس کی

---

[1] یادگار غالب، ص ۱۵۶۔
[2] غالب طبع اوّل، ص ۳۰۸
[3] مکاتیب غالب، ص ۱۱۲ - ۱۲۱۔
[4] غالب طبع ثانی، ص ۴۰۲
[5] انشائے بے خبر، ص ح۔
[6] خطوط غالب، ص ۱۰۵

تاریخ کتابت متنازع فیہ ہے۔ خطوط غالب (نسخہ مہیش پرشاد) میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط اگست ۱۸۴۹ء کا لکھا ہوا موجود ہے[۱]۔ اس سے بھی جناب مہر کی تائید ہوتی ہے۔ اس خط کے اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مرزا کا اُردو میں پہلا خط نہیں ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس سے پہلے بھی انھوں نے متفرق خطوط لکھے ہوں گے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور (۱۸۶۸-۱۷۸۷ء)

خواجہ غلام غوث بے خبر کے متعلق مولانا حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ انھوں نے مرزا غالب سے بھی قبل یعنی ۱۸۴۶ء میں اُردو خطوط لکھنا شروع کیے[۲]۔ اس طرح ممتاز مکتوب نگاروں میں جن کو متقدمین کہا جاسکتا ہے اور جن کے خطوط کی کافی تعداد ہمارے پاس موجود ہے۔ بے خبر کا نام "سرفرو" درج کیا جاسکتا ہے لیکن انشائے سرور میں ایک عرضداشت ایسی موجود ہے جس کے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے خواجہ غلام غوث بے خبر سے بھی پہلے اس میدان میں قدم رکھا۔ اس عرضداشت کے الفاظ یہ ہیں :

"عرضداشت حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔ عرصہ ہوا خانہ زاد نے نسخہ فسانۂ عجائب پیشکش کیا تھا۔ گو ہدیۂ مور ناتواں پیش سلیمان زماں اور نذر گدا آگے سلطان جہاں کے حقیقت نہیں رکھتی مگر نگاہ پرورش شاہنشاہ زماں مثل خورشید درخشاں گل و خار پر یکساں ہوتی ہے۔ اس امید پر ہمہ تن و چشم و گوش عتبہ بوسی کا رہا لیکن ناسازی بخت نے محروم رکھا۔ اب جمعیت پریشانی اور سامان بے سامانی سے گھبرا کے عرض رسا ہوں کہ اگر سلک کفش برداروں اور زمرۂ جاں نثاروں میں آبرو پاؤں تو سر خاک فتادہ سے کر خمیدہ فلک پیر چھوآؤں۔ بقدر لیاقت خانہ زاد کو جو کچھ فرمان بندگان والا در بان ہوگا بجا آوری اس کی فخر سعادت جان کر جان تک دریغ نہیں۔ الٰہی کوس جود و سخا و غلغلۂ کشورستانی و شہرۂ جہانبانی بلند آواز و گلشن سلطنت شاداب و تر و تازہ باد۔

---

[۱] خطوط غالب، ص ۱۰۲۔ [۲] داستان تاریخ اُردو، ص ۲۵۵

الٰہی در جہاں باشی باقبال   جواں بخت و جواں دولت جواں سال"[۱]

اس عرضداشت کی تاریخ کا تعین

انشائے سرور میں نہ سنہ کتابت درج ہے اور نہ مکتوب الیہ کا نام لیکن محولۂ بالا عرضداشت میں کچھ ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جس سے اس کی تاریخ متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور (۱۸۶۷ - ۱۷۸۷ء) جو غالب سے دس سال بڑے تھے اور لکھنؤ کے سب سے مشہور نثر نگار بادشاہ غازی الدین حیدر (۲۷ - ۱۸۱۹ء) کے حکم سے جلاوطن ہو کر کان پور چلے گئے (۱۲۴۰ھ - ۱۸۲۴ء) اور وہاں انھوں نے حکیم سید اسد علی کی فرمائش سے فسانۂ عجائب لکھنی شروع کی۔" یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شروع ہوئی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں ختم ہوئی" مولانا حامد حسن قادری نے رام بابو سکسینہ کے اس بیان کو" نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ" بتلایا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب سنِ تصنیف ۱۲۴۰ھ - ۱۸۲۴ء ہے تو کتاب نصیر الدین حیدر (۱۸۳۷ء - ۱۸۲۷ء) کے عہد میں کیونکر تمام ہوئی لیکن خود سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں بھی یہی بات لکھی ہے۔

" یہ فسانہ بعہدِ دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا اور تمام بعہد سلطان ابن سلطان ابو النصر نصیر الدین حیدر دام ملکہ ہوا۔ اللہ اللہ یہ عجب شاہ جم جاہ از یکہ نشین ہوا ..... غزل

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ   یہ نصیر الدین حیدر بادشائے لکھنؤ"[۲]

سرور نے ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔

جس نے کہ سُنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے   یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا
تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم   بے ساختہ جی بولا نشتر ہے رگِ دل کا
۱۲۴۰ھ

سرور کے ان دونوں بیانات میں تطابق صرف اس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء کو بجائے اختتام کے آغاز تصنیف کا سنہ مانا جائے اور بظاہر اس میں کوئی

---

[۱] انشائے سرور، ص ۵ - [۲] فسانۂ عجائب مطبوعہ نولکشور، ص ۹؛ نسخۂ محمود، ص ۱۶ - ۱۸

محالِ عقلی لازم نہیں آتا۔

فسانۂ عجائب میں مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے بادشاہ غازی الدین حیدر کی تعریف میں اتنا زورِ قلم اس وجہ سے صرف کیا کہ شاید لکھنؤ واپس آنے کی اجازت مل جائے لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ بالآخر ان کے مرنے کے بعد نصیر الدین حیدر (۱۸۳۷-۱۸۲۷ء) کی تعریف میں اشعار کا اضافہ کیا اور فسانۂ عجائب کا مسودہ لے کر لکھنؤ آئے[1]۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ نئے زمانے اور نئی فضا کو دیکھ کر سرورؔ نے نصیر الدین حیدر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی اور فسانۂ عجائب کا ایک نسخہ خدمتِ عالی میں پیش کیا ہوگا اور پذیرائی اور شنوائی نہ ہونے پر زیرِ بحث عرضداشت بطور یاد دہانی پیش کی ہوگی۔

یہ عرضداشت محمد علی شاہ (۱۸۴۲-۱۸۳۷ء) اور امجد علی شاہ (۴۷-۱۸۴۲ء) کے نام بھی ہوسکتی ہے لیکن یہ زمانہ عہدِ تصنیف سے دور پڑ جاتا ہے۔ جس سال واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے اسی سال انھوں نے قطعہ تاج پوشی پر پچاس روپیہ ماہوار مقرر کردیئے (۱۸۴۷ء) اس لیے واجد علی شاہ بھی مخاطب نہیں ہوسکتے اور عرصہ ہوا کا ٹکڑا اس صورت میں بالخصوص بے معنی ہوجاتا ہے۔

پچھلے بادشاہ غازی الدین حیدر (۲۷-۱۸۱۹ء) کے زمانے میں سرورؔ نے کوردہ کان پور میں جلاوطنی کے مصائب برداشت کیے تھے ان سب باتوں کا اشارہ بھی پوشیدہ معذرت اور اظہارِ وفاداری کے ساتھ اس عرضداشت میں موجود ہے۔

"نگاہِ پرورش شاہنشاہِ زماں مثلِ خورشید درخشاں گل و خار پر یکساں ہوتی ہے۔
اس امید پر ہمہ تن چشم و گوش عتبہ بوسی کا رہا لیکن ناسازیِ بخت نے محروم رکھا۔
اب جمعیت پریشانی اور سامان بے سامانی سے گھبرا کے عرض رساں ہوں کہ اگر
سلک کفش برداروں میں آبرو پاؤں تو سرِ خاک فتادہ سے کر خمیدہ خاک پر چھو آؤں"۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر کے نام اس عرضداشت کے ہونے میں یہ قیاس بھی کام آسکتا ہے کہ سرورؔ نے فسانۂ عجائب کو ختم کرنے کے بعد ہی اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کے ذریعے

---

[1] فسانۂ عجائب (محمود) ص ۲۔

اپنی پُر آلام زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہوگی۔ بہرکیف یہ بالکل طے ہے کہ یہ عرضداشت سنہ ۱۸۲۲ء اور سنہ ۱۸۴۹ء کے درمیان لکھی گئی۔

<u>مکتوب نگاری کی تاریخ میں رجب علی بیگ سرورؔ کی اولیت غالبؔ کے مقابلے میں</u>

سنہ ۱۸۲۴ء فسانہ عجائب کا سنہ آغاز تصنیف ہے اور سنہ ۱۸۴۶ء سرور کی تاریخ وابستگی دربارِ اودھ۔ لیکن ان دلائل کے پیشِ نظر جو اوپر لکھے گئے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عرضداشت سنہ ۱۸۲۷ء اور سنہ ۱۸۳۷ء کے درمیان لکھی گئی جو نصیر الدین حیدر کا زمانہ ہے۔ اس طرح سرورؔ کو جو عمر میں غالبؔ اور بےؔ خبر دونوں سے بڑے تھے مکتوب نگاری میں بھی تاریخی اعتبار سے اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

انشائے سرور: انشائے سرور نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کے مطالعے سے مصنّف اور اس کے زمانے کے متعلق بہت سی اہم باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ الحاقِ اودھ (سنہ ۱۸۵۶ء) کے بعد وہاں کے لوگوں پر کیا گزری۔ لوگ کس طرح زندگی سے عاجز تھے۔ خود سرورؔ کی کیا حالت تھی۔ وہ کن کن مصائب سے دوچار رہے۔ ان کے عزیزوں کی بے اتفاقی، سامانِ راحت کی کمی، پیری و بے مائیگی، ضعفِ بصارت کی دردناک داستان سب اس مختصر سے مجموعے میں موجود ہے۔

حالاتِ عصر: سرور اپنے ایک دوست کو رقعہ نمبر ۱۴ میں جو غالباً سنہ ۱۸۵۶ء میں لکھا گیا ہے[1] لکھنؤ کی ویرانی کا حال لکھتے ہیں۔

> " بنارس پہنچا۔ راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دفعتاً عجب واردات ہوئی کہ خبر ویرانی و بربادی لکھنؤ کو بکو مشہور ہوئی۔ شیشۂ دل سنگِ حوادث سے چور ہوا۔ وہاں کا قیام نہ کسی طرح منظور ہوا۔ ہر چند مہاراج بہادر نے بڑی عنایت کی، کفالت کی راہ سے بہت کچھ رعایت کی مگر دل و دماغ نہ رہا۔ بہرکیف افتاں و خیزاں اشک ریزاں لکھنؤ آیا۔ ایک عالم کو تہلکۂ عظیم میں مبتلا پایا۔ شہر میں سناٹا چھوٹا بڑا

---

[1] الحاق اودھ ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ اسی سال والیٔ سلطنت کی داد فریاد کے لیے ایک وفد انگلستان روانہ ہوا جس میں جناب عالیہ ملکہ کشور، مرزا ولی عہد اور مرزا سکندر حشمت خاص لوگ تھے۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں سرورؔ دربار بنارس سے وابستہ ہو گئے۔

آفت میں مبتلا، ہر گلی کوچہ میں انگریزی بندوبست، اپنے اپنے حال میں ہر ایک مست، یکایک حاکم شہر عازم لندن ہوا، اس گرمی میں غریب الوطن ہوا۔ کیا اس دنیائے دنی کا اعتبار، بجز فاعتبروا یا اولی الابصار[۱]

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"افسوس لکھنؤ سا شہر اس بے کیفی سے لٹ جائے والیٔ ملک جس نے خشکے کا پیڑ نہ دیکھا ہو اس فصل میں (گرمی میں) غریب الدیار ہو اپنے بیگانے سے چھٹ جائے۔"[۲]

ایک اور موقع پر افراتفری اور بدانتظامی کا نوحہ کرتے ہیں۔

"شہر میں روز تازہ فساد ہوتا ہے۔ دھڑا دھڑ لٹتا ہے۔ برباد ہوتا ہے۔ کہیں چوری کہیں سرزوری۔ حرام خوری ہے۔ جس دن سے خاص محل میں چوری ہوئی تہلکہ بپا ہے۔ داد وگیر کی صدا بلند ہے۔ معاملہ کھلتا نہیں۔ چند در چند ہے۔ جب برے بھلے دن آتے ہیں ایسے ہی سانحے پیش پا ہو جاتے ہیں۔ اور کچہری میں یہ صورت ہے نواب زادے مُستغیث آتے ہیں۔ جو رو بیٹے ساتھ لاتے ہیں۔ صندل گھسنے کی فریاد ہوتی ہے۔ اس پر طلب داد ہوتی ہے۔ یہاں کی خلقت پر عتاب خدا ہے معلوم نہیں عزت کدھر گئی۔"

فسادات۔ انتزاعِ سلطنت سے قبل اودھ میں کئی فسادات ہندو مسلمانوں کے درمیان ہوئے جن کا ذکر انشائے سرور میں موجود ہے۔ واجد علی شاہ ان ناخوشگوار واقعات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ دربار بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک صاحب مولوی امیر علی ساکن قصبہ امیٹھی نے اس موقع پر جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ ان واقعات کی تفصیل سرور نے رقعہ ۱۹ میں درج کی ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"ذیقعد کے مہینے میں مولوی غلام حسن صاحب نام اہل اسلام فیض آباد میں گئے یہ دعویٰ کیا ہندوؤں نے اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی ہے۔ کلمہ کی دھائی ہے۔ یہ خبر سن کر مسلمانوں کا مجمع ہوا۔ ناظم سلطان پور کا نائب اعلیٰ ہے اسے کہتے ہیں

---

[۱] انشائے سرور، ص ۱۹۔ [۲] ایضاً، ص ۲۸۔

سخت شقی ہے۔ مسلمانوں کو ردکا کہا دو روز چپ رہو دنگا نہ کرو ہم فیصلہ کردیں گے۔ رشوت پہلے سے کھا چکا تھا۔ زر نقد کیسہ میں آچکا تھا مسلمانوں کو حملہ سے ٹالا۔ جب لوگ پراگندہ ہوئے۔ جاہل ہندو دوڑ پڑے۔ مسلمانوں کو مسجد میں گھیر لیا۔ وہ جو شہر کے مہتم تھے انھوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا گو قلیل تھے مگر کثرت سے ہندوؤں کو مار کر مر گئے۔ ساکھے کر گئے۔ ستر مسلمان تیس چالیس قرآن شہید ہوئے۔ سی پاروں کو ہزار پارہ کیا۔ کام ناکارہ کیا۔ کچھ جلائے کچھ نوح کے مہریوں کے ڈانٹ بنائے۔ حاکم ملعون شر کو خیر سمجھا۔ بے گناہ مسلمانوں کا قتل ہونا سیر سمجھا۔ سرکار میں جو خبر ہوئی کچھ تدبیر تقدیر نہ مدنظر ہوئی۔ اب مولوی امیر علی ساکن امیٹھی نے بغرض جہاد قصد فیض آباد کیا۔ اودھ اجودھیا اسی کا نام ہندوں کے تیرتھ کا مقام ہے۔ وہاں کا خلط (کذا)۔ سنئے تعمیر عالمگیری بڑی مسجد ہے اس کی یہ وقعت کھوئی ہے کہ اس کے صحن میں سیتا کی رسوئی ہے کہیں سنکھ پھکتا ہے بم بم کی صدا ہے۔ کہیں تکبیر کی آواز ہے۔ تسبیح کا کھٹکا ہے۔ گنگا مدار کا ساتھ نیا انداز ہے۔ وہاں سے قریب ہنومان گڑھی ہے اس کے کھودنے کی خاطر بھیڑ پڑی ہے۔ ابھی تک دریاباد میں کہ دو منزل لکھنؤ سے یہ مقام ہے مولوی امیر علی صاحب کا قیام ہے۔ دو ہزار مسلمان ان کے ہمراہ ہیں اور ان کو گھیرے ہوئے کئی پلٹنیں ستادن ضرب توپ گرد مہتاب سلگتا ہے۔ اور بہت سے ملازم بادشاہ ہیں۔ سرکار سے ممانعت ہے۔ آگے بڑھنے نہ پائیں۔ ہاتھی گھوڑوں پر چڑھنے نہ پائیں۔ اور مولوی صاحب کا یہ قول ہے خدا کی راہ میں سر نذر کیا۔ مرنا اختیار کیا۔ ترک یار و دیار کیا۔ "حالا ہیچ نمی دانم ہر خرے کہ باشد من پالانم"۔ اس غضب کو غور کیجئے۔ سرکار سے مسلمانوں کی تدبیر ہوتی ہے۔ ہندوؤں کی سزا میں تاخیر ہوتی ہے۔ اس کے سوا خیر آباد کے ضلع میں کھیری قصبہ ہے عشرہ کو وہاں زن و مرد لڑکے سے بوڑھے تک فرد فرد ذبح کرکے گھروں میں آگ لگائی امام باڑے کھودے مسجد ڈھائی کربلا کی تصویر

دکھائی۔ کچھ بھاگ کر جو بچے در دولت پر دھائی دیتے ہیں۔ تنکے چنتے ہیں۔ کارپردازان سرکار کب سنتے ہیں۔ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے دنیائے فانی سے جب منہ موڑا آل باکمال اور کلام ذوالجلال کو دنیا میں چھوڑا۔ ایک کا حاکم کوفہ د شام نے قتل عام کیا۔ بند آب و طعام کیا۔ بارہ سے بارہ کے بعد ملک اودھ کے ہندوؤں نے قرآن کی یہ نوبت پہنچائی۔ مسلمان جو حاکم تھے ان کو غیرت نہ آئی۔ رشوت لی۔ دشمنان ایمان سے ساز ہے۔ جعلی روزہ ہے۔ دغابازی کی نماز ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ ایجاد ہوگا ناحق شہر برباد ہوگا۔ لکھنؤ کا تبرا دور دور مشہور ہے۔ آج کل مجلسوں میں یا عیدین کو مسجدوں میں جہاں شیعہ سنّی کی جماعت ہوتی ہے حاکم شام کے بدلے ناظم سلطان پور اور حاکم فیض آباد پر لعنت ہوتی ہے۔"[۱]

مولوی امیر علی کا حال اور مآل

اس کے بعد مولوی امیر علی کا "حال مآل" سنیے۔ مرزا سرور لکھتے ہیں:

"اس سے زیادہ ماجرائے جانکاہ بعد شہادت سید الشہدا دنیا میں اور نہیں سنا۔ ساون ضرب توپ گرد مہتاب روشنی بیچ میں ایک سو چوبیس خستہ تن کوئی یار نہ مددگار ایک طرف فوج سلطانی ہزار در ہزار پہلے جھٹے میں بہت مر گئے۔ باقی توپوں پر سینہ سپر کر گئے۔ اللہ ری جرأت و جواں مردی۔ تلوار کی باڑھ سے توپوں کی باڑھ بند کر دی ...... دوسرے دن مولوی صاحب کی نعش بے سر و سامان اسی میدان میں گڑی۔"[۲]

---

[۱] انشائے سرور، ص ۲۴ و ۲۵۔

[۲] انشائے سرور، ص ۲۶۔ تاریخ اودھ مصنفہ محمد نجم الغنی، جلد پنجم میں بھی ان واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ہم اس بیان کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ یہ مقابلہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ " (۲۰۰) اجودھیا میں جہاں بت خانہ جنم استھان رام چندر جی تھا اس کے متصل سیتا کی رسوئی ہے۔ بابر بادشاہ نے وہاں ۹۲۳ھ ۱۵۲۶ء میں ایک عالی شان مسجد جو جامع مسجد ہے بہ اہتمام سید موسیٰ بنوائی تھی جس کی تاریخ خیر باقی (۹۲۳) ہے۔ آج تک وہ مسجد سیتا کی رسوئی کہلاتی ہے ..... (۲۰۲)۔
جب علاقہ پچھم راٹھ وغیرہ کی حکومت راجہ درشن سنگھ کے حوالے ہوئی تو اس علاقہ کے ہندوؤں کی

انگریزی کوٹھی کے قیام کے متعلق سرور نے جو خیالات قلم بند کیے ہیں وہ بھی بہت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) قوت زیادہ ہوگئی۔ آس پاس کے ٹیلے کے احاطہ کھنچوایا۔ لڑائی کے قابل قلعہ بنوایا۔ اس کے سبب سے روز بروز ہنود فقرا زور پکڑتے گئے۔ مسجد کے آثار بگڑتے گئے۔ ہندوؤں کی نفاستیں ہونے لگیں بہت زور پکڑ گئے۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلے کی طاقت نہ رہی۔ اس مسجد کے در و دیوار قائم کر کے مکان گڑھی میں ملا لیا۔ اور ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ہنتوں نے مسجد کا نام و نشان مٹا دیا......

سنہ ۱۲۷۱ھ میں واجد علی شاہ کے عہد میں شاہ غلام حسین نے مولوی محمد صالح کی امداد سے دوبارہ مسجد کی آبادی اور بت خانہ کی بربادی کے لیے بعزم جہاد حیدر آباد میں کہ گومتی کے پار ہے محمدی جھنڈا قائم کیا..... جولائی ۱۸۵۵ء کو تقریباً دو تین سو مسلمان نماز کے واسطے مسجد بابری میں جمع ہوئے۔ شاہ صاحب امام ہوئے۔ بیراگیوں نے (ص ۲۰۶) مسجد کو گھیر لیا اور اندر آکر.... ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے.... اکثر مسلمانوں کے گلے میں قرآن شریف حمائل تھے۔ ان کو پرزے پرزے کر کے پاؤں سے روند ڈالا اور جنگلہ جو سرکاری حکم سے مسجد بابری کے چبوترے پر تیار ہوا تھا توڑ ڈالا۔ تاریخ واقعہ بلغ العلی سنہ ۱۲۷۱ھ ہے۔ افضل التواریخ میں لکھا ہے کہ غلام حسین کے ساتھ ۱۳۰ آدمی کام آئے۔

آخر ش ارباب فرنگی محل سے مولوی عبدالرزاق صاحب اور بندگی میاں کے پوتے مولوی سید امیر الدین علی عرف مولوی امیر علی ساکن امیٹھی نے جوش حرارت اسلام کی وجہ سے چاہا کہ توہین اسلام کا دفعیہ کریں۔ اس لیے جہاد پر کمر باندھی اور بہت سے آدمیوں نے ان کا ساتھ دیا.... (ص ۲۱۳) جہاد کی یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ رام پور اور بیلی بھیت کے پٹھان سب سے پہلے جمع ہوئے۔ ایک دن جنرل اوٹرم صاحب ریزیڈنٹ واجد علی شاہ کے پاس آئے اور بیان کیا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کا فساد ہوا چاہتا ہے۔ چنانچہ معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کی گئی۔ مولوی امیر علی نے توقف کیا اور تین مولویوں کو ایک عرضیِ منظوم کے ساتھ واجد علی شاہ کی خدمت میں بھیجا۔ نواب احمد علی خاں۔ مولوی غلام جیلانی۔ مولوی غلام امام شہید اور مولوی فضل حق خیر آبادی چار ثالث مقرر ہوئے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک دن بھی وکلائے اسلام اور ہنت کی روبکاری روبرو نہ ہوئی۔ مصالحت کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں اور آخر کار مجاہدین بادشاہی فوج کے ہاتھوں سے عالم آخرت کو سدھارے۔ ؎

گفت از روئے ہمت ازلی   قتل شد مولوی امیر علی

۱۲۷۲ھ

اس خونی حادثہ کے تین ماہ بعد انتزاع سلطنت ہوا۔ ایک شخص نے دیوان حافظ سے تفاول کیا۔ یہ شعر نکلا:

"دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را ؎ چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند   (تاریخ اودھ، ج ۵)

اودھ کے ضبط ہونے کا امکان نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں پیدا ہو گیا تھا۔ ملاحظہ ہوں: OUDH PAPERS یہ الحاق ہنگامی واقعہ نہیں تھا۔ انگریزوں نے بتدریج اس طرح کے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ سلطنت کی ضبطی ناگوار نہ ہو بلکہ لوگ اسے رحمت سمجھیں (ملاحظہ ہو DACOILY IN EXCELSIS BY MAJOR BIRD)۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

دلچسپ ہیں اور اس زمانے کی حالت کا عبرتناک مرقع ہیں۔

"دریں ولا شہر میں انگریزی کوٹھی لین دین کی ہوئی ہے۔ نام اس کا بینک ہے وثیقے والوں کو قرض لینے کی امنگ ہے۔ مثل مشہور ہے کہ پینا سہل ہے موجوں میں کسالا ہے۔ تاریخ ادائے وعدہ ٹلے تو دیوالا ہے۔ حضرت نے بھی تین ہزار لئے وہاں سے لیے ہیں۔ بارہ دری محل سرا لکھی۔ بادشاہ مرزا اور داروغہ صاحب کی ضمانت ہوئی۔ جائداد ان کی بھی تحریر ہوئی۔ برس دن کا وعدہ ہوا گھر کھونے کی تدبیر ہوئی"[1]

اس کے علاوہ سرور نے سفر کی تکالیف، بے روزگاری کی مصیبت، غلّے کی گرانی، لوگوں کی بے وفائی اور بدکرداری کے متعلق بھی اپنے خطوط میں دلچسپ اشارے کیے ہیں۔

تصانیف سرور۔ خود سرور کے متعلق بھی انشائے سرور میں دلچسپ مواد موجود ہے ان کی تصانیف کے بارے میں بھی ضروری معلومات خطوط کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہیں۔ فسانۂ عجائب انھوں نے ۱۸۲۴ء میں حکیم سید اسد علی کی تحریک سے کانپور میں لکھنی شروع کی۔ اس کے متعلق اوپر بحث آچکی ہے۔

سرور سلطانی۔ مرزا رجب علی بیگ "سرور سلطانی" کے متعلق اپنی عرضی نمبر۹ مورخہ یکم اپریل ۱۸۵۶ء میں بعد زوال مملکت[2] لکھتے ہیں۔

"فدوی نے جلوس کی تاریخ کہہ کے گزرانی اس کے صلہ میں پچاس روپیہ مہینہ ہر مہینے خزانہ سے پاتا ہوں۔ کبھی جو کسی کتاب کے ترجمہ کا ارشاد ہوا بجا لاتا تھا چنانچہ شمشیر خانی کو اُردو میں لکھ کر سرور سلطانی نام رکھا اور بہت صاف اُردو میں لکھا ہے"[3]

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) فسادات واجد علی شاہ کے زمانے میں شروع نہیں ہوئے بلکہ اس کا سلسلہ بہت پہلے سے ہے۔ سنہ ۱۸۴۵ء کے دہلی اُردو اخبار میں بہت سے فسادات کی اطلاعیں ہیں۔ ۱۰ مئی کی اشاعت میں کانپور اور ۲۷ دسمبر کی اشاعت میں لکھنؤ کے فسادات کی خبریں ہیں۔ کتب خانہ آثار قدیمہ نئی دہلی

[1] انشائے سرور، ص ۴۰

[2] الحاق سلطنت ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو ہوا۔

[3] انشائے سرور، ص ۱۱۔

شمشیر خانی شاہنامۂ فردوسی کا ملخص ہے۔ سرور سلطانی اس کا مقفیٰ اور مسجع اُردو میں ترجمہ ہے۔ اس میں ایک مقام پر ہندوستان کی تعریف کی گئی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور مولانا حامد حسن قادری نے اس کی تاریخ تصنیف ۱۸۴۷ء لکھی ہے لیکن انشائے سرور (ص ۹) میں صاف لکھا ہے کہ "بارہ سے سرسٹھ ہجری (۱۸۵۰ء) میں یہ سر رشتہ بہم پہنچا۔"

گلزار سرور۔ رقعہ نمبر ۱۲ میں لکھتے ہیں "دریں ولا نیاز مند حسب فرمائش مہاراج بہادر حدائق العشاق کا ترجمہ کرتا ہے اور اپنا حال کچھ اس میں لکھوں گا۔ یہ لکھنا بھی ضروری ہے راقم کو منظور ہے۔"

اس ترجمہ کا نام انھوں نے گلزار سرور رکھا جس میں ایک افسانہ کی صورت میں روح اور عشق کا مجادلہ درج ہے۔ اس کی عبارت نہایت رنگین ہے۔ غالب نے بھی اسی طرز میں اپنی تقریظ لکھی ہے۔

شبستانِ سرور۔ الف لیلہ کے چند قصّوں کا دلچسپ ترجمہ ہے۔ یہ آخر زمانہ کی تصنیف ہے جب کہ مرزا کو پیری اور ضعف بصارت نے نڈھال کر دیا تھا۔ اس کے متعلق اپنے فرزند مرزا احمد علی کو لکھتے ہیں:

"بھائی سنو۔ ہمارے جینے کا اب اعتبار نہیں۔ حال روز بروز بدتر ہوتا جاتا ہے۔ بائیں آنکھ بالکل نکمی ہو چکی اور داہنی میں غبار ہے۔ اللہ یار ہے۔ ان دنوں تمھاری جدائی سے بڑا حرج ہے۔ الف لیلہ تمام کر چکا۔ نظر ثانی کی دیر ہے وہ ہو نہیں سکتی۔ آنکھ کے روبرو جو اندھیر ہے۔"

رقعہ نمبر ۳ میں مرزا احمد علی کو لکھتے ہیں۔

"دریں ولا الف لیلہ نظم و نثر منشی نول کشور صاحب نے بہت روپے دے کر لکھوائی ہے۔ جو کچھ ہم نے ہذیان بکا ہے اس کے چھپنے کی بھی نوبت آئی ہے۔"

سولخات۔ سرور کی زندگی نہایت پریشانی کے عالم میں گزری۔ وہ نواب غازی الدین حیدر کے حکم سے جلاوطن کر دیئے گئے تھے لیکن ان کا لکھنؤ سے کانپور پہنچنا

ادبی دنیا کے لیے رحمت کا باعث ہوا۔ فسانۂ عجائب انھوں نے اسی زمانے میں لکھی۔ ۱۸۴۶ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ ایک فارسی رقعہ میں لکھتے ہیں۔

"خلاصہ این سمع خراشی و نمک بر جگر پاشی آن کہ بتاریخ سیزدہم شہر ذی الحج ۱۲۶۳ھ۔ ۱۸۴۶ء۔ یوم یک شنبہ آرام خاطر بے قرار و تسکین بخش دل پر اضطرار ازیں جہاں گزراں رخت ہستی بربست"[1]

اسی سنہ میں سرور سلطان عالم واجد علی شاہ (۱۸۴۶-۵۶ء)[2] کے دربار سے منسلک ہوگئے اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی۔ لیکن یہ زمانہ بڑا پرآشوب اور بدانتظامی کا تھا۔ زندگی بھر انھیں کبھی وقت پر تنخواہ نہ ملی۔ خطوط میں جا بجا اس کا تذکرہ موجود ہے۔ ۱۸۵۶ء[3] میں سلطنت اودھ کی بساط الٹ گئی اور بادشاہ معزول ہوگئے۔ اس وقت کارخانہ ہی بدل گیا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کا طوفان اٹھا اور اس نے رہے سہے امن و امان کا بھی خاتمہ کردیا۔ اس زمانے میں سرور نہایت خستہ حال اور پریشان روزگار رہے۔ انشائے سرور میں ایک عرضی نمبر (۱۱) ص ۱۳ پر درج ہے۔ اس میں سرور نے اپنی بیکاری کی مدت لکھی ہے۔

"جاں نثار نو برس عالم بیکاری میں مثل جرس نالاں بے سر و ساماں مبتلائے بلائے روزگار رہا"[4]

یہ عرضی غالباً دربار اودھ سے وابستگی کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت کے بعد بھی سرور کو اطمینان خاطر نصیب نہیں ہوا، اس لیے کہ تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تھی[5]۔ اسی عرضی میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"خدانخواستہ تنخواہ کے ملنے میں جن دنوں تامل ہو جاتا ہے تو وہی سامان گزشتہ از سر نو بالکل ہو جاتا ہے۔ غور کا ہنگام ہے۔ انصاف کا مقام ہے۔ اضافہ کی

---

[1] انشائے سرور، ص ۹۱۔ [2] تاریخ جلوس۔ مبارک ہو مبارک ہو شاہانہ تاج $\frac{۱۲۶۳ھ}{۱۸۴۷ء}$۔

[3] تاریخ معزولیٔ واجد علی شاہ۔ لکھنؤ شد خراب واویلا ۱۲۷۲ھ۔

[4] انشائے سرور، ص ۱۳۔

[5] اس کی تائید نجم الغنی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ حال واجد علی شاہ: "سپاہ و اہل قلم تنخواہ کی نایابی سے جینے سے تنگ تھے۔" تاریخ اودھ، ج ۵، ص ۱۱۲۔

طلب میں مصاحبت مطلوب نہیں۔ جس کام میں آبرو ریزی ہو اس کی ہوس خوب نہیں۔ اس قناعت پر اگر فلک سفلہ پرور ستائے تو اس ظالم کے جور سے کس طور سے کہاں نکل جائے۔

چالوں سے چرخ کے یہ مرا عزم ہے سرور
اس سرزمیں پہ جاؤں جہاں آسماں نہ ہو

اس جفا کو کیوں کر نہ کہوں کب تک چپ رہوں۔ اکیسویں ذی الحج کو دوڑ دھوپ سے کس کس بہروپ سے قبض بہم پہنچائی۔ گیارھویں جمادی الثانی تک بہت دروازوں کی خاک اڑائی۔ اتنے دنوں دوڑا کے خوب ساتھکا کے دیا تو سردست جواب دیا۔ خالی پھرنے پر آمادہ و مستعد نہ ہوا۔ پیچ و تاب دیا۔ حضور قدر دان ادنیٰ و اعلیٰ ہیں اس وجہ سے عرض حال ہے۔ کس و ناکس کی التجا کا سخت ملال ہے۔ کسی سخی داتا کے ذمہ تنخواہ کا اہتمام ہو کہ شکایت بخت کی کہانی کا قصہ تمام ہو۔"

نواب واجد علی شاہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حضور کلکتہ کو تشریف فرما ہوئے جو یہاں رہے گرفتار بلا ہوئے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ناچار رہے۔ رہے تو کیا رہے۔ زیست سے بیزار ہے۔ تیرہ مہینے سے صفائی ہے تنخواہ کی صورت نظر نہیں آتی ہے[۱]"

عرضی نمبر ۹ مورخہ یکم اپریل ۱۸۵۶ء (یعنی بعد انتزاع سلطنت اودھ) میں تحریر فرمایا ہے۔

"اب ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۶ء میں اس سال محرم اور صفر تک (تنخواہ) وصول ہے ربیع الاول سے باقی ہے۔

بنارس میں بھی یہی مصیبت تھی۔ رقعہ نمبر ۱۷ میں لکھتے ہیں۔

"چوتھا مہینہ تنخواہ کا ہوا حبہ وصول نہیں ہوا" (ص ۷۸)

اسی وجہ سے سرور برابر قرض اور افلاس میں گھرے رہے۔ عرضی نمبر ۷ میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] انشائے سرور، ص ۹

"دائرۂ افلاس میں گھرا ہوں۔ خداوندعالم و دانا ہے جس بے حیائی سے اپنا پیٹ پالتا ہوں مصیبت کے دن ٹالتا ہوں۔ ایسا جینے سے مرنا بہتر ہے" (ص ۱۰)۔ اپنے بیٹے کو بنارس سے لکھتے ہیں۔ "پانچ برس کی خدمت گزاری اور کتاب لکھنے کا صلہ دوشالہ رومال ملا تھا۔ اس کو بیچ کے قرض خواہوں کو دیا۔ خدا شاہد ہے ساٹھ ستر کا قرضہ اب بھی باقی رہا۔"[1]

سید علی حسین صاحب کو لکھتے ہیں۔ "پٹیالے کے راجہ آئے تھے۔ کپڑے کی جوڑی عنایت کی۔ اس کو بیچ کر سب کا قرض ادا کیا" (ص ۸)۔ ان معاشی تکالیف کے علاوہ سرور کی صحت بھی اکثر و بیشتر خراب رہی۔

زوال بصارت۔ خطوط میں جا بجا زوال بصارت کا تذکرہ موجود ہے۔[2] آخر عمر میں بینائی نے جواب دیدیا تھا۔ اپنے لڑکے کو لکھتے ہیں۔

"آنکھ نے ہماری طرفۃ العین میں بالکل چشم پوشی کی۔ بہت رنج رہتا ہے۔ اب لکھنے کی گون نہیں رہی۔ اٹکل سے لکیریں کھینچ دیتے ہیں۔"[3]

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔ "بائیں آنکھ کے نور نے بھی منہ پھیر لیا۔ بدحواسی نے گھیر لیا جو مرضیٔ خدا۔"[4] بائیں آنکھ میں غبار آجانے سے مرزا سرور کو خفقان اور اختلاج قلب کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ تنہائی اور افلاس مستزاد تھے۔[5]

ایک رقعہ میں لکھتے ہیں۔ "کوئی اپنا پوچھنے والا نہیں کہ کیسے ہو۔ ہر طرف سے لاؤ لاؤ ہے۔ لوگوں کی بے اعتنائی سے سینہ میں گھاؤ ہے۔" سرور نے عود بصارت کے لیے ایک جلالی عمل پڑھا تھا (ص ۵۹) مختلف علاج کرائے لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر کار جب چار قدم کا آدمی نظر آنا بند ہو گیا تو مہاراجہ بنارس سے تین مہینے کی رخصت لے کر بغرض علاج کلکتہ گئے (ص ۶۲) وہاں نواب واجد علی شاہ سے بھی ملاقات ہوئی لیکن علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ رقعہ نمبر ۲۷ میں لکھتے ہیں۔

"کلکتہ میں بڑا ڈاکٹر تھا کہ اس سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ اس بدبخت نے فریب

---

[1] انشائے سرور، ص ۴۹۔ [2] ایضاً، ص ۱۲-۲۰-۲۲-۵۴۔ [3] ایضاً، ص ۴۳

[4] ایضاً، ص ۷۴۔ [5] ایضاً، ص ۵۰-۵۱-۵۹-۷۹-۸۰۔

کیا ایک عرق ایسا دیا کہ اس کا آنکھ میں ڈالنا (تھا کہ) دو پہر کے بعد دہنی آنکھ میں غبار شروع ہو گیا۔ اس کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ میرا دم گھبراتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"تین چیزیں دنیا میں سخت تر ہیں وہ یہاں موجود ہیں۔ ضعیفی میں تنہائی غربت میں بیماری مفلسی میں قرضداری۔ کیا لکھوں لکھ نہیں سکتا۔ بڑی مشقت سے یہ چند سطریں کھینچی ہیں[۱]"

مراسم و تعلقات۔ سرور کے مراسم و تعلقات نواب واجد علی شاہ سے کافی گہرے اور پائیدار تھے۔ انشائے سرور میں چار خط ان کے نام موجود ہیں اور تین ایسے ہیں جو سرور نے کسی بیگم کی طرف سے نواب صاحب کی خدمت میں لکھے ہیں۔ ان میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جو سلطان عالم کو بعد انتزاع سلطنت لکھے گئے تھے ان میں سے بعض مراسلوں میں ابتذال اور سوقیت پائی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

انشائے سرور میں ایک عرضی مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والیِ بنارس کے نام بھی موجود ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

"بڑی نیک نامی ہے اگر خلق خدا کی زبان پر یہ کلمہ مشہور ہے کہ حضور کی قدردانی سے حزیں کے پہلو میں سرور رہے۔ اہل و عیال کو بھی ساتھ لاؤں گا جب وطن کو دل سے بھلاؤں گا[۲]"

مہاراجہ بنارس کی طرح سرور کو مہاراجہ الور نے بھی بلایا تھا۔ سید علی حسین صاحب کو لکھتے ہیں:

"اگر مہاراجہ شیو داں سنگھ بہادر کو اس ہیچ کارہ کی طلب منظور ہے۔ دست بستہ حاضر سرور ہے۔ الور کتنی دور ہے۔"

مہاراجہ پٹیالہ نے بھی ان کو اپنی ریاست میں طلب کیا تھا اور ایک جوڑی طلائی کڑوں کی ان کو

۱؎ انشائے سرور، ص ۸۰ ۲؎ ایضاً، ص ۸

مرحمت کی تھی۔[۱]

(اسلوب نگارش) انشائے سرور مصنف کے سوانح حیات اور حالاتِ عصر کا آئینہ ہے۔ اس کا طرز بھی بالکل وہی ہے جو اس زمانے میں رائج اور مقبول تھا۔ سطر سطر میں تصنع ساختگی اور قافیہ پیمائی سرور کو بھی مقفیٰ نگاری اور رنگین بیانی کا بڑا اہتمام منظور تھا۔ حد یہ ہے کہ بیٹے کو ایک خط بڑی پریشانی میں لکھا ہے۔ اس میں اس روش کی پوری پابندی نہ ہو سکی تو معذرت کے طور پر لکھتے ہیں :

> "اس وقت تک ڈاک کا وقت تھا۔ جلدی میں یہ لکھ دیا۔ پھر مفصل اپنی طبیعت کا حال اور سرگزشت ایذا اٹھانے کی لکھوں گا۔ یہ دو سطریں انتشارِ طبیعت میں لکھی ہیں کوئی چست فقرہ نہ نکلا۔"[۲]

ایسی ہی معذرت ایک اور خط میں کی ہے :

> "یہ خط پریشانی میں اناپ شناپ بے ناپ تول لکھا ہے، نہ اس میں لطف ہے نہ مزا ہے۔"[۳]

یہ صنعت طرازی اس زمانے کا عام دستور تھا۔ سرور اس دائرے سے باہر نکلنا چاہتے ہیں اور پھر اسی میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جملے انتہائی پریشانی کرب اور اذیت میں لکھے ہیں لیکن قافیہ پیمائی یہاں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو : "بائیں آنکھ کے نور نے بھی منہہ پھیر لیا۔ بدحواسی نے گھیر لیا" یا "ہر طرف سے لاؤ لاؤ ہے .... سینہ میں گھاؤ ہے" یہ رعایت لفظی بھی دیکھئے : "آنکھ نے ہماری طرفۃ العین میں بالکل چشم پوشی کی"

ایک جگہ صرف اتنا لکھا ہے کہ خط آیا۔ اس کو اس طرح لکھتے ہیں : "دل کی طاقت جگر کی قوت، خاطر شکستہ کی مومیائی، دافعِ الم جدائی حاصل دعائے سحر سرمایۂ تمنائے نالۂ اثر خود فراموشی غیر کی زبان سے بولنے والا عقدۂ سربستہ کا کھولنے والا یعنی نامہ نامی صحیفۂ گرامی گلریز دامن آرزو ہوا۔"[۴]

اس کے بعد اسی خط میں ۱۹ سطروں کے اندر دنیا کی ناپائیداری اور تکلیف

---

[۱] انشائے سرور، ص ۱۸ و ۷۹۔ [۲] ایضاً، ص ۵۳۔ [۳] ایضاً، ص ۴۷۔ [۴] ایضاً، ص ۶۹۔

E
9

کا ذکر ہے۔ اتنا لکھنے کے بعد مطلب کی طرف اس طرح رجوع کیا ہے کہ "یہاں تک سمع خراشی کی۔ اتری ہوئی تصویر کی نقاشی کی۔ اس سلسلہ سے ہاتھ اُٹھایا۔ مطلب بر آیا۔"

سرور کی انشا پردازی بہ حیثیت مجموعی تصنع کی زلف گرہ گیر کی اسیر ہے۔ وہ خواہ معاشرتی زندگی کی مصوری کریں یا ملکی بدحالی اور افلاس کے نوحہ گر ہوں یا گھر کے واقعات کا تذکرہ کریں ان کی ہر کوشش اسی زلف گرہ گیر کی ایک شکن ہوتی ہے۔ سرور نے ایک جگہ کرایہ کے مکان کا نقشہ کھینچا ہے وہ اگرچہ ساڑھے تین صفحات پر محیط ہے لیکن ہم ایک مختصر سا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ان کی طرز و روش کا اندازہ ہو گا۔

"دن کو دیواروں پر چیلیں مونڈیروں پر کوّے غل مچاتے تھے۔ رات کو سرِ شام سے الّو چلاتے تھے۔ دروازوں میں بازو نہ چوکھٹ پٹوں میں سے پٹّے بازی ہر دم کی کھٹ پٹ زنجیر پا بہ زنجیر۔ کنڈی گھس کے گھنڈی ہو گئی۔ قفل کے طالع سو گئے۔ کنجی کھو گئی۔ نہ زنجیر کو کنڈی تک کوئی لایا۔ نہ قفل نے کنڈی کا سوراخ پایا۔ دیدۂ منتظر کی صورت دروازہ وا رہتا۔ دن رات بکشادہ پیشانی کھلا رہتا۔ آنے جانے میں عقل پھنستی تھی۔ خلق خدا دیکھ کر ہنستی تھی۔ بازو سے بازو چوکھٹ سے ماتھا رگڑتا تھا آمد و رفت میں ٹکر کھا کے منہ بگڑتا۔ جھکتے جھکتے کمر میں بل آیا۔ کچھ دن نہیں گزرے کہ کُب نکل آیا۔"[1]

ایک جگہ نوروز کی تصویر کشی کی ہے اس کا بھی انداز وہی ہے۔

"آمادۂ ناز گل اور ہزار نیاز سے بلبل ہے۔ ارض و سما میں نوروز کا غل ہے بلند صدائے دور باش ہونے لگی غنچہ دہنوں کو گل اشرفی کی تلاش ہونے لگی۔ ایسی ہوا چلی کہ دفعتاً گلرخوں کے بھاؤ بڑھ گئے۔ ماہرو، عنبریں مو، دام زلف بر دوش، مرصع پوش، طائر دل پھنسانے کی گھات میں خوب نکھرے ہیں۔ کوئی جھمک جھمکا کسی کے چاندی سے جنجال میں بھیگے، بال شانوں پر بکھرے ہیں کسی نے سلک گوہر بہ مسی مل کر رنج کے جوبن سے نیلم کو ہیرا کھلایا ہے۔ کسی بید رد سرخ پوش

---

[1] انشائے سرور، ص ۱۳

نے قتل عام پر بیڑا اٹھایا ہے۔ دھڑا دھڑی لوٹنے کو انداز سے لاکھا جمایا ہے۔ دروازوں پر طلائی نقرئی بانس جڑاؤ کھٹولے کی دہ وہ ڈولی ہوتی ہے جس کو دیکھ کر جی ڈانوا ڈولی ہوتی ہے۔ پردوں میں بنت گوکھر دبچکا سیروں کھلا ہوا لگا ایسے مغرق کہ جب غفلت میں اٹھیں ہوشیاروں کی عقل پر پردے پڑیں۔ جب آنکھوں سے آنکھیں لڑیں کہاروں کی کرتیاں پر بہادے بھاگنے پر تیار۔ یہ ہنگامہ جو نظر سے گزرا خیال آیا جلسہ نوروز ہے۔ ہر بزم میں روشن شمع سب افروز ہے۔ بے ساختہ یہ فقرہ زبان پر آیا باآواز بلند ہر درد مند کو سنایا کہ ان دنوں جو رشک بدر ہیں ان کی راتیں غیرت شب قدر ہیں[1]۔"

بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوش رنگ گلدستہ ہے جو خوشبو اور شادابی سے محروم ہے۔ رنگینیاں ہیں جو آئینہ خانے میں قید کی جارہی ہیں لیکن ہمیں اس طرز انشا پر بحث کرتے وقت اس زمانے کے مخصوص حالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ زوال پذیر اسلوب ایک زوال پذیر معاشرے کی پیداوار ہے جس پر جوش و مستی تصنع اور بناوٹ کا غبار رنگین چھایا ہوا تھا۔ وہی عکس معاشرتی آئینے یعنی ادب میں بھی آگیا۔ اس وقت فارسی کے اثرات غالب تھے اور اُردو ایک نرم و نازک بیل کی طرح اس کے درخت سے چمٹی ہوئی تھی اسی وجہ سے سطر سطر میں فارسی کا پرتو نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ شام کی خوب صورتی یا بڑھاپے کے حسن کے قائل ہیں وہ اس طرز میں بھی بہت سی دلربائیاں محسوس کریں گے۔

سرور نے اپنے مخصوص انداز میں جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ نواب واجد علی شاہ کو سلطنت کی تباہی کے بعد لکھتے ہیں :

"ہونٹوں پر جان تڑپ کر آئی ہے۔ جان عالم کی دُہائی ہے۔ تڑپتے ہیں بلکتے ہیں گھٹ گھٹ کر در و دیوار سے سر پٹکتے ہیں۔ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں مصیبت کے دن بھرتے ہیں۔ ادھر میں لٹکتے ہیں۔ طرۂ طرحدار کا صدقہ ابروے خمدار کا صدقہ بےکسی پر خیال کرو۔ تنہائی کا ملال کرو۔ مفت میں ہماری جان جاتی ہے۔ شب فراق کالی بلا ہے۔ اکیلا پاکے کاٹے کھاتی ہے[2]۔"

---

[1] انشائے سرور، ص ۲۳ - [2] ایضاً، ص ۳۸

سرورؔ بعض جگہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں اور ان کی تحریر میں سخت ابتذال اور عامیانہ پن پیدا ہو گیا ہے جو متانت پر گراں گزرتا ہے۔ رقعہ نمبر ۲۷ میں جو کسی بیگم کی طرف سے نواب واجد علی شاہ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے تحریر فرماتے ہیں :

"سینہ کاہے کو ہے بھٹی ہے۔ ہم نے بڑی مشقت سے بغل میں اس دلِ خانہ خراب کو پالا تھا کہ کام آئے گا۔ یہ نہ سمجھے تھے کہ دیکھ بھال کے آفت میں پھنسائے گا بقول شہوُ ہاتھیوں سے گنا کھانا ہے۔ جیسا کیا اس کی سزا پانا ہے۔ تمھارا نام جان عالم ہے اس پر یہ عالم ہے۔ دل چھین لینے میں طرار ہو بڑے انٹی مار ہو۔ لاکھوں دل زلفِ پیچاں میں لٹکتے ہیں تم مزے اُڑاتے ہو وہ سر پٹکتے ہیں مرتے ہیں دم بھرتے ہیں[1]۔"

سرورؔ کا اثر

سرور کے طرز و اسلوب کی پیروی شاہی خاندان کے مراسلات میں بھی ہوتی تھی۔ واجد علی شاہ کو خود قافیہ پیمائی کا شوق تھا چنانچہ جو خطوط انھوں نے انتزاعِ سلطنت کے بعد اپنی بیگمات کو لکھے ہیں ان میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ بادشاہ شیدا بیگم کو ایک خط میں القاب کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

"نہالِ چمنِ محبت، بالکل چاہت کی اُلفت، الف قد بے خدنے ابرو چاند سا رو بہت اچھی خدا کے واسطے ایک اچھی مورنی کھٹورنی ..... "

اس کا جواب شیدا بیگم نے دیا ہے :

"دُور سے مانگتے ہو تم مجھی ــــ بات ہرگز نہیں ہے یہ اچھی "

ان خطوط سے آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ سرورؔ کی حیثیت ایک فرد ہی کی نہیں ایک تحریک کی بھی ہے۔

سرورؔ کے خطوط نوشتۂ موسیٰ نہیں ہیں۔ ان میں تعقید اور گنجلک نہیں ہے بلکہ وہ بارہ خطوط جو دوستوں اور عزیزوں کے نام ہیں ان میں سلاست اور روانی ہے اور ان کا انداز عرضداشتوں سے مختلف ہے۔ ان میں دل کی دھڑکنیں اور بے چینیاں پوشیدہ ہیں۔ غریبی پریشانی اور بیماری کا بے تکلفانہ ذکر ہے۔ دوستوں سے چھیڑ چھاڑ ہے۔ بیٹے سے

---

[1] انشائے سرور، ص ۳۶

محبت بھری باتیں ہیں۔ ان میں لے دے کے لکھنوی تکلفات میں صرف قافیے کا اہتمام ہے لیکن وہ ناگوار نہیں ہوتا اور بعض جگہ تو وہ بھی نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"کیوں حضرت ہم کیا پوچھتے ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ مطبخ کا حال مسہل کا تال پھنسی پھوڑوں کا احوال تو نہ لکھا۔ ہندو مسلمان کا بکھیڑا پکھیڑا۔ بندے کو دونوں سے سروکار نہیں مہتم اخبار نہیں۔"

اپنے بیٹے احمد علی کو جو خطوط لکھے ہیں وہ سادگی اور صفائی میں منفرد ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دوربینی نے غالب کی امتیازی خصوصیات کو پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا :

"ہاں بھائی ایک دوا ہاتھ آئی ہے۔ اکثر تجربہ ہوا کبھی خطا نہیں ہوئی۔... محمد حسین خاں بیٹھے ہیں تمھارے خط نہ لکھنے کی شکایت وہ بھی کرتے ہیں کہ لکھتے لکھتے ہاتھ گھس گئے جواب نہ بھیجا۔"

بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں زبان و بیان کے اعتبار سے بھی دل میں رکھنے کے قابل ہیں :

"حرص کی دنیا مثل ریشم کے کیڑے کے ہے جس قدر جمع کرتا ہے اس کے اندر آخر کو گھٹ گھٹ کر مرتا ہے۔" یا "تعجیل کا انجام پشیمانی ہے۔ کبر و غرور کا انجام دشمنی ہے۔"

سرور نے القاب نویسی میں موقع اور محل کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک رقعہ بیٹے سے خط نہ بھیجنے کی شکایت کی ہے۔ اس کو اس طرح شروع کیا ہے :

"برخوردار سعادت اطوار۔ بے خبر از حال پدر۔ در بلائے بے وطنی اسیر۔"

یا بعدِ زوالِ مملکت واجد علی شاہ کو لکھتے ہیں :

"اے رونق سریر سلطنت زیب دہ تاج سلطانی مشتاقوں کے باعث زندگانی ہر دل عزیز یوسف ثانی اللہ چاہِ ملال سے نکالے۔ سایۂ عاطفت ہم پر اور اس مملکت پر جلد ڈالے۔"

یا ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"شاہنشاہ کشور وفاداری ادیب دبستان دلفریبی و جفاکاری موجد ناز و نیاز

معشوق فراموش عاشق نواز کجکلاہی کی دھوم رہے زمانہ محکوم رہے۔"

سب سے مختصر القاب یہ ہے: "جناب والا۔ بندگی عرض کرتا ہوں۔" بعض خطوں میں القاب مفقود ہے۔ القاب کا اختصار اور مراسلے میں مکالمے کا رنگ ایک لکھنوی انشا پرداز کے یہاں حیرت انگیز ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے خطوط اردو میں ایک ارتقائی حادثہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک خاص رجحان کی ارتقائی شکل ہیں۔

سرور نے فارسی میں بھی خطوط لکھے ہیں لیکن ان میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ ان میں جا بجا اُردو کی کہاوتیں اور اُردو کے اشعار اقتباس کے طور پر لکھے ہیں

(ب) واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات

واجد علی شاہ اور حکومت (۱۸۴۷-۵۷ء)

مرزا رجب علی بیگ سرور کے مشہور طرز و اسلوب کی پیروی شاہی خاندان کے مراسلات میں بھی ہوتی تھی۔ جانِ عالم واجد علی شاہ کو خود قافیہ پیمائی کا شوق تھا چنانچہ جو خطوط انھوں نے انتزاعِ سلطنت کے بعد اپنی بیگمات کو لکھے ہیں اور جو اُن غم زدہ بیگمات و محلات نے اپنے جلا وطن شوہر کو کلکتہ تحریر کیے ہیں ان میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوں کے مجموعے

اس وقت ہمارے سامنے ان رقعات کے کئی مجموعے ہیں۔

(۱) مخزن اسرار سلطانی معروف بہ رقعات بیگمات (قلمی) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔ مرتبہ محمد امتیاز علی خاں نجیب ساکن شہر فرخ آباد" یہ رقعات ان بیگمات کے ہیں جن کو حضرت واجد علی شاہ خود کلکتہ تشریف لے جاتے کے وقت شہر لکھنؤ میں چھوڑ گئے تھے [۱]۔

---

[۱] مخزن اسرار سلطانی (قلمی) آصفیہ نمبر ۱۹۸۹۱/۲۷۳۔

ان خطوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک حصے میں وہ خطوط ہیں جو بیگمات نے واجد علی شاہ کو لکھے ہیں اور دوسرے حصے میں وہ رقعے ہیں جو شاہ اودھ نے ان خطوں کے جواب میں بھیجے ہیں۔ مخزن اسرار سلطانی کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ خطوط اتفاقاً نجیب کو ملے اور انھوں نے خاص اہتمام سے ان کی نقل کرائی۔ رقعات بیگمات کا مطبوعہ نسخہ کتب خانہ قلعۂ معلیٰ رامپور میں موجود ہے اس کے شروع میں لکھا ہے کہ "کتاب لاجواب عجوبہ روزگار موسوم باسم تاریخی مخزن اسرار سلطانی (۱۳۱۹ھ) معروف بہ رقعات بیگمات کا حق تالیف محفوظ ہے۔ کوئی صاحب بلا اجازت مولوی امتیاز علی خاں نجیب کے چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں .... اور جس کتاب پر دستخط مولف نہ ہوں گے وہ مالِ مسروقہ خیال کی جاوے گی[۱]۔" یہ کتاب بدری نرائن کے اہتمام سے مورس کمپنی بذریہ فرخ آباد میں چھپی ہے۔ یہ تمام خطوط $\frac{\text{۱۲۷۳ھ}}{\text{۱۸۵۶ء}}$ اور $\frac{\text{۱۲۷۴ھ}}{\text{۱۸۵۷ء}}$ کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

(۲) رقعات اہلیہ واجد علی شاہ قلمی۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔ دیباچے میں لکھا ہے۔

"محنت کشیدہ بحر و بر المتخلص بہ اختر صانہ اللہ تعالیٰ عن کل حوادث الدھر و طلب و یابس زمان چشیدہ آفت روزگار دیدہ جب لکھنؤ سے خانماں آوارہ ہو کے وارد شہر کلکتہ ہوا انواع انواع مصیبت میں گرفتار رہا۔ مادر و پسر و برادر عازم لندن ہوئے۔ میں تنہا کلکتہ میں باقی رہ گیا۔ فلک ناہنجار نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا۔ قلعہ فورٹ ولیم میں دو سال ایک مہینہ بے جرم و خطا مقید رکھا۔ وہاں نہ کوئی مونس تھا نہ غم خوار۔ چارہ ساز بے چارگاں ہر حال میں معین و مددگار تھا۔ اسیر صد بلا تھا گرفتار جور و جفا تھا۔ طپش و بے قراری و یاس و ناامیدی ہمدم تھے۔ مگر عنایتِ پروردگار شامل حال ہر دم تھے۔ شب اختر شماری اور دن اشکباری میں بسر ہوتا تھا۔ مصرع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ چونکہ کوئی خطا نہ تھی عادلِ حقیقی نے فریاد رسی کی۔ ائمہ طاہرین نے اس ذرّۂ بے مقدار کی اعانت و امداد کی المختصر ساتویں تاریخ شہر ذی الحج ۱۲۷۵ھ روز شنبہ کو دو گھڑی دن باقی رہے قلعہ سے رہا ہو کے داخل کوٹھی راجہ بردوان میں ہوئے۔ سجدات شکر بدرگاہِ بے نیاز بجالائے۔

---

[۱] رقعات بیگمات (مطبوعہ) کتب خانہ قلعہ رامپور

جب لکھنؤ سے میرا آنا ہوا تھا بیگمات و محلات معلی کا عجیب حال تھا چونکہ صدمہ فراق کی عادی نہ تھیں شبانہ روز سیل سرشک چشم خونبار سے بہاتی تھیں، خوکردہ محبت و الفت کی تھیں۔ سیماب وار ہر دم دہر لحظہ تڑپتی تھیں۔ آخرکار رسمیں ارسال محبت نامہ جات کی جاری کیں۔ علی الخصوص ملکہ دہر نواب نوروزی بیگم صاحبہ کہ درحقیقت والہ و فریفتہ جان پر الم کی تھیں۔ انھوں نے محبت نامہ متواتر بھیجے منظور خاطر فیض مظاہر یہ ہوا کہ ان کے محبت ناموں کو ایک جا جمع کرے تا صفحۂ روزگار پر یہ چند اوراق یادگار رہ جائیں اور مبتدی اور شائق اس فن کے اس کے پڑھنے سے مستفیض ہو بہرہ مند ہو دیں۔ صاحبان شعور کو لازم و مناسب یہ ہے کہ اگر مولف سے کوئی غلطی سہو سے ہوگئی ہو اس پر اعتراض نہ کریں اور پردہ پوشی کریں۔ ستارالعیوب ان کے بھی عیبوں کی پردہ پوشی کرے گا۔ مصنف خطبہ نے سال کو باب اور مہینے کو فصل قرار دیا اور نام اس کا "تاریخ فراق" رکھا ہے۔ مقدمہ شہ ۱۲۷۵ھ مشتمل اوپر نو فصلوں کے۔ فصل پہلی در ربیع الثانی سنہ الیہ فصل دوسری در جمادی الاول فصل تیسری در جمادی الثانی فصل چوتھی در ماہ رجب فصل پانچویں در شہر شعبان فصل چھٹی در ماہ رمضان فصل ساتویں در شہر شوال فصل آٹھویں در شہر ذیقعد فصل نویں در ذالحجہ سن الیہ[1]۔"

نوروزی بیگم واجد علی شاہ کی کسی بی بی کی بہن تھی۔ رشتے کی یا حقیقی۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ اس بیوی کے بطن سے واجد علی شاہ کی ایک لڑکی دہیم آرا تھی جو نوروزی کے ساتھ رہا کرتی تھی اور جس کی وفات کی اطلاع نوروزی نے اپنے مودت نامہ مورخہ ۴ ربیع الآخر شہ ۱۲۷۵ھ میں کی ہے جو اس مجموعے کا پہلا خط ہے۔

"جب سب محلات تمھاری بسبب خوف جان کے بھاگی تھیں میں بھی شہزادی کو لے کے ساتھ اون کے روانہ ہوئی۔ اثنائے راہ میں ہر ایک کا ساتھ چھوٹ گیا۔ تمام مال و اسباب ہمارا لٹ گیا۔ جب شہر میں لوگ آباد ہونے لگے میں بھی آئی۔ گھر میں آتے ہی یہ مصیبت اٹھائی کہ دہیم آرا بیمار ہوئی ہماری حالت دل زار ہوئی۔

[1] رقعات اہلیہ واجد علی شاہ۔ قلمی۔ کتب خانہ مشرقیہ۔ پٹنہ۔

آخر کو ماہ رمضان میں اس راحت جاں نے قضا کی۔ ہیں واسطے رونے کے رہ گئی۔[1]

حزن اختر میں لکھا ہے۔

جو نوروزی بیگم ہے اک مہ کا نام   وہ خالہ ہے اس مہ[2] کی ماہِ تمام
وہی پالتی تھی اسے اے جواں   وہ موجود ہے لکھنؤ میں وہاں
ہوا والدہ کا مگر انتقال   اسے پرورش کرتے ہیں عم و خال

قیصر التواریخ کے بیان کے مطابق ملکہ سیم تن دبہیم آرا کی ماں تھیں لیکن یہ بیان شبہ سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ دبہیم آرا کی ماں واجد علی شاہ کے کلکتہ جانے سے قبل ہی مر چکی تھی اور سیم تن جیسا کہ نوروزی کے خطوں سے ثابت ہے روانگیِ کلکتہ کے بعد بھی زندہ تھی۔

نوروزی بیگم کے خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بہن مر چکی تھی اور نوروزی باوجود اس کے کہ واجد علی شاہ کی بیوی تھی کبھی ان کے تصرف میں نہ آئی تھی۔

"... اور سب محبوب تمھارے خوبصورت ہیں۔ طرحدار ہیں مونس و غمگسار ہیں۔ ہم بے حقیقت بدصورت مٹی کی مورت بھلا کون ہیں۔ نہ ادھی ہیں نہ پون ہیں۔ ان سب کو تم جان و دل سے چاہتے ہو، ہم کو خالی بناتے ہو اور جو تم ہم کو کم کرتے ہو پیار، اس کی وجہ یہ ہے آشکار، کہ اگر یک شب بھی ہم تم ہم خواب ہوتے تو پھر دیکھتے کہ ہر روز تم کیسے بیتاب ہوتے۔[3]"

نوروزی بیگم نے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس کی بہن نے کبھی اسے سامنے نہ آنے دیا لیکن وہ اسی زمانے سے واجد علی شاہ پر مائل تھی۔[4] بہن کی وفات کے بعد اگر واجد علی شاہ نے از خود توجہ نہ کی ہوتی تب بھی وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کو اپنے حالِ دل سے ضرور مطلع کرتی۔ اس کا تخلص پہلے زلیخا تھا لیکن واجد علی شاہ کے کہنے پر کہ یہ کیا بوڑھا تخلص ہے حورا تخلص رکھو۔ نوروزی بیگم نے الف کو حرفِ علت سمجھ کر گرا دیا اور حور تخلص رکھا۔[5]

۱۔ رقعات اہلیہ واجد علی شاہ۔ قلمی۔ کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ۔ شہابی نے اس خط کا سنہ غلط لکھا ہے۔
۲۔ دبہیم آرا نواب بنت السلطان بیگم (شہزادی بیگم) کی طرف اشارہ ہے۔
۳۔ رقعات اہلیہ واجد علی شاہ (قلمی) پٹنہ۔ ۴۔ ایضاً۔ ورق ۵۵ ب۔
۵۔ ایضاً۔ ورق ۲۷ ب۔

مجموعۂ زیر بحث میں جو کچھ نظم و نثر ہے وہ عشیر کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جسے واجد علی شاہ نے تلمیذ السلطان کا خطاب دیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نوروزی بیگم کو ایک طرف تو پردے کا اتنا خیال ہے کہ سالی ہونے کے باوجود واجد علی شاہ کے سامنے نہیں آئی۔ دوسری طرف چار مصوّروں کے سامنے آئی اور ان سے تصویریں کھچوا کر بادشاہ کو بھیجیں۔ مزید یہ کہ اس ادعا کے باوجود کہ اس نے کبھی کسی مرد سے واسطہ نہیں رکھا۔ وہ نہایت بے باکی کے ساتھ جنسی معاملات کے متعلق واجد علی شاہ کو خط لکھتی ہے۔[1] پھر یہ خطوط چھپے ڈھکے نہیں تھے۔ لازمی مختلف لوگوں کی نظر سے گزرتے تھے۔ اول تو غالب گمان یہ ہے کہ یہ عشیر سے لکھوائے جاتے تھے۔ دوسرے بیشتر خطوط اس زمانے کے ہیں جب بادشاہ فورٹ ولیم میں قید تھے اور بند خطوط کا ان تک پہنچنا دشوار تھا۔ اسی طرح خود واجد علی شاہ کے خطوط بھی نوروزی بیگم کو کھلے ہوئے ملتے تھے۔

غدر میں نوروزی کے اوپر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے کئی خطوں میں ننگے پاؤں بھاگنے فاقہ کرنے اور معیشت کی تنگی کا ذکر کیا ہے۔

> "تم خوب جانتی ہو کہ آگے تمھاری بدولت میں ہر روز پہنتی تھی اطلس و گلبدن اب گون کی چھیٹ ہے اور ہمارا تن۔ اوس کا بھی ملنا دشوار ہے۔ تمھارے ازدواج میں ہمارا شمار ہے۔"[2]

نوروزی کا ایک نام جانی بیگم اور لقب ملکۂ وہر تھا اور اس کا شمار واجد علی شاہ کی چہیتی بیویوں میں ہوتا تھا۔

(۳) پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے ذاتی کتب خانے میں ایک مجموعہ تاریخ غز الہ ہے جو غالباً ۱۲۷۶ھ میں ترتیب دیا گیا۔ یہ مطبع مفید عام آگرہ سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں واجد علی شاہ کے خطوط ان کی بیگم ملکہ غز الہ کے نام ہیں۔

(۴) پٹنہ میں نور الزماں بیگم کے خطوط کا ایک ناقص قلمی نسخہ تاریخ نور کے نام سے ہے۔ یہ نسخہ واجد علی شاہ کے کتب خانے میں تھا اور ابھی حال میں خدا بخش لائبریری میں آیا ہے۔

---

[1] رقعات اہلیہ واجد علی شاہ قلمی۔ خط مورخہ ۸ جون ۱۸۵۸ء   [2] ایضاً

اس کے بعض اوراق غائب ہیں۔

نورالزماں بیگم کے یہ خطوط واجد علی شاہ کی فرمائش سے جمع ہوئے تھے۔ مودت نامہ بست و ہشتم میں لکھا ہے :

"اور جو تم نے لکھا تھا کہ ہمارے محبت ناموں کی تاریخ وار ایک کتاب مرتب کرو جس طرح سے تم کو بھیجے ہیں اسی طرح علی الترتیب جمع کرو۔ جانِ عالم۔ حقیقت میں کیا اچھی بات ہے۔ واقعی اس طرح کی کتاب یادگارِ کائنات ہے۔ انشاءاللہ تعالےٰ عن قریب اس حکم کو ہم بجالاتے ہیں جیسا تمھارا حکم ہے ویسا ہی بنواتے ہیں"[1]

ان خطوں کا اسلوب و انداز ایک ہی سا ہے۔ موضوع بھی وہی ہے۔

ہماں پہلو۔ ہماں بستر۔ ہماں درد۔

تاریخِ نور میں ۱۲۷۲ھ سے ۱۲۷۵ھ تک کے خطوط ہیں۔ ان میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جو نورالزماں بیگم نے خود نہیں لکھے۔ ایک خط میں لکھا ہے ۔"میرے ماموں اور ابا جان بعد پانچ برس کے زیارات عتبات عالیات اور حج سے مشرف ہو کر آئے ہیں۔ اب میں عشق نامے ان سے تحریر کرواتی ہوں"[2]

(۵) پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں ایک اور مجموعہ انشائے راحت روح ہے جو ۱۲۸۰ھ میں مطبع اثناعشری لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ منشی کنج بہاری لال آثم نے بیگموں کی طرف سے ساٹھ ستر خط نواب واجد علی شاہ کے نام لکھے تھے۔ ان کے مسودے جو آثم کے پاس محفوظ تھے، غدر کے ہنگامہ و آشوب میں ضائع ہو گئے۔ صرف گیارہ مسودے باقی رہ گئے ان ہی کو تبرک کے طور پر شائع کر دیا ہے۔ اس کے دیباچے میں آثم نے اس زمانے کے ادبی رجحان کی طرف اشارہ کیا ہے :

"جب ۱۲۷۲ھ میں حسب مشیت پروردگار ملک اودھ میں یک قلم سکۂ حکومت انگریزی جاری ہوا ..... وضع لکھنؤ تبدیل ہوئی۔ اُردو کی عزت فارسی کی تذلیل ہوئی .....

---

[1] تاریخِ نور۔ نورالزماں بیگم کے خطوط (قلمی) خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ۔
خط مورخہ ۱۰ رذی الحجہ ۱۲۷۵ھ

[2] تاریخِ نور قلمی (پٹنہ) ص ۴۹۔

یہاں تک کہ حضرت سلطان عالم بھی اسی زبان میں نامہ ہائے شوقیہ بیگمات باعزاز کو تحریر فرمانے لگے اور یہاں سے بھی جوابات ان کے بہ عبارت اُردو جانے لگے۔ اس وقت سے زیادہ تر اس یوسف کی گرم بازاری ہوئی۔ فارسی نامطبوع اور اُردو بیاری ہوئی۔[1]

(۶) تاریخ ممتاز میں واجد علی شاہ کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے کلکتہ کے قیام اور اسیری کے ایام میں اپنی بیوی ممتاز جہاں نواب اکلیل محل[2] کے نام لکھے ہیں۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے[3]۔ ان میں سے کچھ خطوط واجد علی شاہ نے خود لکھے ہیں اور کچھ انھوں نے ذوالفقار الدولہ سے لکھوائے ہیں جو واجد علی شاہ کی ایک اور بیگم کے حقیقی بھائی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنی بہن کی سوکن کو اس طرح کے رنگین اور عشق انگیز خطوط کیسے لکھے ہیں۔ ان خطوں میں معانقۂ جسمانی کا اشتیاق[4] اور پچھلی صحبتوں کا ماتم ہے[5] اور وہ عجیب دقتوں کے عالم میں لکھے گئے ہیں۔

"قاصد بہت کم یاب ہیں کہ جن کے ہاتھوں درد دل لکھ کر بھیجا کروں۔ اگر کوئی ڈاکیا نصیبوں سے ہاتھ آگیا تو ہزار ہزار منت اور سماجت سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ایک آدھا خط روانہ کیا۔"[6]

(۷) تاریخ بدر قلمی۔ ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن۔

سببِ تالیف میں لکھا ہے:

"اما بعد راقم الحروف ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہِ عادل قیصرِ زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ حوالہ صفحہ (؟) بیان کرتا ہے کہ جب سپہر بوقلموں نے نیا رنگ دکھلایا اور سفر کلکتہ کا اتفاق ہوا۔ بعض محلات سلطانی

---

[1] دیباچہ انشائے راحت روح۔ مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۲۸۶ھ۔ [2] خطاب زینت محل تھا۔ یہ نواب محمد علی خاں کی بیٹی اور نواب شہامت علی خاں خلف نواب شجاع الدولہ کی نواسی تھیں۔ [3] نمبر او۔ آر ۵۲۸۸۔

[4] تاریخ ممتاز ورق ۲۶ الف و ۳۶ ب۔

[5] ایضاً ورق ۲۷ الف۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں لاہور سے شائع بھی ہوگئی ہے۔

[6] تاریخ ممتاز ورق ۴۴ الف۔

کہ جلباب دوری اور پردۂ مجبوری میں رہیں اکثر خطوط تو درد آمیز بھجواتی تھیں اور اشتیاق اور محبت کو یاد دلاتی تھیں۔ بپاس مراسم الفت کے مطمح نظر ہوا کہ وہ قراطیس حسن تالیف پاویں تاکہ رائگاں نہ جاویں لہٰذا ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ خطوط نواب بدر عالم صاحبہ کو زیور ترتیب عطا کیا اور تحریرات ہر سال کو مقدمہ اور ہر ماہ کو فصل قرار دیا۔ اور تاریخ بدر نام رکھا۔[1]

ابواب کی تفصیل یہ ہے:

باب اول - ۱۲۷۳ھ ایک فصل (ایک خط)

باب دوم - ۱۲۷۵ھ آٹھ فصلیں (آٹھ خط) کل گیارہ خط -

باب سوم - ۱۲۷۶ھ دو فصلیں (دو خط)

یہ نسخہ خود واجد علی شاہ کا مبیضہ ہے اور اس کے سرورق پر بادشاہ کی مہر ہے۔ ان خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین زور نے لکھا ہے:

"ان خطوط میں نواب بدر عالم نے اپنے بادشاہ شوہر کے فراق کی مصیبتیں نہایت درد انگیز پیرائے میں بیان کی ہیں۔ زبان و اسلوب نہایت شاعرانہ اور پر تکلف ہے اور ان میں واجد علی شاہ کی خانگی زندگی مختلف بیگمات کی خصوصیات امرائے شاہی کے حالات اور دیگر تاریخی امور بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔"[2]

(۸) رقعات بدر مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۲۳ھ

کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ ہم نے اپنے مکرم دوست مولوی سید محمد فاروق صاحب شاہپوری کے اصرار سے اس کتاب کو انجمن ترقی علوم قدیمہ اور انجمن اردو کی تائید میں طبع کرایا ہے۔[3]

یہ تاریخ بدر ہی ہے جس کو نام کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ سید محمد علی عرش ملیح آبادی نے قاسم پریس واقع چنچل گوڑہ میں چھپوایا ہے۔

(۹) بیگمات اودھ کے خطوط مطبوعہ فاروقی پریس، دہلی۔

---

[1] تاریخ بدر قلمی۔ [2] تذکرہ اردو مخطوطات۔ سید محی الدین زور۔ [3]

ان خطوں کو مفتی انتظام اللہ شہابی نے مرتب کیا ہے اور ابتدا میں لکھا ہے :

"بادشاہ اور بیگمات کے نامہ و پیام کا ایک مجموعہ میرے کتب خانہ میں بھی ہے۔ ادبی رسائل میں اکثر ایسے خطوط نظر سے گزرے۔ ان کی نقول اپنے مجموعہ میں اور شامل کرتا رہا۔"

شہابی نے مخزن اسرار سلطانی بھی دیکھی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ "میرے مجموعہ میں ان بیگمات کے خطوط ہیں جن کا مخزن اسرار سلطانی میں ذکر نہیں۔" افسوس ہے کہ شہابی نے اپنے ہر خط کے نیچے حوالہ نہیں دیا ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے مجموعے کے خطوط کون کون سے ہیں۔ ہم نے ان کے بعض خطوں کا مقابلہ نوروزی بیگم اور بدر عالم کے رقعات سے کیا ہے اور ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ شہابی نے اکثر جگہ تحریف کی ہے اور اس کانٹ چھانٹ میں بعض جملے نکال دیئے ہیں اور بعض شوقیہ نظموں کے اشعار کم کر دیئے ہیں۔

یہ خط ہندوستانی عورتوں کے دل کی پکار ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی حکومت کے زوال کے بعد واجد علی شاہ ان کے متعلقین اور رعایا پر کیا گزری۔ ان کے دلوں میں جان عالم کی کتنی محبت تھی اور خود بادشاہ ان حالات سے کتنے متاثر تھے۔ یہ خطوط ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں اور تاریخ ہندوستان کی بہت اہم دستاویز۔

مورخین نے واجد علی شاہ کے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کوئی الزام ایسا نہیں ہے جو ان کے سر نہ لگایا ہو۔ لیکن ان خطوں سے جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ بالکل مختلف ہیں۔ انسان کی اصلی سیرت کا اندازہ عیش میں نہیں تکلیف میں ہوتا ہے۔ یہ خطوط چونکہ انتزاع سلطنت کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس لیے جان عالم کی سیرت کو ظاہر کرنے میں معاون و مددگار ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "وہ اوّل درجہ کے دین دار تھے ان کی نماز قضا نہ ہوتی تھی۔ روزوں کے وہ سچے شوق کے ساتھ پابند تھے"[1] اس میں شک نہیں کہ ان کی بیگمات اور محلات کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن یہ مشرق کا عام دستور رہا ہے اور واجد علی شاہ نے تو ان عورتوں سے بھی جو خادمہ اور پیش خدمت کا کام انجام دیتی تھیں شرعی متعہ کر لیا تھا تاکہ کسی نامحرم پر نظر نہ پڑے۔

---

[1] جان عالم، ص ۱۸۱ (از عبدالحلیم شرر)۔

مٹیا برج میں وہ شاہانہ کر و فر باقی نہیں رہا تھا پھر بھی یہ اس زمانے کا زندہ لکھنؤ تھا۔ لکھنؤ اجڑ چکا تھا لیکن اس کی آخری شمع بنگالے کے ایک کونے میں جھلملا رہی تھی۔

واجد علی شاہ کے عہد کی معاشرت

جان عالم واجد علی شاہ کے عہد کی معاشرت و معیشت کی داستان ہندوستانی تاریخ کا شاید سب سے زیادہ رنگین باب ہے اور بغیر اس کو سمجھے ہوئے حزن اختر کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت زندگی "سکر دوام" میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہر شخص یک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ باغوں کے جلسے، برساتوں کے میلے، حسینوں کے جمگھٹے شعر و شراب و شباب کی رنگینیاں رقص و سرود کی محفلیں غرض ایک ہنگامۂ نشہ و طرب تھا کہ ہر طرف برپا تھا۔ فیض نسیم بھی تھا اور جلوۂ گل بھی۔ نظارۂ جمال بھی تھا اور شوق وصال بھی۔ ہر منظر جنت نگاہ اور ہر گوشہ بساط دامان باغباں بنا ہوا تھا۔ " جان عالم پیا" کی عشرت گاہ پرستاں بن گئی تھی۔ غزالہ ماہر و کرشن لیلا اور اندر سبھا کے تماشے ہوتے تھے۔ ساون کی مست پریوں کے گانے باغوں کے جھولے قیصر باغ میں "کیڑے بھی رنگے جوگن بھی بنی در در میں پھری سیاں کے لیے" کی تانیں ۔۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام لکھنؤ جھوم رہا ہے۔ ہیئت کا نظام بدل گیا ہے۔ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے اور شام و سحر کی یہ رنگینیاں قائم و دائم ہو کر رہ گئی ہیں۔

یکایک زمانے نے ایک ورق الٹا اور وہ سرور و سوز اور جوش و خروش باقی نہ رہا۔ واجد علی شاہ تخت و تاج سے محروم کر دیئے گئے اور ان کو لکھنؤ سے مٹیا برج بھیج دیا گیا، وہاں قید و بند کے مصائب بھی اٹھائے۔ حزنِ اختر میں لکھا ہے :

یہ اختر جو ہے خاکپائے جہاں ۔۔۔ یہ شاہِ اودھ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوسِ اہلِ فرنگ ۔۔۔ طبیعت سے جاتی رہی ہے امنگ
کہ برسوں مجھے قید میں ہو گئے ۔۔۔ میرے بخت بیدار سو سو گئے

واجد علی شاہ کی معزولی

واجد علی شاہ کی معزولی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کا اثر خود ان پر، لکھنؤ پر اور

ان کے متعلقین پر بہت برا پڑا۔ کل تک جس کے ۱۰۰۰۱ اہل علم، ۵۰۰ طبیب، ۱۵۰۰ چوبدار ملازم تھے وہ دفعتاً شہر یاری و سروری سے محروم کر دیا گیا اور وطن سے دور دیارِ غیر میں پھینک دیا گیا۔ جس وقت وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے لکھنؤ سے رخصت ہوئے ہیں ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

تو سننے والوں کے کلیجے شق ہو گئے۔ بچہ بوڑھا عورت مرد ہندو مسلمان کوئی ایسا نہیں تھا جو دھاڑیں مار کر نہ رو رہا ہو۔ ان کی یاد میں غزلیں لکھی گئیں۔ گیت گائے گئے۔ ڈنڈے والوں اور بھاٹوں نے اپنے مذاق کی نظمیں گلی گلی اور کوچے کوچے میں سنائیں۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا عورتیں یہ شعر نہ پڑھتی ہوں ؎

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا
سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

یہ واقعات عبدالحلیم شررؔ نے بیان کیے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو غلط سمجھا جائے۔ نواب خاص محل نے ایک خط کلکتہ سے رشیدا بیگم کے نام لکھا ہے اس سے بھی ان حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

"بہن رشیدا بیگم میراں جی کی ۲۷ تاریخ ۱۲۷۱ھ پنج شنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولنے کا جبکہ سلطان عالم کو جنرل اوٹرم صاحب نے باپ دادا کی سلطنت چھوڑنے اور حکومت سے دست بردار ہونے کا حکم دیا ہے اور لکھنؤ سے ہم لوگ جدا ہوئے جیسے بلبل گلزار سے چھوٹی۔ یوسف مصر سے نکلے۔ بوئے گل چمن سے جدا ہوئی۔ پیا جان عالم کا سکوت اور تمام عملہ کا حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بے کسی آنسو بہانا کمال ادب سے رومال میں غم کے موتیوں کو سمونا۔ اعزا کو ہچکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم آخرش محلات میں ماتم بپا کرتے ہوئے سلطان عالم کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ اس وقت جان عالم کا یہ کہنا "تم پر دس برس تک میں نے سلطنت کی۔ اس عرصہ میں جو کچھ صدمہ اور رنج میری ذات سے تم کو پہونچا ہو۔ اس کو بخوشی معاف کر دو۔ اس وقت ہم معزول ہوئے

اور تم سے چھٹتا ہوں۔ خدا جانے زندگی میں پھر ملوں یا نہ ملوں۔ بہن اس جملہ نے تمھیں یاد ہے مجمع کو مجلس ماتم بنا دیا تھا۔ حضرت منورالدولہ احمد علی خاں نے کہا سرکار ایسے وقت میں غلام کو قدموں سے جدا تو نہ کرو۔ سلطان عالم خاموش ہو گئے۔ حضور ملکہ کشور آرا بیگم صاحبہ اور بھیّا سکندر حشمت سلمہ اور لختِ جگر نورِ نظر ولی عہد بہادر سلمہ میں اور چار اور سرکار کی خادمہ ہمراہ تھیں۔"

آگے چل کر سفر کی روداد لکھی ہے:

"رجب کی پانچویں کو لکھنؤ سے چلے تھے۔ کانپور پہنچے۔ میرا روتے روتے بُرا حال ہوا۔ براؤن صاحب کے بنگلہ میں ہم لوگ مقیم ہوئے۔ رجب بھر مہینا وہیں بیتا۔ شعبان کی پہلی کو الہ آباد کو رخصت ہوے۔ آٹھ دن وہاں ٹھہرے۔ پھر بنارس آئے۔ راجہ بُرا نا نمک خوار تھا۔ اپنی سی اس نے اچھی خدمت کی۔ رانیاں حضور ملکہ کی بڑی تواضع کرتیں۔ ہر وقت ہاتھ باندھے چاکری میں کھڑی رہتیں۔ مجھ مغموم کی پوچھ بھی بہت تھی۔ میں ہر وقت سلطان عالم کی دلجوئی میں لگی رہتی۔ ان کا باتوں میں دل بہلاتی مگر وہ غم میں گھلے جاتے ہیں۔ میں واری جاؤں یہ حال دیکھ کے دل کڑھتا ہے۔ بنارس سے دخانی جہاز پر سوار ہوئے رمضان کی ۲۷ر کو کلکتہ ہمارا قافلہ پہنچا۔ سب پر تکان کا اثر ہے۔ اس وقت تم کو راستہ کی مختصر کیفیت لکھ رہی ہوں۔ تم بھی حال لکھنا۔ ہمارے پیچھے کیا بیتی۔

راقمہ نواب خاص محل، کلکتہ۔ ۲۹ر رمضان ۱۲۷۱ھ"[1]

کلکتہ میں واجد علی شاہ اہلِ لکھنؤ کی تکلیفوں سے بے خبر نہیں رہے۔ اپنی تکلیف سے زیادہ ان لوگوں کی تکلیف کا خیال تھا۔

جانِ عالم نواب منّا جان کو لکھتے ہیں۔

"خط تمھارا دل سے عزیز جان سے پیارا بست دیکم شہر حال کو معرفت کنز الدولہ بہادر کی کلید قفل مسرت ہوا (منظومات مندرجہ سے دریافت ہر ایک حال ہوتا)۔

---

[1] یہ ٹکڑا مخزن اسرار سلطانی میں تو ہے لیکن شہابی نے حذف کر دیا ہے۔ بیگمات اودھ کے خطوط۔ ص ۲۰۔

E
10

اہلِ شہر کی بے قراریاں معلوم ہوئیں۔ ان کی ایذائیں سب مفہوم ہوئیں۔ واللہ جان جان ان سے زیادہ بے قرار ہوں گھر چھوڑے ان سب کے لیے سا کنِ دیارِ نکبت آثار ہوں ..... مرقوم ۲۳ ر رجب ۱۲۷۳ھ۔ راقم جان عالم[1]"

داد خواہی کے لیے وفد

نواب واجد علی شاہ کو اپنی بے گناہی کا پورا الیقین تھا اور وہ انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ کے سامنے داد فریاد کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک وفد لندن روانہ کیا تھا۔ جان جاں بیگم اس کی روداد سرفراز بیگم کو لکھتی ہیں :

"جناب عالیہ کے ساتھ ولایت جانے کے لئے ایک سو دس آدمی سب ذکور و اناث تجویز ہوئے۔ مولوی محمد مسیح الدین خاں سفیر شاہی ان کی پیشی میں میر محمد رفیع مقرر ہوئے۔ حاجی الحرمین شیخ محمد علی واعظ و ذاکر رفیق خاص جنرل صاحب و جلیس الدولہ مصاحب مرزا ولی عہد بہادر کو دس لاکھ روپیہ اخراجات کے لئے دیئے گئے۔ جناب ملکہ معظمہ دام اقبالہا کے لئے ایک ہار الماس کا جس کا وزن تین سیر دوسرا ہار یاقوت کا زمرد کی کنگھی پرچہ الماس بہت سے مالۂ مروارید اور انگوٹھیاں اور پیشواز بہت تکلف کی بتیس ہزار روپیہ کی تیار کی ہوئی ایک نامہ شاہی متضمن حال خود جناب ملکہ دوران اور مختار نامہ جزلی و کلی سپرد جناب عالیہ کیا گیا۔ آخر استخارہ ذات الرقعہ لیا پانچ رقعے نکلے۔ ۱۴ر شوال روز شنبہ ۱۲۷۲ھ بارہ بجے رات کو جناب عالیہ سوار ہوئیں۔ وقتِ رخصت عجیب حشر و نشر محل سے برپا ہوا۔ نعرہ الفراق و الوداع۔ مخدرات اس پردۂ شب میں محیط کرۂ عالم ہوا۔ ہر ایک کی آنکھ سے مسلسل دُرِ اشک بہہ رہے تھے۔ صبح جہاز نے لنگر اٹھایا۔ زیر کوٹھی شاہی گزرا۔ بادشاہ سلطان عالم فرطِ بے قراری سے برآمدے میں کھڑے ہوئے۔ جنرل صاحب و مرزا ولی عہد نے آداب و سلام بادشاہ سے کئے۔ خدا حافظ کہہ کے رخصت کیا۔ طرفین کو

---

[1] مخزن اسرار سلطانی (قلمی) ص ۱۶۴۔ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن نمبر ۱۹۹۹۱/۳۴۳

عجیب صدمہ روحانی ہوا۔ میں نے غم میں دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ جان عالم نے کہا بھی۔ مگر میں روتی رہی۔ جو حال پُر ملال ہم پر گزرا وہ تم کو لکھ دیا۔

رخصت سیر باغ نہ ہوئی   یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

جان جاں بیگم، کلکتہ، ۱۶ شوال ۱۲۷۲ھ "

فورٹ ولیم میں نظر بندی

بادشاہ خود انگلستان جانا چاہتے تھے لیکن اپنی علالت کی وجہ سے نہ جا سکے۔ سال بھر کی علالت کے بعد شفا پائی تو ۱۸۵۷ء میں غدر کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور انگریزوں نے ان کو "انیس غربت مہ جبینوں کی آغوش اور معدودے چند رفیقانِ ہجر کی صحبت" سے بھی محروم کر کے فورٹ ولیم میں قید کر دیا۔ جہاں بجز چند مصاحبوں کے اور کوئی مونس اور غمگسار نہ تھا۔ یہ پوری روداد جان عالم واجد علی شاہ نے اپنے دردناک لب و لہجہ میں شیدا بیگم کو ایک خط میں لکھی ہے، ملاحظہ ہو :

"معلوم ہوا کہ اودھ میں کچھ بلوائی لوگ جمع ہوئے ہیں اور سرکار انگریزی کے خلاف ہو گئے ہیں۔ کم بختوں سے کہو ہم چپ چاپ چلے آئے۔ تم لوگ کاہے کو دنگا مچا رہے ہو۔ میں یہاں بہت بیمار تھا۔ صفرا کی تپ نے دق کر دیا تھا۔ آخر تدبیر کے بعد صحت ہوئی جس قدر نذر و نیاز مانی تھیں وہ کی گئیں۔ جلسہ رات بھر رہا۔ ناچ گانا ہوتا۔ کوئی چار گھڑی رات باقی ہوگی۔ غل پکار ہونے لگا ہم غفلت میں پڑے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی ہکا بکا رہ گئے۔ دیکھا کہ انگریزی فوج موج در موج ٹڈی دل چاروں طرف سے آ گئی۔ میں نے پوچھا یہ کیا غل ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا علی نقی قید ہو گئے۔ مجھ کو غسل کی حاجت تھی۔ میں تو حمام میں چلا گیا۔ نہا کر فارغ ہوا کہ لاٹ صاحب کے سکریٹری حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔ میرے ساتھ چلئے۔ میں نے کہا آخر کچھ سبب بتاؤ۔ کہنے لگے گورنمنٹ کو کچھ شبہہ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا میری طرف سے شبہہ بیکار ہے۔ میں تو خود جھگڑوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ اس کشت و خون اور خلق خدا کے قتل و غارت کے سبب سے

تو میں نے سلطنت سے ہاتھ اُٹھالیا۔ میں بھلا اب کلکتہ میں کیا فساد کرا سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا مجکو صرف اتنا معلوم ہے کہ کچھ لوگ سلطنت کے شریک ہوکر فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اچھا اگر انتظام کرنا ہے تو میرے چلنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ہی مکان پر فوج مقرر کردو۔ انھوں نے کہا مجکو جیسا حکم ملا ہے وہ میں نے عرض کردیا۔ بالآخر میں ساتھ ساتھ چلنے پر تیار ہوا۔ میرے رفقا بھی چلنے پر تیار ہوگئے۔ سکریٹری نے کہا۔ صرف آٹھ آدمی آپ کے ہمراہ چل سکتے ہیں۔ بھوپا مجاہد الدولہ۔ ذہانت الدولہ سکریٹری صاحب اور میں ایک بگھی میں سوار ہوکر قلعہ میں آئے اور قید کرلئے گئے۔ میرے ساتھیوں میں ذوالفقار الدولہ فتح الدولہ خزانچی کاظم علی سوار باقر علی حیدر خاں کول، سردار جمال الدین چپراسی، شیخ امام علی حقّہ بردار، امیر بیگ خواص، ولی محمد مہتر، محمد شیر گولہ انداز، کریم بخش سقّہ، حاجی قادر بخش کہار، امامی گاڑی پوچھنے والا، یہ قدیم ملازم نمک خوار تھے۔ زبردستی قید خانہ میں آگئے۔ راحت سلطانہ خاصہ بردار حسینی گلوری والی، نورالخانم مغلانی، طبیب الدولہ حکیم بھی ساتھ آیا۔ دیکھا دیکھی آیا تھا۔ گھبراگیا اور کہنے لگا۔ خدا اس مصیبت سے نجات دے۔ میں نے بہت کچھ حق جتائے کہ تجھ کو بیس برس پالا ہے مگر وہ اپنی جان چھڑا کر بھاگ گیا۔ جس قلعہ میں ہم قید کئے گئے اس کو قلی باب کہتے ہیں۔ یہ خط کربلائی آب خاصہ بردار کے بھائی کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ ؎

ہوا ہے اب تو یہ نقشہ ترے بیمارِ ہجراں کا
کہ جس نے کھول کر مُنہ اس کا دیکھا بس وہیں ڈھانکا

جان عالم اختر"

<u>قید و بند کے مصائب</u>

جان عالم نے اکثر خطوں میں قید و بند کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ ان خطوں کا لب و لہجہ بہت دردانگیز اور غم افزا ہے۔ بظاہر افسروں نے اعزاز میں فرق نہیں کیا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی جینے سے بیزار تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

" صبا بھی ہم قیدیوں کی پیغامبری نہیں کرتی۔ ہر طرف پہرا ہے۔ ہر طرف یاس ہے۔ دو رفیق ہیں۔ ایک خوف دوسرا ہراس۔ ایک قید خانے میں ہم پڑے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف حراست ہے۔ ہمارے ساتھ اٹھارہ آدمی مصیبت جھیل رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے جینے سے بیزار ہے۔ قید غم میں گرفتار ہے۔ بہشتی و خاکروب آتے ہیں ان کے ساتھ ایک ایک گورا بھی آتا ہے۔ مجال کیا جو منہ سے بول سکے۔ قید خانہ کی کوٹھی بہت وسیع ہے مگر میرے کس کام کی۔ ہر وقت دروازے بند گرمی سے دل تنگ ہے اور پریشان ہوں۔ حالت تباہ ہے۔ جب دروازے کھلتے ہیں تو دھوپ کی شدت سے جان بیزار ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ لاٹ صاحب کو شکایتی خطوط بھیجے مگر کسی کا جواب نہیں آیا۔ تم خدا کا شکر کرو۔ آزاد ہو اپنی نیند سوتی ہو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ شیدا بیگم کا خط آیا تھا۔ اس کا جواب لکھ دیا ہے۔ اس کو ملا بھی ہوگا یا نہیں۔

وہ بلبل مردود بہار اور خزاں ہوں   جس کا ٹھکانہ نہ چمن ہیں نہ قفس میں
کیا ہے اختر بے پر کو اس نے مکر سے قید   کہیں بھی ہوتا ہے ایسا شکار کا اسلوب

راقم جان عالم " (بنام سرفراز محل)

اس درماندگی و پریشاں حالی میں بعض بیگموں اور دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا بعض بچھڑ گئے بعض روٹھ گئے یا بہانہ کر کے چلے گئے[1] جان عالم کو بعض حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ وہ ہر وقت انھیں یاد کرتے تھے[2] ان سے یادگار محبت کے طور پر خاص خاص چیزیں مانگتے۔ بعض فرمائشیں پوری کر دیتیں اور بعض شوخ ادائی سے انکار کر دیتیں۔ تو اس کا بے حد رنج ہوتا اور پہروں دل قابو میں نہ آتا۔ ایک خط میں انھوں نے ماضی و حال پر تبصرہ کیا ہے:

" دیکھو تو زمانہ کا کیا عالم ہو گیا۔ زاویۂ تنہائی میں بیکس ہوں۔ آہ وہ صحرا مصاحبین میں کبھی شہنشاہ تھے۔ ملک اودھ کے بادشاہ تھے۔ اب جنگل مسکن ہے۔ افسوس

---

[1] خط بنام شیدا بیگم مورخہ دہم رجب ۱۲۷۳ھ۔ [2] خط بنام سرفراز محل۔

جان عالم ہے اور سندر بن ہے۔ سب نے سنا: تم کو چھوڑ دیا۔ یگانہ و بیگانہ نے
رشتۂ الفت توڑ دیا۔ خدا ہر دم ہمراہ ہے۔ ہر وقت لب پر آہ ہے۔ افسوس
جوانی برباد ہوتی ہے۔ تارِ نظر میں چشم در اشک پروتی ہے۔"[1]

نواب نشاط محل کو لکھتے ہیں :

"فرنگیوں کی بے اعتنائی حد سے زیادہ ہے۔ میرے حالات جو صاحبات محل
تک پہنچے ہوں گے، مصائب کی تفصیل ان سے ہویدا ہے۔
حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتلِ ناداں ورنہ   بے گنہ مارنے قابل یہ گنہ گار نہ تھا"

۱۸۵۷ء میں جو آزادی کی لڑائی چھڑی تھی اور جس کی وجہ سے جان عالم قید کیے
گئے تھے وہ اب چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لکھنؤ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر
نہ رہ سکا۔ وہاں جان عالم کے صاحبزادے مرزا برجیس قدر کو تخت نشین کیا گیا[2] اور نواب
حضرت محل اور احمد اللہ شاہ نے جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔ ان کا حال سرفراز بیگم
نے اپنے مخصوص انداز میں اختر محل کو لکھا ہے۔ یہ خط تاریخ کا ایک اہم ورق ہے۔ اس
لیے اس کے ضروری اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

"میری ملکہ عالم، رفیق سلطان عالم لکھنؤ کی حالتِ زار جان عالم کے لئے لکھ
رہی ہوں۔ یہاں کا حال دگرگوں ہے۔ برا شگون ہے۔
ایک دن مشہور ہوا کہ کل یا پرسوں فوج بیلی گارد پر دھاوا کرے گی۔
صاحبان محصور کو زیرِ تیغ کرے گی۔ اور وہاں کی زمین کو کھود کر برابر کر دے گی۔
یہ خبر گوش زد صاحبات محل ہوئی۔ آپس میں کہنے لگیں کہ جس وقت یہاں
سب کو قتل کیا جتنے کلکتہ میں ہیں ان کی جان کا ہے کو رہے گی۔ ایک نے کہا

---

[1] مخزن اسرار سلطانی (قلمی) ص ۱۶۷۔ خط بنام رشیدا بیگم مورخہ ۲۹ شعبان ۱۲۷۳ھ۔

[2] دہلی اردو اخبار' مورخہ ۲ اگست ۱۸۵۷ء میں لکھا ہے۔ "عنایت الٰہی سے وہاں (لکھنؤ) کے تمام گورے اور افسر اہل قلم انگریز اعلیٰ سے ادنیٰ تک سب فی النار پہنچائے گئے۔ وہاں کی مسند نشینی بالفعل پسرِ خورد واجد علی شاہ کو بعمر دس برس ہوگئی لیکن مشروط بمنظوری بندگان اقدس ہمارے حضور ظل سبحانی کے (دہلی اردو اخبار۔ نمبر ۳۱۔ جلد ۱۹ نیشنل آرکائیوز دہلی)۔

ہم تم ہی نہ بچیں گے کس واسطے کہ فرنگیوں کا جال مثل گھاس کی جڑ کے ہے۔ جتنا کاٹو اتنا ہی بڑھتا ہے۔ غرض کہ نواب فخر محل بندی جان، نواب سلیمان محل، نواب شکوہ محل، نواب فرخندہ محل، یاسمین محل، محبوب محل، اور کئی محل جمع ہو کر حضرت محل سے کہنے لگیں اور نواب خورد محل اور نواب سلطان جہاں محل اُن کی شریک تھیں۔ کہا کہ تم سب طرح اچھی رہیں۔ تمہارا بیٹا بادشاہ ہوا۔ مبارک۔ مگر ہم سب بے وارث ہوئی جاتی ہیں۔ کل فوج کا یہ ارادہ سُنا ہے۔ اب تمہیں انصاف کرو پھر بادشاہ اور محلات وغیرہ جتنے کلکتہ میں ہیں زندہ بچیں گے یا سب پھانسی دئے جائیں گے۔ ایسی سلطنت کو چولھے میں ڈالو۔ جناب عالیہ نے برہم ہو کر جواب دیا معلوم ہوا تم سب ہمارا بُرا چاہتی ہو۔ بلکہ اس سلطنت کے ہونے سے جلتی ہو۔ غرض کہ ایسی جلی کٹی ہوئی جناب عالیہ برجیس قدر کو لے کر اندر دالان میں چلی گئی۔ یہ خبر افسروں کو لگ گئی مفتاح الدّولہ وغیرہ حضرت محل کے پاس آئے۔ اور کہا محلات فرنگیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ نکال باہر کرو۔ وہ بولیں صبر سے کام لو۔ دوسرے دن بیلی گارد پر حملہ کرنے چلے۔ مگر پہلے شہر پر ہاتھ صاف کیا۔ لوٹ مار کی۔ برجیس قدر نے خود گھوڑے پر بیٹھ کر تلنگوں کو بلوا کر کہا، بہادرو ہم تم سے بہت خوش ہوئے۔ خوب لڑتے ہو۔ مگر رنج یہ ہے یہ ہے کہ تم شہر کو لوٹتے ہو۔ سب رعایا بد دعا کرے گی۔ افسروں نے دست بستہ عرض کی۔ جناب عالی اب شہر نہ لٹے گا۔ اور دلّی سفیر روانہ کیا کہ حضور بہادر شاہ سے سند مسند نشینی کی لی جائے۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں سے مقابلہ کرتی ہے۔ آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے اور اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔ عالم باغ پر بڑا مقابلہ رہا۔ احمد اللہ شاہ[1] سے بھی حضرت محل مل لی۔ ہر دو نے بڑی جانفشانی دکھائی۔ مگر قسمت کو کیا کریئے۔

---

[1] مولانا سید احمد علی عرف ضیاء الدین خطاب دلاور جنگ۔ عام طور پر مولوی سید احمد اللہ شاہ مدراسی کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ یہ جلال الدین عادل کے پوتے اور ابوالحسن تانا شاہ والی گول کنڈہ کے پڑپوتے تھے (ملاحظہ ہو تذکرۂ علما (قلمی) از اکرام اللہ گوپاموی)۔ شاہ صاحب نے انگلستان، مصر، عرب و ایران کا سفر کیا تھا اور وہ اس زمانے کے

(باقی صفحۂ آئندہ پر)

۲۲ر دسمبر، ۵۷ء کا روز تھا۔ فرنگی سردار جنرل اوٹرم اور جنرل ہوپ لاک مقابل تھے۔ ۴۰ ہزار فوج یہاں جمع تھی۔ پانی بڑے زور کا برسا۔ تاریکی ہوگئی۔ فرنگیوں کی توپ نے اور گولے برسائے۔ تلنگے پلٹے۔ ممو خاں اور اشرف الدولہ نے ہٹ کر ناکہ چار باغ لیا۔ راجہ مان سنگھ نے بڑی بہادری دکھلائی۔ نو ہزار جمعیت سے ایسا مقابلہ فرنگیوں کا کیا کہ ان کے جی چھوٹ گئے۔ شام ہوگئی تھی۔ جناب عالیہ نے راجہ مان سنگھ بہادر کو جاں فشانی و جاں بازی پر خطاب فرزندی دیا کہ خلعت دوشالہ رومال اور ملبوس خاص دوپٹہ عنایت کیا اور بہادری کی بڑی تعریف کی۔ مگر یہ سب تدبیریں الٹی رہیں۔ آخرش ہم کو شکست اٹھانا پڑی۔ کانپور سے نانا راؤ پیشوا آیا۔ دتی سے جنرل بخت خان روہیلہ یہ رشتہ دار ملکہ خاص کا ہے۔ شاہزادہ فیروز شاہ آئے۔ احمد اللہ نے بڑی بہادری دکھلائی۔ سب نے منہ کی کھائی۔ فرنگیوں نے جان توڑ کر تلنگوں کو پسپا کیا۔ قیصر باغ کے محلات پر گولے گرے بیگمات بھاگیں۔ بڑی افراتفری تھی۔ خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھلائے۔ پا برہنہ،

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

قومی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر تھے۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تھا ٹیپو سلطان کے کارناموں کا غلغلہ بلند تھا انگریزوں کا عروج اور ہندوستان کی بیکسی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ انھوں نے علوم رسمی کے ساتھ فنون حرب بھی سیکھے۔ اور میر قربان علی سجے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ ہفتے میں تیسرے روز بعد نماز عصر قلعہ اکبر آباد کے میدان میں مریدوں کو لے جاکر فن سپہ گری اور شہ سواری کی مشق کراتے تھے۔ تقریر کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو مسلمان جمع ہو جاتے تھے (مسلمانوں کا روشن مستقبل، چوتھا ایڈیشن، ص ۱۰۰) شاہ صاحب نے غدر میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور اُن کے نام کا سکہ بھی جاری ہوا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادمِ محراب شاہ حامیٔ دین محمد احمد اللہ بادشاہ

(ملاحظہ ہو تاریخ احمدی منظوم از مولوی فتح محمد تائب لکھنوی)

لیکن ہندوستانیوں میں اتحادِ عمل اور یک جہتی نہیں تھی اس لیے انگریزوں کے قدم پھر جم گئے اور شاہ صاحب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کا سر کاٹ لیا گیا اور جسم آگ میں جلا دیا گیا۔ ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء (تاریخ شاہ جہاں پور، ص ۱۳۹) جنرل ٹامس نے شاہ صاحب کے متعلق لکھا ہے: "مولوی احمد اللہ بڑی لیاقت اور قابلیت رکھتا تھا ...... باغیوں میں اس سے بہتر سپاہی نہ تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کالن کیمبل کو میدانِ جنگ میں ناکامیاب رکھا۔"

سراسیمہ، پریشاں حال، دامن بڑے پائنچوں کے اپنی پتلی کمروں سے باندھے ہوئے
پاندان اور بیش قیمت اشیاء ساتھ لئے بھاگتی پھرتی تھیں۔ جناب عالیہ سراسیمہ،
پریشان، پاپیادہ مع صاحبات اور شاگرد غول عورات ملازمین باغ کے کوٹھوں
پر سے گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے باہر نکلیں۔ حلقۂ عورات صف بستہ،
ان کے بیچ برجیس قدر ایک سیّد کی گود میں، کندھے سے چمٹے ہوئے اور غالیچہ
اور چاندنی رفع احتمال کو ڈالے ہوئے۔ جس نے راہ میں قافلۂ ناموس شاہی
کو دیکھا بے اختیار پیٹنے اور رونے لگا۔ یہ انقلاب کا زمانہ تھا۔ بہر حال
گلیوں میں گرتی پڑتی ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کے مولوی گنج میں جواہر علی خاں
کے یہاں پہنچے۔ وہاں سے پینس میں سوار ہو کر غلام رضا خاں کے گھر آ ترِیں۔
پھر شرف الدولہ کے یہاں گئیں۔ رات کو شاہ جی کے مکان میں ٹھہریں۔ جنرل
اوٹرم نے کہلا بھیجا کہ تم اپنے محل میں آرام سے رہو۔ ہم باغیوں کو نکال کر تمہارا
احترام کریں گے۔ حضرت محل نے مصیبت اُٹھا کر ہمت نہیں ہاری۔ ۲۹ رجب ۷۴ھ
کو قریب شام مع برجیس قدر پینس میں سوار ہو کر ناکۂ عالم باغ کی طرف سے مع ممو خاں
گھوڑے پر سوار لکھنؤ سے روانہ ہو گئیں۔ راستہ میں راجہ مردن سنگھ زمیندار ترّدی
سے پیش آیا۔ مولوی عمادالدین دیوی عرف مولوی محمد ناظم بسواں باڑی تین کوس
سے استقبال جناب عالیہ کے لئے آئے۔ بڑی دھوم سے نقارہ و نشان
جلوس سواری سے مرزا بندہ علی بیگ کے امام باڑے میں اتارا۔ راہ میں فقرا
کو دو ہزار خیرات کئے۔ جب داخل شہر ہوئیں توپیں سلامی چلیں۔ وہاں
صلاح ہوئی کہ بریلی کو چلیں۔ چنانچہ یہ قافلہ آگے کو روانہ ہو گیا۔ میری
چھوکری یاسمین ساتھ تھی وہ لوٹ آئی۔ اور اس نے سب حال کہا جو جانِ عالم
کے سنانے کے لئے تم کو لکھ رہی ہوں۔ اب یہاں فرنگیوں کا معاملہ مولوی احمد اللہ شاہ
سے ہو رہا ہے۔ دیکھئے کیا انجام ہو۔ میں بھی اپنی بھانجی کے یہاں خیر آباد جا رہی
ہوں۔ دیکھوں یہ خط میرا پہنچتا ہے یا نہیں۔ مفتاح الدولہ کے آدمی کے ہاتھ

بھیجتی ہوں۔ وہ یہاں سے بھاگ کر کلکتہ جا رہا ہے۔"

سرفراز بیگم کا خط نہ صرف تاریخی معلومات کا گنجینہ ہے بلکہ وہ نسوانی جذبات کا بھی مظہر ہے۔ انھوں نے حضرت محل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شیدا بیگم کے خیالات سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ جانِ عالم کو لکھتی ہیں :

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا کہ جس کی عورت ایسی جوانمردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہے تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہوگا۔ جب ہی خوف سے حضور کو آنکھوں آنکھوں میں رکھا۔"

لیکن غدر میں جب پانسا پلٹا تو ان ناز پروردہ بیگمات و محلات پر قیامت گزر گئی۔ جاہ و حشم دولت و ثروت آسائش و آرام سب یک لخت جاتا رہا۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں تھی۔ ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے کا آغاز تھا۔

<u>بیگمات کی مصیبتیں</u>

شیدا بیگم لکھتی ہیں :

"جانِ عالم فرنگیوں نے بڑی بے دردی سے حضرت باغ پر گولے برسائے۔ محلات کے ساتھ میں بھی جان لے کر بھاگی۔ سب سامان حضرت باغ میں چھٹ گیا اور جو کچھ بچ رہا تھا وہ سب مسافرت میں لٹ گیا۔ اب سر دست یہ حال پہنچا ہے کہ جب کسی سے نہیں قرضہ بہم پہنچتا ہے تو نوبت فاقہ کشی کی آتی ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر نگین آرا کے انتقال کی خبر لکھتی ہیں :

"والدین اور ہمشیر کے ساتھ پیدل ننگے سر کرسی تک پہنچے۔ وہاں نگین آرا بیگم کو بخار آیا۔ تین روز وہاں مقام ٹھہرایا۔ چوتھے دن سب وہاں سے بھاگے میں بھی بڑھی آگے۔ آخر رفتہ رفتہ تقدیر ہم کو مصیبت کی جگہ لے گئی۔ یہ صدمۂ غم ہم کو دے گئی۔ راہ میں نہ دوا میسر ہوئی کچھ نہ اس کو افاقہ ہوا۔ گرمی سے سر کا تڑاقا ہوا۔ سترھویں رمضان کو اس نے انتقال کیا۔ ہمارا غیر حال کیا۔ اب تک جب صورت یاد آتی ہے

ٹکڑے چھاتی ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنے تئیں ہلاک کروں، گریبان اور کسوت حیات چاک کروں۔ ناچار ہوں اگر اس طرح موت نہ ہوتی حرام تو میں کرتی اپنا کام تمام۔

ہمیشہ آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے
الٰہی موت دے گزری میں ایسے جینے سے

اس مصیبت سے کوئی بچا ہوا نہیں تھا۔ حور بیگم کے اوپر بھی یہی تکلیفیں گزریں، وہ روٹیوں کو محتاج ہو گئیں، کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ اثنائے راہ میں کبھی کھانا ملا اور کبھی فاقہ ہوا شہزادی دیہیم آرا ان تکلیفوں کو برداشت نہ کر سکی اور بالآخر راہیِ جنت ہوئی۔

"جب سے سب محلات کے ساتھ نکلی شہزادی کو لئے لئے ننگے پاؤں چلی۔ راستے میں سب سے مفارقت ہوئی۔ بدشواری تمام سعادت گنج پہنچنے کی نوبت آئی۔ وہاں بڑی تلاش سے ایک مکان خالی پایا۔ اس میں دو دن کی بسر تیسرے دن بخوف جان آبرو وہاں سے کیا سفر۔ غرض کہ یوں ایک دن کہیں رہی اور دو دن کہیں رہی۔ اس آوارگی میں طاقت جینے کی بھی نہیں رہی .... آخر افتاں و خیزاں ہر قریہ و قصبہ میں پھرتی ہوئی اپنے گھر معافی خاں کی سرا میں آئی، وہاں آ کر سب سے زیادہ مصیبت اٹھائی۔ شہزادی دیہیم آرا بیگم بیمار ہوئی۔ ہماری حالت دل زار ہوئی۔ وہ صدمہ کس منہ سے بیان کروں کہ راحت جاں ہماری رمضان میں قضا کر گئی۔ خدا شاہد ہے کہ میں جیتے جی مر گئی۔ اب تک جب اس کی صورت یاد آتی ہے ٹکڑے چھاتی ہو جاتی ہے۔ اے جانِ عالم خدا و رسول گواہ ہے سب سے زیادہ میری حالت تباہ ہے۔ کھانے پینے سے حیران ہوں۔ گھر تک جاتا رہا[1]"

---

[1] شہابی نے اس خط کی تاریخ ۲ ر ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ دی ہے جو صریحاً غلط ہے۔ (ص ۵۹) کتب خانہ خدا بخش کے قلمی نسخے میں اس کی تاریخ ۴ ربیع الآخر ۱۲۷۵ھ مندرج ہے جو یقیناً صحیح ہے۔ یہ تمام خطوط ۱۲۷۵ھ ہی کے ہیں۔ شہابی اور خدا بخش کے قلمی نسخے کی عبارتوں میں بھی اختلاف ہے۔

خط لکھنے کے لیے صرف کاغذ اور قلم ہی کی نہیں، خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے جانِ عالم اور ان کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی سرخی ہے، جذبات کی گھٹا ہے، ارمانوں کا سوگ ہے، ان میں دل کی کیفیات کا اظہار ہے لیکن ایسا بے لاگ جیسے تیر کمان سے نکل جائے۔ یہ خطوط صرف تاریخ کے طالب علم ہی کے لیے اہم نہیں ہیں، ادب کا بھی بیش قیمت سرمایہ ہے۔

ان خطوں کی ادبی قدر و قیمت

عبدالحلیم شرر نے ان خطوں کے متعلق حزنِ اختر کے مقدمے میں لکھا ہے :

"بادشاہ اور ان کے محلات کے درمیان میں جو خط و کتابت ہوئی وہ خطوط "تردد نامہ" کے لفظ سے یاد کئے جاتے اور اکثر رنگین و پرافشاں کاغذ پر ہوا کرتے ..... ان میں زبان کی پاکیزگی کے ساتھ نہایت ہی شستہ و رفتہ بامحاورہ زبان کا لحاظ رکھا جاتا اور عاشقانہ رنگین بیانی ہوتی ..... مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا انھیں تردد ناموں کی برکت ہے۔"[۱]

ایک اور موقع پر لکھا ہے :

مجھے فارسی عاشقانہ عبارت آرائی کے شوق میں یہاں بیت الاجرا واجد علی شاہ میں حسن و عشق کا ایک نہایت ہی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ بادشاہ کے نام محلات عالیات اور بیگمات جو خطوط بھیجا کرتیں وہ خطوط بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد اسی دفتر بیت الاجرا میں محفوظ رکھے جاتے۔ یہ خط جو تردد نامے کہلاتے علی العموم سرخ اور پرافشاں کاغذ پر ہوتے اور عموماً عاشقانہ انداز سے رنگین عبارت میں لکھے جاتے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہوگی جن کو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے ان میں بڑا لطف آیا۔ افسوس کہ وہ نایاب ذخیرہ خدا جانے کہاں گم ہوگیا۔ آج موجود ہوتا تو شائع کرنے کے قابل تھا۔ اس لئے کہ اس میں جتنے خطوط تھے بیگمات انشاپردازوں کے لکھے ہوئے تھے اور نہایت زورِ قلم دے کر رنگین عبارتوں میں لکھے گئے تھے .... ہر ایک خط میں ایک جداگانہ جدت طرازی اور تازگی تھی۔ بہرحال میری انشاپردازی

---

[۱] جانِ عالم، ص ۸۱ - ۸۲۔

کا پہلا انصاب بھی تر د د نامے تھے جو ظاہری صورت اور باطنی رنگ عبارت دونوں حیثیتوں سے بہت ہی دلکش ہے[۱]"

عورتیں زبان کی سب سے بڑی محافظ ہوتی ہیں اور اُردو کی ٹکسالی زبان کا تو دارومدار صرف بیگمات پر ہے۔ واجد علی شاہ کی بیگمات کو اس معاملے میں خصوصیت حاصل ہے۔ ان کی زبان سند ہے اور اس کی صحت اور پاکیزگی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

عورت صحیفہ قدرت کا ایک دلکش موضوع اور کائنات کی لطافتوں کا اختصار ہے۔ شاعری اس کی نگہ حسین سے شراب بن گئی ہے اور ادبیات کی تحریک شعری سرتاسر اس کی رہین منت ہے۔ خطوں میں جو طرحداری ہے وہ اسی کے جمال کا پرتو ہے۔ شاید اسی لیے خواتین مکتوب نگاروں کا مرتبہ قابلِ رشک رہا ہے۔

طرزِ نگارش

بیگماتِ اودھ کے خطوں میں روزمرّہ کی چاشنی، الفاظ کی ترتیب، محاورات کی برجستگی اور ندرت ادا کی شیشہ گری یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرٹ ناقص ہے جس میں کوئی طرز اور اسلوب نہیں ہے۔

واجد علی شاہ کا بھی علمی مذاق نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اور دراصل ان میں دو ہی ذوق تھے۔ ایک ادب اور شاعری کا اور دوسرا موسیقی کا۔ شرر کا بیان ہے کہ "ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے وہ عالم نہ تھے مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہو گا۔" اُردو میں انھوں نے جو تصانیف چھوڑی ہیں وہ ان کی قابلیت کی گواہ ہیں۔ خطوط کے لیے کسی خاص علم و فضل کی ضرورت نہیں ہے وہ صرف "حسنِ اتفاق" کا نام ہیں اور صرف چند لمحات کی یاد قائم رکھنے کے لیے لکھے جاتے ہیں اور زندگی میں شاید یہ لمحات ہی سب سے زیادہ عزیز چیز ہیں۔

اودھ کے اس غم نصیب بادشاہ نے بھی اکثر خطوں میں ان عزیز لمحات کی یاد تازہ کی ہے اور تصوّر میں اس محفل طرب کو دوبارہ آراستہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے

---

[۱] دلگداز۔ جون ۱۹۳۲ء، ص ۱۲۳ (آپ بیتی)۔

اوقات کو جذبات کی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر جیا ہے وہ عالمِ خیال ہی میں کیوں نہ ہو بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ان دلربا اداؤں دلچسپ واقعات اور حسین یادوں کا وہ ایک مینا بازار سا لگاتے ہیں اور قید خانے کی خلوت میں ان کو دلِ صد پارہ کی قاشوں سے مکرر اور سہ کرر خریدتے ہیں۔ اس سے ان کے زخموں میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے اور حال کی تلخیاں ایک حد تک گوارا ہو جاتی ہیں۔ ان تلخیوں کی کچھ حد بھی ہے۔ تاج و تخت سے محرومی، سلطنت کی تاراجی، ماں اور بھائی کی دائمی مفارقت، قید و بند کے مصائب، نگین آرا اور دیہیم آرا کا انتقال، دوستوں کی بدسلوکی، بیگمات و محلات کی تباہی اور مفلسی۔ پھر اپنی بے زری اور بے کسی۔ غرض مصائب کا اتھاہ سمندر ہے جس میں ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی ہچکولے لے رہی ہے۔ وہ ان مصائب کو دلکش یادوں[1] سے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو جعفری بیگم یاد آتی ہے۔ اس کی تیغ زبانی اور نازک مزاجی۔ اس کا کھلنڈرا پن اور چنچل طبیعت[2]۔ انھیں نگار محل کا قصہ یاد آتا ہے جس کو انھوں نے کام و دہن کی تمام لذتوں کے ساتھ ۱۲ صفحے میں لکھا ہے[3]۔ اسی طرح سرفراز پری کے ساتھ جو معاملاتِ عشق و محبت در پیش تھے وہ ان کی چشمِ باطن کے سامنے پھر دست افشاں اور پاکوباں آگئے ہیں[4]۔ اصل میں وہ خط نہیں لکھتے بلکہ "تا دستداد مواصلت جسمانی نصف ملاقات پر اکتفا کرتے ہیں[5]۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"خیر جی یہ بھی ایک طبیعت کا مزہ ہے۔ دل لگی ہے ایک تحریر کا لطف ہے۔ خفا نہ ہوا کرو۔ جی بہلایا کرو[6]۔"

امراؤ محل کو لکھتے ہیں :

"جب تک حصول مواصلت نہ ہو خط و کتابت میں غفلت نہ ہو[7]۔"

یہی حال دوسرے فرقت زدوں کا تھا۔ نواب بدر عالم لکھتی ہیں :

---

[1] و [2] خط بنام سرفراز محل۔ [3] بنام شیدا بیگم مرقومہ دوازدہ شوال ۱۲۷۶ھ۔

[4] بنام بدر عالم صاحبہ [5] مخزن اسرار سلطانی (قلمی) ص ۱۷۰۔ فرخندہ محل کے نام۔

[6] شیدا بیگم کے نام۔ مورخہ ۲۶ رمضان ۱۲۷۳ھ (مخزن اسرار سلطانی۔ قلمی)

[7] مورخہ ۲۰ شعبان ۱۲۷۳ھ۔

"زندگی کا سہارا اب فقط خط تمھارا ہے۔ بلّٰہ ہاتھ جوڑتی ہوں، منّتیں کرتی ہوں جانِ عالم
ادھر دیکھو۔ ہماری طرف منہ پھیرو۔ سنتے ہو خط جلدی جلدی لکھا کرو۔" [1]

بعض جگہ خطوں میں یہ شراب چھلک گئی ہے۔ ان میں اختلاط کی باتیں ہیں اور عشق و عاشقی کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ نواب بدر عالم بادشاہ کو لکھتی ہیں۔

"اے ہماری دولتِ حجاب کے لینے والے ..... ایذا و تکلیف کو دینے والے کلبۂ احزان کی نشست میں ہم کو شہنشاہ کی منزل کی برخاست زیادہ ترنقش جگر ہے اور تمھارے فراق میں واللہ اب تک دردکر ہے۔ یاد تمھارے حرکات و اختلاط کی ہر اعضا میں کھبی ہے اور نوکِ نشترِ فراق ہماری رگ رگ میں چبھی ہے ..... مجھے بھولا سمجھ کر اپنا مزا یاد دلاتے ہو، مستوں کو سرود عبث سناتے ہو" [2]

لیکن زندگی کی حقیقتیں بڑی بے رحم ہوتی ہیں۔ جب وہ دامن گیر ہوتی ہیں تو خوشی رنج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

"سنو اے جانِ جاں تم جو بدر عالم کو جانِ عالم کی دلہن لکھتے ہو ..... حق تعالیٰ وہ دن لائے کہ دولہا مع برات آئے۔ عروس شب گھونگھٹ فراق کو ہٹا مصحفِ رخسار دکھائے۔ شربتِ وصل پلائے۔ جب دلہن کہنا۔ اب تو بلاکشیدہ ستم رسیدہ کہنا چاہیئے۔ شہنشاہ کی منزل کی جو برخاستوں کو پوچھتے ہو۔ بس یہ تم نے آبلہ ہائے جگر پر نشتر لگا کر زخم پر نمک چھڑکا یا آتش میں روغن دیا ہائے غضب کیا۔" [3]

محبوبہ عالم نواب مغل صاحبہ نے ان پچھلی صحبتوں کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے:

"اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا
جانِ عالم پچھلی باتیں یاد آتی ہیں گھنٹوں رلاتی ہیں۔ برسات کا موسم کیا آتا ہے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ مجھ پہ غم کا عالم چھا جاتا ہے۔ عیش باغ کا جلسہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مینھ برسا پانی جا بجا بہہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زرد وزی پاپوش پہن کر پھرے۔ کیچڑ کا نام کیا ہے مٹی بھی نہ بھرے۔

---

[1] رقعات بدر، ص ۱۷۔ [2] ایضاً، ص ۲۰۔ [3] ایضاً، ص ۲۶۔

فصل بہار کی صفت پروردگار کی قدرت۔ باغ میں آنے کا ہر ایک شائق تماشہ دیکھنے کے لائق خواجوں کا جمگھٹا، زنگار رنگ کی پوشاک، آبیس کی تاک جھانک، باغ کا تختہ لالہ نافرمان، جس پر مٹنے والوں کی جان قربان۔ صاحبانٌ محلات کی سبک روی۔ خرام ناز ہر قدم پر کبک دری چال بھول کر جبین نیاز رگڑتی شاخ سرو ان کے روبرو نہ اکڑتی۔ جان عالم تمھاری جانب سے آم کے درختوں میں جھولا پڑتا۔ جھولنے والیوں پر آپ کا دل ٹپکا پڑتا۔ ہر ایک محبت سے پینگ بڑھاتے۔ خواجین ہمت بڑھا بڑھا کے نینگ چڑھاتے۔ باغ میں کوئل پپیہے مور کا شور جھولے پر گھٹا..... ساون بھادوں کے بھالے وہ رنگین جھولنے والے ..... اس سمے کا خیال آکر دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

ان خطوں میں اشتیاق و محبت ہجر و مفارقت اور شکوہ و شکایت سب ہی کچھ ہے گویا ایک دنیا اس دیدہ تر میں سمٹ آئی ہے۔ نظیر کے تغزل کی روح یعنی "سخن گزشتہ گفتن گلہ دراز کردن" کھنچ کر ان خطوں میں آ گئی ہے۔ بعض جگہ محبت کا اظہار عورت کی طرف سے کیا گیا ہے اس لئے ان میں ہندی کے دوہوں کا بھی لطف ہے۔ ہر خط کا انداز الگ ہے۔ القاب الگ ہے۔ جو خط پریشانی میں لکھے گئے ہیں ان میں اسلوب سادہ اور موثر ہے۔ جو نسبتاً اطمینان سے لکھے گئے ہیں ان میں طرز بیان دلفریب اور طرحدار ہے لیکن خلوص کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ رنگینی اور تکلف نے رمز و ایما کو نکھار دیا ہے اور خطوں کے ماحول اور لکھنے والوں کی بیچارگی اور خستہ درونی کو اور نمایاں کر دیا ہے۔

القاب

القاب میں بڑی بڑی جدتیں برتی گئی ہیں۔

بدر عالم صاحبہ لکھتی ہیں:

"اے میرے قدردان اے میرے مہربان اے میرے معین و مددگار اے میرے ہمدم و غمخوار اے میرے یوسف اے میرے جانی اے میرے قیدی اے میرے زندانی اے میرے جان عالم اے میرے سلطان عالم اے میرے اختر پیارے

1

ہیں صدقے تمھارے۔"

فرخندہ محل لکھتی ہیں :

"مہر گلزار رعنائی مندرد کو بہار بے وفائی زید اللہ حسنہ۔"

کنیز فاطمہ بیگم لکھتی ہیں :

"دافع درد و الم حضرت جان عالم زید اللہ عشقہ۔"

شیدا بیگم لکھتی ہیں :

"مہر پیشانی چہرہ نورانی ابرو کمان تیر مژگان بادام چشم بہرام حشم گل کی خوشبو بلبل کی گفتگو فرشتہ زیب زاہد فریب حسینوں کے رنگ زہرہ جبینوں کے ڈھنگ شاہد کی سج عزیز کی دھج دارد ئے درد اشتیاق مرہم زخم فراق داؤد آواز مجسم اعجاز بے آراموں کے چین استاد تان سین[1] محفل کی زیبائش ہر دل کی آرائش خورشید جمال کی ضو حسن کی لو بے فکروں کا قہقہہ خوش دلوں کا چہچہہ بے صبروں کے آرام بے نشانوں کے نام شاہوں کے سرتاج نازنینوں کے مزاج ......"

جان عالم فاطمہ بیگم کو لکھتے ہیں :

"رشک بدر مشتری قدر زہرہ جمال مہر مثال حور نژاد پری نہاد گل رو سمن بو انیس و ہمدم خوبی مجسم۔"

بادشاہ نواب شیدا بیگم کو لکھتے ہیں :

"مجنوں کے دل کی تسکین لیلیٰ کا روئے رنگین یوسف کے منہ کا بناؤ زلیخا کے کلیجہ کا گھاؤ وامق کے آنکھوں کی روشنی عذرا کی دل لگی نل کی راحت دمن کی عزت قیس کے دل کا رکھ رکھاؤ پری زادوں کا بناؤ سورج کی کرن چاند سا بدن اختر نما نواب شیدا چاہنے والی گلے کی نباہنے والی دل پسند ارجمند عاشق فریب معشوقہ بازیب نہال چمن محبت بالکل چاہت کی صورت الف قد بے ساختہ تسے ابرو چاند سا رو بہت اچھی خدا کے واسطے ایک مجھی مورنی لاکھوں میں کٹھورنی

---

[1] جان عالم کو موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ جان عالم از عبدالحلیم شرر، ص ۶۸۔

محبت کا پہلا عشق کا نقشہ ..... کروڑ بار جیوں گا مگر تجھی پر مروں گا۔"[1]

شیدا بیگم اس کے جواب میں لکھتی ہیں :

" دور سے مانگتے ہو تم بھی بات ہرگز نہیں ہے یہ اچھی "

ایک اور خط میں لکھتی ہیں :

" اختر آسمانِ دلربائی گوہرِ دریائے آشنائی خسرو خو شیریں گفتگو سلیمان حشم بلقیس شیم یوسف جمال زلیخا خصال ماہ صورت چکور سیرت لیلیٰ کی سج مجنوں کی دھج دمن کے دل کا گھاؤ نل کی صورت کا ساؤ عذرا کا ناز وامق کا انداز شاہد کی راحت عزیز کی عزت شمع کا رنگ پروانہ کا ڈھنگ شہر کی آرائش پہلو کی زیبائش زخم فراق کا مرہم، مرزا جان عالم ......"

اسی طرح دعائیہ اور اشتیاقیہ الفاظ میں بھی جدت ہے :

چہرۂ الفت بآب وتاب باد زید اللہ جمالہ زید اللہ نورحسنہ

خاتمہ پر لکھا ہے :

" زیادہ حسرت ہم آغوشی ۔ زیادہ شوق وصال "

بعض القاب بہت مختصر ہیں :

" جان عالم ہمارے اختر پیارے " یا " اختر پیارے میں صدقے تمہارے "
یا " اختر جانی "

یہ خطوط دوری و مہجوری کے عالم میں لکھے گئے ہیں اس لیے بعض بعض جگہ ہجر میں وصال کا لطف ہے اور تحریر میں تقریر کا رنگ آگیا ہے۔ بعض مواقع پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو بے تکلف دوست آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ نواب بدر عالم صاحبہ لکھتی ہیں :

" سنو صاحب کوئی تمہاری محبت میں مَرے یا جیئے تمھیں اپنی طعنہ زنی سے کام
ہے یہ بھی خوبی ہمارے ایام کی ہے "

نو ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کے خط میں لکھتی ہیں :

" سنو جان عالم بغیر تمھارے ان صندلی کلائیوں میں جہانگیریوں کا نقشا ہے گویا

---

[1] مخزن اسرار سلطانی (قلمی) ص ۱۵۷

شاخ نخل صندل میں مار پیچاں لپٹا ہے "

ایک اور خط میں لکھا ہے :

" سنو جانی تم معشوق ہو ہم عاشق ہیں اور تو کوئی نشانی تمھاری نہیں رکھتی مگر خط تمھارے ہاتھ کے ہردم سینۂ غم کے خزینے پر رہتے ہیں کبھی آنکھوں پر رکھ کر روتی ہوں اشکوں سے بھگو لیتی ہوں "

دوسرے موقع پر لکھتی ہیں :

" جان عالم ادھر دیکھو ہماری طرف منہ پھیرو۔ سنتے ہو خط جلدی جلدی لکھا کرو "

یہی بے تکلفی جان عالم کے خطوں میں ہے :

" نواب نگار محل تو نے بھرستا رکھا ہے "

" دیکھو تو زمانہ کا کیا عالم ہوگیا زاویۂ تنہائی میں مکین ہیں "

ان خطوں میں جو صفائی اور بے تکلفی ہے وہ مستقبل کا اشاریہ ہے۔ غالب کے ہاتھوں میں پہنچ کر یہ نقش اتنا دلفریب ہوگیا کہ دل و نظر دونوں اس میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ صفائے گفتگو کچھ غالب کی خصوصیت نہیں ہے۔ ان کی اس خصوصیت میں سرور اور بے صبر بھی شریک ہیں۔

زبان

بیگمات کے ان خطوں میں تمام نسائی خصوصیات موجود ہیں بعض جگہ ان کے مخصوص محاورے ہیں اور محلاتی زبان کا چٹخارہ ہے۔ مثلاً یاسمن محل لکھتی ہیں۔

" جان عالم ایک سال ہوگیا۔ سب چہیتوں کو نوازا مجھ نگوڑی کو کبھی بھول کے بھی پرزہ کاغذ سے خوش نہ کیا "

نواب خاص محل کلکتہ سے شیدا بیگم کو لکھتی ہیں :

" میں ہر وقت سلطان عالم کی دلجوئی میں لگی رہتی، ان کا باتوں میں دل بہلاتی مگر وہ غم میں گھلے جاتے ہیں۔ میں واری جاؤں یہ حال دیکھ کے دل کڑھتا ہے "

نواب بدر عالم دلدار محل کے انتقال پر لکھتی ہیں :

"جانِ عالم تم نے جو لکھا تھا کہ تیسری تاریخ رجب کی نواب دلدار محل نے اس جہانِ فانی کو چھوڑا طرف عالم باقی کے منہ موڑا۔ ہے ہے سنتے ہی بیہوش ہوئی یہ کیا ستم ہوا۔ میری انیس کنجِ لحد سے ہم آغوش ہوئی۔ لطف زندگی سے دل بیٹھ گیا۔ الفت اور صحبت کا مزا اُٹھ گیا۔ خدا انھیں جنّت نصیب کرے۔ ان کا اقبال بڑھا کہ تمھاری خدمت میں انتقال کیا۔"[1]

بعض جگہ سوکن کا جلاپا اور رشک و رقابت کے جذبات سطح پر آگئے ہیں۔ نواب بدرعالم واجد علی شاہ کو لکھتی ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ نواب خاص محل صاحبہ اگلے ہی زمانہ میں کہ جب میں ان کے پاس رہتی تھی کیسے کیسے فساد کرتی رہیں اور کبھی روادار میری تم تلک جانے کی نہ ہوئیں۔ اب عنایت خدا سے کلکتہ میں گواہی دیتی ہیں۔"

محلات عجیب عجیب فتنہ و فساد اٹھاتی تھیں اور خوب ایک دوسرے کی لگائی بجھائی کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ نواب شیدا بیگم پر اتہام لگا کہ لڑکی ہوئی ہے۔ دوسری مرتبہ یہ الزام لگا کہ "نثار علی لہسنیا ہاتھی پر چڑھ کے چینی بازار میں ان کے محل کے کوٹھے کے سامنے چار گھڑی تک کھڑا رہا اور ان کے یہاں کی کھڑکیاں کھلی رہیں اور عورتیں بیٹھی رہیں۔ نہ تو کھڑکیاں بند ہوئیں نہ عورات ہٹیں۔ اس کے کیا معنی"[2] نور زماں بیگم کی بھی کسی نے چغلی کھائی اور حکم ہوا کہ خرد محل کے ساتھ جا کر رہو۔[3] انھوں نے اپنی برأت میں لکھا ہے :

"اشراف زادیوں سے یہ فعل نہیں ہوتے"[3]

سلطان جہاں بیگم بھی ان الزاموں سے بری نہ تھیں۔ ۱۵ محرم ۱۲۷۲ھ کے خط میں لکھتی ہیں :

"لوگوں نے مجھ رنجور پر اتہام باندھے حضور کو بھی یقین آگیا۔ حضرت عباسؑ علمبردار کی سوگند۔ میں آپ کا نام لیے بیٹھی ہوں۔ نہ غمخوار ہے نہ دمساز ہے صرف آپ کی یاد ہے۔

رفتہ رفتہ ہوئی ہوں سودائی دور پہنچے گی میری رسوائی"

---

[1] رقعات بدر، ص ۱۹۔ [2] مخزنِ اسرارِ سلطانی (قلمی) کا آخری خط۔ [3] تاریخ نور قلمی، ص ۲۲ و ۲۱۔
[4] تاریخ نور قلمی (پٹنہ) ص ۲۰ تا ۲۲۔

ان خطوں کے پڑھنے سے ملتے ہوئے درباری ماحول کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نفسیات انسانی کے وہ پہلو بھی جو کسی لباس میں بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے یہ رشک وحسد امتیاز و تخصیص کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور اس کے پیچھے یہ احساس ہے کہ دوسروں کو زیادہ قربت حاصل ہے اور ہم اس صف اول میں نہیں ہیں۔

ہندوستان کے دربار اس کی ہمہ رنگ تہذیب وتمدن کے آئینہ دار رہے ہیں اس لیے جو اُردو ان درباروں کے ساتھ میں پلی اور بڑھی اس میں فارسی بدنمائی کی حد تک غالب نہیں رہی۔ محمد قلی قطب شاہ واجد علی شاہ اور بہادر شاہ کی اُردو ملا وجہی مرزا سرور اور شاہ نصیر سے مختلف ہے۔ اس میں ہندیت کا چٹخارہ ہے۔ یہ خطوط بھی اس مزے سے خالی نہیں ہیں۔ جان عالم لکھتے ہیں :

"میری بچی بھی خواہوں نے چاہا کہ .... اس .... سے جلد ملاقات کا سبیہتہ ہو .... جی کڑا کر کے نجم النسا پھر اس کے گھر گئیں"

جان عالم نے بدر عالم کو جہانگیریاں بھیجی ہیں، اس موقع پر لکھتے ہیں :

"صندلی کلائیوں میں لہراوٹ ان کی مبارک ہو۔ شاخ گلاب میں سجاوٹ کی چمک ہو"

دہلی کے بعد لکھنؤ میں جو تہذیبی شمع روشن ہوئی وہ دربار کی مشعل سے' اس لیے یہاں اردو ادب کو جو قدریں ملیں وہ بھی اس دربار سے جس پر ایک محدود فارغ البال طبقے کا قبضہ تھا۔ دلی کا ادب کبھی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے بے نیاز نہیں رہا لیکن لکھنؤ اول تو کھڑی بولی کے علاقے سے دور تھا اور دوسرے یہاں کی تہذیبی روایات تمام تر شہر کے جاگیرداروں اور رئیسوں سے وابستہ تھیں اس لیے اس کی نثر میں بَلا کا تکلف اور تصنع ہے۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات نے ان صنائع کو برتا ہے لیکن بعض جگہ مصیبتوں نے اس برف کو پگھلا بھی دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبِ رواں کا ایک چشمہ ہے جو پھوٹ بہا ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی خو بو وہی تھی۔ اور وہی پرانی روایات ان کو جان و دل سے عزیز تھیں۔ اب سروری اور جہانداری

ختم ہو چکی تھی لیکن وہ اب بھی سلطان ملک حسن و جمال اور خسرو ماہ طلعتان شیریں مقال تھے۔ چنانچہ بعض خطوں میں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات نے وہی تکلف اور تصنع برتا ہے جو اس زمانے کی خصوصیت ہے۔

دلپذیر بیگم واجد علی شاہ کو لکھتی ہیں:

"آٹھ پہر کبھی تمھارے در دنداں کے تصور میں اشک بہاتی ہوں اور کبھی لب یاقوت گوں کے دھیان میں دیدۂ خونبار سے لخت جگر مثل عقیق احمر ٹپکاتی ہوں۔ کبھی تمھارے سبز رنگ زمرد زمانی کے خیال میں دست وحشت غیرت مرجاں سے اپنے عارض گلفام کو مارے طمانچوں کے لال کرتی ہوں اور کبھی یشب خیال دل کی تختی واسطے دفع خفقاں کے سینہ پر دھرتی ہوں۔ کبھی کاکل مشکیں کی یاد میں نیلم کی طرح آنکھوں میں ایسی تیرگی چھاتی ہے کہ ہر ایک آنکھ پتھرا کے نگینۂ سلیمانی بن جاتی ہے۔"

نگار محل لکھتی ہیں۔ یہ رعایت لفظی بھی ملاحظہ ہو:

"اچھا جوگی بر دگی نے اپنے روپ پر رجھایا۔ ہمیں بھی جوگی بنایا۔ اسی مکھتی میں باسا ہوا جینے کا سانسا ہوا۔ تار گریباں زنار ہوئے۔ قشقہ کی جگہ داغ حرماں نمودار ہوئے۔ اشک خونی گلے کا ہار ہوئے ..... مرگ چھالا ہے نالہ سے ناقوس کا کام نکالا ہے۔ بھبوتی خاک دھول ہے کبھی بیراگن پنجہ ترشول ہے۔ گیسوئے مشک بار الجھ الجھ کر جٹا بن گئے۔ کسی سبزۂ رخسار کے ہجر میں دل و جگر پانی کی طرح چھن گئے۔ شراب الست کے مست ہیں بے شراب مخمور ہیں۔ پربھو کی دیا سے جوگ روگ میں بھرپور ہیں۔ اپنے کنور کنھیا کی پوجاری ہیں جگت دھرم لٹا دھاری ہیں۔"

ان خطوں کو اس زمانے کے مخصوص تاریخی حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ اس وقت جاگیرداری ختم ہو رہی تھی لیکن ختم نہیں ہو چکی تھی۔ سرمایہ داری کی اینٹ رکھی جا چکی تھی لیکن ابھی عمارت بن نہیں پائی تھی چنانچہ بادشاہ اور ان کی بیگمات کی جو نفسی کیفیت تھی

وہ بھی ان ہی خارجی عوامل کا نتیجہ تھی۔ اس لیے ان خطوں میں جو حسن ہے وہ نظر فریب ہے۔ دل گداز نہیں۔

لکھنؤ میں نثر شاعری کی انگلی پکڑ کر آئی تھی۔ اس لیے اس میں اور نظم میں بہت کم فرق تھا۔ اور قافیہ پیمائی کا جا بجا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ روش خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ شیدا بیگم لکھتی ہیں:

"مجمع جود و کرم صاحب سیف و علم حضرت سلطانِ عالم زادُاللہ عشقہٗ بڑا ہے یہ ظلم و ستم کہ تم نے محبت نامہ نہ کیا رقم۔ سچ کہو تمھیں خدا کی قسم۔ کیوں ہوگئے ہم سے برہم۔ ہم کو اس کا بہت ہے غم۔ کس نے الفت کی ہے کم۔ اپنا تو فرقت سے نکلتا ہے دم۔ کہ خیریت سے لائے تم کو رب اکرم۔ پھر ہم تم ہوں باہم اور نورِ چشم نگیس آرا بیگم تسلیم کرتی ہیں ہو کر خم۔"

یہی قافیہ پیمائی اشعار میں تبدیل ہو جاتی ہے:

سفر سے جلد آؤ جانِ عالم جمال اپنا دکھاؤ جانِ عالم

منظوم خطوط

نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی دلیل تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ اکثر خطوط بھی منظوم لکھے جاتے۔ واجد علی شاہ کی بیگمات نے اکثر منظوم اشتیاق نامے لکھے ہیں جو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ذیل میں نواب شیدا بیگم کے ایک منظوم خط کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

بہار آئی کہاں تو ساقیا ہے تصور ہر گھڑی مجھ کو ترا ہے
زمرد ہوگئی ساری زمیں ہے ہر ایک سو باغ میں سبزہ کھلا ہے
وہ پانی نہر میں صاف جاری کہ جس پر دل مرا لہرا رہا ہے
ملاروں کی کہیں آتی ہے آواز کسی جا شاخ میں جھولا پڑا ہے
وہ جوبن اب ہمارا ہے کہ ہر دم پری بھی حور بھی ہوتی فدا ہے
مسی ہونٹوں پر اور آنکھوں میں سرمہ رچی ہاتھوں میں پاؤں میں حنا ہے

طلائی ہے پڑا موباف سر میں — چنی ماتھے پہ افشاں خوش نما ہے
گلابی پائجامہ سُرخ کرتی — ڈبٹہ گاج کا دھانی رنگا ہے
ملا ہے عطر مجموعہ کا ایسا — کہ سارا مثلِ عنبر گھر بسا ہے
ولیکن بے تمھارے جانِ عالم — مرا اندر سے دل گھبرا رہا ہے
یہ ساون سب یونہی جاتا ہے خالی — جو ایسے میں تم آؤ تو مزا ہے
میں شیدا جان و دل سے ہوں تمھاری — تمھیں میری نہیں پروا ذرا ہے[1]

(ج) فارسی انشا کے اُردو تراجم

<u>فارسی کا اثر</u>

اس دَور کی انشا پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے آئینے پر فارسی نے صیقل کی ہے اور اس کے اسالیب کی تزئین و آرائش میں فارسی کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

---

[1] مخزنِ اسرارِ سلطانی (قلمی) ص ۱۴۶ - ۱۴۷۔

مخزنِ اسرارِ سلطانی میں اس کے علاوہ بھی منظوم خطوط ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۹ تا ۱۲ - ۱۴۷ - ۱۴۸ - ۱۴۹ - ۶۹ تا ۷۲ -

نور بیگم کے خط کے چند اشعار یہ ہیں :

اے جانِ جاں بصورتِ جاں اعتبار کیا — تم آؤ یا نہ آؤ ہمیں اختیار کیا
بے اپنے گل کے سیر گلستاں خراب ہے — کیفیتیں دکھائے گی فصلِ بہار کیا
برہم ہوئے ہیں گیسوئے برہم کی یاد سے — اب پوچھتے ہو تم سببِ انتشار کیا
گیسو کی آرزو کبھی عارض کا اشتیاق — دیکھیں دکھائے گردشِ لیل و نہار کیا
ممکن نہیں جو کوچۂ جاناں میں رہ سکے — میرے غبار سے ہے صبا کو غبار کیا
لو آؤ ایک دم میرے پہلو میں سو رہو — گر اپنا جانتے ہو تم اے جانِ جار کیا
لاکھوں حسیں ہیں صورتِ جاناں کے شیفتہ — ہم کس قطار میں ہیں ہمارا شمار کیا
کب ہے یقیں کہ زینتِ آغوش ہو حصول — اے حور اُن کے دل پہ ہمیں اختیار کیا

مخزنِ اسرارِ سلطانی (قلمی) ص ۷

خاص طور پر اُردو انشا کے ابتدائی نمونے بالکل فارسی کی کاربن کاپی ہیں۔ وہی عبارت کی رنگینیِ الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی کی جان تھی، اُردو انشا میں بھی موجود ہے۔ اسی وجہ سے ابتدائی دَور میں نہ صرف فارسی کی نقل کی گئی بلکہ مشاہیر فارسی انشا پردازان کے خطوط کے ترجمے بھی ہوئے تاکہ اہلِ اُردو اسی سانچے میں اپنے خطوط کو ڈھال سکیں۔

<u>فارسی انشا کے اُردو تراجم</u>

اُردو میں جن مستند اور مشہور فارسی مکتوب نگاروں کے ترجمے ہوئے ان میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ابوالفضل کے رقعات ہیں جن کے منتخبات کا اُردو ترجمہ قمرالدین خاں نے کیا۔ یہ آگرہ سے ۱۸۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس سے ایک سال قبل منشی قمرالدین خاں اکبرآبادی نے انشائے خلیفہ اور رقعاتِ عالمگیر کے ترجمے کیے اور وہ بھی آگرہ سے شائع ہوئے[۱] ہندوستان کی فارسی انشا میں انشائے ہرکرن بہت مشہور ہے۔ ہرکرن متھرا داس کنبوہ ملتانی کا بیٹا تھا اور عہدِ جہانگیر میں نواب اعتبار خاں کا منشی تھا۔ اس کی انشا کا اُردو میں[۲] ترجمہ ہوا جو بہت مقبول اور مشہور ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں انشائے مادھو رام کا ترجمہ ہوا[۳]۔ ۱۸۷۲ء میں انشائے صفدر[۴] فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی۔ اس کے نسخے بھی ہندوستان اور انگلستان میں موجود ہیں۔

(د) اُردو میں خطوط نگاری سکھانے کی قدیم کتابیں

اُردو میں محض فارسی سے ترجمے ہی نہیں ہوئے بلکہ بہت سی کتابیں خطوط نگاری سکھانے اور اس کے آئین و آداب سمجھانے کے لیے بھی لکھی گئیں۔ ان میں خاص طور پر

۱۔ ہندوستانی کتابوں کی فہرست۔ بلوم ہارٹ (۱۹۰۰ء) ج ۲، حصہ ۲، انڈیا آفس۔

۲۔ ایضاً۔ ترجمے کا نام انشائے ہندی ہے اور مترجم کا نام منشی نظام الدین (مطبوعہ بمبئی ۱۸۵۰ء)

۳و۴۔ ہندوستانی کتابوں کی فہرست۔ بلوم ہارٹ (۱۹۰۰ء) ج ۲، حصہ ۲، انڈیا آفس۔

قابلِ ذکر مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) فارسی اور اُردو کی انشا مع ترجمہ انگریزی مولفہ و مترجمہ نعمت خاں منشی اکبر آبادی د ٹی۔ ایچ۔ جی۔ بیسنٹ۔ کلکتہ ۱۸۴۳ء دوسرا ایڈیشن کلکتہ ۱۸۴۵ء۔ انڈیا آفس میں موجود ہے۔

(۲) عرائض و خطوط مطبوعہ مدراس ۱۸۴۹ء (انڈیا آفس)۔

(۳) انشائے ہندی از منشی نظام الدین مطبوعہ ۱۸۵۰ء مطبع محمدی۔

(۴) دستور النثر[۱]۔ اس کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔

<u>دستور النثر قلمی۔ ۱۸۵۱ء</u>

آرکاٹ کے ایک باشندے محمد لطیف نے اپنے لڑکے کے واسطے کئی رقعے نوعنوانات کے تحت جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام انھوں نے مفید الصبیان رکھا تھا۔ اس کا ترجمہ محمد خاں عرف بدوح — میاں نے اصل کے مطابق اپنے "دکھنی محاورے" میں کیا ہے تاکہ اُردو جاننے والے کم عمر لڑکے اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس کا ذکر مصنف تمہید میں خود کرتا ہے۔ ایک تمہید کے علاوہ کتاب نو قسموں (ابواب) پر مشتمل ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اول قسم۔ خوشی اور مبارکبادی کے خطوط لکھنے میں۔
دوسری قسم۔ غم اور ماتم کے نگاشت میں۔
تیسری قسم۔ میوے اور مٹھائی کی تحریر میں۔
چوتھی قسم۔ سب کاموں کی نوشت میں۔
پانچویں قسم۔ لفظوں کی غلطی اور صحیح جاننے میں۔
چھٹی قسم۔ شوقی خط کے ترقیم میں۔
ساتویں قسم۔ بیچ آداب اور القاب اور لفافوں کے۔
آٹھویں قسم۔ خط اور قبالہ اور تمسک وغیرہ کے بیچ میں۔

۱۔ فہرست اُردو مخطوطات۔ جامعہ عثمانیہ۔ ص ۱۰۳۔

نویں قسم۔ عربی فارسی ہندی انگریزی اردی مہینوں کے نام وغیرہ میں۔

آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد بے حد و ثنائے بے حد اس کو شایاں ہے جس کی قدرت کے وصف میں بڑے بڑے داناؤں کی عقل حیران ہے۔

خاتمہ۔ حرفِ دال کا موافق ڈیڑھ نقطے کے ہے۔ باقی اسی موافق جانے عقلمند کو ایک اشارہ ہے۔ مختصر کرنا مناسب جانا۔

کتاب تیرہویں صدی ہجری میں خطوط عرائض وغیرہ لکھنے کے جو طریقے دکن میں رائج تھے ان کا اچھا خاکہ ہے۔

ترقیمہ کے الفاظ یہ ہیں:

اور تمام کیا اس کتاب کو شکر سے پردردگار کے چھاؤنی جالنہ پور میں قادر خاں کاتب تیرہویں تاریخ ماہ ذیقعدہ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء)۔

<u>دستور الہدایت۔ قلمی۔ ۱۸۵۸ء</u>

(۵) دستور الہدایت[1] (قلمی) از قاسم نوجی بالکنڈی ۱۲۷۵ھ۔ ۱۸۵۸ء۔

(۶) انشائے اُردو[2] از چرنجی لال۔ اتالیق خطوط نویسی الہ آباد ۱۸۶۱ء۔

<u>انشائے خرد افروز</u>

(۷) انشائے خرد افروز[3]۔ مطبوعہ نول کشور کانپور سنہ طباعت ۱۸۸۴ء۔

ابتدا میں لکھا ہے:

"از آں جا کہ فی زمانہ ہندوستان میں اردو زبان جاری ہے فارسی انشا سے کام کم چلتا ہے۔ اس لیے صاحبان عالی شان حکام زمان نے فائدہ عام کے واسطے تعلیم علوم خاص اُردو کی تہذیب فرمائی اور طلبا کے حق میں صرف فارسی پڑھنا کافی نہ جان کر فارسی کے شمول میں اُردو کے قواعد کی تعلیم بھی ضرور جانی اور ہر فن کی

۱؎ فہرست کتب خانہ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن انشائے اُردو۔ ۲؎ بلوم ہارٹ۔ انڈیا آفس۔

۳؎ فہرست کتب خانہ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن۔ انشائے اُردو۔

کتابیں اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کرا کے علم آسان کر دیا۔ اب یہ انشا بھی برائے حکام اُردو زبان میں مبتدیوں کے واسطے مرتب ہوئی۔ اور اس میں ضروری بعضے قاعدے اور خطوط عرائض وغیرہ جن سے کچہریوں کے کام کی واقفیت اور خط کتابت سے آگاہی ہو، لکھ کر اس کو دو قسم پر منقسم کیا۔ اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ پہلی قسم میں اُردو کی ماہیت اور اس کے بعضے قواعد اور انشا کے طریقے اور خطوط اور رقعے وغیرہ دوسری قسم میں عرضیاں اور پروانے اور پٹہ اور قبولیت اور قبالہ وغیرہ[۱]"

یہ کتاب مسٹر ہزبل جیمس صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

"تحریر خطوط کے بعضے طریقے اور آداب" کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"خط و کتابت کے طریقے جو فارسی عبارت میں مستعمل اور مروج ہیں اردو عبارت میں بجمیعاً کار آمد نہیں بلکہ ان میں سے بعض تو نازیبا ہیں اردو نویس کو چاہیے کہ مکتوب الیہ کے القاب میں اس کے رتبے کے موافق ایک دو الفاظ پر اکتفا کرے مثلاً بیٹا باپ کو لکھے حضرت قبلہ گاہی صاحب سلامت یا جناب والا بزرگوار سلامت ..... استعارات سے جہاں تک بنے پرہیز کرے اور غیر مشہور الفاظ کا تحریر میں استعمال نہ کرے۔ یہاں تک کہ اگر لفظ ہندی غیر مشہور ہو تو فارسی لکھے اور خبر بہت دور جا کر نہ نکالے۔ جہاں تک ہو سکے جملہ میں اختصار کرے اور مدح و ذم میں حد سے زیادہ مبالغہ نہ کرے ...[۲]"

اس کتاب میں انگریزی اثرات صاف نمایاں ہیں۔ اسی لیے تاکید ہے کہ فارسی طریقوں کو بجمیعاً اردو میں نہ برتا جائے۔ ہر جگہ اختصار کو ملحوظ رکھا جائے اور استعارات سے جہاں تک ممکن ہو پرہیز کیا جائے۔

انشائے کریم الدین

(۸) انشائے کریم الدین[۳]۔ مولوی کریم الدین نے دفتری خط و کتابت رقعے عرضیاں

۱؎ انشائے خرد افروز، ص ۱۔ ۲؎ ایضاً، ص ۴-۵۔ ۳؎ بلوم ہارٹ۔ انڈیا آفس۔

اور دستاویزیں سکھانے کے لیے لکھی ہے۔ لاہور ۱۸۶۴ء۔

(۹) انشائے بہارِ بے خزاں از مولوی غلام امام شہید

یہ خطوط کا مجموعہ ۱۸۶۶ء میں مرتب اور شائع ہوا۔

شہید کے والد کا نام شاہ غلام محمد تھا۔ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نظم فارسی میں مرزا قتیل کے اور اُردو میں شیخ مصحفی کے شاگرد تھے۔ شہید مداحِ نبی اور عاشقِ رسول کے القاب سے مشہور ہیں۔ نعت خوب لکھتے تھے۔ ان کا یہ مجموعہ خطوط و مضامین کا بہت مقبول ہوا۔ انھوں نے اس کتاب کا سبب تالیف یہ بیان کیا ہے۔

"فقیر غلام امام شہید کہ جب کچہری صدر دیوانی کی الہ آباد سے اکبر آباد آئی اور بندہ بھی ۔۔۔ جناب بنجمن شیلر صاحب بہادر کی رفاقت میں یہاں آیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ۔۔۔۔۔ حاکم امیر حاتم بے نظیر نواب مستطاب جناب ایل جیمس ٹامسن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر کے حضور سے حکم پہنچا کہ ایک انشا مختصر کہ لڑکے اس کو سمجھ سکیں اور اس سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم پاویں اُردو میں تیار ہوئے[۱]"

اسی حکم کی تعمیل میں شہید نے یہ اوراق لکھے اور اس کے چار باب مقرر ہوئے۔

پہلا باب ـــــ نظم و نثر کے بیان میں

دوسرا باب ـــــ بعضے دستورات اور خطوط کے قاعدوں کے بیان میں

تیسرا باب ـــــ رقعات میں

چوتھا باب ـــــ میں دستاویزوں کا حال اور ہر ایک کی مثال "کہ جاننا اس کا لڑکوں کو ضرور ہے"

ہمارے نقطۂ نظر سے دوسرے اور تیسرے باب نہایت اہم ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو انشا کی بنیادیں فارسی پر قائم کی گئیں اور وہی آئین و ضوابط بجنسہٖ اُردو میں منتقل کیے گئے۔ شہید نے خود لکھا ہے :

"خط و کتابت کا دستور اُردو میں اب تک جاری نہیں ہوا۔ پھر اب اگر کوئی اُردو میں اس کا رواج دیا چاہے تو جس طرح نظم اور نثر فارسی کے طور پر جاری ہوئی اسی طرح

۱؎ انشائے بہارِ بے خزاں، ص ۳

خط وکتابت کا بھی فارسی کے طور پر جاری ہونا ضروری ہوگا اور فارسی میں جو خط لکھنے کے قاعدے مقرر ہیں ناچار اُردو میں بھی اسی کا تابع ہونا پڑے گا۔[1]

شہید کا نظریہ انشائے خرد افروز کے مصنف سے مختلف ہے اور وہ اردو انشا کو بالکل فارسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔

اسی اصول کے پیش نظر شہید نے خط کے اکیس ارکان بتلائے ہیں۔

القاب۔(۱) مقدمہ القاب مثلاً خالو صاحب داروغہ صاحب

(۲) القاب

(۳) دعائیہ جیسے زاد لطفہ، سلمہ اللہ تعالیٰ

آداب۔ (۴) آداب

(۵) تحیت مثلاً دعا سلام و نیاز کورنش بندگی

(۶) اشتیاقیہ۔ اشتیاق تمنا اور آرزو کے کلمات

(۷) ملاقاتیہ۔ ملاقات معانقہ ملازمت اور قدم بوسی کے الفاظ

(۸) صفت ملاقاتیہ۔ جیسے ملاقات بہجت آیات ملازمت کیمیا خاصیت دیدار فرحت آثار۔

(۹) اظہاریہ مثلاً واضح ہو۔ عرض پرداز ہوں۔

(۱۰) خطوں کے نام مثلاً سرفراز نامہ۔ منشور کرامت نشور۔ رقیمہ نیاز۔

(۱۱) خطوں کی رسید

(۱۲) ادراکیہ مثلاً ارشاد فیض بنیاد سے آگاہی ہوئی۔

(۱۳) کاتب کے نام مثلاً مخلص، فدوی، نمک پروردہ، غلام، کمترین، مابدولت

(۱۴) مکتوب الیہ کے نام۔ آنجناب۔ بندگان حضور۔ آں عزیز۔ آں نور دیدہ۔

(۱۵) دوسرے شخص کی صفت۔ مثلاً قبلہ عالم کے حضور میں عرض کیا۔ برخوردار مذکور سے کہہ دیا۔

(۱۶) چیز کا بھیجنا۔ مثلاً بھیج دی ہے۔ خدمت عالی میں ارسال کی ہے۔

---

[1] انشائے بہار بے خزاں، ص ۲۲۔

(۱۷) چیز کا مانگنا۔ مثلاً لطف فرمایئے۔ مرحمت فرمایئے۔

(۱۸) اپنا آنا مثلاً قدم بوسی کو حاضر ہوا تھا۔ تمھارے پاس گیا تھا۔

(۱۹) مکتوب الیہ کا آنا یا جانا مثلاً قدم رنجہ فرمایا تھا۔ جب سے بنارس کو سدھارے یا گئے ہو۔

(۲۰) مطلب

(۲۱) خاتمہ۔ زیادہ کیا تصدیع دوں۔ یا زیادہ آداب۔

شہید نے مطلب کا نمبر بیسواں رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بعض جگہ فارسی کو برقرار رکھا ہے اور بعض جگہ اس کا اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔

انشائے بہارِ بے خزاں میں جا بجا اس بات کی تاکید ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ مکتوب الیہ کے مطابق لکھا جائے۔ اس اصول کی توضیح کے لیے شہید نے پانچ خط ایک ہی مضمون کے مختلف عبارتوں میں نقل کیے ہیں[۱]

تیسرے باب میں غلام امام شہید نے چند رقعات کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ہم ان میں سے دو خطوں کے اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے ان کے طرزِ نگارش کا اندازہ ہو سکے گا اور اس زمانے کا محبوب اور مقبول طرز بھی معلوم ہوگا۔ پہلا خط جواب طلب۔

"مرغِ جاں کو قفسِ تن سے رہائی ہوتی
لیکن اِس جانِ جہاں سے نہ جُدائی ہوتی

شفیق میرے۔ جس دن سے آپ کلکتے تشریف لے گئے ہیں لکھنؤ کا شہر میری آنکھوں میں اُجاڑ اور گھر مجھے ایک کالا سا پہاڑ معلوم ہوتا ہے اور بیٹھتا ہوں تو جگر میں درد بے اختیار ایسا اٹھتا ہے کہ بے چین ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں تو ناتوانی سے تھرتھرا کر ناچار بیٹھ جاتا ہوں۔ رونگٹا رونگٹا بدن میں نشتر سا چبھتا ہے اور کلیجہ آٹھ آٹھ پہر آگ کے انگارے کی طرح پھکتا ہے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا اور دل کے زخم کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔ نیند تو خواب میں بھی صورت نہیں دکھاتی۔ اب موت بھی مجھ سے آنکھ [illegible]تی ہے[۲]"

دوسرا خط اس کے جواب میں۔

خواب میں تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی   جو بلا جان پہ آئی ہے نہ آئی ہوتی

---

[۱] انشائے بہارِ بے خزاں، ص ۳۲ و ۳۳ (مطبع نول کشور، کانپور)   [۲] ایضاً، ص ۳۸ و ۳۹۔

شفیق میرے۔ عنایت نامہ کیا پہنچا۔ ع۔ گویا مُردے کے جلانے کو مسیحا پہنچا۔ کاغذ اس کا جگر کے زخم کے واسطے کافور کا مرہم تھا اور نقطے پر محبوب کے تل کا لطف اور ہر سطر پر معشوق کی زلف کا عالم تھا سفیدی اس کی آنکھ کی سفیدی اور سیاہی تِیکی کی سیاہی تھی۔ قلم سے کیا نامہ لکھا گویا سرمہ کی سلائی تھی کہ اس کے ہر لفظ سے آنکھ روشن ہو گئی۔ اب اپنا حال کیا لکھوں کہ جدائی سے بیتاب رہتا ہوں اور آٹھ پہر آپ ہی کی کہانی دل سے کہتا ہوں۔ ہڈیاں شمع کی طرح جلتی اور مثل موم کے پگھلتی ہیں۔ دبلا اتنا ہو گیا ہوں کہ پانی کی لہر کی طرح اپنے آنسوؤں کے دریا میں آپ ہی بہا جاتا ہوں . . . . [1]

شہید کا خیال یہ ہے کہ " اُردو زبان میں عربی اور فارسی اور ہندی اس طرح مل گئی ہے کہ اگر کوئی چاہے لفظ عربی خواہ فارسی کا اس میں شمول نہ ہو اور خالص ہندی کے الفاظ میں گفتگو کرے تو بولنا دشوار ہو جائے۔[2]" اسی لیے وہ اُردو انشا کو بالکل فارسی کے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خط و کتابت کے جو اصول و آئین انھوں نے لکھے ہیں وہ اُردو اور فارسی دونوں میں یکساں طور پر کام آسکتے ہیں۔ خود اُن کے الفاظ میں:

> " اب ہم خط و کتابت کے دستور یہاں سے لکھے دیتے ہیں کہ اردو اور فارسی دونوں کے لیے کام آویں۔[3]"

شہید کے خیال میں اُردو فارسی سے روگردانی نہیں کر سکتی اور " اگر کوئی رقعہ فکر و تلاش سے لکھا جائے جس میں کوئی لفظ فارسی اور عربی کا نہ آوے تو وہ صنعت میں داخل ہے اگرچہ فارسی اور عربی نہ ہونے کے سبب سے اس کے اردو کو بہت خوب نہ کہیں گے۔[4]"

اس کے بعد انھوں نے اس قسم کی صنعتوں کو بعض رقعات میں برتا ہے مثلاً :

۱۔ رقعہ جس میں ہندی کے سوا کوئی لفظ عربی اور فارسی نہیں ہے۔ ۲۔ رقعہ جس میں الف نہیں آیا۔ ۳۔ رقعہ جس کے کسی لفظ کے پڑھنے میں ہونٹ سے ہونٹ نہیں ملتا۔ ۴۔ رقعہ غیر منقوطہ۔ ۵۔ رقعہ جو نظم اور نثر دونوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ۶۔ رقعہ شطرنج کے تلازمے میں۔

---

[1] انشائے بہار بے خزاں۔ ص ۳۱۔
[2] ایضاً۔ ص ۲۳۔
[3] ایضاً۔ ص ۲۲ و نیز ص ۵۳۔
[4] ایضاً۔ ص ۵۴۔

مولوی غلام امام شہید کا طرزِ نگارش سرتاسر فارسی سے مستعار ہے۔ اس میں وہ خونِ جگر نہیں ہے جس سے آرٹ میں جان آجاتی ہے۔ اسی لیے یہ نالۂ نے، سرود رسے نہ بن سکا۔

(۱۰) مفید الانشا از منشی شیو نرائن۔ لکھنؤ ۱۸۶۹ء۔
اس کا ہندی میں بھی ترجمہ ہوا اور ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔[۱]

(۱۱) لذۃ الافہام از سید محمد علی مولوی صفوی (۱۸۷۲ء)۔
یہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور طبع ہو چکی ہے۔

(۱۲) مکتب نامہ (۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء) یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔ (آصفیہ)۔

(۱۳) انشائے مفید النسا، از عبداللہ خاں۔ مطبوعہ لکھنؤ۔
سنہ ۱۸۷۲ء۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔[۲]

(۱۴) انشائے نور چشم۔ اس میں یار محمد خاں شوکت کے لکھے ہوئے خطوط ہیں۔
کانپور ۱۸۷۳ء[۳]

(۱۵) مکتوب احمدی[۴] ۱۸۷۵ء مطبوعہ لکھنؤ از سید احمد حسین۔

(۱۶) مجموعہ کاغذات کارروائی[۵]۔ (۱۸۷۶ء) از درگا پرشاد، مطبوعہ لکھنؤ

(۱۷) ظرافت نامہ[۶]۔ انگریزی سے ترجمہ از ناصر علی۔

(۱۸) انشائے دل ربا۔ لکھنؤ ۱۸۷۷ء انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

(۱۹) حدیقۃ الوصایا[۷] (۱۸۷۸ء) از کرشن لال دہلوی۔

(۲۰) انشائے نصرت (۱۸۷۹ء) از محمد نصرت علی خاں۔

(۲۱) رقعات نسواں[۹] (۱۸۹۲ء) از مرزا ابراہیم سلطان حزیں دہلوی۔
اس میں خاص دہلی کی زبان لکھی ہے۔

---

[۱] بلوم ہارٹ۔ فہرست کتب خانہ انڈیا آفس (ہندی)۔ [۲] بلوم ہارٹ۔ فہرست مطبوعات۔ برٹش میوزیم۔
[۳] [۴] [۵] [۶] بلوم ہارٹ۔ کتب خانہ انڈیا آفس۔ [۷] [۸] فہرست کتب خانہ انڈیا آفس، ج ۲، حصہ ۲۔
[۹] ضمیمہ فہرست کتب برٹش میوزیم۔

E
12

(۲۲) مبادی الانشا ۱۸۹۶ء از محمد ذکاءُ اللہ۔ آصفیہ۔
(۲۳) تحفۃ النساء از محمد دلاور شاہ دہلوی فسوں (۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء)
کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔
(۲۴) انشائے فیض منشا از منشی احمد حسین۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ اہل اسلام
مدراس میں موجود ہے۔
(۲۵) منشات پریشاں از نواب غلام دستگیر خاں (آصفیہ)

یہ سلسلہ عصر حاضر میں بھی جاری رہا تھا اور بہت سی کتابیں انشائے جدید اور انشائے نسواں پر شائع ہو چکی ہیں لیکن اس زمانے میں ان آئین و آداب کی وہ پابندی نہیں ہوتی جو پہلے ہوتی تھی اس لیے ان کی وہ اہمیت بھی نہیں رہی۔

سموط درد

یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر ایک کتاب سموط درد کا ذکر نہ کیا جائے جو شائع تو ۱۹۲۵ء میں ہوئی لیکن ہے اگلے وقتوں کی چیز۔ یہ مولانا سید محمد عبدالقادر سیفی نے بے نقط لکھی ہے اور مصنف کا خیال ہے کہ "اردو منشات میں ان رقعات کو پہلا نمونہ کہنا بے جا نہ ہوگا[1]"

سموط درد کے مراسلات تین سمط یعنی لڑیوں پر منقسم ہیں۔ سمط اوّل میں بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کو خطوط ہیں۔ سمط دوم میں چھوٹوں کی طرف سے بڑوں کو خطوط ہیں اور سمط سوم میں برابر اور مساوی درجہ والوں کو خطوط لکھے ہیں۔ ذیل میں ایک خط کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ مراسلہ ولد کو مدح علم میں۔

آرام دہ دل سوگوار ولد کامگار۔ محمد طوالعمرہ

دعا، طوالعمرہ موصول ہو کر لائح ہو کر مراسلہ موصول ہوا۔ حال معلوم ہوا۔ ہر گاہ ہمارا مراسلہ وصول ہو معاً دارالعلوم لاہور کو سدھارو اور علوم مرسومہ حاصل کرو۔ احمد سلمہ کو دلاسا دو اور دعا کہہ کر کہو کہ سوداء لاحاصل اور وہم لاطائل دور کرو اور سرگرم کار ہو کر دل لگا کر علم و ادراک حاصل کرو گروہ آدم مکرم علی اہل عالم واسطہ علم ہوا والا گدھا اور مرد لاعلم ہم دگر ہمسر ہوگا اگر علم معدوم ہو معاملۂ کارگاہ عالم معاً معدوم ہو[2]"

---

[1] سموط درد، ص ۷۔ [2] ایضاً۔

سید اصغر علی اصغر اکبر آبادی

اس میدان میں مولانا عبد القادر سیفی کی منفرد حیثیت نہیں ہے۔ ان سے پہلے بھی ان رنگینیوں کو آئینہ خانے میں مقید کیا گیا ہے۔ مولانا شہید کے ہم عصر اور مہاراجہ مہندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے میر منشی سید اصغر علی اصغر اکبر آبادی (۱۸۷۹-۱۸۴۰ء) نے الف بائے موحدہ تائے مثلثہ جیم حائے حطی خائے معجمہ دال مہملہ ذال معجمہ رائے مہملہ سین مہملہ شین معجمہ صاد مہملہ ضاد معجمہ طائے مہملہ ظائے معجمہ عین مہملہ غین معجمہ ف قاف کاف لام میم ن د ہائے ہوز یائے تحتانی اور منقوطہ کے ترک میں بہت سے رقعات لکھے ہیں۔ اور عشقیہ خطوں میں لفظی اور معنوی صنعتوں کو برتا ہے مثلاً ترک الفت میں لکھتے ہیں:

سوزِ تپِ فرقت سے عجب رنگ ہیں دل کے
تحریر نہیں ہوتے ہیں جو ڈھنگ ہیں دل کے

طوطیٔ شیریں تقریر چمن مودت بلبل نوید گلشن محبت غنچۂ مقصد ہمیشہ شگفتہ رہیو

غم فرقت سے سینہ میں مرے شعلے بھڑکتے ہیں
کلیجہ دل جگر تینوں یہ بسمل سے تڑپتے ہیں

جگر سوختہ شعلہ مجبوری دل برشتہ سوزش دوری مذبوح خنجر چشم پوشی مجروح شمشیر شیوہ خموشی خو کردۂ رنج و غم ستم دیدۂ پیہم جرعہ چشیدۂ قدح درد دردو مریض تپ ہجر چہرہ زرد نمیقۂ لطیفہ سے مسرور ہے مے خوشی و خرمی سے مخمور ہے۔ زہے وثیقہ شریفہ جہتے دقیقہ رفیعہ کہ حرف حرف زخم جگر کو مرہم صحت بخش ہے لفظ بلفظ دل مغموم کو فرحت نقش ہے۔ بندہ پرور جب سے فلک کج رو درپئے ستم و جور ہے۔ یہ خیفتہ و خستہ زندہ در گور ہے۔ گو روتے روتے دیدۂ خونی میں نمی نہیں پھر بھی لختِ جگر کے نکلنے میں کمی نہیں[1] . . . . . . "

ان خطوں میں صرف لفظوں کی بازیگری اور فارسی کی بے کیف تقلید ہے۔ ان کا تعلق روح اور دل کی گہرائیوں سے نہیں ہے۔ ان میں جو فنی شعور کار فرما ہے وہ بھی جامد اور رسمی قسم کا ہے۔

---

[1]: ادبی خطوط (رقعاتِ اصغر) ص ۹۔ مطبوعہ آگرہ۔

بابِ سوم

بے خبر اور غالب

(الف) خواجہ غلام غوث بے خبر

غالب سے پہلے کا مکتوباتی ادب

غالب سے پہلے کا مکتوباتی ادب اس زمانے کے سماجی اور تہذیبی تقاضوں سے بے تعلق نہیں ہے۔ اس کی تمام تر روایتیں ماحول کی پیداوار ہیں۔ اسی لیے وہ تکلفات و رسوم کی خوبصورت زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کا حال دورِ متوسطین اور دورِ متاخرین کی اس اُردو شاعری کا سا ہے جس کی بلند پردازی اور پرکاری ختم ہوگئی تھی اور جہاں صنعت و محاورہ کا استعمال ہی شعر و سخن کا کمال سمجھا جانے لگا تھا۔

اس کی فنی روایتیں

جن لوگوں نے اردو مکتوبات پر اپنا نام ثبت کر کے اس کا ایک معیار قائم کیا وہ فارسی انشا ہی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ ان کی ذہنیت رجحانات اور خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کیے تھے۔ اسی لیے اُردو کا مکتوباتی ادب بھی فارسی کے قدم بہ قدم چلتا رہا لیکن جب یہ فنی روایتیں محکوم سے حاکم بن گئیں اور مکتوب نگاری طلسم آرائی کا دوسرا نام ہوگئی تو مرزا غالب نے جن کا یونان کے دیوتا جانس JANUS کی طرح ایک رخ ماضی

کی طرف تھا اور دوسرا مستقبل کی طرف پرانی روشوں کو ختم کرکے ایک نئی راہ دکھلائی اور جدت و اختراع کا وہ چشمہ جو مدت سے خشک پڑا تھا ان کی کوششوں سے پھر ابل پڑا۔

خواجہ غلام غوث بے خبر ۱۹۰۵-۱۸۲۴ء

بڑی حق ناشناسی ہوگی اگر اس سلسلے میں غالب سے پہلے خواجہ غلام غوث بے خبر کا ذکر نہ کیا جائے جنھوں نے مرزا غالب سے بھی قبل اس میدان میں قدم رکھا اور ۱۸۴۶ء ہی میں[1] مکتوب نگاری کو فنی خراد پر چڑھایا۔ ان کے خطوط ادبی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ بجا طور پر غالب کے پیش رو کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے اردو خطوط کا ایک مجموعہ ۱۹۴۰ء میں آگرہ سے انشائے بے خبر کے نام سے شائع ہوا اور اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۹۱ء میں رقعات و نثر اُردو کا مجموعہ فغان بے خبر کے نام سے نامور پریس الہ آباد سے چھپا جس کا مطالعہ دراصل غالب کی عود ہندی کے ساتھ کرنا چاہیے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست!

بے خبر کے خطوں کا پس منظر

بے خبر نے جس وقت انشا کے میدان میں قدم رکھا فارسی کا زوال ہو رہا تھا اور اردو میں علوم و فنون کی کتابیں کثرت سے تصنیف ہو رہی تھیں۔ اردو نے گھریلو زندگی میں نفوذ کر لیا تھا اور مکتوبات و مراسلات میں بھی اس کا رواج ہو چلا تھا۔ چنانچہ بے خبر لکھتے ہیں:

> "خط و کتابت بھی اسی (اُردو) میں ہونے لگی۔ میرے ہمنواؤں نے بھی باوجود اس کے کہ فارسی دانی میں اہلِ زبان کے محسود تھے اسی ہنجار کو اختیار کیا۔ یاروں کی جماعت سے خارج کیوں کر ہوتا۔ ناچار مجھے بھی اسی طریقہ پر چلنا پڑا۔"[2]

فارسی ختم تو ہوگئی تھی لیکن اس کے اثرات باقی تھے اسی وجہ سے اُردو نثر میں بعض بعض جگہ الفاظ کی بازی گری بندشوں کی شعبدہ بازی اور تکلف اور تصنع کی آمیزش نظر آتی ہے۔ خاص طور پر تقریظیں اور نثری دیباچے فارسی کی تقلید میں بالکل مقفیٰ اور مسجع عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ بے خبر بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ داستانِ تاریخ اُردو

---

[1] انشائے بے خبر، صفحہ ، ج۔ [2] فغان بے خبر، ص ۳۔

میں لکھا ہے :

"تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ برتتے تھے۔[۱]"

بے تکلفی اور بے ساختگی

بے خبر کے خطوں میں کہیں کہیں قافیہ پیمائی اور مترادفات کی گلدستہ بندی ہے لیکن سرور کے مقابلے میں بے تکلفی اور بے ساختگی زیادہ ہے۔ کہیں کہیں مکالمے کی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔ القاب بھی مختصر اور موزوں ہیں۔ مثلاً لطف فرما میرے، مخدوم یا مکرمی۔ بعض جگہ القاب غائب ہے۔

مولوی محمد حامد کے خط کا جواب اس طرح شروع کرتے ہیں۔ یہ بے تکلفانہ انداز قابل غور ہے۔ مرزا غالب نے اسی بنیاد پر ایک عالی شان قصر تعمیر کیا ہے۔

" دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

اس وقت آپ کے اشتیاق نامے نے مجھے سخت متحیر کیا۔ اللہ اکبر یہ اشتیاق کہ ایک عرصہ سے اس کا ہونا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور یہ گریز کہ ایک شہر میں رہ کر ملنا تو درکنار یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا حال مجھ پر ظاہر ہو۔ خدا خدا کیجیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے آئیے اور ملیے ورنہ میں یہ سمجھوں گا کہ آپ کا اشتیاق سچا نہیں ہے۔"

اس خط کے خاتمے پر لکھتے ہیں۔

" ہاں صاحب آپ نے یہ القاب ہادی مراحل خداشناسی جامع علوم ظاہرا و باطنی مجھے کیسے لکھا۔ مجھے اس القاب سے کیا مناسبت۔ میری صورت میری وضع میری معاشرت میری حالت سب اس کے خلاف۔ خداشناسی اگر اسی کا نام ہے جو میرا حال ہے تو بقول حضرت مولوی معنوی

گر ولی ایں است لعنت بر ولی "[۲]

یا حکیم محمد شفیع صفی پوری کو لکھتے ہیں۔

---

[۱] داستان تاریخ اردو، ص ۲۵۵۔ [۲] انشائے بے خبر، ص ۶۲۔

"اجی حضرت عید ملنے آیا ہوں۔ اٹھیے اور ملیے۔

سخت می خواہم کہ در آغوش تنگ آرم ترا
ہر قدر بفشردہٴ دل را بیفشارم ترا

آپ فرمائیں گے کہ عید پیچھے تر کیسی۔ یہ بات نہیں ہے۔ عید کی نماز یعنی رمضان شریف کے بخیر سدھارنے کا صلواۃ الحمد پڑھ کے جو پڑا تو ضعف صوم سے کئی دن بے ہوش پڑا رہا۔ پھر جو ہوش آیا تو اسی وقت ادھر کو چلا۔ بہت جلدی کی۔ دوڑتا ہوا آیا ہوں جو آج پہنچا۔ ورنہ اپنا تو ناتوانی سے بقول یا دش بخیر بے خبر یہ حال ہے۔

در اول بہار روم گر بسوئے باغ
از ضعف تا رسم بدر آں خزاں رسید[1]"

یہ صفائی اور شگفتگی اکثر جگہ نظر آتی ہے۔ منشی فدا علی عیش سے غائبانہ رسم ہے۔ ان کو لکھتے ہیں۔

"اعلیٰ درجہ کے وہ حضرات ہیں جو دل میں الفت کو راہ دینے کے لئے آنکھوں کے واسطے کے پابند نہیں ہوتے۔ جیسے آپ ہیں۔ پھر آپ نوادر روزگار اور مغتنمات زمانہ سے کیوں نہ ہوں۔ یہ آپ کی قدر دانی ہے کہ آپ نے مجھے الطاف غائبانہ کا سزاوار اور میرے ہذیان کو قابل التفات سمجھا ورنہ میں اس لائق ہوں نہ میرا کلام۔ میں ہستی کے لئے باعثِ عار و ننگ ہوں اور وہ آئینہ سخن کے واسطے زنگ[2]"

بعض بعض جگہ ادا بلندیٔ فکر اور ندرت بیان کی مثالیں ملتی ہیں۔ غلام دستگیر خاں کو لکھتے ہیں۔

"جن عنایت فرمانے فغان بے خبر کو لوگوں کے کانوں تک پہنچایا تھا اب انھوں نے خونابۂ جگر کو رنگ طبع دیا جو میرے فارسی نظم و نثر کے مجموعہ کا نام ہے چونکہ

---

[1] انشائے بے خبر، ص ۶۳۔ [2] ایضاً، ص ۷۶

ہفتہ عشرہ میں تمام ہوجانے والا تھا میں نے عنایت صحیفہ کے جواب عرض کرنے میں اس کے تمام ہونے کا انتظار کیا۔ چنانچہ وہ اختتام کو پہنچا اور آج اس کی ایک جلد خدمت عالی میں روانہ کی کہ میری نادانی کے دو گواہ آپ کے حضور میں پہنچیں[۱]۔"

یا ایک دوست کو لکھتے ہیں ۔

"میں نے سُنا ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جانے والے ہیں اور صبر میرے دل سے طاقت میرے جسم سے، روشنی میری آنکھوں سے، فرحت میری طبیعت سے، سکون میرے حوصلہ سے رخصت ہوکر آپ کی ہمراہی کا ارادہ رکھتے ہیں ایک تو آپ کا سدھارنا دوسرے اتنے رفقائے قدیم کا جدا ہونا جو قیامت میرے سر پر لائے گا وہ ظاہر ہے مگر کیا کیجئے نہ آپ کو روکنے کی قدرت ہے اور نہ اس سبھوں کو منع کرنے کی طاقت[۲]۔"

صنعت طرازی

لیکن یہ بادہ ناب جلد ختم ہوجاتا ہے اور اس کے بعد پڑھنے والے پر خمار کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ بے خبر کا اسلوب اس زمانے سے بالکل جداگانہ نہیں ہے۔ وہی قافیہ پیمائی، وہی کرسی نشینئ الفاظ استخوان بندئ تراکیب اور مترادفات کی کثرت جو اس زمانے کے خصائص امتیازی ہیں۔ وہ ان کے یہاں بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں اور سادہ اور سلیس حصہ زیادہ نہیں ہے لیکن اس صنعت طرازی میں کہیں تعقید ثقالت اور معمائیت نہیں ہے۔

بے خبر نے مولانا غلام امام شہید کا دیوان مرتب کرکے اس پر دیباچہ لکھا ہے اس کی اطلاع شہید کو کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ اس میں تصنع تو ہے لیکن خشونت نہیں ہے۔

۱؎ انشائے بے خبر۔ ص ۵۳۔

۲؎ ایضاً ۔ ص ۶۸۔

"قبلہ میری شوخی دیکھیے۔ یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سُناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معمہ حل کرتا ہوں۔ لعل کے روبرو میں رنگ کی دوکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سُنیے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ یدِ بیضا کی چمک دیکھیے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو کرے۔ اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے۔ گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے۔۔۔۔۔۔ میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو۔ اس کے لیے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو[1]"

بے خبر کے خطوں میں نہ سرور کی سی شعبدہ بازی ہے اور نہ غالب کی سی پرکاری۔ ان کے یہاں سلاست اور جدت ہے جس کی دلکشی میں کلام نہیں۔ بے خبر نے مولوی محمد حامد کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کو خط میں لکھتے ہیں :

"قصہ کہانیوں میں سُنا کرتا تھا کہ اس قسم کے دوست بھی ہوتے ہیں کہ محبت رکھتے ہیں اور نظر نہیں آتے تو استعجاب ہوتا تھا۔ جب سے یہ معاملہ پیش آیا کہ آپ دل سے تو محبت کرتے ہیں اور آنکھوں سے میری چھپے رہتے ہیں تب سے وہ تعجب جاتا رہا۔ اب یہ دعا ہے کہ خالقِ جن و انس آپ کے دل میں میری محبت کو اتنی بڑھائے کہ وہ ایک دن کھینچ کر آپ کو میری آنکھوں کے سامنے لا دے[2]"

غالب نے کچھ ایسے ہی موقع پر حاتم علی مہر کو لکھا تھا :

"علاقۂ محبتِ ازلی کو برحق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر

---

[1] انشائے بے خبر، ص ۴۹ - [2] ایضاً، ص ۶۷

ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اس کے اجارے میں آئی ہے۔ یہ بھی دلیلِ آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہ ہولے اپنے کو بیگانۂ یک دگر سمجھیں البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں۔ اگر سمجھیں[1]"

بے خبر اور غالب کے طرز و اسلوب کا فرق

اسی طرح بے خبر اور غالب کے یہاں تعزیتی مضامین کے خطوط ہیں[2] جن سے دونوں کے طرز و اسلوب کا فرق صاف معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں وہی فرق ہے جو مغلوں کی ابتدائی عمارتوں اور تاج محل میں ہے۔

غالب اور بے خبر میں خصوصی تعلقات تھے۔ غالب نے ان کی زبان اور شاعری کا اعتراف کیا ہے۔

"حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے ابداع اس کو کہتے ہیں۔ جدت طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروے کار لائے[3]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"دو مخلص صادق الولاء دیکھیے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم[4]"

فغانِ بے خبر میں نو (۹) خط مرزا غالب کے نام ہیں۔ یہ خطوط اس لیے اہم ہیں کہ وہ مرزا کے معرکہ آرا خطوط کی تخلیق و تحریر کا باعث ہوئے۔ غالب ایک خط میں بے خبر کو لکھتے ہیں:

"مولانا۔ بندگی۔ آج صبح کے وقت شوق دیدار میں بے اختیار، نہ ریل نہ ڈاک توسنِ ہمت پر سوار چل دیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا اور کب پہنچوں گا۔ اتنا بے خود ہوں کہ جب تک تم اطلاع نہ دو گے میں نہ جانوں گا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا[5]"

---

[1] خطوطِ غالب۔ مہیش پرشاد، ص ۲۹۵۔ [2] انشائے بے خبر ص ۶۷-۶۸۔ اور خطوط غالب، ص ۱۰۔ ۱۴۔
[3] اُردوئے معلیٰ، ص ۲۳۲۔ [4] ایضاً، ۲۳۲۔ [5] ایضاً، ص ۲۲۹۔

اسی خط میں اور باتوں کے بعد لکھتے ہیں :

"آج اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آگیا۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط بنواتا ہوں۔"

بے خبر نے اس خط کا بہت دلچسپ جواب لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"حضرت آج علی الصباح میں گورکھ پور کے میدان میں خیمہ کے اندر اکیلا بیٹھا تھا چکیں جو چاروں طرف کے دروازوں کی چھٹی تھیں، صاف قفس کی صورت تھی۔ ہر سمت کو دیکھتا تھا اور تنہائی سے گھبرا کر یہ مصرع "ہائے یہ تنہائی اور کنج قفس" دفعتاً بنٹو بڑھو کا غل ہوا۔ حیرت میں آیا کہ کس کی سواری آتی ہے۔ دیکھا تو دیکھا کہ شوق اور تمنا اور محبت ان سارے حشم و خدم کا آگے آگے اہتمام ہے۔ اور پیچھے ان کے حضرت توسن ہمت کو کداتے پھنداتے چلے آتے ہیں۔ پھر تاب کسے تھی۔ بے اختیار دوڑا۔ خیمے سے باہر آیا۔ جھک کر آداب بجالایا۔ رکاب تھام کر گھوڑے سے اتارا۔"

یہ خط مکالمہ کی صورت میں ہے۔ آخر میں لکھا ہے :

"حضرت (غالب) نے فرمایا "اسی کو دیکھ رہا تھا کہ خاص تراش آگیا اور حارج ہوا" یہ سن کر میں نے منہ بنا کر کہا اس وقت میں نہ ہوا ورنہ حجام کی خوب حجامت کرتا کہ اس نے میرا حرج کیا۔"

بے خبر کو عودِ ہندی کی ترتیب میں بھی بڑا دخل ہے[1]۔ ان کو یہ نام پسند نہیں تھا اور اصرار تھا کہ اس مجموعے کا نام قندِ ہندی یا قند مکرر ہو[2]۔ انھوں نے غالبؔ سے آخر زمانے میں بھی دو مرتبہ ملاقات کی اور ان کے پیرفانی ہونے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :

"حضرت غالب سے دو بار ملا۔ اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیرفانی ہو گئے ہیں۔ اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے لکھ کر باتیں ہوتی ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہو۔ جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجئے۔ لکھنے میں

---

[1] فغان بے خبر، ص ۲۰۷۔ [2] ایضاً، ص ۱۳۰۔

بھلا کہاں تک لکھئے مگر ہوش وحواس بہت درست. شوخیٔ طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم۔"

شوخی

بے خبر کے خطوں میں شوخی بھی ہے جو لطف سے خالی نہیں ہے۔ ایک خط شاہ برہان الدین کو فقیروں کی بول چال میں لکھا ہے۔

"یاد اللہ۔ کیا بھول گئے جو مدّت میں فقیر کو یاد کیا۔ شاد رہو آباد رہو اتنا بھی غنیمت ہے۔ جمع اللہ کی اکثر صورتوں کو میں لکھتا رہا کہ آپ سے عشق اللہ کہہ دیں۔ سب نے یہ لکھا کہ ان سے دیدوادید نہیں ہوتی۔"

ایک نئی روشنی کے دوست کو لکھا ہے۔ شوخی اور طنز ملاحظہ ہو۔

"آرٹکل نہیں کہ آپ پسند کریں۔ اوپینین نہیں کہ آپ کو مطبوع ہو۔ اسپیچ نہیں کہ آپ بغور سنیں۔ ایڈریس نہیں کہ آپ خوش ہوں۔ لکچر نہیں کہ آپ ویری دل کہیں۔ ڈیبیٹ نہیں کہ آپ ریویو فرمائیں۔ ڈسکس نہیں کہ آپ جی ارس ارشاد کریں۔ ایک پورانی (کذا) عربی ملاؤں کی دست فرسودہ اس پر مہمل اُردو جس میں نہ کوئی لفظ انگریزی نہ نئی روشنی کا پرتو۔"[1]

بے خبر کا درجہ

بے خبر کی حیثیت سرور اور غالب کے درمیان برزخ کی سی ہے اور ان کا طرز اِن دونوں کے اسلوب نگارش کی ایک درمیانی کڑی ہے۔ بے خبر کے خطوں میں ایسی بچی باتیں ہیں جن میں عمومیت اور رنگا رنگی ہے۔ مگر ان کی عمومیت میں وہ حرکی تصویریں نہیں ہیں جنھوں نے غالب کو غالب اور ان کے لفظی خطوط کو متحرک تصاویر بنا دیا۔

بے خبر کے خطوں میں سلاست اور صفائی ہے لیکن اس سنگ طور سے ایک نیا کعبہ نہیں بن سکتا۔ یہ سعادت مرزا غالب کے حصّے میں آئی جنھوں نے اردو انشا کو تقلید کی بندشوں سے آزاد کرا کے اس کے کہنہ پیکر میں ایک نئی روح کو آباد کیا۔ بے خبر نے

---

[1] فغانِ بے خبر، ص ۱۶۷۔

تعزیت کے خطوں میں بھی ان بے محل تکلفات کو برتا ہے جو مرگ تخیل کے مترادف اور عدم خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر ان کی ریزہ کاری جھوٹی اور صنعت گری نقلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"مخدوم حکیم صاحب کی تحریر سے ایسے آپ پر اس صدمہ کا پہنچنا معلوم ہوا جس کو سن کے میرا دل لرز گیا۔ انسان اگر ایک پھول کا درخت لگاتا ہے تو اس کے پھول کا زمین پر گرنا ناگوار گزرتا ہے۔ جب نور بصر اشک کے قطرہ کی طرح دامن صحرا پر گرے لخت جگر امید کے مانند خاک میں ملے۔ جس چاند سے دنیا آنکھوں میں روشن ہو وہ چھپ جائے۔ جس نخل مراد سے گھر گلشن ہو وہ صرصر خزاں سے خشک نظر آئے۔ جس کا نام سو دعاؤں کے ساتھ لیتے ہوں اس کے نام کے ساتھ ہزاروں نالہ وفغاں کا ہجوم ہو۔ جس کی درازی عمر کی امید پر باوجود زندگی سے نفرت ہونے کے جیتے ہوں اس کے فراق میں بن آئے مرجانے کی دھوم ہو تو پھر اگر سینہ گریباں سے پہلے چاک ہو دل وجگر کا قصہ بغیر دشنہ وخنجر کے پاک ہو۔ حیرت سے اشک خون کے مثال سوکھ جائے سکتہ سے آہ راہ پھول کے لب تک نہ آئے پھانسی کی طرح گلوگیر ہو ...... تو کچھ تعجب کی بات نہیں[1]۔"

رجب علی بیگ سرور غلام امام شہید اور ان کے دوسرے مقلدوں کے یہاں یہ رنگ اور نمایاں ہے۔ دراصل اس زمانے کی ادا بلندی فکر اور تزئین بیان کی معراج یہی تھی۔ ان کو پڑھ کر کاغذ کے پھولوں کا دھوکا ہوتا ہے جن میں نہ خوشبو ہے اور نہ شادابی۔

(ب) مرزا اسد اللہ خاں غالب

اُردو فارسی کے حسن مستعار سے چمکی۔ ایسا نظر سوز حسن جس میں اس کے اصلی خط وخال ہی چھپ گئے۔ فارسی ختم ہونے کو تو ختم ہو گئی لیکن اپنا ایک بھوت چھوڑ گئی جو اُردو کے طول و عرض پر ابر کی طرح چھا گیا۔ سرور اور بیگماتِ اودھ نے جو خطوط انتہائی پریشانی کے عالم میں

---

[1] انشائے بے خبر، ص ۷۰-۷۱۔

لکھے ہیں ان میں بھی فارسی تقلید کا دامن بالکل ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ اس آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے۔ غازہ و گلگونہ سے بدصورتی چھپانے کی کوشش کی گئی لیکن نئی ضرورتوں اور تبدیلیوں نے اس نقاب کو نوچ پھینکا۔ اور اُردو انشاء ان تکلفات کے طلسم سے آزاد ہوگئی لیکن پرانی روایات جو خون کی طرح رگ و پے میں سرایت کر جائیں اُن کا دور ہونا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک عظیم المرتبت شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ماضی کا احترام اور مستقبل کی پذیرائی کر سکے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب ۱۸۶۹-۱۷۹۷ء

اُردو انشا کی خوش بختی تھی کہ یہ کام غالب کے ذریعے ہوا۔ ان کی حیثیت ایک دوراہے کی سی ہے جہاں قدیم و جدید آکر ملتے ہیں۔ انھوں نے ماضی سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا بلکہ اردو انشا کی مینائے کہن میں نئی شراب انڈیل کر اس کا رنگ و آہنگ ہی بدل دیا۔

کیا غالب نے محمد شاہی روش کو سب سے پہلے ختم کیا ہے

غالب کے خطوں میں باتیں کی ہیں اور ہجر میں وصال کے مزے لیے ہیں لیکن وہ ان خیالات کے موجد یا مخترع نہیں ہیں۔ اب "محمد شاہی روشیں" متروک ہو چلی تھیں اور فارسی کی نئ طرازیوں کے بجائے سادگی و بے ریائی پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اس زمانے میں رام چندر مدرس علوم انگریزی دلی کالج ایک رسالہ "محب ہند" نکالتے تھے۔ اس کی پہلی جنوری ۱۸۵۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون توہمات و رسوم کے ذیل میں "طریقہ خط و کتابت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں فارسی انشا پردازی پر سخت اعتراضات کیے ہیں اور لکھا ہے:

> "ظاہر ہے کہ جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں اور اپنا مطلب ایک دوسرے سے بیان کرے (کذا) اس میں سوا مطلب کی باتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا چنانچہ کسی کو یہ کہتے نہیں دیکھا کہ بعد گزارش تسلیمات فراواں و کورنشات بے پایاں واضح حصال ملازمت کثیر المباہجت و ملاقات مسرت سمات فلاں کتاب مجھ کو عنایت کرو بلکہ وقت خطاب کے نفس مطلب پر اکتفا کرتے ہیں۔ چونکہ دو شخص کہ تعارف رکھتے ہیں ہمیشہ ایک جا نہیں رہتے اسی واسطے ضرور پڑا کہ کوئی طریقہ مخاطبت و اظہار

مافی الضمیر کا جاری کیا چاہے لکھنے سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا اسی لیے تحریر قائم مقام تقریر ہے۔ صرف مضمون جو وقت خطاب کے کہا جاتا اسی کو لکھنا بھی چاہیے چنانچہ دستور اہل عرب کا یہی ہے کہ کاغذ پر صرف سلام و مطلب لکھ دیتے ہیں من فلاں الی فلاں کذا و کذا والسلام۔ ناگری میں بھی اہل ہند صرف مطلب سیدھی سیدھی طرح صاف صاف لکھ دیتے ہیں مع سمت و تاریخ۔ انگریزی میں بھی یہی دستور ہے کہ ضرورت سے زیادہ خط میں اور واہیات و منشات داخل نہیں کرتے۔ سوائے حضرات فارسی بازوں کے جنھوں نے موافق اپنی عادت کے سب چیزوں کو بگاڑا تھا۔ خط کو خراب کیا۔ اول میں خط کے لمبے چوڑے القاب بعد اس کے آداب و تسلیمات و شرح اشتیاق پانچ چار دس بیس سطروں میں بعد اس کے حال خیریت و عافیت میں چار سطروں میں پھر شکایت نہ پہنچنے خط کی طرح طرح سے اور بے قرار و مضطر ہونا جس کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ یا حال پہنچنے خط کا اور سرفراز و ممتاز ہونا۔ پھر کچھ تھوڑا مطلب بڑی عبارت میں اور بعضے خطوں میں سوائے امور مذکورہ اور کچھ بیان نہیں۔ بعد ان کے سب آشنایوں کو اسامی وار سلام لکھتے ہیں۔ اکثر امرا بلکہ عوام میں دستور ہے کہ مبادا دوسرا آدمی شکایت کرے۔ کچھ نہ کچھ لکھ کر جس میں مطلب کی ایک بات نہیں ہوتی۔ البتہ انشا پردازی و عبارت آرائی میں حتی الوسع دریغ نہیں ہوتا۔ بھیج دیتے ہیں۔ خطوط تہنیت و تعزیت کے دفتر کے دفتر ہوتے ہیں۔ بعضے خطوں میں دیکھا کہ مضمون نہایت عتاب کا ہے لیکن القاب و آداب سے شرف و عظمت و اخلاص و محبت ٹپکتا ہے ..... ایک جا تین خط سات روز کے عرصے میں آئے۔ تینوں میں دو دو چار چار سطریں خیر و عافیت کی مندرج تھیں۔ بار بار خیریت کے لکھنے کی کیا حاجت ہے۔ دوسرے یہ کہ لکھنا نفس مطلب کا دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ اور کوئی واردات خلاف خیر و عافیت کے واقع نہیں ہوئی۔ اگر ہوتی خط میں ضرور مندرج ہوتی۔ خط کو نائب و خلیفہ

تقریر کا اختیار کیا تھا۔ نہ دفتر واسطے انشا پردازی و اغلاق عبارات و صناعات و استعارات کے، جس کا فارسی والوں کو نہایت مرتبہ میں خبط ہو گیا ہے نفس انشا میں کچھ برائی نہیں بلکہ ایک فن شریف ہے لیکن اپنے مقام مناسب میں، نہ ہر جگہ تقریر و تحریر و سلام و کلام میں دس سطریں لکھنی جس میں نفس مطلب ایک سطر میں ہو تضیع اوقات ہے۔ ایک خط ۲۳ سطر کا میں نے دیکھا جس میں مضمون صرف اتنا تھا کہ قریب چار ساعت نواختہ بر غریب خانہ تشریف آرند۔"[1]

ان خیالات کی گونج غالب کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوگی۔ اس لیے کہ یہ رسالہ دہلی کے مقبول رسالوں میں تھا اور بہادر شاہ ظفر کی غزلیں اس میں چھپتی تھیں[2] اس پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب اُردو انشا کا کوئی ناگہانی حادثہ نہیں ہیں بلکہ تاریخ ارتقا کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔

غالب کا تقدم تاریخی نہیں، ادبی ہے

وہ سادگی اور بے تکلفی جو غالب کے خطوں کا وصف امتیازی ہے۔ اس کے نشانات ان کے پیش روؤں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن یہ تقدم تاریخی زیادہ ہے اور ادبی کم۔ اُردو میں سادہ اور آسان نثر کا رواج غالب سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ نوابان کرناٹک کے خطوط فورٹ ولیم کالج کی کوششیں انگریزی حکومت کا قیام صحافت کا فروغ اور فارسی کا زوال ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے لیکن غالب کی سادگی اور بے تکلفی نہاں خانۂ ازل سے آئی ہے اور اس کے آگے ندرت خیال سجدے سے سر نہیں اٹھا سکتی۔ یہ فطری سادگی خود ایک زیور ہے اور اس نے غالب کے منشیانہ ابداعات کو بالکل غیر فانی بنا دیا ہے۔

---

[1] رسالہ محب ہند، ج ۲۹، ص ۴۶-۴۹۔ مورخہ پہلی جنوری ۱۸۵۰ء۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے: رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی کے اہتمام سے مطبع العلوم دہلی میں مطبوع ہوا۔

[2] پہلی جنوری ۱۸۵۰ء کے محب ہند میں بھی شاہ جم جاہ دہلی کی دو غزلیں چھپی ہیں۔ ایک کا مطلع یہ ہے:

یہ چھوڑو خواب غفلت غافلو ہشیار ہو جاؤ
کہ ہے النوم اخ الموت تم بیدار ہو جاؤ

غالب نے اُردو میں خطوط لکھنا کب سے شروع کیے

غالب نے اُردو میں خطوط کب لکھنا شروع کیے۔ یہ اُردو انشا کی تاریخ کا ایک مباحثہ انگیز مسئلہ ہے اور ابھی تک پورے طور پر طے نہیں ہوا۔ حالی کی یادگارِ غالب میں لکھا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن مہر نیم روز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس وقت بضرورت ان کو اُردو میں خط و کتابت کرنا پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت مہر نیم روز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں شاق ہوئی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی۔"

حالی، مہر، عرشی اور حامد حسن قادری کی رائیں

غالب کا یہ قول اس خط سے لیا گیا ہے جو انھوں نے شاکر کے نام لکھا ہے اور عودِ ہندی میں موجود ہے۔ اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن اس میں شدتِ نسیاں اور جاں کنی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط غدر کے بعد کا ہے۔ حالی کے اس بیان سے صرف اتنی وضاحت ہوتی ہے کہ غالب نے ضعفِ پیری کی وجہ سے اُردو میں خط لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن اردو میں سب سے پہلا خط کب لکھا اس پر مطلق روشنی نہیں پڑتی۔ اقتباسِ بالا میں "معلوم ہوتا ہے" "غالباً" "قیاس چاہتا ہے" اور اس قسم کے دوسرے الفاظ ملتے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ حالی کو خود اپنے قول کی صداقت کا پورا یقین نہیں ہے

حالی کا یہ دعویٰ کہ غالب نے مہر نیم روز کی تصنیف کی وجہ سے اُردو میں خط نویسی کی ابتدا کی[1] محض قیاس پر مبنی ہے اور کوئی ایسی روایت جو اس کی موید ہو موجود نہیں۔

غلام رسول مہر نے لکھا ہے: "غالب ۱۸۵۰ء سے اُردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اُردو نثر کو اہلِ علم بلند پایہ نہیں دیتے تھے اس لیے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے لیکن جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا۔ غالب کی خط و کتابت فارسی کے بجائے اُردو میں زیادہ ہوتی گئی"[2]

مولانا عرشی نے اس پر محاکمہ کیا ہے اور فیصلہ حالی کے حق میں صادر کیا ہے[3] لیکن جناب مہر کو اپنی رائے پر اصرار ہے۔ انھوں نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں بھی یہی لکھا ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے بیشتر بھی متفرق خطوط لکھتے رہے ہوں گے[4]

فارسی غالب کی مادری زبان نہیں تھی

فارسی غالب کی مادری زبان نہیں تھی۔ قاطع برہان میں لکھا ہے:

"پدرم در دہلی پیکر پذیرفت و من در آگرہ منشور ہستی یافتم۔ حاشا کہ خود را از اہلِ زبان گیرم[5]"

قیاس چاہتا ہے کہ غالب نے ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اُردو میں خط لکھے ہوں اس لیے کہ انھوں نے شعر بھی پہلے اُردو میں کہے ہیں اور پھر فارسی میں۔

ضرور ہے کہ انھوں نے ۱۸۴۸ء سے بھی قبل اردو میں خطوط لکھے ہوں گے

اس کے علاوہ ان کو بعض ناخواندہ یا اُردوداں لوگوں کو بھی خط لکھنے پڑے ہوں گے وہ بھی اُردو ہی میں ہو سکتے ہیں۔ امراؤ بیگم گمان غالب یہ ہے کہ ناخواندہ تھیں کلب علی خاں کے نام جو ان کے خطوط ہیں وہ بھی ان کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ بنارس اور کلکتہ سے جو خط غالب نے اپنی بیوی کے لیے بھیجے تھے اور جن کا ذکر چھج مل کے نام کے خطوں میں ہے۔ وہ کس زبان میں ہوں گے۔ قیاس چاہتا ہے کہ وہ اُردو میں ہوں گے۔ رام پور سے جو خط

[1] یادگارِ غالب، ص ۱۵۶۔ [2] غالب، طبع اول، ص ۳۰۸۔ [3] مکاتیب غالب، ص ۱۱۲-۱۲۱۔
[4] غالب، طبع ثانی، ص ۴۰۲۔ [5] قاطع برہان، طبع ثانی، ص ۱۳۱۔

غالب نے "استانی جی" (امراؤ بیگم) کے لیے لکھے ہیں ان میں بھی یہی ہے کہ "جاؤ اور پڑھ کر سناؤ"۔[1] اگر امراؤ بیگم پڑھ سکتیں تو ان کے بارے میں یہ ہوتا کہ خط پڑھوا دینا جیسا کہ خط نمبر ۱۸ میں ہے ۔

"مرزا شہاب الدین کو دعا۔ نواب ضیاء الدین خاں کو سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبان کو پڑھوا دینا ۔"

اس بحث سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ غالب نے فارسی سے پہلے اُردو میں خط لکھے ہوں گے اور اس زمانے میں بھی جب وہ عام طور پر فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے اس کا قوی امکان ہے کہ انھوں نے کبھی کبھی اُردو میں خط لکھے ہوں۔ پنج آہنگ کے خطوں میں جگر کاوی اور محنت پڑھی اچھی طرح نمایاں ہے۔ اس وقت بھی سرسری مراسلت کے لیے انھوں نے اُردو ہی کو نوازا ہوگا۔

پروفیسر حامد حسن قادری نے انشائے بے خبر کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کا کوئی خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا نہیں ہے[2]۔ لیکن کم سے کم دو خط ۱۸۵۰ء سے قبل کے موجود ہیں۔ ایک تو منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام کا خط ہے جس میں لنگی کا تقاضا ہے۔

<u>لنگی والا خط اور اس کی تاریخ</u>

"کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی۔ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا۔[3]"

افسوس ہے کہ اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن پنج آہنگ میں وہ فارسی خط موجود ہے جس میں لنگی کی فرمائش کی گئی تھی[4]۔ ہم اس کا ترجمہ مالک رام صاحب کے شکریے کے ساتھ درج کرتے ہیں:

"تمھیں یاد ہوگا کہ میرے پاس برّہ پوستین کی ٹوپی تھی وہ اب کرم خوردہ ہو گئی ہے اور میرے سر پر کچھ نہیں۔ مجھے ٹوپی کی حاجت نہیں البتہ ابریشمی لنگی جیسی پشاور اور

---

[1] خط نمبر ۱۱-۱۳ اور ۱۹ - [2] انشائے بے خبر (آگرہ)۔ [3] خطوط غالب، ص ۱۰۵ نیز اُردوئے معلیٰ، ص ۲۳۶
[4] پنج آہنگ، ص ۱۲۰ –

ملتان میں بنتی ہے اور ان اطراف کے امراء اسے زیب سر کرتے ہیں۔ چاہتا ہوں لیکن ایسی لنگی ہو کہ اس کے رنگ شوخ اور انگشت نما نہ ہوں۔ حاشیہ سرخ نہ ہو۔ کام اگرچہ نازک اور نفیس ہوا ہو لیکن سونے چاندی کے تار اس میں نہ صرف ہوئے ہوں۔ ابریشم سیاہ اور سبز اور خاکستری اور زرد اس کے تار و پود میں استعمال ہوا ہو۔ غالباً اس طرح کی چیز اس علاقے میں جلد اور آسانی سے دستیاب ہو جائے گی۔ تلاش کریں اور مہیا کر کے ڈاک سے مجھے بھیج دیں اور قیمت بھی لکھیں۔ اگر قیمت نہیں لکھیں گے تو میں نہیں لینے کا۔[۱]"

اس فارسی خط کی تاریخ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ عرشی صاحب کا خیال ہے کہ "جوہر خطوں کے جواب میں بے حد سست تھے اور ان کے نام کے خطوط کے درمیانی وقفے ہمیں معلوم ہیں لہٰذا کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دیے ہوں۔" ان وجوہ کی بنا پر انھوں نے جوہر کے نام کے اُردو خط کی تاریخ ۲۱ مئی ۱۸۵۰ء مقرر کی ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود صاحب کی رائے میں "جوہر کے نام کا اُردو خط ان کے نام فارسی خط مورخہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے چند ہفتے بعد کا ہے[۲]۔" جوہر کے وعدے اور غالب کے تقاضے میں چند ہفتے یا چند مہینے ہی کا وقفہ ہو سکتا ہے سال ڈیڑھ سال کا فرق بڑا عجیب ہے۔ رہا خطوں کا درمیانی وقفہ وہ مطبوعہ خطوں سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ بہت سے خط ایسے بھی تو ہوں گے جو منظرِ عام پر نہ آئے ہوں یا ضائع ہو گئے ہوں۔ مہر نے بھی یہی لکھا ہے:

"یہ دونوں خط لازماً ایک دوسرے سے قریب زمانے میں لکھے گئے ہوں گے۔[۳]"

اس موقع پر ایک ادبی لطیفے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ پروفیسر رسا ہمدانی نے ۱۹۳۹ء میں ایک مجموعہ نادر خطوط غالب کے نام سے شائع کیا جس کے پہلے خط کی عبارت یہ ہے:

۱؎ ذکرِ غالب، طبع ثانی، ص ۱۵۹؛ ۲؎ رسالہ مصنف علی گڑھ، ج ۲، نمبر ۴، ص ۴۳-۴۷۔ مالک رام کے خیال میں یہ خط "زیادہ سے زیادہ ۱۸۴۹ء کے اوائل کا ہو سکتا ہے"۔ ملاحظہ ہو رسالہ جامعہ، دہلی، ج ۳۶، نمبر ۲، ص ۹۸۔

۳؎ غالب، طبع اوّل، ص ۲۰۸۔

"شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمھیں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔"

اس خط پر یکم جنوری ۱۸۵۱ء تاریخ ثبت ہے۔ اس سے رسا ہمدانی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تاریخ مذکور سے مرزا غالب نے فارسی ترک کر کے اُردو میں خط و کتابت شروع کی۔ ان خطوط پر قاضی عبدالودود[1]، جناب مالک[2] رام اور مولانا امتیاز علی خاں[2] عرشی تبصرہ کر چکے ہیں اور تینوں کی متفقہ رائے ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں اور ان کے تار و پود خود غالب کے دوسرے خطوں اور یادگار غالب سے مستعار لیے گئے ہیں۔

<u>تفتہ کے نام خط اور اس کی تاریخ</u>

خطوط غالب میں ایک خط منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔ اس میں غالبؔ نے لکھا ہے:

"واللہ۔ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے ہو تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے اس سے زیادہ گنجائش میری روش نہیں[3]۔"

مولوی مہیش پرشاد[4] نے داخلی شہادت کی بنا پر اس کا زمانۂ تحریر اگست ۱۸۴۹ء قرار دیا ہے[5]۔ آگرہ کے اسعد الاخبار میں دیوانِ تفتہ کا اشتہار ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"دیوان تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے۔ ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے وہ بھی اس موسم سرما میں انشا اللہ تعالیٰ تمام ہوگا اس کی ضخامت ۲۵ جزو کے قریب ہے اور قیمت چار روپے۔ بعد اختتام کے پانچ ہو جائیں گے۔ اکثر شائقین سخن نے اس کی درخواست مع زر ثمن داخل مطبع کی ہے کیوں کہ وہ دیوان عجب فصاحت خیز اور لطف انگیز ہے۔ اکثر اشخاص اس کے طبع ہونے کی خبر سن کر بہت

---

[1] رسالہ معاصر پٹنہ، جنوری ۱۹۴۳ء۔ [2] رسالہ جامعہ دہلی، مارچ ۱۹۴۲ء

[3] مکاتیب غالب، بار چہارم، ص ۱۵۶۔ [4] خطوط غالب (مہیش پرشاد) ص ۱

[5] ایضاً، ص ۲۔

خوش ہوئے ہیں۔ خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثنا خواں ہیں[1]۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مطبع کو اصلی یا ترمیم شدہ تقریظ کا علم ۲۰ راگست ۱۸۴۹ء سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ خط بھی اس تاریخ سے پہلے کا ہونا چاہیے۔ اس خط کے اسلوب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مرزا کا اردو میں پہلا خط نہیں ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس سے پہلے بھی انھوں نے متفرق خطوط لکھے ہوں گے[2]۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور کے اواخر میں مصروفیت اور انحطاط قویٰ کی وجہ سے اردو کے رقعوں کی تعداد بڑھ گئی ہوگی۔

اردو نگاری کے اسباب

مہر نیم روز کے لکھنے میں مرزا غالب نے تمام حسن کارانہ قوتوں کو صرف کر دیا تھا اور اس نقش کی درستگی میں "دل و نگاہ و نفس" سب کچھ لگا دیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"از کار فرمائی ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بپرداختن ایں نمط کہ خود را چوں سایہ با زمین ہموار ساختہ ام تا پرداختہ ام و بہ انگیختن ایں نقش کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام۔ دست از کار ہائے دگر کوتاہ ست و دل از اندیشہ ہائے دگر برکنار[3]۔"

اس کے علاوہ قلعہ کی بہتیری مصروفیت تھی ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا اور اصلاحِ کلام کی خدمت بھی بادشاہ نے مرزا کے سپرد کر دی تھی۔ چنانچہ قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے۔ ہر روز صبح کو قلعہ جانا اور پھر دوپہر کو آنا بعد کھانا کھانے کے حضرت کے مسودوں کو درست کرنا۔ احباب کے خط لکھنے کی فرصت بہت کم ہاتھ آتی ہے[4]۔"

یہ حال تو اردو خطوں کا تھا۔ فارسی کے لیے جس قوت دل و دماغ اور اطمینان و آرام کی ضرورت تھی وہ مفقود تھا۔ قاضی عبدالجلیل بریلوی کو ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

---

[1] اسعد الاخبار آگرہ، ۲۰ راگست ۱۸۴۹ء مطابق ۲۹ رمضان ۱۲۶۵ھ [2] رسالہ نگار، لکھنؤ نومبر ۱۹۴۳ء ۔ مکاتیب سرور از مولف مقالہ ہذا نادرات غالب (آفاق حسین) مطبوعہ کراچی میں خط نمبر ۲۔ ۹ رمارچ ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ [3] کلیات نثر فارسی، ص ۲۷۴۔

[4] اردوئے معلیٰ ضمیمہ سرخوش۔

"فارسی کیا لکھوں۔ یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں مرنا سر پر کھڑا ہے[1]۔"

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :

"بندہ نواز۔ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی ترک کرنے کے اسباب مہر نیم روز کی وجہ سے مصروفیت کا بڑھ جانا حضرت کے مسودات کا درست کرنا غلبۂ پیری اور ہجوم مصائب و آلام ہیں۔

شروع شروع میں مرزا غالب اُردو نگاری کو باعثِ ننگ سمجھتے تھے چنانچہ کوئی رقعہ انھوں نے "قلم سنبھال کر اور دل لگا کر[2]" نہیں لکھا لیکن متذکرہ بالا وجوہ سے مجبور تھے۔ شاکر کو لکھتے ہیں :

"آپ انھیں نذر محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اردوے سادہ و سرسری کو غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں[3]۔"

نثر اُردو کی فرمائش پر منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں :

"مگر بھائی تم غور کرو اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا۔"

پھر انہی کو لکھتے ہیں :

"میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔"

خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں :

"غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں یہ لائق شمولِ مجموعۂ نثر اُردو کہاں ہے[4]۔"

---

[1] عود ہندی، ص ۱۶۵ ۔ [2] اُردوے معلّیٰ مکتوب بنام منشی شیو نرائن، ص ۳۶۱ ۔
[3] اُردوے معلّیٰ، ص ۲۱۵ ۔ [4] عود ہندی، ص ۱۶۴ ۔

مرزا کی وہ اردو نگاری جو بقول ان کے عامیانہ بھی ضرورتاً اور مجبوراً شروع کی گئی لیکن رفتہ رفتہ تفریح کا مشغلہ بن گئی اس عہد افسردگی و یاس کو مسرت و انبساط کے ساتھ گزارنے کا ایک یہی طریقہ باقی تھا کہ جو دوست آشنا باقی تھے ان سے خط و کتابت کی رسم جاری رکھی جائے۔ کچھ ان کی سنی جائے اور کچھ اپنی کہی جائے۔ اس طرح اُردو مکاتبت غالب کا تفریحی مشغلہ بن گئی مرزا تفتہ کو انھوں نے لکھا ہے:

"ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔"

تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔"

وہ نثر جو ضرورتاً اور مجبوراً لکھی گئی رفتہ رفتہ ایسی دلکش اور نادرہ کار بن گئی کہ دنیائے اُردو اس کا جواب پیش کرنے سے یکسر قاصر ہے۔

غالب کے خطوں کی ادبی اہمیت

ملٹن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر وہ فردوس گم شدہ نہ لکھتا اور محض Areopagitica لکھ کر مر جاتا تب بھی اس کی شہرت میں کوئی فرق نہ آتا۔ اسی طرح اگر خاکم بدہن دیوانِ غالب نہ ہوتا اور محض غالب کے رقعات ہوتے تب بھی وہ آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکتے۔

تھوڑی دیر کے لیے رقعات غالب کے گوناگوں ادبی محاسن سے قطع نظر کر لیجیے اور صرف یہ سوچیے کہ ان کی انشا پردازی کی تاریخ میں کیا اہمیت ہے تو یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ وہ نثر جس کے بانی سرسید سمجھے جاتے ہیں اس کی خشتِ اوّل غالب ہی کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔

علاوہ ازیں اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ مرزا غالب کی شوخی اور ظرافت نے اودھ پنچ اسکول کے لیے راہ کھول دی[1] اور اگر یہ اولین تخم ریزی نہ کی گئی ہوتی تو اُردو کا دامن اودھ پنچ کے سدا بہار پھولوں سے خالی ہوتا۔ یہاں یہ بات بھی

---

[1] گلدستہ پنچ؛ ص ۵۔

نہ بھولنا چاہیے کہ غالب اور اودھ پنچ کی ظرافت میں بڑا فرق ہے۔ وہی فرق جو تبسم زیرلبی اور خندۂ زخم ریز میں ہوتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو اپنے سر پر بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے اندھیری رات میں دشوار گزار سفر طے کر تا رہا ہے۔ وہ اگر راستے کے پیچ وخم اور نشیب و فراز سے دوسرے راہگیروں کو مطلع کر دیتا ہے تو وہ نفس کے الفاظ میں اپنا ہی بوجھ ہلکا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کا بھی بوجھ ہلکا کر دیتا ہے۔

قدیم لوازم مراسلت میں اجتہاد

مرزا غالب کے خطوں میں اجتہاد کی شان نظر آتی ہے۔ ان سے پہلے بلکہ ان کے زمانے تک اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کی خط وکتابت بڑی حد تک رسمی اور تقلیدی تھی۔ آداب و القاب اور دعائیہ جملے مقرر تھے تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں چند باتیں کی جاتی تھیں اور بقیہ خط حشو و زوائد سے بھرا ہوتا تھا۔ مرزا غالب نے اس طرز کو دیکھا جس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور دانت گرے ہوئے تھے۔ ان کی "جوان" طبیعت نے اس رنگ کے خلاف بغاوت کی اور اپنا ایک علیحدہ طرز نکالا جو سرتاسر نیا شوخ اور حسین ہے۔ چنانچہ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دعا کہنا (اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا)۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔ کیوں سچ کہیو۔ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی۔ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اور اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے

اور وہ مقبول نہ ہوگی۔[1]

القاب

غالب نے القاب کا فرسودہ طریقہ بالکل بدل دیا، کبھی صرف میاں، برخوردار، پیرو مرشد، بھائی صاحب، سے خط شروع کرتے اور کبھی اس طرح :

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ۔ مرزا تفتہ
میری جان کے چین سرفراز حسین
میری جان خدا تیرا نگہبان
میری جان سنو داستان
اے میری جان، اے میری آنکھیں۔
اہا ہا میرا پیارا مہدی آیا

کبھی صرف نام لکھتے مثلاً " علاؤالدین خاں تیری جان کی قسم"۔ یا کبھی مضمون براہ راست شروع کر دیتے جیسے :

مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے
ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو
دیکھو صاحب یہ باتیں ہمیں پسند نہیں
کیوں مہاراج
کیوں یار کیا کہتے ہو
آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ
آئیے بیٹھیے مولانا سیاح السلام علیکم

کبھی اس طرح لکھتے : " آپ کا بندۂ منت پذیر غالب خونیں صفیر یوں نوا سنج ہوتا ہے کہ عنایت نامہ عز ورود لایا۔

مرزا غالب نے بعض القاب و آداب ایسے لکھے ہیں جس سے مکتوب الیہ کے اخلاق و حالات پر روشنی پڑتی ہے مثلاً :

---

[1] اُردوئے معلّی، ص ۱۸۶۔

"بخدمت شفقی و مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ قلبہ بالاسرار وعینہ بالانوار"

رحیم بیگ، مرزا کے حریف اور آنکھوں سے معذور تھے۔ یہ سب باتیں اس القاب سے ظاہر ہوتی ہیں۔

میر مہدی، دلّی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے تھے اور دلّی کی زبان پر بڑا فخر کرتے تھے۔ غالؔب ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں:

"آؤ میاں سید زادے آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔"

میر مجروح نے دلّی کا حال پوچھا۔ اس کے جواب میں مرزا غالؔب خط اس طرح شروع کرتے ہیں: "جویائے حال دہلی سلام لو۔" بعض القاب مرزا غالؔب نے ایسے ایجاد کیے ہیں جو خود ان کے حالات کی غمّازی کرتے ہیں مثلاً علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں:

"جانِ غالؔب مگر جسم سے نکلی ہوئی جان۔ قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے۔"

یا مولوی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں:

"میرے شفق میرے شفیق، مجھ سے ہیچ پوچ کو ماننے والے، مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے، میرے محب میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"جاناں بلکہ جان مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو غالب خستہ کا سلام اور نور دیدہ و سرور سینہ منشی محمد میراں کو دعا اور مجھ کو فرزند ارجمند کی نوید۔"

بعض القاب ایسے ہیں جن میں طنز یا ظرافت کا پہلو نمایاں ہے۔ نواب سعد الدین شفق نے ایک مرتبہ خطوں کا جواب نہیں دیا۔ مرزا غالب نے دوسرے خط میں بجائے امید گاہ کے امید کاہ لکھ بھیجا۔

غالؔب نے مرزا حاتم علی مہر کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کو خط اس طرح شروع کرتے ہیں:

"علاقۂ محبتِ ازلی کو برحق جان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اس کے اجارے میں آئی ہے یہ بھی دلیلِ آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہ ہولے اپنے کو بیگانہ یک دگر سمجھیں۔ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں اگر سمجھیں۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی اردو بازار کے مولوی صاحب سوائے مرتضوی پیر علم عباس ابن علی کا سایہ۔"

نواب امیرالدین احمد خاں رئیس لوہارو کو لکھتے ہیں:

"اے مردم چشم جہاں بیں غالب، پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشم جہاں بینِ غالب کی پتلی۔" چشم جہاں بیں" تمھارا باپ مرزا علاؤ الدین خاں بہادر، اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادے نواب امیرالدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمھارا دلدادہ ہوں۔"

غالب کے بعض القاب ایسے ہیں جو باہمی تعلقات کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً میر مہدی جیتے رہو۔ یا میرے مہربان میری جان مرزا تفتہ سخن داں۔ یا نواب یوسف علیخاں فردوس مکاں کو لکھتے ہیں:

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت آداب بجالاتا ہوں۔"

کاتب کا تعارف

غالب نے اسی جدت اور بے تکلفی کے ساتھ کاتب کا تعارف بھی کرایا ہے۔

نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں:

"تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مقلوب رکھ لیا ہے۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ناوک بیداد کا ہدف (پیر حرف یعنی) غالب، آداب بجالاتا ہے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"۱۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے۔"[1]

خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں :

"قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے۔"[2]

چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں :

"کاتب وہی ہے جو لفافہ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہے۔"

جب آخر میں نام لکھتے ہیں تو اس کے ساتھ عموماً کوئی ہم قافیہ فقرہ ضرور ہوتا ہے مثلاً "نجات کا طالب، غالب"۔ "خط کی رسید کا طالب۔ غالب"۔ "بندۂ علی ابن ابیطالب، آرزو مند مرگ، غالب" یا عرضداشت ہوا خواہ، اسد اللہ۔ ایک جگہ تفتہ کو لکھتے ہیں :

"بوڑھا ناتواں مفلس قرض دار کانوں کا بہرا قسمت کا بے بہرا زیست سے بیزار مرگ کا امیدوار غالب"۔

غلام نجف خاں کے خط میں دیر ہوئی تو اپنے خط کو تمام کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "نجات کا خدا سے اور تم سے اس رقعہ کے جواب کا طالب غالب"۔ بابو ہر گوبند سہائے کو ولائتی شراب کی فرمائش کے بعد "غالبِ جاں بلب" لکھتے ہیں۔

تاریخ کتابت

اسی طرح غالب نے تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا ہے اور بعض مواقع پر اس میں بڑی بڑی جدتیں بھی برتی ہیں۔ حکیم نجف خاں کو ہاپوڑ سے لکھتے ہیں : "بدھ کا دن، پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۱۰ جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے۔"[3]

نواب علاؤالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :

"آج منگل ہے ۷ شعبان کی اور ۲۶ دسمبر کی۔ دو بھتیجے تمھارے جمعہ کے دن ۲۲ دسمبر کو

---

[1] اردوئے معلیٰ، ص ۲۴۲۔ [2] ایضاً، ص ۲۷۴۔ [3] ایضاً، ص ۲۴۳۔

روانہ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم الخمیس کو مرحلہ پیما ہوں گا۔"

ایک اور خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھا ہے :

"چارشنبہ ۱۸ مئی بقول عوام ۔ باسی عید کا دن صبح کا وقت[1]۔"

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

"آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج یکشنبہ کا دن ہے۔ ساتویں تاریخ رمضان کی اور انیسویں اپریل کی ۔"

دعا اور سلام

اسی طرح مرزا غالب نے دعا اور سلام کے لکھنے میں بھی موقع اور محل کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو لکھتے ہیں :

"فرزند دلبند شمشاد علی بیگ کو اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی۔"

یہ شوخی اور جدت بھی ملاحظہ ہو۔

استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھپی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی، سن و سال کی رعایت سے نہیں کرتے سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی۔ اور اس نظر سے کہ سید ہیں، درود۔ اور موافق اس مصرع کے سوائے اللہ واللہ ما فی الوجود۔ سجود۔"

شاہ عالم کے خط میں ان کے والد کو سلام لکھتے ہیں :

"اور اپنے والد ماجد یعنی میرے مرشد ہم عصر و ہم فن کو وہ سلام جس سے محبت ٹپکے اور اشتیاق برسے۔"

نواب علاؤ الدین خاں کے خط میں نواب امین الدین خاں کو سلام لکھتے ہیں :

"بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی دتاب گویائی سلام۔"

یوسف مرزا کے خط میں ان کے ماموں کو سلام لکھا ہے :

"اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو میرا سلام بہ اعتبار محبت کے اور بندگی باعتبار سیادت کے۔"

---

[1] آزردۂ معلی، ص ۴۴۶۔

صاحب عالم کے خط میں چودھری عبدالغفور کے متعلق لکھتے ہیں :

"خورشید عالم کو سلام۔ چودھری صاحب کو نہ سلام نہ نیاز صرف یہ پیام کہ ہم تمھارے خط کو مفرحِ روح سمجھتے تھے وہ وظیفہ روحانی منقطع کیوں ہوا؟"[1]

مکالمہ

غالب کے خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تحریر کو تقریر اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ خود بھی اس کے معترف ہیں۔ چنانچہ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

"بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے۔ مکالمہ ہے"[2]

منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں :

"یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت گویا مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے"[3]

نواب انور الدولہ کو لکھتے ہیں :

"پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں"[4]

مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں :

"مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"[5]

درحقیقت یہ مرزا غالب کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے فارسی میں یہ رنگ اختیار کیا۔ اس کے بعد اسے اُردو میں فروغ دیا۔ پنج آہنگ کے دیباچے میں عام انداز سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بیگانگی ایں روش از شیوہ غالب ستمدرنہ چنداں ست کہ بگفتن نیاز داشتہ باشد و اداشناس داند کہ ہنجارِ من در نگارشِ ایں است کہ چوں کلک و ورق بکف گیرم مکتوب الیہ را بلفظے کہ فراخورِ حالت اوست در سرآغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم"[6]

---

[1] اردوئے معلیٰ، ص ۵۸۔ [2] ایضاً، ص ۲۰۳۔ [3] ایضاً، ص ۳۱۲۔ [4] ایضاً، ص ۲۵۸۔
[5] کلیاتِ نثر غالب، ص ۵

مرزا نے اسی بے تکلفانہ روش کو اُردو میں داخل کیا۔ چنانچہ بعض خط بالکل دو آدمیوں کی بالمشافہ گفتگو معلوم ہوتے ہیں مثلاً ان کو یہ لکھنا ہے کہ محمد علی بیگ میرے (غالبؔ کے) کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں۔ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا آج نہ جائیں گی، کہا آج ضرور جائیں گی۔ اسی مطلب کو انھوں نے اس طرح ادا کیا ہے۔

" محمد علی بیگ ادھر سے نکلا بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی۔ آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے "

ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

" اہا ہا میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ، شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے، بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے، خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا[1]"

میر مہدی مجروح کو تاخیر نگاری کا سبب لکھتے ہیں اور خط میرن صاحب اور اپنے درمیان ایک فرضی مکالمہ سے شروع کرتے ہیں :

" اے جناب میرن صاحب السلام علیکم "

" حضرت آداب "

" کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی "

" حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں "

" نہیں۔ میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ

---

[1] خطوط غالب، ص ۲۶۱

خفا ہوا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے۔"

"حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔"[1]

<u>شوخیٔ تحریر</u>

مرزا غالب کی تیسری خصوصیت جو انھیں تمام مکتوب نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی شگفتہ نگاری ہے۔ مولانا حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں:

"وہ چیز جس نے ان (غالب) کے مکاتبات کو ناول یا ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق یا مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی ..... مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ سے وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ (ہوتی ہے)۔"[2]

(الف) غالب کی ظرافت اور بذلہ سنجی ان کی صفت نہیں بلکہ ذات ہے۔ اکثر جگہ انھوں نے اپنے مصائب اور امراض کا ذکر کیا ہے لیکن ایک جگہ بھی ایسی نہیں کہ اس کو دیکھ کر پڑھنے والا متاثر اور محظوظ نہ ہو۔ جس طرح کلی کی چاک دامانی کا نتیجہ پھول ہے ایسے مرزا غالب کی خونابہ افشانی بھی رنگینی و دلفریبی کے ہزار پہلو اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ وہ رنج والم کی داستان بھی اس ملاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ انقباض سے زیادہ سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

مرزا حاتم علی مہر کی معشوقہ مر گئی جس کی وجہ سے ان کو بڑا رنج ہوا۔ مرزا تعزیت کا خط لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہووے۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔" بھئی مغل بچے غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں

---

[1] خطوطِ غالب، ص ۲۶۹۔ [2] یادگارِ غالب، حالی۔

E
14

کو بخشے۔ اور ہم تم دونوں کو بھی۔ کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔[1]"
حاتم علی مہر نے پھر لکھا کہ کسی طرح صبر نہیں آتا۔ بے چین ہوں۔ ان ہی کو دوبارہ لکھتے ہیں۔
آزاد نگاری اور شوخ گفتاری کی اس سے بہتر مثال شاید ہی مل سکے۔

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ۶۵ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ۔ (اور اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی) میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔[2]"

اسی طرح ذوالفقار الدین خاں کے خط میں اپنی موت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس میں درد بھی ہے اور ظرافت بھی ہے۔

"حال قصیدے اور مخمس کا معلوم ہوا۔ قبلہ و کعبہ وہ کر رہے ہیں جو آبا اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ ان کو منظور ہے کہ دعا کا عطیہ جدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جدا پاؤں۔"

کارساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

لیکن میری جان انصاف تو کر ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بے ہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک۔ سات مہینے یہ۔ اور بارہ مہینے سال آئندہ۔ اس مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس۔ نہ جاڑے کی شدت نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف۔ نہ مخبر کا خطر۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں نہ روٹی

---

[1] خطوط غالب، ۳۱۵۔　　[2] خطوط غالب، ص ۳۱۵ و ۳۱۶۔

پکواؤں۔ عالم نور۔ اور سراسر سرور۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش ست تو بدیں آرزو مرا برساں "

سید احمد حسین مودودی نے شکایت کی تھی کہ غزلوں کی اصلاح میں دیر ہوئی، اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"پیر و مرشد آپ کو میرے حال کی خبر بھی ہے۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہوگئے ..... کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن کے خدا نے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے احباب و دوست خدمت اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھ دیا کروں گا۔"

احمد حسین مودودی ہی کو شکایتی خطوں کے جواب میں لکھتے ہیں :

"پیر و مرشد۔ تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی خبر نہیں رہی۔ آپ کے خطوط آئے ہوں گے کوئی خط پڑھ لیا ہوگا کوئی عنوان ناکشادہ پڑا رہا ہوگا ..... اب میں اپنی زبان سے یہ کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں۔ مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا بہرا، اپاہج، بدحواس، ناتواں، فلک زدہ آدمی ہوں۔ عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا اس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی اس کو دیکھ کر بھیجوں گا مگر حضرت کے مسکن کا پتہ بھول گیا ہوں۔"

ساری باتیں لکھ کر آخر میں یہ لکھنا کہ حضرت کے مسکن کا پتہ بھول گیا ہوں بڑی پُر لطف بات ہے۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ دلّی کے اجڑنے کی داستان ہو۔ اپنے آلام و افکار کا تذکرہ ہو۔ دشمن کی شکایت یا دوست کی حکایت ہو۔ تندرستی یا بیماری کا ذکر ہو۔ تعزیت و تہنیت یا عیادت ہو۔ سب میں ظرافت اور شگفتگی کا رنگ موجود ہے۔ اس خوشگوار تداق و مزاح میں وہی لطف پوشیدہ ہے جو نسیم سحر یا جوئبار کی سُبک خرامی میں ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ بغاوت کا حال چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں :

"میں مع زن و فرزند اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا۔ نہ نکالا گیا نہ مارا گیا۔"

اس کرب میں جو کیفیت ہے اس سے انکار ممکن نہیں، حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

"میاں حقیقتِ حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمہ میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرضِ بازپرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

میر مہدی آشوبِ چشم میں مبتلا ہیں، مرزا عیادت کا خط لکھتے ہیں لیکن کیسی محبت سے، ظرافت کے ساتھ۔

"میاں کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمھارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں۔ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں ...... تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو۔ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت حال مفصل لکھوں ..... میرے نورِ چشم کی آنکھ کیوں دکھی۔"

(ب) مرزا غالب نے بعض مواقع پر رعایتِ لفظی سے عبارت میں شوخی اور رنگینی پیدا کی ہے۔ علاء الدین خاں علائی کو نواب کلب علی خاں کے جشنِ تخت نشینی کے متعلق رام پور سے تحریر فرماتے ہیں :

"آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا جائے۔" (اردوئے معلی، ص ۲۴۱)

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق سے میر امجد علی قلق کے متعلق استفسار کرتے ہیں :

"میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ان کے تخلص نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے یعنی قلق میں مبتلا ہوں۔"

خواجہ غلام غوث بے خبر عودِ ہندی کا دیباچہ مرزا سے لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب اس سلسلے میں ان کو لکھتے ہیں :

"مجموعہ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے تو اس کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکان تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔"

(ج) بعض جگہ مرزا غالب نے کسی شعر یا کسی عبارت میں تبدیلی یا تصرف کرکے تفنن اور ظرافت پیدا کی ہے۔ میر حسن نے یہ شعر بے نظیر کی زبان سے قید کی حالت میں بدر منیر کے فراق میں کہلوایا ہے۔ میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں

کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قیدِ گراں

مرزا غالب یہ شعر تبدیل کرکے میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں (مرزا برسات کی مصیبت میں گرفتار ہیں خود ان کا مکان چھلنی ہے)۔ میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں

کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں

نواب علاؤ الدین خاں اور ان کے والد میں اختلاف کے بعد صلح ہو گئی۔ اس موقع پر مرزا نے حافظ کے اشعار میں تصرف کرکے ان کو لکھا ہے۔

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد حوریان رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

قدسیاں بہر دعائے تو و والا پدرت قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

میر کا شعر ہے۔ میر کو کیوں نہ مغتنم جانوں

دلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

غالب کی تبدیلی ملاحظہ ہو: کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں

دلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

(د) مرزا غالب کبھی کبھی دوسروں کے لطائف پیش کرکے اپنی ظرافت کو شوخ اور اپنی دلیل کو مضبوط بنا دیتے ہیں۔ نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں:

"میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا..... بارے اب من کل وجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جاتے جائے گا۔ آگے کون سے

قوی تھے کہ اب اس کو ضعف کہا جائے۔ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر
کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا ہائے بڑھاپا۔ ادھر ادھر دیکھا جب جانا کوئی نہیں ہے یہ
کہتا ہوا بڑھا کہ جوانی میں کیا پتھر پڑے تھے۔"

غدر کے زمانے میں غالب پر یہ الزام لگا کہ انھوں نے بادشاہِ دہلی کا سکہ لکھا تھا۔ مرزا کہتے تھے کہ وہ سکہ ذوق نے کہا تھا اور "اُردو اخبار" میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں:

"ہر چند قلم رو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا۔

چوں جنبشِ سپہر بفرمان داور است
بیداد نبود انچہ بما آسماں دہد

یہ تحریر بطریقِ حکایت ہے۔ نہ بسبیلِ شکایت۔

"از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری۔ فرمود کدام حال خواہد بود۔ کسے را کہ خدا از وے فرض طلبد، و پیمبر سنت و زن، نان خواہد و ملک الموت جان۔"

مرزا غالب کی ظرافت ایک رخشِ عناں تاب ہے جس کو نہ مہمیز کی ضرورت ہے اور نہ تازیانے کی حاجت۔ یہ ایک خداداد سعادت ہے جس کا حصول زورِ دماغ سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بخششِ معنوی کی ضرورت ہے۔ اس ظرافت میں تازگی، ذہانت، جودت اور ادبیت ہے لیکن ابتذال اور سوقیت نام کو نہیں ہے۔ نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں:

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔۔۔۔۔"

باغِ بے نظیر کی نمائش کا حال اخبار میں دیکھا ہے اور چاہتے ہیں کہ نواب کلب علی خاں

کو اس جشن کی مبارکباد دیں اور نہ آنے کا عذر کریں۔ اس مضمون کو اس طرح لکھتے ہیں :

"نمائش گاہِ سراسر سرور رام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں۔ بالاخانے پر رہتا ہوں اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا، کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور رام پور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی، قفس اور میں طائر، اسیر اور وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں۔ نہ پھر سکوں جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے[1]"

(ر) مرزا غالب جب کوئی عذر پیش کرتے ہیں یا کسی بات کی توجیہہ کرتے ہیں تو ظرافت کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ نواب علاؤالدین خاں نے اپنے دوسرے لڑکے کی تاریخ ولادت کی فرمائش کی، مرزا تاریخ نکالنے سے بہت گھبراتے تھے چنانچہ عذر کیا اور لکھا :

"شیر اپنے بچے کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخن ور ہو گئے حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ نام تاریخی کیوں نہ نکال لو۔ کہ مجھ پیرِ غم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاؤالدین خاں، تیری جان کی قسم۔ میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب۔ دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

میر مہدی، دلّی کے عاشق تھے۔ ان کے آشوبِ چشم کی توجیہہ ملاحظہ ہو۔

"تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور

---

[1] مکاتیب غالب، ص ۶۹ (متن)

جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اڑی اس کو آپ نے از راہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔"

غالب نے اپنی تاریخِ وفات "غالب مرد سنہ ۱۲۷۷ھ" قرار دی تھی لیکن وہ اس سنہ میں نہ مرے حالانکہ اس زمانے میں ہیضہ کی وبا بھی پھیلی۔ اس کی توجیہہ مجروح کے خط میں کرتے ہیں:

"میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔"

مجروح نے پوچھا اب وبا کا کیا حال ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"وبا تھی کہاں، جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک ۶۶ برس کا مرد اور ایک ۶۴ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی ہے۔ تف بریں وبا۔"

طنز

(س) مرزا غالب طنزیات کے بادشاہ ہیں اور یہ ان کے بلند پایہ انشا پرداز ہونے کا روشن ثبوت ہے، اس لیے کہ طنز نگاری کی قابلیت، انشا پردازی کی ہفت خواں طے کرنے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔

چسٹرٹن نے لکھا ہے کہ ایک سور کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خدا نے اسے بنایا ہے طنز یا تضحیک ہے۔ اس آئینے میں مرزا کے یہ جملے دیکھنے کے قابل ہیں۔ غالب کو حامیانِ قتیل اور ہندوستانی فارسی دانوں سے خاص بیر تھا۔ چنانچہ صاحب برہان قاطع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم ..... ہندیوں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں۔ ایک بچۂ گاؤ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔"

جانسن نے لکھا ہے کہ وہ آدمی کیا جس میں ذرا سا بھی عناد اور کینہ نہ ہو۔ غالب کے یہاں اس وصف کے ساتھ ساتھ انداز بیان بھی ایسا موثر ہے جس سے وہ زخم تیغ پیدا ہو سکتا ہے جس کو کہ دل کشا کہا جائے۔ ایطاء کے متعلق چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

"..... اگر قابلِ تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبد الواسع اور غیاث الدین اور عبد الرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے۔ باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے۔"

تضحیک کی مثالیں لٹریچر میں اکثر ملیں گی[1] لیکن یہ طعنہ، تیر بار شاید کہیں نہ مل سکے۔ ذیل کا اقتباس "صد بار خوانده و دگر از سر گرفته ایم" کی قبیل سے ہے لیکن اس کی لطافت معلّات کی اجازت نہیں دیتی۔

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

نواب انور الدولہ شفق کا خط دیر میں آیا۔ ان کی تاخیر نگاری کا ذکر عجیب انداز میں کرتے ہیں:

"حضرت پیر و مرشد اگر آج میرے سب دوست و عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے تو میں کہتا کہ آؤ رسم تہنیت بجا لاؤ۔ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انور الدولہ کا خط لایا۔ اینکہ می بینم بہ بیداریست، یارب یا بخواب۔"

مرزا غالب کے مکاتیب میں وہ عبارتیں بھی ملتی ہیں جہاں ظرافت کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور سنجیدگی ان کو برہنہ دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتی ہے۔ بعض جگہ غیظ و غضب کے عالم میں ناملائم الفاظ بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں۔

جدتِ ادا

مرزا غالب کے خطوط کی چوتھی خصوصیت جدتِ ادا ہے۔ وہ پامال مضامین کو بھی نرالے اور اچھوتے انداز میں لکھتے ہیں۔ تعزیت کا موضوع نہایت فرسودہ ہے لیکن مرزا غالب یہاں بھی اپنے لیے نئی راہ نکال لیتے ہیں۔ نواب امین الدین خاں کی والدہ کی تعزیت کا خط

[1] ملاحظہ ہو رسالہ 'اردو' دہلی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۱۶۲-۱۶۳۔

لکھتے ہیں :

"بھائی صاحب آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم، تکلفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلتِ نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے مواقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت میں کیا اور میری دعا کیا۔"

یوسف مرزا سے ان کے باپ کی تعزیت کرتے ہیں۔ یہ خط اُردو کی ادبیات عالیہ میں شمار ہو سکتا ہے۔

"یوسف مرزا۔ کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا ..... مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا اگر سچ ہے تو جواں مرد، ایک بار دونوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ[1]۔"

یوسف مرزا کو ایک اور خط لکھا ہے جس میں ان کے بچے کی تعزیت کی ہے۔ ملاحظہ ہو ایک ایک جملے میں کیسا درد اور خلوص ہے۔

"اے میری جان، اے میری آنکھیں ..... وہ خدا کا مقبول بندہ تھا، وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے اولاد بہت نانا کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا

---

[1] خطوطِ غالب، ص ۱۷۰ و ۱۷۱۔

بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔[1]"

امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی خبر سن کر مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔"

یہ خطوط تو وہ ہیں جو دوسروں کو تعزیت میں لکھے ہیں لیکن خود بھی جب انھوں نے اپنے رنج و افسردگی کا بیان کیا ہے تو وہ ظرافت اور ندرت سے خالی نہیں ہے منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب۔ میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

جب سکندر زمانی بیگم کا انتقال ہوا تو غالب نے ایک تعزیت نامہ نواب کلب علی خاں کی خدمت میں بھیجا۔ (یہ مکاتیب غالب کے ص ۴۶ - ۴۷ پر شائع ہوا ہے) جو جدتِ بیان کے اعتبار سے نوادر میں سے ہے۔ ہم اسے تمام و کمال نقل کرتے ہیں۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے۔ چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبانِ فارسی و عبارت بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم۔

---

[1] خطوط غالب، ص ۱۵۵ و ۱۵۶۔

دل نے قبول نہ کیا۔ آرائشِ گفتار نظماً و نثراً واسطے تہنیت ہے کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے۔ طبیعت راہ دیتی ہے الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ معنی پیدا کئے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف، جس بات کا تصور ناگوار ہو، اس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بے قرار ہو۔ یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ ہنوز تہنیت اور مدح کا حق ادا نہ ہوا تھا کہ مرثیہ لکھنا پڑا۔ اگر ایک بات میرے خیال میں نہ آئی ہوتی تو مجھے زندگی دشوار تھی یعنی حضور کو ابتدائے جلوس میں وہ رنج پہنچا کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا۔ غم گیتی کی نہایت یہ چاہتی ہے کہ اب معدۃ العمر ابداً مؤبداً حضرت کو کوئی غم نہ ہو۔ ہمیشہ جہاں جہاں دار و جہانستان و شاد و شادماں رہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپ کے قدم بوسی کا طالب غالب "[5]

اسی طرح غالب نے تہنیت میں بھی جدت برتی ہے۔ نواب علاؤالدین خاں کے لڑکا پیدا ہوا، اس کی مبارک باد لکھتے ہیں:

"میری جان۔ نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو..... تمھاری طرزِ تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوا کہ سعید ہے یا سعیدہ۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو کہ احتمال رفع ہو۔"

غالب کی جدتِ ادا نے دراصل ان کو حلقۂ شام و سحر سے نکال کر جاوداں بنا دیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔ بہ سخن ناصیہ فرکیانم دادند۔

غالب قربان علی بیگ سالک کو اپنی مالی پریشانیوں کا حال لکھتے ہیں۔ اس کا انداز بھی بالکل اچھوتا ہے۔

[5]: مکاتیب غالب (بار چہارم) ص۔ ۴۶۔ ۴۷

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے —
سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیں خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر، ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

حاتم علی مہر نے پنج آہنگ کی جلدیں بندھوائی تھیں اور غالب کو لکھا تھا کہ کتابیں تیار ہو گئی ہیں۔ اس سلسلے میں غالب تفتہ کو لکھتے ہیں جو اس زمانے میں آگرہ میں تھے۔

"جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سُنا دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں کا اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں ..... یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب ملے گا۔"

میر مہدی مجروح کے خط میں میر سرفراز حسین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"شام ہوئی چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان یقین

سید نصیر الدین ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ میں۔ اس کے سر پر ایک ٹوکرا۔ اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا اہا ہا سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے۔ شراب نہیں۔ آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا، بادۂ انگوری سے بھرا ہوا، مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہے۔ مگر میں تمھاری تکلیف اور تکلّف سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے۔ خانہ آباد دولت زیادہ۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کو غدر کے بعد پچھلی صحبتوں کو یاد کرکے لکھتے ہیں :

"صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدّت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔"

تشبیہات و تلمیحات

کسی ادیب اور انشاپرداز کے کمال اور استادی کو جانچنے کے بہت سے گُر، نکتے اور انداز ہیں۔ ان میں سے ایک صحیح اور موزوں تشبیہہ اور تلمیح کا استعمال بھی ہے۔

مرزا غالب نے پنج آہنگ کی بعض جلدوں پر حکام کو بھیجنے کے لیے طلائی نقش و نگار بنوائے تھے۔ ان کے متعلق مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں ۔

"طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔"

نمائش باغ بے نظیر دیکھنے کی تمنا ہے لیکن ناطاقتی نے بُرا حال کر رکھا ہے۔ اس موقع پر نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں ۔

" پالکی قفس اور میں طائر اسیر۔ وہ بھی بے بال و پر۔ نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔"

منشی حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں ۔

"کل ایک خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارہ دنبالہ دار آیا۔"

میر مہدی مجروح کو مہاراجہ الور کے اختیارات ملنے پر لکھتے ہیں ۔

"سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔"

اپنے پھوڑوں کا حال سیف الدین سیاح کو لکھتے ہیں ۔

"بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہے۔"

نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں ۔

"ان دنوں میں متفرقات کے قرض دار سرگرم تقاضا بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپیے کی ہنڈی صراحی آب حیات ہوگی۔ دام مرگ سے نجات ہوگی۔"

تصویر کشی اور صورت گری

غالب مکمل آرٹسٹ ہیں اور ان کے آرٹ کے مظاہر ان کے مکتوبات میں بھی موجود ہیں۔ انھوں نے محاکات اور تصویر کشی کا کمال دکھلایا ہے یعنی لفظوں کے ذریعے پیکر تراشی اور صورت گری کی ہے۔ یہ سعادت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ تخئیل اور مشاہدہ وسیع اور دقیق اور الفاظ کا سرمایہ دستِ شوق سے قریب ہو۔ برسات کے موسم میں

خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں ۔

"پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے ۔ ترشح ہو رہا ہے ۔ ہوا سرد چل رہی ہے پینے کو کچھ میسر نہیں ۔ ناچار روٹی کھائی ہے ۔

افقہا پر از ابر بہمن مہی سفالینہ جام من از مے تہی

غم زدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا ۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں ۔

"سنو ایک آشوب غدر کالوں کا ۔ ایک ہنگامہ گوروں کا ۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا ۔ ایک آفت وبا کی ۔ ایک مصیبت کال کی ۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے ۔ آج اکیسواں دن ہے ۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جیسے بجلی چمک جاتی ہے ۔ رات کو اگر کبھی کبھی تارے دکھائی دیتے ہیں لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں ۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے ۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے ۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکانات گر گئے ۔ سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے ۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے ۔ قصہ مختصر وہ اَن کال تھا کہ مینھ نہ برسا ، اناج نہ پیدا ہوا ، یہ پَن کال ہے پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے ۔"

مجروح کو لکھتے ہیں ۔

"کوٹھری میں بیٹھا ہوں ۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے ۔ ہوا آرہی ہے ۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے ۔ حقہ پی رہا ہوں ۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کرلیں ۔"

حاتم علی مہر کے خط میں اپنی تصویر کھینچتے ہیں ۔

"تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا ۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے ۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے

تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھنی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں۔

تا دسترم بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مِسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے۔ عام۔ مثلاً۔ حافظ بساطی نیچہ بند دھوبی سقہ بھٹیارہ جولاہہ کنجڑا منہار پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا بک رہا ہوں۔"

سہلِ ممتنع

مرزا غالب کے رقعات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سہلِ ممتنع کے درجے پر پہنچ گئے ہیں۔ ان میں بلا کی سادگی، بے تکلفی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اس کا انھیں خود بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد۔ سہلِ ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے ..... خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا[1]"

یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوں میں کہیں تصنع، خشونت اور خشکی نہیں ہے۔ آمد کا ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔

مرزا غالب نے بعض اُردو خطوں میں مخاطب کو خوش کرنے کے لیے مقفّٰی و مسجّع عبارت لکھی ہے لیکن پُرلطف بات یہ ہے کہ اس میں تصنع اور آورد بہت کم ہے۔ دوسرے فقرے میں بھی بالعموم وہی بے تکلفی اور روانی پائی جاتی ہے جو پہلے فقرے میں ہوتی ہے۔

---

[1] عودِ ہندی، ص ۱۴۰۔

یہ بات بقول مولانا حالی" اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطفِ طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن اور قافیے کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

" آؤ میاں سید زادہ آزادہ۔ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کے برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب، وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی"[1]

حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں۔

" وہی زمرد میں کا رخ وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک سا حور بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

تزک و تذکرہ کا لطف

رقعات غالب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تزک و تذکرہ کا سا لطف پوشیدہ ہے۔ وہ ان کی شخصیت، خاندان و نسب، شکل و صورت، تعلیم و تربیت، عادات و خصائل، معاشرت و معیشت، نظریۂ حیات و ادب، اعزا و معاصرین سے تعلقات شاعری تصانیف کا آئنہ و گنجینہ ہیں۔ نظامی بدایونی مرحوم نے مرزا کے خطوط سے جو حقیقتاً ان کی زندگی اور جزئیات کی سچی تصویریں ہیں۔ ایک مختصر خود نواشت سوانح عمری تیار کی ہے جو نکات غالب کے صفحات ۵ تا ۱۹ پر محیط ہے۔ مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، غالب مرتبہ غلام رسول مہر، ذکر غالب مرتبہ مالک رام اور اس نوع کی دوسری کتابوں میں بھی جو غالب

---

[1] خطوط غالب، ص ۲۶۸

کی تصویر مرتب کی گئی ہے اس کے رنگ ان کے رقعات ہی سے مستعار لیے گئے ہیں۔

سیرت

غالب کی سیرت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ایک گروہ نے انھیں ولی کا درجہ دیا ہے۔ اور ان میں وہ تمام صفات قدسی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالی ہیں جو عام طور پر ایک معمولی گوشت پوست کے انسان میں نہیں پائی جاتیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو غالب اسی وجہ سے پسند ہے کہ وہ حمد و نعت لکھنے والا اور توحید و تصوف کے مسلک کو سو سو طرح سے نظم کرنے والا ہے"[۱] بعض نے اسے ننگ آفرینش قرار دیا ہے اور کوئی بُرائی ایسی نہیں ہے جو اس سے منسوب نہ کی ہو۔ ضرورت ہے کہ غالب کی سیرت کے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کو یک جا کر کے ایک مکمل تصویر سامنے لائی جائے جس میں عقیدت اور تعصب کی رنگ آمیزی نہ ہو۔

اس موقع پر تمام مطبوعہ مواد کا احاطہ کرنا ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے لیکن غالب کی سیرت کے بعض مباحثہ انگیز پہلوؤں کو واضح کرنے کے لیے جن کا تعلق نئے اور غیر مطبوعہ مواد سے ہے ہم چند مطالب کی طرف چشم سخن سے اشارہ کریں گے تاکہ اس تمہید سے آیندہ بحث کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

غالب کے خطوط اور کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط ہوش و خرد کے دنیا دار آدمی تھے۔ شیخ سعدی کی طرح ان میں ایک خاص قسم کی ہوشمندی اور دنیوی زیرکی تھی۔ مرزا کی شخصیت میں جو چیز غیر معمولی کشش اور دلاویزی رکھتی ہے وہ بھی ان کی بشریت اور اس پر فخر و ناز ہے وہ خود لکھتے ہیں :

خوئے آدم دارم ۔ آدم زادہ ام

غالب نہایت متواضع خلیق ملنسار بے تعصب اور زندہ دل آدمی تھے لیکن ان کے حالات میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ان کے اخلاق سے تخالف رکھتی ہیں۔ ان کی غیرت اور خودداری میں شبہہ نہیں۔ ان کی مالی پریشانیاں بھی تسلیم ہیں۔

---

[۱] علی گڑھ میگزین غالب نمبر مرتبہ مختار الدین آرزو

اس لیے کہ وہ پنشن کے جھگڑے میں کم وبیش پندرہ سولہ برس الجھے رہے اور ان کا یہ زمانہ بہترین آرزؤں اور ارمانوں کا زمانہ تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے اس کے حصول کے لیے جس انداز میں انگریزی حکام کی تعریف کی ہے وہ ان کی زبان سے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح نوابانِ رامپور کی "بندگی" میں غالب کا "بھلا نہ ہونا" اور ان کے سامنے ان کی "الحاج والتجا" "عبد و معبود" دونوں کے لیے شرمناک ہے۔ پنشن کا معاملہ صرف روپیے کا معاملہ نہیں تھا۔ خاندانی حق اور وجاہت کا بھی معاملہ تھا۔ اس لیے غالب کی بے چینی اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ جس ماحول کے پروردہ تھے اس میں بزرگوں کی عزّت ملک و مال سے زیادہ اہم تھی۔ دہلی کالج کی ملازمت سے انکار کا بھی اصلی سبب یہی تھا۔ غالؔب نے تین قصیدے ملکہ وکٹوریہ کے لیے اور سترّہ ہندوستان کے مختلف وائسراؤں اور گورنروں اور سکریٹریوں کے لیے لکھے ہیں۔ ان میں بھی سوال ثناگوئی اور مدح گستری سے زیادہ جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کا تھا یا دربار لبر اور خلعت کا۔ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں غالؔب نے جو معذرت آمیز قصیدے لکھے ہیں ان میں حصولِ زر کے علاوہ عزّت و آبرو کی تمنّا بھی جھلکتی ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں عزّت کی ایک نشانی یہ بھی تھی کہ آدمی کسی نہ کسی طرح قلعہ معلّٰی سے وابستہ ہو لیکن غالب مصری کی مکھی تھے شہد کی مکھی نہ تھے۔ جب بہادر شاہ کی جانشینی کے متعلق آخری فیصلہ ہوا تو انھوں نے سوچا کہ بہادر شاہ کے بعد یہ شاہی سلسلہ ختم ہوجائے گا اس لیے انگریزوں سے تعلقات استوار کرنا چاہئیں چنانچہ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں فارسی قصیدہ لکھا اور خطاب و خلعت کی درخواست کی۔ اس کا جواب جنوری ۱۸۵۷ء میں ملا۔ اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے غدر شروع ہوگیا۔

<u>معاصرین سے تعلقات۔ غالب اور نواب شمس الدین</u>

پنشن کا ذکر آیا ہے تو غالب اور نواب شمس الدین کے تعلقات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ۱۸۲۶ء سے غالب کی پنشن نواب صاحب سے متعلق ہوگئی تھی اور انھوں نے برِبنائے مخالفت ۱۸۳۱ء سے ان کو پنشن کا ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔ ۸ر اکتوبر ۱۸۳۵ء کو

انگریزوں نے نواب صاحب کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دے دی۔ مرزا کی نواب صاحب سے دشمنی فریزر سے دوستی ان کا مجسٹریٹ سے یارانہ اور مقدمے کے زمانے میں آنا جانا یہ باتیں معمولی نہیں تھیں۔ لوگوں کو شبہہ ہوا کہ غالب نے مخبری کی ہے لیکن خود نواب شمس الدین احمد خاں کو غالب کے خلاف کوئی شبہہ نہیں تھا لیکن غالب نے جو خط ناسخ کو لکھا ہے اس سے اُن کی حریفانہ خوشی اور طمانیت ظاہر ہوتی ہے۔

"از ایزد ستم گر کش۔ ستم رسیدہ نواز۔ بدعا ہائے صبح گاہی می خواہم کہ ایں خیرہ سر بے آزرم زود تر... از سرفرازی بہ پایہ دار آید۔ و دانم کہ ہمم ظفر یاب و دعائم مستجاب است"[1]

یہ خیالات اس شخص کے قلم سے عجیب معلوم ہوتے ہیں جو "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کو اپنا اصول بنائے ہوئے ہو۔

غالب اور نواب یوسف علی خاں

غدر میں جب بادشاہ دہلی اور قلعہ شاہی کے تعلقات کے سبب سے غالب کی پنشن بند ہوگئی تو نواب یوسف علی خاں ہی کی سعی و سفارش سے ۱۸۶۰ء میں دوبارہ جاری ہوئی چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں:

"ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذی شان تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکار دولت مدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں۔ پیشگاہ گورنمنٹ سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا۔"

اس امداد کا غالب نواب صاحب سے اقرار بھی کرتے ہیں:

"جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں۔ عالم غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔"

لیکن پنشن وصول ہو جانے کے بعد اس حقیقت سے اغماض کرتے ہیں۔ چنانچہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

---

[1] متفرقات غالب مرتبہ پروفیسر مسعود حسن ادیب

"والیٔ رام پور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خداساز ہے بعلی ابن ابی طالب علیہ السّلام"[1]

حالاں کہ سچ کے معاملے میں ان کا مسلک یہ ہے:

"میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"[2]

مرزا غالب رام پور سے کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا۔ سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت"[3]

غالب نے کھول کر یہ نہیں لکھا کہ اس وقت تک کچھ نقد نہیں ملا لیکن کنایۃً وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ حالاں کہ ۳۰ راکتوبر کو ایک ہزار روپیہ مل چکے تھے۔ اور تفتہ کے نام یہ خط ۲۸ رنومبر ۱۸۶۵ء کا لکھا ہوا ہے[4]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دوستی کے پردے میں بھی دنیا داری کے قائل تھے اور اپنے اغراض کی حفاظت پوری شد و مد سے کرتے تھے۔

مرزا غالب اور قتیل کی دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ جس سے مرزا قتیل کا تعلق سُن پاتے اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ ناسخ نے لکھا کہ آپ دکن چلے جائیں۔ وہاں چندو لال شعر و سخن کے بڑے دلدادہ ہیں۔ موخر الذکر قتیل کے شاگرد تھے اس لیے ناسخ کو لکھتے ہیں:

"چندو لال زمرۂ مارا چہ داند و ہنجار ما را کے دریابد آں کہ در پارسی قتیل را باستادی گیرد غالب را چہ می کند و آنکہ در اردو نصیر را استاید ناسخ را چہ می کند و خود عرش از ہشتاد متجاوز است تا بادمی رسم او بجہنم می رسد"[5]

---

[1] آرزوئے معلی، ص ۲۳۱۔ [2] ایضاً، ص ۲۴۰۔ [3] ایضاً، ص ۹۸۔ [4] مکاتیب غالب (دیباچہ بارچہارم، ص ۱۲۴۔ [5] متفرقات غالب، ص ۱۰۲۔

غالب اور شہید

غالب کو مولوی غلام امام شہید سے بھی یہی بیر تھا کہ وہ قتیل کے شاگرد تھے پھر اس کی بھی ناگواری تھی کہ وہ ۵۰۰ روپیے ماہوار کے نوکر ہو گئے تھے۔ اُردوئے معلّٰی میں لکھتے ہیں:

"اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں (دکن میں) کوس انا و لا غیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں..... ایک شخص مجھ سے کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپیے مہینا سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے[۱]"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی غلام غوث خاں بے خبر مخلص خالص الاخلاص ہیں۔ ہرگز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں۔ البتہ اس کو خوشگو جانتے ہیں اور کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں... باطل است آں چہ مدعی گوید۔ مدعی اپنے زعم میں مجھ کو اپنا ہم فن جان کر حسد کرتا ہے۔"

اس خط میں مدعی سے مراد مولوی غلام امام شہید ہیں وہی شہید جن کو کلیات نثر میں "بندگان والا شان مخدوم مکرم و مطاع معظم" لکھا ہے[۲]۔ یہ بھی واضح رہے کہ خواجہ غلام غوث بے خبر شہید کے بڑے معتقد تھے اور اس کو "خاقان سریر آرائے کشورستان نکتہ دانی" سمجھتے تھے۔ انھوں نے دیوان شہید کو مرتب کر کے اس کا دیباچہ بھی لکھا ہے[۳]۔ غالب کو بے خبر سے حصول مقاصد کی امید تھی۔ صاحبان انگریزی کی آمد و رفت تبدیلی و تعیناتی کا حال ان سے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے وہ ان کو خاصے خوشامدانہ خط لکھتے رہتے تھے[۴]۔ جب بے خبر نے شہید اور غالب کے تعلقات کی ناخوشگواری کا موخر الذکر کے سامنے ذکر کیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور لکھا کہ "مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات ہوئی تھی جب وہ دلّی آئے تھے..... روز ملاقات سے اس دن تک کہ حضرت دکن روانہ ہوں کوئی امر ایسا کہ باعث ناخوشی کا ہو درمیان میں نہیں آیا..... "

---

[۱] اُردوئے معلّٰی، ص ۳۸۸۔ [۲] کلیات نثر فارسی، ص ۵۱۔ [۳] انشائے بے خبر، ص ۴۹۔

[۴] قتیل و غالب، ص ۶۰۔

اس سے زیادہ قابلِ اعتراض غالب اور آزردہ کے تعلقات ہیں جن کو ہم دو غیر مطبوعہ خطوں کی روشنی میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

غالب اور آزردہ

مفتی صدرالدین آزردہ کا پایہ علم و فضل اور نجابت اور شرافت میں بہت بلند تھا۔ وہ مولانا فضل امام خیرآبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے اور مولوی فضل حق کے ہم سبق۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک فارسی خط میں جو انھوں نے کلکتہ کے مولانا امین اللہ کے نام لکھا تھا۔ ان کا شمار دہلی کے "فضلائے نامدار" میں کیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ "فنونِ عقلی و نقلی اور ادب اور اصول" میں مہارت تام رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ آزردہ کے دیوان خانے میں اہلِ علم کا مجمع رہتا تھا اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔ ان کا مذاقِ سخن بہت پاکیزہ تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا نہ تو دیوان ملتا ہے اور نہ تذکرہ شعرائے ریختہ۔ لیکن حالی نے جو اقوال ان سے منسوب کیے ہیں ان سے ان کی نکتہ سنجی اور سخن فہمی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ غالب نے ایک قطعہ میں ان کی سخن وری کا اعتراف کیا ہے

هند را خوش نفسانند سخن ور که بود
باد در خلوت شان مشک فشاں ازدم شاں
مومن و نیر و صهبائی و علوی و انگاه
حسرتی اشرف و آزرده بود اعظم شاں

غالب نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جو کلیات فارسی میں موجود ہے[1] اس کے چند شعر یہ ہیں۔

صدرِ دیں و دولت و صدر الصدر روزگار
مہر و مخدوم و مطاع و والی و مولائے من

گویم و از نکتہ چیناں در دلم نبود ہراس
کیقباد و قیصر و کیخسرو و دارائے من

موکبش جوں مرجع علم ست باغیرم چہ بحث
پرسشے دارد ارسطومی دود ہمپائے من

---

[1] کلیات فارسی، طبع ۱۹۲۵ء، ص ۳۲۰ تا ۳۲۲۔

خاک کویش خود پسند افتاد در جذب سجود ‏ ‏ ‏ سجدہ از بہر حرم نگزاشت در سیمائے من[1]

آزردہ نے اپنے انتقال[2] سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کو ایک خط لکھا ہے جس میں اپنی بیوی کی امداد و اعانت کی درخواست کی ہے۔ یہ خط غیر مطبوعہ ہے اور آئندہ مطالب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اسے ہم تمام و کمال نقل کرتے ہیں۔

"جناب مستطاب نواب صاحب معلی القاب جم المناصب کثیر المناقب معدن تفقد و نوازش بے پایاں استظہار نیازمندان ملاذ عقیدت کیشاں دامت عنایتکم۔

شکر الطاف والا میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے۔ اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مدارج علیا عطا فرمائے۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ ضعیفہ[3] اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمٰن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت لئیق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے۔ ان دونوں کو آپ کے سپرد کئے جاتا ہوں۔ اگر ناگوار خاطر عاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسن سلوک میرے بعد بھی

---

[1] غالب نے آزردہ کا ذکر کئی جگہ غیر معمولی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: پنج آہنگ طبع ۱۸۸۴ء، ص ۱۰۶-۱۲۳-۱۲۴-۲۰۱ اور ۲۰۲۔

[2] آزردہ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ یعنی ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو ہوا۔ مولوی ظہور علی المخاطب بہ شمس الشعرا نے تاریخ وفات لکھی ہے، چراغش ہست تاریخ ولادت۔ کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود۔ (تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴)

[3] نام لاڈو بیگم۔ نواب صاحب کے نام لاڈو بیگم کی عرضی بھی فارسی میں ہے جس میں انھوں نے آزردہ کے کتب خانے کی فہرست بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو غدر کے بعد فراہم کیا تھا۔

مجھ سے ہوگا۔

سپردم بتو مایہ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے۔ ذوالجلال والاکرام آپ کو عمر خضری اور دانش فلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرمائے۔ معروضہ پانژدہم جولائی ۱۸۶۸ء مطابق بست و سوم ربیع الاول ۱۲۸۵ھ۔

نیاز نامہ محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی[1]

| محمد صدر الدین خاں |

پتہ پر لکھا ہے۔ بسیار ضرور ست زود تر برسد۔"

طرفہ لطیفہ ہے کہ غالب نے آزردہ کے انتقال کے بعد (جن سے زندگی بھر ان کے بڑے اچھے مراسم رہے اور جن کو انھوں نے میر مخدوم و مطاع اور والی و مولا سب ہی کچھ لکھا تھا) نواب صاحب موصوف کو خط لکھا ہے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کر کے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ غالب کی سیرت کا یہ پہلو قابلِ اعتراض ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے۔ ہم وہ غیر مطبوعہ خط نقل کرتے ہیں۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا جیسا کہ میرزا جلال اسیر کہتا ہے۔

جرعہ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نگزرے۔ اس خط میں میں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپیے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ امین الرحمٰن

---

[1] دار الانشا سرکار رام پور نمبر رجسٹر محافظ خانہ ۲۵۶ - دوست و آشنایان (غیر مطبوعہ) نیز ملاحظہ ہو مولف مقالہ ہذا کا مقالہ "غالب اور آزردہ" مطبوعہ آج کل دہلی (غالب نمبر) فروری ۱۹۵۲ء

اس کا بھانجا ہے۔ مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہیں (کذا) آپ سے۔ ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپیہ کا قرض رکھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسرا التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپیہ مہینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے۔ یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک   دولت و عز و جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی ۲۷ جولائی سال حال

عرضداشت دولت خواجہ اسد اللہ [1]

لفافہ پر ۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء درج ہے۔

۱۸۶۲ء میں غالب نے آزردہ کی آمدنی اور ان کی گزراوقات کے متعلق بالکل مختلف خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"تیس چالیس روپیے مہینے کی آمدنی لیکن امام بخش کی اولادوں کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔"

غالب کے بیانات میں کھلا ہوا تضاد ہے۔ ۱۸۶۲ء میں انھوں نے آزردہ کی آمدنی تیس روپیے لکھی ہے۔ ۱۸۶۸ء میں وہ دگنی ہو گئی۔ چھ برس پہلے وہ خوشحالی سے بسر نہیں کرتے تھے۔ اب کنایۃً وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا خاندان امداد کا مستحق نہیں ہے[2]

---

[1] دارالانشا سرکار رام پور نمبر رجسٹر محافظ خانہ ۲۳۴ ـ دوست آشنایان (غیر مطبوعہ) اس کے بعد کا ایک خط مکاتیب غالب میں موجود ہے جو ۱۳ اگست ۱۸۶۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ (ص ۸۲)

[2] ہمارے پاس غالب کے کچھ اور بھی غیر مطبوعہ خطوط ہیں جو ۸ فروری ۱۸۶۵ء، ۵ نومبر ۱۸۶۶ء اور ۲۶ جنوری ۱۸۶۹ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان تینوں خطوں کے مخاطب نواب کلب علی خاں والئ رام پور ہیں۔

غالب اور حامیانِ قتیل

غالب ہندی شعرائے[1] فارسی گو اور ہندی فرہنگ نویسوں کے قائل نہ تھے اس معاملے میں بعض جگہ نہ صرف وہ حدودِ انصاف سے باہر نکل گئے ہیں بلکہ صاحب برہان اور دیگر مخالفین کا جا بجا مذاق اڑایا ہے اور کہیں کہیں عالمِ غیظ و غضب میں ایسے ناملائم اور نامناسب باتیں بھی لکھ دی ہیں جو اُن کے شایانِ شان نہیں۔ سیاح کو رحیم بیگ صاحب ساطع برہان کے متعلق لکھتے ہیں :

> "وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔۔۔۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا۔ سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا۔ لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں وائے اس ہیچ در ہیچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔"

نواب انور الدولہ شفیق کو ملا غیاث الدین کے متعلق لکھتے ہیں :

> "آپ جانتے ہیں کہ یہ کیوں ہے۔ ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام۔ انشائے خلیفہ اور منشآتِ مادھو رام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں۔"

حامیانِ قتیل سے معرکہ میں غالب نے جو درشت گفتاری کی اس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اور بھی کہ یہ مسئلہ بالکل علمی اور تحقیقی تھا۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "معرکہ غالب اور حامیانِ قتیل ــــ ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں" از مولفِ مقالۂ ہذا مطبوعہ رسالہ اُردو، دہلی، ج ۲۷۔ نمبر ۲۔

بشریت

اس بحث سے مقصود غالب سے قطع محبت نہیں ہے بلکہ اس کی بشریت کو نمایاں کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسی بشریت نے اس کی ادبی شخصیت کو جاودانی بنا دیا ہے۔ غالب انسان تھا۔ اسی دنیائے آب و گل کا انسان۔ اس میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ کچھ بات کی پیچ بھی تھی، کچھ تملق اور خوشامد کا بھی جذبہ تھا۔ کچھ حقیقت سے چشم پوشی اور زمانہ سازی بھی تھی۔ لیکن ہمارے نزدیک دامن سیرت کے ان داغوں کو ظاہر کر دینے سے اس کی ادبی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس میں برائیوں سے زیادہ اچھائیاں تھیں اور معائب سے زیادہ محاسن۔ اس کے رقعات وسعت اخلاق، مروت، سلامتی طبع، ذہانت، زندہ دلی اور بے تکلفی کے مصفیٰ اور مجلیٰ آئینے ہیں۔ اس کو اپنے دوستوں سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کا ثبوت اس کے خطوں میں جا بجا موجود ہے ہم صرف دو اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

> "اے میر مہدی تو درماندہ اور عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دہلی کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان کے غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں۔ مقدور رہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا۔
>
> ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ[1] "

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

> "یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ بس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے[2]"

مرزا نے دوستوں عزیزوں اور شاگردوں کا آڑے وقت میں ساتھ بھی دیا ہے۔ ان کے جو تعلقات امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے تھے وہ ان کی وفا پرستی کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مرزا جب جوئے کے مقدمے میں قید ہو گئے

---

[1] اردوئے معلیٰ، ص ۱۱۸۔ [2] ایضاً، ص ۲۵۵۔

تھے[1] تو شیفتہ نے ان کی بڑی مدد کی تھی چنانچہ جب شیفتہ پر وقت پڑا اور وہ قید سے رہا ہو کر آئے تو مرزا فوراً ان کے پاس میرٹھ گئے اور چار دن ان کے پاس ٹھہرے۔ یہ در اصل اسی احسان کا نتیجہ تھا جو تیرہ چودہ برس پہلے شیفتہ نے ان سے کیا تھا۔ غالب کا معتمد الدولہ سے نہ ملنا اور دلی کی ملازمت سے انکار ان کی خودداری کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کی عظمت کے خط و خال ان کی روزمرہ کی زندگی ہی میں نظر آسکتے ہیں۔

غالب کی سیرت اس عہد کے دنیادار اور زمانہ فہم شرفا کی سیرت سے ملتی جلتی ہے۔ ان میں آخری دورِ مغلیہ کی تمام خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں۔ وہ "عالم دوبارہ نیست" کے قائل تھے اور عیش امروز پر زور دیتے تھے۔ وہ مایوس ہو جانے کے بعد پھر عزم کر سکتے تھے۔ اپنی کوتاہیوں پر ہنس سکتے تھے۔ اور اپنی بیماری اور بے رونقی سے دوسروں کے دلوں میں درد آمیز مسرت پیدا کر سکتے تھے۔ ان کی وضع داری انفرادیت انسان دوستی وسیع المشربی اور خوش طبعی میں ایک قسم کی طرح داری ہے جو ان کی شخصیت کو بہت محبوب اور مقبول بنا دیتی ہے۔

تاریخی معلومات

مرزا غالب کے خطوط تاریخی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ ایک مورخ اس زمانے کی معاشرت اور سیاست کے متعلق بہت سی باتیں ان سے اخذ کر سکتا ہے۔ غدر کے بعد دلّی میں جو خاک اڑی اس کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

> "یہاں شہر ڈھہ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار۔ کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے ..... برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں ۱۳ سیر۔ چنے ۱۶ سیر۔ گھی ڈیڑھ سیر[2]

---

[1] یوسف ہندی قید فرنگ میں۔ مطبوعہ حیدرآباد، دکن

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔"

نواب انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔"

معزول بادشاہ کے خاندان کے متعلق علائی کو لکھتے ہیں:

"معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔"

سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"خداوندِ نعمت۔ کیا تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا حال پوچھتے ہو۔ این دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مُرد۔"

نواب یوسف علی خاں نے چوب چینی کی فرمائش کی۔ مرزا غالب نے بڑی کوشش سے پانچ سیر فراہم کی اور از راہ معذرت لکھا:

"دلی اب شہر نہیں چھاؤنی ہے۔ کمپ ہے۔ نہ قلعہ۔ نہ شہر کے امراء۔ نہ اطراف شہر کے روساء۔"

منشی شیو نرائن نے کہا کہ میرے اخبار کے خریدار پیدا کیجیے۔ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں آدمی کہاں کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ ڈھونڈھتے

پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں ۔"

مرزا تفتہ کو ہنگامہ قتل کے متعلق لکھتے ہیں :

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار۔ کوئی میرا شاگرد۔ ہندستانیوں میں کچھ عزیز۔ کچھ دوست۔ کچھ شاگرد۔ کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا ۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔ اس سے بہتر نقشہ اس زمانے کا اور کیا ہو سکتا ہے۔

"اس چرخِ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس دبے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔ شعر

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا "

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو باغی فوج دہلی میں داخل ہوئی۔ اس زمانے میں مرزا گوشہ نشین ہو گئے۔ غالب نواب یوسف علی خاں والئی رام پور کو لکھتے ہیں کہ میں اس زمانہ میں بباطن بیگانہ اور بظاہر آشنا رہا۔[۱] یہ دن مرزا پر بہت سخت گزرے۔ آمدنی مفقود اور خرچ بدستور لیکن کس قدر خوشی کی بات ہے کہ اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ غالب کی خبر گیری ان کے ہندو دوستوں نے کی۔ مہیش داس نے شراب پہنچائی اور تفتہ نے روپیے۔ منشی ہیرا سنگھ شیوا جی رام اور بال مکند سے بھی جو خدمت بن پڑی وہ دل و جان سے انجام دی۔[۲]

---

[۱] مکاتیب غالب، ص ۱۳۔ [۲] کلیات نثر فارسی، ص ۲۰۵

ادبی معلومات

مرزا غالب کے خطوط ادبی نقاد کے لیے بھی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ مرزا محمد عسکری مرحوم کا ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس قسم کے خطوط یک جا کر دیئے ہیں[۱] لیکن ان کی عظمت کا قصر ان کی شاعری اور انشا پردازی پر قائم ہے۔ تحقیق کے وہ مرد میدان نہیں ہیں[۲]۔

غالب کی انشا کا اثر

مرزا غالب اُردو خطوں کے موجد نہیں ہیں۔ ان سے بہت پہلے نامہ نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ آسان القاب رائج ہو گئے تھے۔ اور زبان میں بھی ایک حد تک سلامت اور روانی آ گئی تھی لیکن جذبات اور خیالات عبارت کی باریکی و تاریکی میں جگنو سے اڑتے نظر آتے تھے اور خطوں میں وہ نزاکت اور لطافت پیدا نہیں ہوئی تھی جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے انھوں نے مضامین کے تارے آسمان سے نہیں اتارے ہیں۔ یہی روزمرہ کی باتیں ہیں جو گویا آمنے سامنے بیٹھ کر کی گئی ہیں لیکن وہ ایسی بے باک صداقت کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور ان میں مرقع نگاری کے وہ تمام اسالیب برتے گئے ہیں کہ وہ شربت کے سے گھونٹ اور مصری کی سی ڈلیاں معلوم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر سکسینہ کی رائے پر بحث

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے:

"(غالب کی) اس کاٹ چھانٹ سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ طرز تحریر کی درستی ہو گئی اور یہ ایک نہایت عمدہ جدت کی مثال قائم ہو گئی جس سے اُردو خطوط نویسی پرانے تکلف اور تصنع اور بے موقع اظہار علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں اور دلچسپ بن گئی۔ ہر چند کہ یہ اختراع ان کے معاصرین کو پسند نہ آیا

---

[۱] ادبی خطوط غالب، طبع دوم نیز رسالہ اُردو بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء جس میں تذکیر و تانیث سے متعلق غالب کا ایک خط شائع کیا گیا ہے۔ [۲] اس موضوع پر قاضی عبدالودود کا مقالہ غالب بہ حیثیت محقق اگرچہ اغلاط سے خالی نہیں ہے لیکن پڑھنے کے قابل ہے۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر، ص ۱۷۱-۲۱۲۔

E
16

مگر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اور وقت گزرتا گیا، لوگوں کو اس کی اہمیت کا ضرور احساس ہوا اور ہر طرف اس کے متبعین پیدا ہو گئے۔ مولانا حالی، سرسید، مولوی ذکا اللہ، مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے علاوہ دیگر ارباب قلم مثلاً امیر مینائی، اکبر وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے طریق پر نثریں لکھیں مگر حق یہ ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی، شوخی و ظرافت، جذبات نگاری اور اظہار مافی الضمیر میں کوئی ان کا مدمقابل نہ ہو سکا۔[۱]

اس اقتباس میں غالب کی "ادبی اختراعات" کے خلاف جو معاصرین کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے اس کے تسلیم کرنے میں ہمیں تامل ہے۔

غالب کے طرز کی مقبولیت

غالب نے اُردو میں سب سے پہلا خط کب لکھا، یہ تمام مواد کے نہ ہونے کی وجہ سے قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ۱۸۵۰ء سے پہلے اُردو میں خطوط لکھنا شروع کر دیئے تھے اور ان کے رقعات کو بہت جلد شہرت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے بغیر مرزا کی اجازت کے ان مکتوبات کی اشاعت کا تہیہ کر لیا۔ چودھری عبدالغفور سرور "مہر غالب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جو نامہ کہ بنام میرے بعبارت اُردو تحریر کیا۔ مکتوب سادہ رویوں سے دلرباتر اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا وہ بینا ہے۔ جس کان نے سنا وہ شنوا ہے۔ بس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اٹھانا خلاف انصاف جانا دل مائل تمام بشہرت عام ہوا۔"[۲]

ان خطوں کی مقبولیت اور شہرت کا یہ عالم تھا کہ عود ہندی کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو اطراف و جوانب سے تقاضے کے خطوط آئے اور ان تقاضوں سے عاجز ہو کر غالب نے

---

[۱] تاریخ ادب اُردو (ترجمہ عسکری) ص ۳۱-۳۲۔

[۲] عود ہندی، ص ۵ و ۶۔

۷ مارچ ۱۸۶۴ء کو غلام غوث بے خبر کو لکھا :

"وہ مجموعہ اردو چھپے گا یا چھپا ہی رہے گا۔ احباب اس کے طالب ہیں بلکہ بعض نے طلب کو بسر حد تقاضا پہنچا دیا ہے۔"[۱]

ایک اور خط میں بے خبر ہی کو لکھتے ہیں :

"فی الحال پنجاب احاطے میں اون کی (رقعات) کی بڑی مانگ ہے۔"[۲]

ان تمام شہادتوں کے پیش نظر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ غالب کے مکاتیب کا جدید انداز معاصرین کو پسند نہیں آیا۔ پسند سب کو آیا لیکن پوری تقلید کسی سے نہ ہو سکی۔[۳]

ہمیں حسن اتفاق سے غالب کے معاصرین اور احباب کے چند خطوط حاصل ہوئے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ غالب کی جرأت آموزی نے معاصر انشا پردازوں کو بھی ہمت دلا دی تھی کہ وہ فارسی کو چھوڑ کر سادہ اور بے تکلف اُردو میں اپنے مطالب کا اظہار کریں۔

میر مہدی مجروح

میر مہدی مجروح غالب کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے مرزا کے طرز و اسلوب کی پیروی کی کوشش کی ہے اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں خود غالب کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

"میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں۔ صد آفریں اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"[۴]

اس خط کا جواب جو میر مہدی مجروح نے لکھا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

"قبلہ و کعبہ۔ آداب بجا لاتا ہوں۔ بھلا حضرت آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کے

---

[۱] عود ہندی، ص ۱۲۴۔ [۲] ایضاً، ص ۱۲۵۔ [۳] نیز ملاحظہ ہو یادگار غالب — مرزا غالب کے خطوط پر ریویو۔ [۴] خطوط غالب، ص ۲۴۸۔

طرز پر لکھ سکوں۔ توبہ۔ استغفر اللہ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

مہر عالم افروز کے سامنے ذرۂ ناچیز کی کیا نمود اور بحر بے کراں کے روبرو قطرۂ تنگ ظرف کا کیا وجود۔ یہ دعویٰ میاں ظہوری کریں۔ یہ اندیشہ نظیری کو آوے۔ میں بے چارہ کس حساب میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات منبع کمالات کو اس فن میں یکتا پیدا کیا ہے۔ ہاں اگر دو چار برس قدموں میں پڑا رہوں اور فضل و کمال کی طرح دروازے پر حاضر رہوں تو البتہ کچھ راہ پر آ جاؤں۔ سو یہ چرخِ تفرقہ پرداز کب کسی کو اپنی مراد پر پہنچاتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ دو آدمی حسب دلخواہ ایک جگہ مل بیٹھیں۔ کچھ ان دنوں میں آپ ہی آپ جی گھبراتا ہے اور شوقِ قدم بوسی بہ ولولہ افگن ہے کہ چل اور خاک قدم کو صندل پیشانی کر۔ اگر حضرت یہ صورت ہے تو دو چار دن میں حاضر ہوتا ہوں اور اختصاص قدم بوسی پاتا ہوں۔ زیادہ حدِ ادب

میر مہدی [۱]

میر مہدی مجروح دلّی کے عاشق تھے اور اہلِ دہلی کی زبان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ مرزا غالب نے ایک خط میں لکھا ہے :

" اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں[۲]"

میر مہدی اس خط کے جواب میں لکھتے ہیں :

" قبلہ و کعبہ۔ آداب بجا لاتا ہوں۔ بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے۔ اگر شرم آئے تو رجب علی سرور کو آئے جس نے وہ لاف و گزاف کیا ہے کہ جیسا

---

[۱] اس خط کی نقل ہمیں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ [۲] خطوط غالب، ص ۲۶۰

لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں۔ ان سے کہا چاہیے کہ ارے مردِ خدا خدا سے ڈر۔ لکھنؤ کس بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے۔ کون سی تاریخ میں وہاں کے لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے۔ ماہیت تو اس کی یہ ہی ہے ناکہ مضافات صوبہ اودھ میں کا ایک شہر ہے۔ یہ دلّی سے کیونکر مقابلہ کرے گا کہ اگر پانسو برس کی تصنیفات دیکھو گے اس میں سے یہی لکھا پاؤ گے :

حضرت دہلی کنفِ عدل داد　　　جنت عدن ست کہ آباد باد

اس پر یہ غرّہ کہ جو یہاں کی زبان ہے وہ کہیں کی نہیں۔ باوجودیکہ تفاخراً یہ شہر (کذا) ناسخ نے لکھا ہے :

سن چکے ہیں خوب اردوئے معلیٰ کی زباں
سالہا صحبت رہی ہے ہم کو ناسخ میر سے

اور یہ بات ظاہر ہے کہ میر دلّی کے تھے مگر افسوس کہ ان کے پیرو اس بات پہ خیال نہیں کرتے۔ اے حضرت میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو وہاں کی کون سی ایسی بات پسند آئی کہ ایسی طرف داری فرمائی۔ قطع نظر زبان سے تراش خراش لباس بھی وہاں کی نرالی ہے۔ واہ ری دلی تیرے قربان۔ کیا حدِ اوسط پر سب کا عمل تھا کہ سب چیز افراط و تفریط سے مائل بحدِ وسط تھی۔ کیوں ہو (کذا) "خیر الامور اوسطہا" پر سب کا عمل تھا۔ بھلا حضرت یہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ وہاں سب طرح کے اہلِ کمال موجود ہیں۔ بھلا دلّی سے بھی زیادہ کہیں اہلِ کمال ہوں گے۔ میاں امیر کے برابر لکھنؤ میں کون سا خوش نویس تھا۔ حضرت غالب کی سی نظم و نثر کس کی۔ امام الدین خاں سا حکیم۔ مولانا صدر الدین خاں سا عالم۔ محمد اعظم سا مصور۔ بدر الدین خاں سا مہر کند کہاں ہے۔ دستنبو کی طرح نواب گورنر بہادر نے کس کی تصنیف طلب کی۔ بدر الدین خاں کے مانند ملکہ معظمہ کی مہر کھدنے لکھنؤ میں کون سے مہر کند کے پاس آئی۔ خانم کے بازار کے وہ کاریگر جنھوں نے انگریزی اسباب

بدل ڈالا ورنہ کسی کو معلوم ہوا یہ لوگ کہاں۔ گو دلّی اب اُجڑ گئی اور سارا شہر برباد ہو گیا مگر اس شہر سے جس کی تعریف میں پہلے میر حسن صاحب مثنوی یہ فرما گئے ہیں بہتر ہی ہے۔

زبس شہر ہے بیٹھر پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں — کسی کا جھوپڑا تحت الثریٰ میں
سیاہ گل سے گلی یوں تر بہے ہے — بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے

اگر دلّی کی شہریت اور خوش قطعی کی تعریف کروں تو ایک کتاب بن جائے۔ خط سمجھ کر موقوف کیا۔ میر مہدی مجروح "

ذیل میں مجروح کا ایک اور خط پیش کیا جاتا ہے جس میں غالبؔ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔

(بنام مرزا غالب)

"قبلہ و کعبہ۔ سلامت

بعد گزارش آداب عرض رسا ہوں۔ حضرت نیام بے شمشیر کمان بے تیر چشم بے تنویر نغمہ بے تحریر قالب بے جان یعنی آپ کا بے خط کا عنوان پہنچا۔ جس قدر لفافۂ سربستہ دیکھ کر دل کھلا تھا اتنا ہی کھول کر دل بند ہوا۔ ادھر ٹٹولا ادھر ٹٹولا کچھ نہیں۔ خط اصلا (کذا) کو الٹا پلٹا شاید کہیں ایک دو سطریں لکھی ہوں وہ بھی ندارد۔ یا اللہ یہ کیا خط کہ خط ہے اور خط نہیں۔ معلوم ہوا کہ ظاہری لفافہ ہے۔ اندر کچھ نہیں۔ یہ صورت حامل معنی نہیں۔ میرن صاحب کہتے ہیں جناب مرزا صاحب کا خط دکھاؤ۔ میر اشرف علی کہتے ہیں مطلب سناؤ۔ جن کو اُردو کا شوق ہے ان سے کہتا ہوں فارسی خط ہے۔ کیا مزا اٹھاؤ گے۔ جو فارسی کے خواہاں ہیں ان سے کہتا ہوں اُردو ہے۔ دیکھ کے کیا نفع پاؤ گے۔ واہ واہ حضرت خوب ہنسی کی۔ اب یہ فرمائیے کہ آپ نے واقعی میں خط نہیں لکھا یا لفافے میں رکھنا فراموش کیا۔ شق اول آپ کے الطاف بزرگانہ

سے بعید ہے کہ اتنی مدت کے بعد میرا عریضہ جائے اور ایسا شخص اس کے جواب میں دریغ فرمائے اور شوق ثانی میں امیدوار اور منتظر دو نوازش نامہ سمجھیے اور جلد ارسال کیجیے۔ زیادہ اور کیا سمع خراشی کروں۔

خدوی میر مہدی مجروح[1]"

مرزا علاؤ الدین خاں علائی

غالب کے تعلقات مرزا علاؤ الدین خاں علائی سے بھی خصوصیت کے تھے۔ غالب ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں :۔ " مولانا نسیمی۔ کیوں خفا ہوتے ہو۔ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر خلیفہ اول ہے تم خلیفہ ثانی ہو۔ اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے۔ جانشین دونوں۔ مگر ایک اول ہے اور ایک ثانی ہے[2]" علائی غالب کے عزیز شاگردوں میں سے تھے اس لیے مرزا کے طرز سے وہ بھی متاثر تھے۔ ان کی نثر کا رنگ علائی پر کس درجہ غالب تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو موخر الذکر نے سید محمد صاحب مرحوم شاہی امام جامع مسجد دہلی کے نام لکھا تھا[3]

" یا محمد یا امام یا دوست۔ کیسے فائز المرام ہوئے۔ جنازہ سوار کیوں کر پہنچے۔ راہ میں کیا بیتی۔ قطع منزل و طے ارض کیوں کر ہوا۔ فرمایئے ولادت سعادت کا کیا رنگ ہے۔ کچھ آپ نے پایا۔ کچھ آپ کے گھر جایا۔ یہ سب سوال ہیں ان کا جواب بصراحت پہنچے۔ یہاں کا حال سنیئے۔ کہ آپ کا جانا اور جاڑے کا جانا برابر ہے وہ گرمی وہ آفت تموز ہے کہ توبہ توبہ بھنے جاتے ہیں جلے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب اور منشی جی صاحب بیچارے دو قطبین ہیں کہ ہلتے جلتے ہیں۔ حکیم صاحب تو اکثر خموش اور منشی جی خویشتن فراموش اونگھ رہے ہیں۔ میں چپ۔ جانتے ہو اس سے بدتر وہی کاوش وہی کاہش وہی ناسازی۔ آپ کا ذکر دو چار بار یہاں ہوا۔ بدگو بھی تمھاری خوبی تقدیر سے خوش گو ہو گئے۔

---

[1] اس خط کا جواب خطوط غالب میں موجود ہے ملاحظہ ہو خط نمبر ۲۹۸ ص ۲۵۲۔

[2] خطوط غالب، ص ۳۲۳۔ [3] سید یوسف بخاری دہلوی۔ یہ دلی ہے۔ ص ۳۷-۳۸۔

نواب صاحب کو بھی تمھاری طرف مائل دیدن پایا۔ کیا عجب کہ آپ کو یہ امر ملحوظ ہوں اور جلد آپ آویں[۱]"

مفتی صدر الدین آزردہ

مفتی صدر الدین آزردہ غالب کے معاصرین میں بہت بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کا ایک خط گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ان کے چند خطوط اور ہیں ان کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) نواب یوسف علی خاں کے نام۔ لکھا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر میری عیادت کو آئے۔ اور ڈاکٹر ولایتی کو ساتھ لائے۔ انھوں نے دوا کھانے کی اور مالش کی تجویز کی ہے۔ اس سے تخفیف ہے[۲]

(۲) نواب یوسف علی خاں سے تریاق فاروق اصیل مانگا ہے[۳]

(۳) نواب کلب علی خاں کے مزاج کا حال پوچھا ہے[۴]

(۴) نواب کلب علی خاں کے نام۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی پر آپ کی توصیف منکشف اور محقق ہے[۵]

(۵) کلب علی خاں کے نام مسند نشینی کی تہنیت میں[۶]

(۶) کلب علی خاں کی مزاج پرسی کی ہے اور اپنا حال لکھا ہے[۷]

(۷) اس خط میں آزردہ نے نواب کلب علی خاں کی اس پرسش حال کا شکریہ ادا کیا ہے جو نواب صاحب نے زبانی مرزا غالب سے اور خطوں کے ذریعے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے کی تھی۔ اسی خط میں انھوں نے اپنے مدرسے کے طلبا کے لیے

---

[۱] مکتوبات آزاد (طبع ثانی؛ لاہور) میں حالی کا ایک دلچسپ خط محمد حسین آزاد کے نام ہے۔ ص ۱۲۸ و ۱۲۹۔

[۲] نمبر رجسٹر محافظ خانہ ۱۴۴۴۔ دارالانشا سرکار رام پور۔ غیر مطبوعہ۔ عنوان دوست دآشنایان

[۳] " " ۲۴۹۔ " " " " "

[۴] " " ۱۲۷۔ " " " " "

[۵] " " ۱۸۰۔ " " " " "

[۶] " " ۳۶۳۔ " " " " "

[۷] " " ۴۶۵۔ " " " " "

وظائف کی درخواست کی ہے۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم نے ہر چند وظیفہ مقرر کرنا چاہے تھے لیکن آزردہ نے ان کو اس کی تکلیف نہ دی تھی۔ اب اپنی "زیرباری اور بیکاری" سے مجبور ہو کر لکھا ہے۔

من کجا و ذوق گل چیدن کجا لے باغباں
نالۂ بلبل بزور ایں جا مرا آوردہ است[1]۔

آزردہ کے ان خطوں میں جو نوابان رام پور کے نام لکھے گئے ہیں حشمت الفاظ اور سنجیدگی عبارت ہر جگہ موجود ہے۔ جو دراصل ان کے علم و فضل اور افتادِ طبع کا نتیجہ ہے لیکن غالب کی سی پرکاری اور نادرہ کاری ان کے یہاں نہیں ہے۔ ہم ان کا ایک اور خط نقل کرتے ہیں جس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ (نواب کلب علی خاں کے نام)

"نواب صاحب مستطاب معلی القاب والا مناقب جلیل المناصب معدن تفقد بے کراں نوازش فرمائے بے پایاں استظہار نیازمنداں ملاذ عقیدت کیشاں دامت عنایتکم۔

بعد گزارش مراسم نیازمندی ہا ملتمس آنکہ قبل اس کے بسبب دریافت خبر فرحت اثر مسند نشینی خدام والا مقام سے کمال سرور حاصل ہوا تھا۔ اب کہ پیش گاہ فرمان فرمائے ہندوستان و انگلستان سے بذریعہ صاحب کلاں بہادر خلعت مسند نشینی کا آیا اور اس کی خوشی جشن تہنیت کا قرار پایا۔ اس امر کے سننے سے دل اخلاص منزل کو فرحت پر فرحت اور شادی اوپر شادی کے زیادہ ہوئی۔ خدام والا مقام پر واضح ہے کہ یہ نشاط ایسی ہے کہ منشیان فصاحت بیاں اس کی تہنیت میں دفتر کے دفتر لکھ سکتے اور شاعران تیز زباں قصیدے کے قصیدے کہہ سکتے ہیں۔ اِلّا یہ خلاصہ کیش بسبب بیماری فالج کے کہ از چندے لاحق حال رکھتا ہے۔ اس کے باعث سے نہ ہاتھ کو حرکت اور نہ پاؤں کو قوت رفتار اور نہ زبان کو طاقت گفتار ہے اس لئے

---

[1] نمبر رجسٹر محافظ خانہ ۵۲۹ - دارالانشا سرکار رام پور - دوست و آشنایان (غیر مطبوعہ)

حصول سعادت سے معذور اور حضوری خدمت سے بہ ناچاری مجبور رہا مگر
قدیمی ترقی خواہ آپ کے خاندان عالی کا جیسا کہ تھا تا حال ویسا ہی ہوں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ایک سال یہ اور ہزار سال اور بعز وجاہ اوپر مسند
حکومت دائم اور قائم رکھ کر کام روائی عالمیان کرے۔ زیادہ ایام حشمت و
اقبال مدام رہے۔ فقط المرقوم ششم ماہ دسمبر ۱۸۶۵ء۔
(مہر) الراقم محمد صدرالدین خاں صدر الصدور سابق دہلی۔"[1]

اس عبارت میں سنجیدگی اور متانت تو ہے لیکن بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا پہلے فارسی میں سوچتا ہے۔ اس کے بعد اُردو میں لکھتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خطوط کے مخاطب نواب صاحب ہیں جن کے سامنے کچھ نہ کچھ تکلفات بہر صورت قائم رہتے ہیں لیکن وہ خطوط جو انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان میں روانی اور سادگی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر ان کا ایک خط نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے شاگرد رشید نواب صدیق حسین خاں مرحوم کے نام لکھا ہے۔

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا نکالا کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا۔ مقدمات دور میں فتویٰ دینا۔ کمیٹیوں میں حاضر ہونا۔ طلبا، مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا۔ احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا۔ ہزارہا کاغذ کا دستخط کرنا۔ پھر گھر میں آکر طالب علموں کا پڑھانا۔ اور اطراف وجوانب کے سوالات شرعی کا لکھنا۔ وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا۔ مجالس شادی اور غمی اور اعراس میں جانا۔ شعر وشاعری کی صحبت کو گرم رکھنا۔ باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔

---

[1] نمبر رجسٹر محافظ خانہ ۲۶۳۔ دارالانشا سرکار رام پور عنوان۔ دوست و آشنایان۔

الفتوؤں[1] کو ساتھ لے جانا اور ان کی دعوت کا اہتمام کرنا۔ یہ اشغال ایسے تھے کہ رات دن اسی میں غلطاں پیچاں تھا اور جان کو ایک دم آرام نہ تھا۔ نہ کھانے کی حلاوت نہ سونے کا مزہ۔ نہ طاعت کا لطف۔ نماز پنجگانہ بھی حسب عادت ادا ہوتی تھی دبوجہ فیصلے لکھتے لکھتے ظہر کا وقت اکثر آجاتا۔ تو بوجہ ڈگری و ڈسمس[2] کے عین نماز میں دسوسہ انداز ہوتی۔ تنخواہ اور آمدنی رجسٹری کی جب آتی تو ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتی۔ اگرچہ لوگوں کو میرے ہونے سے اس کام پر نفع تھا مگر میری ذات کو کچھ فائدہ اور تمتع دنیا کا نہ تھا۔ اور آخرت کا حال یہ ہے کہ یہ نوکری یعنی فصل خصومات موافق قوانین انگریزی کے اور یہ فتویٰ نویسی گو برعایت قواعد شرع ہو۔ ہرگز جائز نہ تھی۔ گو دباؤ سے ہمارے علم و وجاہت کے کوئی بول نہ سکتا تھا اور استکراہ ہمیشہ اس سے رہا مگر کبھی چھوڑا نہیں۔ اس چالیس برس کی نوکری میں ہزار ہا کو جتایا اور ہزار ہا کو ہرایا۔ سینکڑوں بسوہ داریاں ہمارے حکم سے نیلام ہوئیں۔ صدہا آدمیوں کے قتل کا فتویٰ دیا اور صدہا قید ہوئے۔ سوائے اس کے اور گناہ بہتیرے ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور جو علم الٰہی میں ہیں۔ اس کا کچھ حساب نہیں۔ ساری عمر صرف افعال بہیمی و حیوانی ہوئی اور اگر انسان ہوئے تو شیطان ہوئے۔ اس کی مغفرت پر بھروسہ ہے والا مواخذہ ہو تو کچھ ٹھکانا نہیں حقوق اللہ وہ اپنے فضل عمیم سے بخشے گا۔ حقوق العباد بھی اس کے کرم سے بخشے جائیں گے۔ اللھم مغفرتك اوسع من ذنوبي ورحمتك ارجى عندی من عملی۔ جب حال یہ ہے تو کیسا انعام واحسان اس کا

---

[1] یہ خاص دلّی کا لفظ ہے جس کے معنی بیکار لوگوں کے ہیں۔

[2] انگریزی الفاظ اُردو میں رواج پا رہے تھے۔ اس کی مثالیں غالبؔ، حالیؔ، سرسیدؔ، نذیر احمد سب کے یہاں ملیں گی۔

ہے کہ ایسے گرفتارِ علائق کو ان بلّیات سے ایسا الگ کردیا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔..........[1]

مفتی سید محمد عباس

مفتی سید محمد عبّاس، غالب کے ممتاز معاصر میں سے تھے۔ غالب نے ایک نسخہ قاطع برہان کا ان کو بھجوایا تھا۔ غلام حسین قدر بلگرامی کے نام خطوں میں اس کا ذکر بھی ہے[2]۔ ذیل میں ہم مفتی صاحب کا ایک رقعہ غالب کے نام نقل کرتے ہیں جو تجلیات میں شائع ہوچکا ہے۔ اس سے ان کے طرز و اسلوب کا اندازہ ہوگا۔ یہ گراں بہا کتاب مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے مرتب کی تھی اور اس میں غالب کا وہ خط بھی شائع کیا تھا[3] جو عودِ ہندی اور اُردوئے معلّی میں موجود ہے اور جس کے جواب میں دراصل مفتی محمد عبّاس[4] نے یہ خط لکھا ہے۔

"جناب والا اسلمہ اللہ تعالیٰ۔ مکتوب مرغوب کو دیکھ کر مسرور ہوا۔ تعلق خاطر دور ہوا لیکن کانپور میں بسبب ترددات سفر جواب کی نوبت نہ آئی اور لکھنؤ میں ملاقاتِ احباب سے فرصت نہ پائی۔ کیا عرض کروں میں بہت ناتواں ہوں۔ مشتِ استخواں ہوں۔ رنجوں میں گرفتار ہوں۔ رحمت الٰہی کا امید وار ہوں۔ اگر کچھ بھی دل و دماغ میں قوت پاتا اور فی الجملہ درس و تدریس اور تحریرِ جوابِ مسائل سے فرصت پاتا اس رسالہ کو از اوّل تا آخر دیکھ کر جو ذہن ناقص گزرتا مفصّل عرض کرتا۔ ماشاء اللہ آپ کی نظم و نثر سے دل مزے اُٹھاتا ہے۔ جو صاحب ذوق ہے لذّت پاتا ہے۔ اس نگارش نے کتاب دکنی کو نظر سے گرا دیا۔ حُسنِ خط میزانِ دکن بھلا دیا۔ اللہ ری شوخیٔ کلام کہ چشمِ غزالانِ ختن کو حیرت ہے اور یہ لطافت و ظرافت کہ ادائے بیان

---

[1] تاریخ قنوج۔ قلمی نامکمل از نواب صدیق حسن خاں مرحوم مملوکہ صفی الدولہ نواب علی حسن خاں۔

[2] "خطوط غالب" نمبر ۲۱۳ و ۲۱۴۔ ص ۱۹۲۔ [3] تجلیات۔ ص ۱۹۵۔ حصّہ دوم

[4] ولادت سنہ ۱۸۰۹ء، وفات سنہ ۱۸۸۹ء

طناز کو کیا نسبت ہے۔ سہام ملام کا جو آپ نے شکوہ فرمایا ہے حال اس کا یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے حضرت موسیٰ نے درگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا تیرا دم بھرتا ہوں دو دعائیں کرتا ہوں۔ مجھ کو جنت عطا کر اور خلق کی زبان سے رہا کر۔ ارشاد ہوا۔ دعائے اوّل قبول ہے۔ تو جنتی ہے۔ رسول ہے۔ لیکن دوسرا جو سوال ہے اس کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے واسطے بھی نہیں کیا غرض خلق کا حلق بند نہیں وہ لوگ کم ہیں جو مردہ پسند نہیں۔ قاطع برہان خوب نام ہے۔ اس میں کیا جائے کلام ہے معنی صاف ہیں۔ معترض ناانصاف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے پیدا ہے کہ اس نے برہان قاطع کو اُلٹا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کا ایک نمط پر ہونا جائے تامل و غور ہے۔ ظاہرا اس کا مطلب اور ہے اور آپ کا مقصد اور ہے۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آتے ہیں۔ اس نے غالباً معنی ثانی مراد لئے ہیں۔ اور آپ معنی اول استعمال میں لائے ہیں۔ بہر صورت برہان کی طرف ظاہراً قاطع کی اضافت ہے اور اس ترکیب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں کچھ شک و ریب نہیں کہ الہام میں حسن ہے۔ کچھ عیب نہیں لیکن تقصیر معاف۔

ظرافت نے آفت کو برپا کیا
درشتی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا

خیر گزشتہ راصلوات۔ والسّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ[1]

مفتی صاحب نے غالب کو درشت گفتاری پر صحیح ٹوکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین پھکڑ بازی اور دشنام طرازی پر اُتر آئے اور غالب کو دستار سنبھالنا مشکل ہو گئی۔ اس کی تفصیل یادگار غالب اور ذکر غالب میں موجود ہے۔

---

[1] تجلیات، حصہ دوم، ص ۱۹۶ و ۱۹۷۔

سیدغلام حسنین بلگرامی

غالب، سیدغلام حسنین "قدر" بلگرامی کی بھی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں۔

"بندہ پرور۔ آپ کے عنایت نامے کے آنے سے تین طرح کی خوشی مجھ کو حاصل ہوئی ایک تو یہ کہ آپ نے مجھ کو یاد کیا دوسرے آپ کی طرزِ عبارت مجھ کو پسند آئی۔ تیسرے آپ حضرت علامہ الجلیل اور آزاد مغفور کی یادگار ہیں[1]۔"

ذیل میں ہم قدر بلگرامی کا ایک رقعہ پیش کرتے ہیں جو انھوں نے صغیر بلگرامی کے نام لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے غالب کے طرز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔

"خط کی بھی کیا بات ہے۔ روز کی سوغات ہے۔ نصف ملاقات ہے ......

سید فرزند احمد صاحب صغیر دیر بزی۔ مجرا۔ مزاج اقدس۔ دو خط آپ نے بھیجے اور ایک پیغام۔ آپ نے بلگرام کی تاریخ شروع کی بلکہ تمام۔ یہ بڑا کام کیا۔ قیدیں بھی اچھی لگائیں۔ مجھے کیوں نہ لکھ دیا۔ کہ ایک فقیر مذہب آزاد مشرب ہے۔ نکما لاابالی مزاج۔ نیم دیوانہ نیم ہوشیار زہے آزاد پابندی۔ خہی پابند آزادی بکار خویش سرمستی۔ بکار غیر ہشیاری۔ کبھی سچ کہوں یا جھوٹ۔ جھوٹ بولے میری بلا۔ میرا خدا اور میں اتنا جانتا ہوں کہ خلف علی میرے باپ کا نام اور کرامت علی دادا کا۔ اور شاہ عبدالواحد شاہدی جدِ اعلیٰ اور سید محمد صاحب الدعوۃ الصغرا جد القبلہ زیدیہ سیّد ہوں زید سجاد کے بیٹے۔ سجاد، حسین کے فرزند۔ حسین حضرت فاطمہ کے جگر گوشہ۔ فاطمہ پیغمبر کے جسم کا ٹکڑا۔ طریقہ پوچھو تو نفیری ہوں۔ شیعی میرا طریق ہے۔ آگے خدا کا نام۔ بے شک علی بھی نام ہے پروردگار کا۔ فارسی گویوں میں غالب سے بہتر اور اردو میں بحر سے بہتر اور مرثیے میں انیس سے بہتر کسی کو نہیں جانتا۔ تیس برس سے شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا نہ آیا۔ دو دیوان مرتب تھے۔

---

[1] خطوطِ غالب، ص ۲۰۱۔

انھیں چھانٹ کر ۱۲۹۶ھ میں ایک کیا اور خم خانہ نام رکھ دیا۔ اب تیسرا دیوان جس کو میرے حساب دوسرا سمجھنا چاہیے ترتیب دے رہا ہوں ......[1]

قاضی عبدالجمیل جنون

قاضی عبدالجمیل "جنون" غالب کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا ایک خط ہمیں مولوی مہیش پرشاد مرحوم کی وساطت سے ملا ہے ملاحظہ ہو۔

بنام مرزا غالب۔

"کعبہ مرادات جناب مرزا صاحب دام ظلہم العالی .....

یہ التماس ہے کہ میں نے اس دوران میں بہت رنج اور تکلیفیں اٹھائیں۔ مختصر یہ ہے کہ گویا لفظ آدمی کا اطلاق مجھ پر برائے نام بلکہ بمشاہدہ حال ایک اتہام ہے۔ تین قطعہ نیاز نامہ بفاصلہ دو دو تین تین مہینے کے والا خدمت میں بھیجے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک عریضہ بھی نہ پہنچا ہو۔ پھر جواب نہ پانا کیا معنی۔ ان دنوں آپ کی خبر تشریف آوری رام پور اور وہاں سے ارادۂ بریلی تا ۱۹ ماہ انگریزی گرم اور مشہور ہے۔ اگر سچ ہے تو زہے نصیب آپ کے حال کا تحقیق نہ ہونا میری از خود رفتگی کی دلیل ہے۔ اس مدت میں میرے کام و دہن لقمہ زہر مرگ کا مزہ چکھتے رہے۔ چاشنی شعر و سخن ان کو بہم نہ پہنچے۔ ہاں البتہ کچھ تاریخیں بوجہ اصرار بعض احباب البتہ حوالۂ قلم ہوئی ہیں کہ بعض اصلاح روشناس نظرگاہ قبول ہوئے ہیں۔ زیادہ حد آداب[2]۔"

غالب نے اس خط کے جواب میں لکھا ہے۔

"نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں۔ خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں[3]۔"

---

[1] جلوۂ خضر، ج ۲، ص ۲۲۹ تا ۲۳۱۔ صفیر کے جواب کے لیے ملاحظہ ہوں۔ ص ۲۳۴ تا ۲۳۶۔
[2] نیز ملاحظہ ہو رسالہ "اردو ادب"، ج ۱، نمبر ۳ و ۴، ص ۵۵۱۔
[3] خطوط غالب، ص ۱۲۷، خط نمبر ۱۵۸۔

معاصرین کی ان تحریروں کے پیش کرنے سے مقصود رُخِ روشن کے آگے شمع رکھنا نہیں ہے۔ بلکہ غالب کے طرز کی خصوصیات اور اس کے وسعت اثر کو نمایاں کرنا ہے۔

(ج) بہادر شاہ ظفر

غالب کے زمانے میں ذوق کی لسانی تحریک کا بڑا شہرہ تھا۔ مرزا نے اس سے بہت کچھ لیا اور اسے بہت کچھ دیا۔ خود بہادر شاہ ظفر اس محاورہ اور روزمرہ کے بڑے شائق تھے۔ غالب نے اس لباس میں حسنِ معنی کا اضافہ کیا اور اپنے شوخ و ذہین تعشق سے پیکر الفاظ میں نئی روح پھونک دی۔ اسی وسعت تخیل اور لطافت بیان نے جدید اُردو شاعری کے لیے راہ ہموار کر دی۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق "اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے" ٹھیک اسی طرح غالب نے اُردو نثر میں ایک نئی آواز اُٹھائی۔ ان کی جدت ادا، شگفتگی اور ظرافت روشنی کا ایک منارہ ہے جس سے اُردو انشا کا راستہ دور تک جگمگا اُٹھا اور راہ گیروں کے لیے ہر طرح کی سہولت پیدا ہو گئی۔ بائرن کے خط اس کی نظموں سے اور چارلس لیمب کے مراسلات اس کے مضامین ایلیا سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح غالب کے دیوان اور اس کے خطوں کی اضافی اہمیت متعین کرنا مشکل ہے۔

ذوق اور ظفر کے یہاں "گرمی اندیشہ" نہیں ہے۔ زبان کی ہمواری اور محاورے کی چاشنی البتہ ہے اور یہ اسلوب جذبات نگاری کے لیے نہایت موزوں ہے۔ وہی جذبات نگاری جس کی خطوں میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اگر ہم ان تحریروں میں جذبات کی دھڑکن نہیں سن سکتے اور دل کے نہاں خانوں کو کھلا ہوا نہیں دیکھ سکتے تو وہ خط نہیں مضامین ہوں گے۔ ظفر اور قلعہ معلی کی بیگمات کے خطوں میں یہ جذبات نگاری موجود ہے۔ ان کے یہاں یہ روزمرہ اور محاورہ روایت نہیں ہے جیسا کہ شاہ نصیر کی شاعری یا رجب علی بیگ سرور اور بیگمات اودھ کے بعض خطوں میں ہے۔ بلکہ یہ صفت سے زیادہ ذات ہے۔ غلاف نہیں۔ تار و پود ہے۔ غالب نے اس جذبے میں فکر و نظر کو بھی شامل کر دیا ہے۔ اسی لیے ان کی تصویریں حسین اور موثر ہونے کے علاوہ خیال انگیز بھی ہیں۔

بہادر شاہ ظفر

ذیل میں ہم بہادر شاہ ظفر کا ایک خط نقل کرتے ہیں جس سے ان کے طرز و اسلوب کا اندازہ ہوگا۔

"حسین مرزا[1]۔ تم نے خط بھیجا۔ تمھاری محبت کا شکریہ۔ کبھی کبھی دلّی کی خبریں مل جاتی ہیں۔ دلّی والوں پر اب بھی جو مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں انھیں سن کر کلیجے کے ٹکڑے اُڑتے ہیں۔ غدر ختم ہوگیا مگر ان کی مصیبتیں باقی ہیں۔ سوائے خدا کے کون ہے جو انہیں تکلیفوں سے بچائے۔ میرے حصے میں لاچاری اور بے اختیاری آئی۔ بدبختی اور رسوائی آئی۔ بچوں کی لاشیں آئیں عزیزوں کی مجبوری اور تنگی آئی۔ میں نے مڑ مڑ کر اور پلٹ پلٹ کر یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا۔ دلّی پر خدا کا قہر نازل ہوا۔ دلّی والوں پر فلتے پر فاقے پڑے اور چھوٹے چھوٹے بچے رزق کے لیے بلبلائے اور میں جو ان کا بادشاہ تھا ان کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ بادشاہوں کا بادشاہ اور دونوں جہانوں کا مالک ناراض تھا۔ میں بے آسرا فقیر کیا تھا۔ میرے اختیار میں اتنا بھی نہ تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر ایک تنکا بھی اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھ سکوں۔ اس کی مرضی یہی تھی کہ ہم سب تباہ ہوں دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجے اور بابر کی اولاد کالے پانی بھیجی جائے۔ اس نے جو چاہا وہ ہوا۔ ہم کالے پانی میں ہیں اور صبر و شکر کے سوا کچھ کر نہیں سکتے۔ دلّی والوں کی مصیبتیں ہم سے زیادہ ہیں۔ شہر میں اب بھی تلاشیاں ہوتی ہیں۔ گھروں میں جو کچھ تھا لٹ چکا جو کچھ کہیں بچا کھچا رہ گیا تھا وہ دن دہاڑے لٹ رہا ہے۔ جس کا قصور ثابت ہوا ان کو بھی سزا دی جارہی ہے اور جو بے قصور ہیں وہ بھی روندن میں آرہے ہیں۔ منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش جو کچھ

---

[1] حسین مرزا' نواب حسام الدین حیدر کے بیٹے تھے۔ دلّی کے بازار بلی ماران میں ایک محلہ حسام الدین حیدر کی حویلی ان کے نام سے موجود ہے۔ حسین مرزا شاہی قلعہ میں نظارت کے عہدے پر فائز تھے۔ گوڑ گاؤں کے کلکٹر "فنٹ" نے انھیں گولی سے مروا دیا تھا۔

نہ کریں تھوڑا ہے۔ ان کے اعمال نامے کھلی ہوئی کتاب کے ورق ہیں۔ جنھیں دلّی والوں کی نظروں سے چھپایا نہیں جاسکے گا۔ رونا تو ان کا ہے جو ہر لحظے دم قدم کی خیر منایا کرتے تھے اور اب بھی دلّی کے اور دلّی والوں کے غم میں گھُلے جارہے ہیں اور صاحب کے دربار سے خلعت پانے کے لیے بھی بے قرار ہیں جنھوں نے عمر بھر قلعہ سے تنخواہیں پائیں اور اب دشمنوں کے قصیدے پڑھتے ہیں۔

یہاں کا حال کیا سناؤں۔ تنگ اور تاریک کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔ باہر نکل کر کیا کروں۔ چارپائی پر پڑے پڑے دردناک شعر گنگناتا ہوں۔ یا نماز پڑھا کرتا ہوں۔ اسی طرح صبح سے شام اور شام صبح ہوجاتی ہے۔ اب زندگی کی شام بھی قریب ہے۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا ہے جلد تاریکی پھیل جائے گی مگر میری قربانی کا بیج کبھی نہ کبھی زمانے کے ہاتھوں سے پرورش پاکر ضرور پھول بن کر کھلے گا۔

کل دو فرنگی آئے تھے۔ قید کے زمانے کی پنشن مقرر کرنا چاہتے تھے مگر جب ساری بادشاہت چھوڑ دی تو تھوڑے سے ٹکڑوں پر کیا رال ٹپکاؤں گا۔ اس ارادے پر اڑ گیا ہوں اور ان سے کہہ دیا ہے کہ کمپنی سے پھوٹی کوڑی نہ لوں گا۔ ملکہ کے بچے کھچے زیور ہیں۔ ان ہی کو بیچ بیچ کر روٹیاں چل رہی ہیں۔ جب یہ ختم ہوجائیں گے تو فاقہ کریں گے مگر جو منھ سے نکل گیا وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ظفر کی نہیں، ہاں سے نہ بدلے گی اور ظفر اپنی آن پر دھبّہ نہ آنے دے گا۔

دلّی کا —— ابوظفر سراج الدین "

یہ سادہ عبارت ہے جس میں کسی قسم کی گلکاری اور صنعت گری نہیں ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا حُسن ہے۔

بہادر شاہ ظفر کا دوسرا خط حضرت کالے صاحب کے بڑے صاحب زادے

میاں غلام نظام الدین کے نام ہے۔ یہ خط نہیں اس عہد کا مرثیہ ہے۔

"میاں نظام۔ جیتے رہو۔ اور خدا تمھیں گردش فلک سے بچائے۔ ہم کیسی بری تقدیر لے کر آئے تھے کہ کسی دن چین نہ پا سکے۔ دل میں ٹیسیں ہیں آنکھوں میں سے خون کے آنسو بہتے ہیں۔ دلّی یاد آتی ہے دلّی والے یاد آتے ہیں، کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو انھوں نے جھیلی نہ ہو اور کوئی اذیت ایسی نہیں ہے جو مجھ پر نہ پڑی ہو، جیسی ہم پر پڑی خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ اگر مصیبت پہنچنے دیتی تو دلّی پہنچتی اور ایسی پہنچتی کہ دنیا دیکھتی۔ میں نے اپنی سی بہت کی مگر تقدیر نے چلنے نہ دی۔ جو مصاحب اور خدّام بظاہر پروانے تھے وہی نمک حرام سوہانِ روح تھے۔ انھوں نے زخموں پر ایسے نشتر لگائے کہ کسی پہلو کو بغیر کچوکوں کے نہ چھوڑا۔ ان جان چھڑکنے کا دعویٰ کرنے والوں نے مجھ سے اور اپنے وطن سے غداری کی۔ فرنگیوں کو ایک ایک منٹ کی خبریں پہنچائیں اور مقدمہ میں کھلم کھلا اور منہ در منہ دشمنی کی۔ قلعہ کے دیوان خاص میں قلعہ (کذا) بنانے والے شاہ جہاں کے پوتے کو مجرم بنا کر مقدمہ کا کھیل رچایا گیا اور ان کے دل نہ دکھے۔ ان کی آنکھوں میں سے پانی نہ بہا۔ ان آنکھوں میں پانی تھا ہی نہیں وہ پانی تو پہلے ہی مر چکا تھا۔ حکیم جی جاٹ مل کپتان فارسٹ سر تھیوفلس ٹیکاف مکھن بختاور سنگھ کشن سنگھ چنی لال بساطی گلاب نامہ بر سانڈرس مکند لال کپتان ٹیلر سارجنٹ فلیمنگ کپتان مارٹینو مسز فلیمنگ جان ایوریٹ سے گواہوں کی گواہیوں پر دلّی والے دلّی سے بدر کر کے کالے پانی بھیج دیئے گئے مگر دلی اور دلی والوں کے زخموں کی آہیں ایسی نہیں ہیں جو سینوں سے نکل کر ختم ہو جائیں۔ میں نے خواجہ صاحب میں اپنی زندگی میں اپنے لیے قبر بنوالی تھی۔ مگر میری مٹی دلّی سے دور یہاں کی تھی۔ یہاں کی آب و ہوا مجھے اب زندگی میں راس نہیں ہے مرنے کے بعد یہاں میری روح کو کس طرح چین آئے گا۔ دلّی والے کو دلّی سے

دور کر دو جیسے چمن سے بلبل جدا ہوئی پھر وہ سر پٹخ پٹخ کر کیوں نہ مر جائے میں ایسے پرندے کی طرح ہوں جس کے بال و پر نوچ کر اسے اُڑنے سے معذور کر دیا ہو۔ میرے جوان جوان لال مار ڈالے گئے۔ ان کی لاشیں ۲۴ گھنٹے کوتوالی پر لٹکی رہیں اور پھر بے گور و کفن انھیں جنگل میں پھنکوا یا گیا۔ دلّی کے دیدار د جوان بندوقوں کی باڑھ پر رکھ لیے گئے۔ انھیں قطار در قطار پھانسیاں دی گئیں معصوم عورتوں کی عزتیں لوٹی گئیں۔ یہ سب داغ میرے سینے پر ہیں اور میں انھیں کلیجے سے لگائے بیٹھا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دنیا میں کوئی ستم ایسا تو باقی نہیں رہ گیا جو دلّی کے بادشاہ اور دلّی کے نام لیواؤں پر نہ توڑا گیا ہو۔

میری صحت بہت خراب ہو گئی ہے۔ نزلہ کی شکایت روز افزوں ہے۔ داڑھوں میں اور دانتوں میں ہمیشہ درد رہتا ہے۔ گردے کے درد کے دورے بھی بڑھ گئے ہیں۔ دلّی مر گئی میں اب زندہ رہ کر کیا کروں مگر دلّی نہیں مری، وہ سو گئی ہے پھر انگڑائی لے کر جاگے گی، میں مر جاؤں گا پھر اُٹھ نہیں سکوں گا مگر کون کہتا ہے کہ میں نہیں اُٹھ سکوں گا۔ ہندوستان کی زمین سے ہزاروں لاکھوں بہادر شاہ اٹھیں گے۔ اجڑے چمن پر پھر بہار آئے گی اور بلبلیں پھر چہکنے لگیں گی۔ دلّی کبھی مٹائی نہ جا سکی اور نہ کبھی مٹائی جا سکتی ہے۔ میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا۔

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ[1]

اس خط کے آخری جملے ہمارے دل میں شکوک پیدا کرتے ہیں کہ اس کے لکھنے والے دلّی کے قیدی بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہی ہیں یا کوئی اور۔

---

[1] بہادر شاہ ظفر کے ان دونوں خطوں کی نقلیں ہمیں جناب محمد رحیم صاحب دہلوی کے توسط سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ انھوں نے یہ خط ۱۹۴۲ء میں برما کے ایک مہاجر سے خریدے تھے۔ خط کا آخری پیراگراف شبہات پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے کسی نے تحریف کی ہو۔

شاہ زمانی بیگم

مندرجہ ذیل خط ظفر کی بہو شاہ زمانی بیگم کا ہے۔ اس طرز کا مقابلہ بیگمات اودھ کے خطوں سے بے محل نہ ہوگا۔ اس میں وہ تکلفات یکسر مفقود ہیں جو لکھنؤ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ ہیں۔

"از کالا پانی۔ قیدی بادشاہ کا تاریک قید خانہ۔

اماں حضرت کو سلام۔

پیاری دلی سے دور کالے پانی سے یہ پہلا خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کو وہ رات تو یاد ہو گی جس کی صبح کو حضور (بادشاہ) ملکہ عالم (زینت محل) وہ (شاہزادہ جواں بخت) اور میں اور ہمارے بہت سے ساتھی دلی سے جدا کیے گئے۔ کیسے کہرام کی رات تھی اور کس قدر حشر برپا تھی۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی۔ دل میں رہ رہ کر ٹیس اٹھتی تھی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو رو نہ رہا ہو اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس میں آنسوؤں کے موتی نہ بہہ رہے ہوں۔ حضور (بادشاہ) فرط بے قراری سے کبھی ادھر ادھر ٹہلتے تھے کبھی گم سم ہو کر رہ جاتے تھے۔

دلی ہم سے چھوٹ گئی جیسے چمن سے پھولوں کی خوشبو جدا ہوئی۔ چلتے وقت حضور نے جب سب سے کہا۔ اب میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہوں اور تم سب مجھ سے چھوٹتے ہو میرا کہا سنا معاف کرنا تو آپ کو یاد ہو گا۔ کئی عورتیں پچھاڑ کھا کر گر پڑیں، کئی مردوں کی چیخیں نکل گئیں اور کوئی ایسا نہ رہا جو بلبلا نہ گیا ہو تڑپ نہ اٹھا ہو۔

جس قلعہ میں حضور کی بادشاہی کے نقارے بجتے تھے اور جس دلی کی زمین ظلِ سبحانی کے قدم چومتی تھی اس نے انھیں دھکے دے دے کر نکالا اور قسمتِ شاہی نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ جب ہمارا بدنصیب قافلہ گوروں کے جنگی پہرے میں روانہ ہوا تو حضور ڈولی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

دلّی والوں کو غدر نے پیس ڈالا تھا اور لوگ گوروں کی پرچھائیوں سے ڈرتے تھے۔ مگر پھر بھی حضور کے دیکھنے کے اشتیاق میں اس قدر دیوانہ تھے کہ راستہ ہجوم سے پٹا پڑا تھا۔ اس وقت دلّی والے خوف کو بھول گئے تھے۔ سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ حضور نے ڈولی کے پردے اٹھوا دیئے تھے اور وہ خود بھی رو رہے تھے۔ آنسوؤں کے چمکیلے موتی ان کی سفید داڑھی پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور وہ بڑی حسرت سے اپنی ساری رعیت کو خدا کے حوالے کرکے ہمیشہ کے لیے دلّی سے اور دلّی والوں سے وداع ہو رہے تھے۔ میرا اور سب ساتھیوں کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس تقدیر کی کسے خبر تھی کہ حضور کی آن اس طرح دھڑدی دھڑدی لٹے گی۔ تاج و تخت کے وارث دلّی کی سرزمین پر اس بے دردی سے قتل کیے جائیں گے اور تیموری خاندان کی بہو بیٹیاں اس طرح قیدی بنا کر بے پردہ دلّی سے نکالی جائیں گی۔

دلّی سے رنگون تک پہنچنے کی کہانی بہت طویل ہے اور بہت درد انگیز ہے کبھی فرصت سے لکھوں گی. ہندوستان کے چپہ چپہ پر ہمارا جھنڈا لہراتا تھا۔ اس کے بعض حصوں سے اس کے بادشاہ اور اس کے خاندان کو اس حالت میں گزرنا پڑا کہ وہ سب قید تھے اور ذلت کی بدنصیبی میں گرفتار تھے حضور بادشاہ کا ہر سانس ایک آہ اور ہر لفظ ایک کراہ تھا۔ رعیت اپنے بادشاہ کی اس بے کسی کو دیکھتی تھی اور دل پکڑ کر رہ جاتی تھی۔ ہمارے ساتھیوں میں سے بہت سے ساتھی جو دلّی سے ہمارے ساتھ چلے تھے اور جنھوں نے اپنی قسمتوں کو ہماری قسمت سے وابستہ کر دیا تھا راستہ ہی میں ہم کو چھوڑ گئے۔ انھوں نے سلطنت کے سایہ میں ہمارا ساتھ دیا تھا تکلیف اور مصیبت میں ہمارا ساتھ نہ دے سکے حضور بادشاہ کی زندگی کی ساتھی تاج محل بھی ہمارے ساتھ آکر پلٹ گئیں۔ اندھیرے میں سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔

ہم یہاں پہنچے تو حضور (بادشاہ) ملکہ عالم (زینت محل) وہ (شاہزادہ جواں بخت) ان کے بھائی شاہزادہ عباس شاہ اور مجھ (شاہ زمانی بیگم) سمیت تیس آدمی تھے۔ ایک دو واپس چلے گئے اور کل کی کسی کو خبر نہیں۔ کب کون ساتھ چھوڑ دے۔ سچ ہے کوئی ہم سے کیوں ہمدردی کرے اور کیوں کسی کو ہماری حمایت کا خیال آئے۔ ہمارے اقبال کا چراغ بجھ گیا اور اب ہمارے چاروں طرف اندھیرا ہے۔

جہاز سے اُترنے کے بعد حضور اور ہم سب کو سخت پہرے میں قید خانے میں پہنچایا گیا۔ ہمارا یہ قید خانہ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف پہرہ دار ہر وقت چیلوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔

ہم میں سے کسی کو بھی یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ مچھر بھی زیادہ ہیں۔ ہم سب بیمار رہتے ہیں۔ قید خانہ کی لکڑی کی عمارت بہت پرانی اور بوسیدہ ہے۔ اور بارش میں ٹپکتی رہتی ہے۔ اس میں جب ٹپکا لگتا ہے تو ہمارے پاس ضرورت کی جو دو چار ٹوٹی پھوٹی چیزیں رہ گئی ہیں انھیں کبھی ادھر رکھتے ہیں کبھی ادھر رکھتے ہیں۔

حضور کے غم کی داستان کس طرح بیان کروں۔ جن کی آنکھ کے ایک اشارے سے کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا وہ اب پہرہ داروں کے حلقے میں چپ چاپ گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھے رہتے ہیں۔ وحشت کا زور ہوتا ہے تو یکایک اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر ٹہلتے ہیں اور پھر بیٹھ جاتے ہیں جیسے گر پڑے ہیں۔ کمر بالکل جھک گئی ہے اور سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگی رہتی ہے۔

زبردستوں نے کمزوروں کو ستایا مٹا ڈالا۔ ہندوستان پر رات کا اندھیرا چھا گیا اب ہماری زندگی میں صبح کے طلوع ہونے کے آثار نہیں پائے جاتے مگر اماں حضرت ہم ہوں یا نہ ہوں ایک دن وہ ضرور آئے گا کہ

ظالم مٹ جائیں گے اور ہندوستان کی عظمت کا سورج پھر سے چمکے گا۔

آداب۔ آپ کی غم نصیب بیٹی۔ شاہ زمانی بیگم[1]"

اگر یہ پورا خط اصلی ہے تو یہ خط نہیں خون کی ایک بوند ہے۔ اس کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی ہے۔ اسی لیے اس کی دلپذیری میں شبہہ نہیں۔ ان تمام تحریروں میں لکھنؤ کا سا تصنع نہیں لیکن دہلی کا سا سوز و گداز ہے۔

رجب علی بیگ سرور کے انداز و اسلوب نے تمام انشا پردازانِ لکھنؤ کو متاثر کیا تھا۔ حد یہ ہے کہ شاہی مراسلات میں بھی اس کی پابندی ہوتی تھی۔ دہلی میں غالب کی بھی محوری حیثیت ہے لیکن اس نے ظفر یا بیگمات تیموریہ کی زبان پر کوئی اثر نہیں ڈالا بلکہ خود قلعے کی زبان سے فائدہ اُٹھایا اور اس کو مالا مال کر دیا۔

اس دور کے مکتوباتی ادب پر غالب کا احسان

غالب کی حیثیت ایک جزیرہ کی سی نہیں ہے۔ اس سے پہلے سادہ اور آسان نثر کا رواج ہو چلا تھا۔ جیسا کہ نوابان کرناٹک اور یاس آوری وغیرہ کے خطوں سے ظاہر ہے۔ لیکن غالب نے اس رجحان کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور ادب کے دامن میں بلاغت کے موتی ٹانکے۔ یہ بات بھی لطائف ادب میں سے ہے کہ غالب سلیس نثر کے قائل نہ تھے اور اُردو کو "معانیٔ نازک[2]" کے لائق نہ سمجھتے تھے منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں۔

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔[3]

ایک اور خط میں ۴ جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں۔

"میاں اُردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو۔[4]

---

[1] یہ خط بھی جناب محمد رحم صاحب دہلوی کے شکریے کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو۔ رسالہ "انجمن" دہلی۔ ج اول۔ شمارہ ۱۔ ص ۳۵ و ۳۶۔ اس خط کا بھی آخری جملہ شبہہ پیدا کرتا ہے۔ ملکی عظمت کا یہ احساس اور قید و بند میں اس کے بیان کرنے کا یہ اسلوب تاریخی حالات سے میل نہیں کھاتا۔

[2] اردوئے معلیٰ، ص ۳۶۳۔ [3] ایضاً ص ۳۶۶

[4] ایضاً ص ۳۶۷۔

لیکن یہی رقعات سادہ و سرسری جو اُن کی "سخن وری کے شکوہ کے منافی" تھے ان کی شہرت و ناموری کا باعث ہوئے۔ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ غالب کی شہرت

" ہندوستان میں جس قدر ان کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی "۔

غالب کی تقلید کی ہر شخص نے کوشش کی لیکن کامیابی کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ نہ کوئی ایسا حیوان ظریف تھا۔ نہ کوئی ایسا شاعر شیوا بیان۔ نہ کسی کی رگوں میں زندگی کا ایسا تندرست خون موجزن تھا اور نہ کوئی خطوں سے دوستوں کی ایسی محفل گرم کر سکتا تھا۔ نہ کسی میں آفاقیت اور انفرادیت کے ایسے جوہر تھے اس لیے یہ پیروی کسی سے نہ ہو سکی۔ ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے ظفر کی سادگی غالب کی پرکاری میں تبدیلی ہوگئی ہے اور بیسویں صدی کی نثر تو بجز اس اجمال کی تفصیل کے اور کچھ نہیں۔

اُردو انشا پردازی غالب کے بارِ احسان سے گردن نہیں اُٹھا سکتی۔ سرسید اور حالی ایک طرح ان کے دامنِ تربیت میں پلے بعض نے دور سے فیض اُٹھایا بعض نے مدعیانہ اپنا راستہ الگ نکالا تاہم غالب کی فیض پذیری سے انکار کی ہمت ایک بھی نہیں کر سکتا۔ مولانا شبلی اور رام بابو سکسینہ اس باب میں متفق ہیں کہ غالب کی طرزِ خاص کا سرسید اور ان کے رفقا پر بڑا اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقشِ اوّل غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا[۱]

مولانا نظامی بدایونی مرحوم غالب کے اثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" خدا کی شان ہے کہ آج تمام ملک کی مراسلہ نویسی اسی سانچہ میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے بہت پہلے اس ملک کے مذاق کا اندازہ کر لیا تھا "[۲]

۱؎ "تاریخ ادب اُردو (عسکری) ص ۴۲۔ نیز مولانا شبلی کا مضمون "سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر"

۲؎ نکات غالب، ص ۳۔

(د) امیر مینائی اور داغ دہلوی

امیر مینائی ۱۹۰۰ - ۱۸۳۲ء

امیر مینائی، غالب اور سرسید کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کی کوششوں سے لکھنؤ کا رنگ نکھر کر دہلی سے قریب آگیا ہے۔ جس زمانے میں انھوں نے ہوش کی آنکھ کھولی اودھ کی دولت مستعجل کے خاتم سلطان عالم واجد علی شاہ طوطی بول رہا تھا اور لکھنؤ مشرقی دنیا کے فضل و کمال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فیض نسیم اور جلوۂ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر منظر جنت نگاہ اور ہر گوشہ بساط دامان باغباں بنا ہوا تھا۔ دولت کی افراط اور اسباب معیشت کی فراوانی نے ہر علم و ہنر کا استاد وہاں جمع کر دیا تھا۔ فقہ اور مذہب کے ساتھ ساتھ موسیقی اور شاعری کا بھی چرچا تھا۔ گویا مسجد اور میخانے دونوں آباد تھے۔ ناممکن تھا کہ زمان و مکان کے یہ قومی موثرات امیر پر اثر پذیر نہ ہوتے۔ انھوں نے جس خاندان میں پرورش پائی تھی وہ صوفیوں کا ملجا اور ماوا تھا اور ارشاد و ہدایت میں سب سے معزز و مفتخر تھا۔ چنانچہ ان پر یہ رنگ چڑھا اور ایسا چڑھا کہ خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شعرائے لکھنؤ کے زمزموں نے بھی اپنا اثر دکھلایا اور ان کے دردمند دل میں شاعری کا ذوق پیدا کر دیا۔

خطوں کا پس منظر انیسویں صدی کی معاشرت

انیسویں صدی کی معاشرت بھی عجیب تھی۔ اس وقت رندی و زہد میں وہ تضاد نہیں تھا جو آج ہے۔ مومن کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے تیار ہے اور شب وصل غیر کاٹنے کے لیے آمادہ۔ لیکن وہ اس سطح سے بلند ہو کر غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کی ترغیب بھی دیتا ہے اور کہتا ہے۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب   یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں   مری جاں فدا ہو تری راہ میں

امیر مینائی نیک طینت اور پاک سرشت بزرگ تھے بقول مولانا ثاقب ایک عالم نور، مجسم شفقت و محبت اور پیکر تہذیب و متانت۔ ان کے تقدس اور بے ریائی کی

شہرت لوگوں میں اسی قدر تھی جتنی ان کے علم وفضل اور کمالات شاعری کی۔ لیکن ایسا زاہد وعابد زمانے کے اثر سے مجبور ہو کر شعر کہتا ہے تو یہی

شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی۔

لکھنؤ کی فضا صرف "شاعرگر" ہی نہیں تھی یہاں زبان کا کھرا کھوٹا بھی پرکھا جاتا تھا اور ایک ایک لفظ کی تراش خراش بھی دیکھی جاتی تھی۔ ان ہی صحبتوں میں امیر مینائی کو اُردو زبان کی چھان بین کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے امیر اللغات لکھنے کا مصمم ارادہ کرلیا "اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی اور غدر ہوگیا۔ وطن کی تباہی اور گھربار لٹنے سے چندے حواس ہی جمع نہ ہوسکے۔ الفاظ کیسے[۱]"

لکھنؤ کا زوال

۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ معزول ہوئے اور لکھنؤ جو رشکِ شیراز و اصفہان تھا، اُجڑ گیا۔ اس کے ایک برس بعد غدر کا ہنگامہ برپا ہوا، اس میں " اموال بھی تلف ہوگئے۔ جانیں بھی سینکڑوں ضائع گئیں مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ غارت گروں نے ہمتیں بھی لوٹ لیں۔ صفات قدیمہ کا نشان بھی باقی نہ رہا۔ ہمدردی ڈھونڈے نہیں ملتی قوتیں سلب ہوگئیں۔ حافظے کام کے نہ رہے[۲]" یہ زمانہ امیر کے لیے بڑی مصیبت اور آزمائش کا تھا۔ ان کے بزرگوں کی میراث لٹ گئی گھر کھد گیا[۳] دیوان ضائع ہوگیا[۴]۔ ناچار وہ وطن جو ملک سلیمان سے اچھا تھا چھوڑنا پڑا اور انھوں نے تلاش روزگار میں ہمیرپور اور مین پوری کی خاک چھانی۔ امیر اس قلزم خون کے تنہا شناور نہیں تھے، اُردو کے اور ادیبوں اور شاعروں پر بھی یہ وقت پڑ چکا تھا۔

رامپور دارالسرور بن گیا

لکھنؤ اور دلی کی خزاں سے رام پور کی چمن بندی ہوئی اور وہ اہل کمال کے لیے دارالسرور بن گیا۔ "ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں" مخصوص دعوت کے ساتھ

۱؎ امیر اللغات حصہ اوّل دیباچہ۔
۲؎ مکاتیب امیر، ص ۳۱۲ - ۳۱۳ -
۳؎ طرۂ امیر۔ امیر احمد علوی
۴؎ مکاتیب امیر، ص ۲۶۷ - ۲۶۸

صلائے عام بھی ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں امیر بھی رام پور پہنچ گئے اور عدالت عالیہ کا منصب افتا ان کے سپرد ہو گیا۔ نواب کلب علی خاں نے ان کو اپنا استاد مقرر کیا اور کوئی دقیقہ ان کی قدر افزائی میں نہ اٹھا رکھا۔ امیر ریاض حسن خیال کو لکھتے ہیں۔

"میرے ساتھ خاص جو ان کا برتاؤ تھا وہ سوا میرے اور ان کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ دو سو سولہ روپے ماہوار تو تنخواہ وہ مجھے دیا کرتے تھے اور ہر سال ختم سال پر چار پانچ ہزار روپیہ دے دیتے تھے۔ اور اس طرح دیتے تھے کہ وہ جانتے تھے اور میں اور میرا خدا"[1]

لیکن نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد امیر کا وقت کافی پریشانی میں گزرا اور وہ آسائش جو خلد آشیاں کے عہد میں حاصل تھی تقریباً ختم ہو گئی۔ مہدی حسن خاں شاداب کو لکھتے ہیں۔

"اب ان امور کا پتہ کہاں۔ رام پور ہے اور مڈل پاس مدار المہام ..... ایشیائی باغ جو کلب علی خاں نے دنیا بھر سے گل بوٹے چن کر لگایا تھا، خزاں کے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس کا لگایا ہوا شجر ہوں۔ جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں یہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اب جب اصل شجر میں نقصان ہے تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم"[2]

سنہ ۱۹۰۰ء میں حضور نظام کے شدید اصرار سے مجبور ہو کر امیر حیدر آباد چلے گئے لیکن ابھی راستے کی تھکن بھی دور نہ ہوئی تھی کہ سخت بیمار پڑے اور وہیں انتقال کیا۔ انھوں نے حیدر آباد جاتے وقت یہ شعر پڑھا تھا۔

اب نہ ٹھیروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

اس میں لفظ "غریب الوطنی" سے ان کا سنہ وفات ۱۳۱۸ھ نکلتا ہے۔

---

[1] مکاتیب امیر، ص ۳۳۵۔ خط مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۸۹۸ء۔

امیر کا اسلوب بیان

امیر مینائی اقلیم سخن کے آخری تاجدار مانے گئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی نثری خدمات کا ابھی تک مناسب اعتراف نہیں ہوا۔ شاعری میں انھوں نے ناسخ کے رنگ کو سنوار کر اسے خوشنما اور دلآویز بنا دیا۔ اسی طرح نثر میں انھوں نے جو اسلوب نکالا اس میں نہ رجب علی بیگ کا سا تصنع ہے نہ بے خبر کی سی رعایتِ لفظی اور نہ غلام امام شہید کا سا اہتمام لیکن وہ متانت اور پختگی ہے جو ان سب میں مشترک ہے۔ اس میں لکھنؤ کا سا تکلف نہیں ہے لیکن اس کی خوبصورتی ہے۔ غالب کی سی شوخ اور ذہانت آمیز گفتگو نہیں ہے لیکن سادگی اور صفائی ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت پختہ اور بے رخنہ ہے۔ زبان اور محاورے کا چٹخارہ عبارت کی سادگی اور راستی بیان کی لطافت اور متانت قدم قدم پر ملتی ہے۔ وہ بھاری الفاظ کے بجائے بالعموم ہندی کے ایسے ہلکے اور سبک الفاظ اور محاورے استعمال کرتے ہیں جن کو حالی اردو کی جان کہتے تھے۔ مثلاً ایک تعزیت کے خط میں لکھتے ہیں۔

"پیارے زاہد تمھارا خط نہ آنے سے پہلے ہی میرا جی دھڑکتا تھا کہ کچھ ضرور دال میں کالا ہے اور میں دعا مانگتا تھا کہ الٰہی خیر ہو۔ آج جو تمھارا خط آیا اس کا ہر فقرہ میرے کلیجے میں تیر بن کر اترا۔ جواں مرگی کا صدمہ تو ایسا ہوتا ہے کہ دشمن پر بھی ہو تو دل دکھ جاتا ہے[۱]" یا

"مرض وبائی پھیل رہا ہے۔ ہر وقت دھڑکوں ہی میں گزر ہوتی ہے[۲]"

چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

"ممالک نزدیک و دور سے کلام اس کثرت سے آتا ہے کہ میرا دل چھوٹ جاتا ہے طاقت وفا نہیں کرتی[۳]"

"آنکھوں کو جب سے روگ لگا ہے تب سے لکھنا اور کتاب دیکھنا گویا چھوٹ ہی گیا ہے[۴]"

---

[۱] مکاتیب امیر، ص ۲۰۴۔ [۲] ایضاً، ص ۱۲۲۔ [۳] ایضاً، ص ۱۲۷۔ [۴] ایضاً، ص ۱۲۸۔

"ایسی پتھر زمین میں کیا نازک شعر کہے ہیں۔"[1]

"شاعری کے واسطے طبیعت میں امنگ شرط ہے۔ وہ جوانی کے ساتھ سدھاری بڑھاپے میں جوش کہاں کبھی کسی دوست کی فرمائش سے مجبور ہو کر کچھ کہہ لیتا ہوں تو بڑے ہی جبر سے۔ پھر اس میں مزا کہاں سے آئے۔ اور جب اپنا کلام آپ ہی پسند نہ آئے تو اوروں کو کیونکر رجھائے۔"[2]

"خیر بھائی تمھاری ہی آنکھ اونچی رہے۔"

بعض فقرے برجستہ اور رواں ہیں۔ ان میں صفائی اور سادگی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مضمون آفرینی اور معنی تراشی بھی ہے۔

(الف) "اب جو تم نے اپنی ملاقات سے مسرور کرنے کا وعدہ کیا ہے خدا تمھارے وعدے کو پورا کرے۔ جو تمھارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے اور اپنی تمنا کو پورا ہوتے میں نے کم دیکھا ہے۔ اس لیے اس وعدے سے دل کو پوری خوشی نہیں ہو سکتی۔"[3] (حکیم برہم کے نام)

(ب) "مدت سے تمھارا محبت نامہ نہیں آیا۔ یہ بھی تمھارا آنا ٹھہرا"[4] (حکیم برہم کے نام)

(ج) "غزل آپ نے خوب کہی ہے۔ ماشا اللہ زمین بھی نئی ہے شعر بھی مزے کے نکلے۔ اپنا حق ثابت کرنے کو میں نے کچھ دخل دیا ہے۔ خدا جانے بگاڑا ہے یا بنایا ہے۔"[5]

(د) "اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتنی لیاقت دی ہے اس سے زیادہ سعادت دی ہے اور سعادت بھی زیادہ میری محبت دی ہے اور میرے دل کو جو آپ کی محبت دی ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔"[6]

(ر) اس سرکار میں جب تک کوئی اندرونی ذریعہ نہ ہوگا کاروائی کی امید

---

[1] مکاتیب امیر، ص ۱۸۱۔ [2] ایضاً، ص ۱۹۷ و ۱۹۸۔ [3] ایضاً، ص ۱۱۴۔
[4] ایضاً، ص ۱۱۵۔ [5] ایضاً، ص ۱۶۰۔ [6] ایضاً، ص ۲۱۱

نہیں اور اندرونی ذریعہ اس پر موقوف ہے کہ آدمی برسوں وہاں پڑا رہے اور گوناگوں کوششیں کرتا رہے۔ یہ شرح کشاف جو میں نے پڑھی اس کی سچائی میں بال برابر فرق نہیں .....[1] (جلال کے نام)

بعض خطوں میں سنجیدہ ظرافت اور شگفتہ متانت بھی ہے۔ حکیم کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں (امیر اس زمانے میں امراض و اغراض کی شدت سے بے چین تھے)۔

"حکیم صاحب دل کے بڑھانے والے۔ اگلی صحبتوں یاد دلانے والے، خطوط آپ کے کم آتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ زیادہ آئیں بشرطیکہ غزلیں ان میں نہ ہوں۔"[2]

پروفیسر ثاقب کو لکھتے ہیں :

"اگر اردو زبان میں کچھ موزوں کرنے کا اتفاق ہوتا ہو تو طرح دامن گل چیں میں طبع آزمائی ضرور فرمائی جائے کہ اس کی رونق بڑھے اور ترتیب حروف تہجی میں آپ کے ثائے مثلثہ کا گھر آباد ہو کہ وہ ویران پڑا ہے۔"[3]

حضرت بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں :

"آموں کی فصل آگئی اور آپ کی مستعدی ہدیہ کرنے کی نسبت اس تحریر سے معلوم بھی ہوئی۔ میں ہدیہ بھیجنے سے پیش تر شکرگزاری کرتا ہوں مگر بنظر بے تکلفی آپ کی غزل دیکھتے دیکھتے یہ شعر زبان پر آگیا۔

آم وہ بھیجیے، کہ ہوں کم یاب
ورنہ اسہال ادھر بھی کثرت سے ہے"[4]

بعض خطوں میں وہ بے تکلفی پائی جاتی ہے جو پرائیویٹ خطوں کی جان ہے۔ زاہد سہارن پوری کو لکھتے ہیں :

"تم مجھے مطمئن کرنے میں دیر نہ کرو۔ قلم اٹھاؤ خیرت نامہ لکھو اور تردد رفع کرو۔"[5]

---

[1] مکاتیب امیر، ص ۳۵۸۔ [2] ایضاً، ص ۸۔ [3] ایضاً، ص ۲۵۲۔
[4] ایضاً، ص ۳۳۷ و ۳۳۸۔ [5] ایضاً، ص ۲۰۴۔

ذیل کا بے تکلفانہ مضمون اپنے "پرانے یار" داغ کو لکھا ہے لیکن سنجیدگی اور متانت کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔

"گل دستوں کی کثرت ایسی ہے کہ اب یہ مشغلہ[۱] بھی ابتذال سے خالی نہیں اور زیادہ تر اسی ابتذال کی وجہ سے طبیعت گریز کرتی ہے اور پرچے کو رونق بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ گل دستوں سے فروغ کی صورت اگر ہے تو یہی کہ محاسن معنوی میں کوشش کی جائے۔ اس کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ معدودے چند عمدہ نامور شعرائے خوش فکر و خوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے۔ آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقہ نامور کی افسر ہے لہذا خواستگار ہوں کہ اپنی طبع نازک پر جبر کر کے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے مگر پہلے سے کہہ رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم سے غریبوں کو بھی کہنے کی گنجائش رہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دنیا بھر کے قلم توڑ دیئے جائیں[۲]"

ذیل کا خط جو رسالہ نیرنگ دہلی کے امیر نمبر میں چھپا تھا۔ امیر کے بے تکلفانہ طرز نگارش کا آئینہ دار ہے۔ اس سے امیر و داغ کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۸۹۱ء میں داغ کو حیدر آباد سے استاد السلطان کا خطاب ملا۔ اس کا تذکرہ اخباروں میں چھپا۔ امیر نے بھی دیکھا لیکن داغ نے اپنے خط میں اس کا ذکر نہیں لکھا۔ امیر نے اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"مصدر لطف اتم قدیمی مکرم سلامت۔ سلام مسنون اخلاص مقرون مدت کے بعد نوازش نامہ آیا۔ ممنون یاد آوری فرمایا۔ بندہ نواز مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ بہر کیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بہ خطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا مگر اس

---

[۱] نومبر ۱۸۹۵ء میں امیر نے "دامن گل چیں" کے قالب بے جان میں دوبارہ روح پھونکنے کا قصد کیا تھا۔
[۲] مکاتیب امیر، ص ۲۰۵ -

تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور کھیت گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تلمذ سے فرمائی وہ میرے سرور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے۔ شکایت جو آپ نے "صنم خانۂ عشق" دیوان دوم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے وہ دیوان چھپا کہاں ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ رشک و حسد سے نہ گزاریں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یک جائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہوگئے ہو۔ یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رکاوٹ کے لئے ایک بات قرار دی ہے.... (داغ نے امیر کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہوگا۔ اس کا جواب اسی خط میں دیتے ہیں) اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آگیا کہ مرحوم و مغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو کوئی اور حوصلہ نہیں ہے......

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو بھیجوں۔ جی افسردہ رہتا ہے۔ کبھی کسی گل دستے والے کے اصرار سے کچھ بکتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغتیں چشم بد دور آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں۔ خدا جمیعت خاطر بڑھائے۔ (اسی خط کی آخری سطروں میں کس بے تکلفی اور خلوص سے لکھتے ہیں)۔

ارے یار۔ استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تو لا۔ یا استاد یا استاد برسوں کہا کیا ہے۔ اب جو وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔ امید ہے کہ کبھی کبھی رسم رسل و رسائل رہے۔ میں ابتدا سے تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔ امیر فقیر[1]

"۳۱ مارچ ۱۸۹۱ء"

---

[1] نیرنگ دہلی۔ امیر نمبر۔ نیز داستان تاریخ اردو، ص ۳۰۳

امیر مینائی کے خطوط میں بعض بعض جگہ رعایتِ لفظی بھی نظر آتی ہے لیکن اس کا وہ اہتمام نہیں ہے جو رجب علی بیگ سرور یا خواجہ غلام غوث بے خبر کے یہاں ہے۔ اسی لیے یہ رعایات ناگوار اور بدمزہ نہیں معلوم ہوتیں۔ زاہد سہارنپوری نے آلو اور شفتالو بھیجے ہیں اس کے شکریے میں امیر مینائی لکھتے ہیں :

"نخل بند حقیقی میرے میوے کے لانے والے کے نہالِ آرزو کو دو جہاں میں سرسبز و شاداب رکھے۔"

امیر مینائی کے گھر آگ لگنے پر زاہد صاحب نے اظہارِ افسوس کیا۔ امیر اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"واقعہ آتش زدگی پر جو دل سوزی کے کلمات تم نے لکھے انھوں نے لگی کو بجھایا۔"

بعض جگہ قافیہ پیمائی بھی کی ہے مثلاً

"تمھاری تحریر سعادت خمیر سرور افزائے خاطر عاطر ہوئی۔"

بعض جگہ رنگین عبارت ملتی ہے۔ نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں:

"سوادِ تحریر سراپا تنویر سرمۂ کش دیدۂ منتظر ہوئی۔"[1]

بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں :

"تمھارا حسنِ طبیعت آرائشِ اصلاح کا محتاج نہیں۔"

رحلت نواب خلد آشیاں کے بعد جو رام پور کا نقشہ بدلا ہے اس کے متعلق نواب مرزا داغ کو لکھتے ہیں۔

"ایشیائی باغ جو انھوں نے (نواب خلد آشیاں نے) دنیا بھر سے گل بوٹے چن کر لگایا تھا۔ خزاں کے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس باغ کا ایک کھلایا ہوا شجر ہوں جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں ہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اب جب اصل شجر میں نقصان ہے تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم۔"[2]

---

[1] مکاتیب امیر، ص ۲۰۰ ۔ [2] ایضاً ۔ ص ۲۸۸ ۔

امیر نے القاب بھی بالعموم سادہ استعمال کیے ہیں۔ بعض جگہ پرانی روش بھی ہے۔
ہم ذیل میں چند بطور نمونے کے لکھتے ہیں :

"محب دل نواز" "داغ دل کے مرہم پیارے برہم"
"پیارے کوثر ارحم الراحمین بہ طفیلِ ساقیٔ کوثر تم کو دونوں جہان میں جام مراد سے سیراب کرے"
"حکیم صاحب" "میرے عنایت فرمائے قدیم سلامت"
"میرے دل نواز مجھ سے زیادہ مجھ پر مہربان میرے قدر دان سلامت"
"پیارے زاہد الٰہی تم ہو اور دونوں جہان کی لذتیں"
"سعید کونین مولوی زاہد حسین کو دعائیں"
"عین الانسان و انسان العین پیارے زاہد حسین صانکم اللہ عن کل شین میرے دل نواز میرے قدر شناس سید صاحب جسمی و روحی فداک"
"گرامی گوہرا۔ معنی پرورا"۔ "مخدوما و مکرما دام الطافکم"
"حضرت داغ نازک دماغ سلام لیجئے"۔

بعض جگہ القاب نہیں ہے اور فوراً خط کا مضمون شروع کر دیا ہے۔

امیر کے خطوں کی اہمیت

جس طرح امیر کی شاعری مشاقی پختگی قادر الکلامی توازن الفاظ اور ایجاز کے لیے مشہور ہے ایسے ہی ان کے مکاتیب کی مقبولیت و شہرت کا انحصار، زبان کی فصاحت و متانت، صحت و خطا کی احتیاط، الفاظ کے برمحل استعمال اور جملوں کی صحیح بندش اور ساخت پر ہے۔

یہ خطوط امیر کی ذاتی پاکیزگی اور نکو کرداری کا آئینہ اور لفظی بیانی اور عروضی دقائق و نکات کا گنجینہ ہیں۔ صاحب امیر اللغات نے ان میں لغوی اور لسانی مباحث[1] کو بھی

[1] ملاحظہ ہو "امیر مینائی خطوط کی روشنی میں" از خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ رسالہ اردو دہلی، ج ۲۷، ش ۱، (جنوری ۱۹۴۳ء)۔

پھیلایا ہے جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن امیر کے خطوں میں وہ رنگینی اور شگفتگی نہیں ہے جو شخصیت کی بوقلمونی اور ہمہ گیری سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی سب سے اعلیٰ مثال مرزا غالب کے خطوط ہیں۔

داغ دہلوی (۱۹۰۵-۱۸۳۱ء)

امیر کے ہم عصر یعنی مرزا داغ کے خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن وہ ان کا ادبی کارنامہ نہیں ہیں۔ ان میں عبارت کی دلآویزی اور عشوہ پردازی تقریباً مفقود ہے۔ بعض خطوں کی عبارت ڈھیلی اور معمولی ہے اور ان میں کسی قسم کی ادبی یا منشیانہ شان نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ داغ صرف شاعر تھے، نثر نویس نہیں تھے۔ ملٹن ظہوری غالب اور امیر کی سی سعادت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے کہ وہ نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر انشائے داغ کے گلستان خزاں منظر کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو اس میں بھی چند ایسے گلہائے خوش رنگ مل جائیں گے جو امیر کے یہاں نہیں ہیں۔ پھر داغ اور امیر کی طبیعتیں مختلف تھیں۔ امیر متقی پرہیزگار اور سادہ مزاج تھے اور داغ بذلہ سنج، خوش طبع اور رنگین مزاج۔ کوچہ گردی کی بو جو ان کی شاعری میں ہے وہ خطوں میں بھی کہیں کہیں ہے۔ جہاں نگاران عشوہ فروش کا ذکر کیا ہے وہاں یہ شراب دو آتشہ ہوگئی ہے۔ مثلاً

> "بی فرشتن[۱] مع بابو خدا بخش کے پہنچیں۔ میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے۔ میں رند خراباتی وہ زاہد مناجاتی۔ دیکھئے کیا ہو[۲]"

یہ رنگ امیر کے یہاں نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی افتاد طبیعت داغ سے مختلف تھی۔ امیر کے خطوں کا مطالعہ ان کے اخلاق و عادات اور فضیلت و علمیت کو سامنے رکھ کر ہی کرنا چاہیے[۳]

---

[۱] منی بائی حجاب، جو اب تائب ہوگئی تھیں۔

[۲] انشائے داغ (مطبوعہ)

[۳] خطوط امیر مینائیؔ از خواجہ احمد فاروقی، رسالہ آجکل دہلی، اپریل ۱۹۵۰ء

داغ کے خطوط کی سوانحی اہمیت اور داغ کے غیر مطبوعہ خطوط

داغ کے رنگ تغزل سے ادبستان شعر و سخن کا ہر بچہ اور بڑا واقف ہے لیکن نثر میں بجز خطوط کے ان کی اور کوئی یادگار نہیں ہے۔ ان کے مکاتیب کے مجموعہ "انشائے داغ" کی حیثیت ایک بڑے شاعر کی یادگار اور باقیات کی ہے۔ کہیں کہیں داغ کی شوخی و شگفتگی رندی و شاہد بازی ادبی آگہی و گرویدگی کے نقوش بھی مل جاتے ہیں جن سے داغ کی زندگی کی ایک مکمل تصویر تیار کی جا سکتی ہے لیکن بذاتِ خود یہ خطوط اعلیٰ پایہ کے نہیں ہیں۔ ان کو صرف اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ وہ مرزا داغ کے نام سے منسوب ہیں۔

داغ کی یہ عادت تھی کہ وہ حضور نظام اور امرائے عظام کے علاوہ زیادہ تر خطوط کسی حاضر باش سے لکھوا دیا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے خطوں میں بے ربطی اور سہوی اور املائی غلطیاں ملتی ہیں۔ اکثر مراسلے جلوت میں لکھوائے ہیں۔ مرزا صاحب بولتے جاتے تھے اور لکھنے والا لکھتا جاتا تھا۔ اور اس حالت میں اور اور باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں اس لیے ان مراسلوں میں آب داری اور رنگینی جیسی داغ کے خطوں میں ہونے کی توقع ہوتی ہے۔ وہ تقریباً مفقود ہے۔ تاہم اس آئینے میں ان کے سوانح اور سیرت کے تمام خط و خال نظر آسکتے ہیں۔ یہ مکاتیب گویا مکمل دستاویزیں ہیں جن سے ہم کو ان کے مذاق و کردار، میلان و رجحان، عادات و خصائل اور حیات و جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ حامد الدولہ بہادر مصاحب واجد علی شاہ[1] کو ۲۹ر اگست ۱۸۸۵ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں لکھتے ہیں:

"یہ چلن تیرے نئے اے گردشِ دوراں ہوئے
حامد الدولہ بہادر داغ کے پرساں ہوئے

عالی مناصب والا مراتب جہاں پناہ کے مصاحب دام عنایتکم

عنایت نامہ ساڑھے تین برس کے بعد آیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ چونکہ عذر نہایت معقول تھا دل مشتاق نے بہت لطف اٹھایا۔ میرے جواب کا سوم چہلم ششماہی برسی ہو چکی تھی۔ ساڑھے تین برس کا حساب روز حساب تک سمجھ میں نہ آئے گا۔ حامد الدولہ بہادر جس وقت تمہارا خط آیا ع

---

[1] واجد علی شاہ کا انتقال ۱۳۰۵ھ - ۱۸۸۷ء میں ہوا۔

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کلکتے کی لہر آئی۔ دل پر سانپ لوٹ گیا۔ اپنا مطلع یاد آتا ہے۔

مطلع ۔ بیٹھے اوداس اٹھے پریشاں خفا چلے
پوچھے تو کوئی آپ کیا آئے کیا چلے

نوکری بری چیز ہے۔ اگر حرص و طمع دامن گیر نہ ہو تو اس کا ترک کرنا ممکن ہے اسیر لطف کیوں کر آزاد ہو۔ افسوس رہا کہ آپ صاحبوں نے یہ سمجھا کہ داغ بھی کام کا آدمی ہے۔ فقط نام کا آدمی نہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

پھپا مرزا نوشہ کا یہ شعر میرے حسب حال ہے۔ میں ایک مرنج و مرنجاں آدمی۔ کھونے کو گیا۔ کچھ کمانے کو نہیں گیا تھا۔ دل لگی کا یار جلسوں سے سروکار۔ اہل سخن کا مشتاق۔ میں رنج کی باتوں کو کیا جانوں۔ بفضلہ تعالیٰ جس دن سے پیدا ہوا خدا نے آج تک روزِ بد نہیں دکھایا۔ رامپور آکر عجب اخبار مکروہ اخبار سنے کہ جن کے خیال سے جی متلاتا ہے جو آسائش مجھے کلکتے میں ملی، شاید جنت میں ملے۔ وہ یہ کہ آب و ہوا نہایت موافق مزاج تھی۔ جس دن سے کلکتہ چھوڑا، آٹھ دن اچھا نہ رہا۔ کئی بار تو مر ہی چکا تھا بلکہ اب بھی صاحب فراش ہوں[1]۔"

حامد الدولہ بہادر سے تعلقات کلکتہ میں قائم ہوئے تھے چنانچہ داغ حمیدن بائی نقاب کو لکھتے ہیں :

"حامد الدولہ صاحب کے دو خط مٹیا برج سے میرے پاس آئے۔ انواع مضامین پریشانی لکھے ہیں۔ کلکتہ میں مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک خط کا جواب بھیج چکا ہوں۔ یہ نہیں معلوم تم صاحبوں سے ان سے رسم و راہ کیسے ہیں اور وہ کیسے آدمی ہیں[2]۔"

---

[1] مکاتیب داغ (قلمی) کتب خانہ رام پور، نمبر ۲۰۴ انشائے اردو۔
[2] مکاتیب داغ (قلمی) خط مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۸۵ء (غیر مطبوعہ)

داغ کے تعلقات نقاب اور حجاب سے

داغ نے کلکتہ کے متعلق لکھا ہے " وہاں کھونے کو گیا تھا۔ کچھ کمانے کو نہیں گیا تھا۔" اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ " قیام رام پور کے زمانہ میں کسی کام سے حضرت داغ کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں ایک پرکالۂ آتش سے ملاقات ہوئی۔ نام اس کا منی بائی تھا۔ داغ اسے اپنا دل دے بیٹھے...... مثنوی فریاد داغ اسی زمانہ کی پیداوار ہے اور خالصتاً منی بائی کے ہجر و فراق کا نتیجہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے داغ کے سوز عشق اور ان کی محبت اور گرویدگی.... کا پتہ چلتا ہے۔ منی بائی ایک تعلیم یافتہ طوائف تھی شاعری بھی کرتی تھی۔ حجاب تخلص تھا۔ یہ چیز متنازعہ فیہ ہے کہ آیا وہ فیض داغ سے شاعرہ ہوئی یا پہلے سے شعر کہا کرتی تھی۔ جس زمانہ میں داغ اس سے ملے وہ ایک شخص کی پابند و ملازم تھی۔ داغ کی پذیرائی نہ ہو سکی۔ اس چیز نے سوز عشق پر وہ کام کیا جو آگ پر تیل کام کرتا ہے محبت کی جو چوٹ داغ نے دل پر کھائی تھی زخم بنی اور بالآخر ناسور ہو گئی۔"[1]

داغ نے اپنے اور حجاب کے معاملات کا اکثر خطوں میں ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ یوراج بیر بر ٹھاکر کرشن بہادر بیدار کو لکھتے ہیں :

> " تمہارا استاد بوڑھا ہے۔ مگر ہزار جوانوں سے بہتر۔ کبھی دل میں آتا ہے اپنا عاشق آپ ہو جاؤں۔ راجہ صاحب ہمارے عاشق تم ہو جاؤ۔ خدا کے لیے ہو جاؤ۔ بھگوان کے لیے ہو جاؤ۔ منی بائی حجاب تخلص جو صاحب مثنوی فریاد داغ ہیں ہر چند بلاتا ہوں نہیں آتیں۔ وہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے حضور پُر نور نہیں جانے دیتے۔ اور بالفعل تو میرے دم ہی پر بنی ہوئی ہے۔ سخت علیل ہوں..... آپ بھی دعا کیجیے اور میری علالت اخبارات پنجاب میں چھپوا دیجیے کہ سب احباب کو خبر ہو جائے۔ کلکتہ کے اخباروں میں تو چھپ گئی۔ راجہ صاحب آپ اپنی طرف سے ایک خط منی بائی حجاب کو ضرور بھیجیے بدیں مضمون کہ ہماری نظر سے آپ کی مثنوی گزری۔ اگر یہ حال سچ ہے تو نہایت لائق آدمی ہو بلکہ منتخب روزگار۔ مگر ایک بات سے تعجب ہے کہ باوصف

---

[1] مرزا داغ اور منی بائی حجاب از سید رفیق مارہروی۔ نگار لکھنؤ اگست ۱۹۴۸ء

اس علالت شدید کہ جس کا صدمہ تمام ہندوستان کو ہے اور خلقِ خدا دست بدعا ہے۔ آپ رام پور نہ جائیں اگر ہزار روپیے کی نوکر ہوتیں تو اس وقت میں نوکری چھوڑ دیتیں ......[1]

۵ ستمبر ۱۸۸۵ء کے خط میں حمیدن، بائی نقاب کو حجاب کے متعلق لکھتے ہیں :

"کاش اس قدر میں دیدار خدا کا مشتاق ہوتا ..... میں نے پہلے سُنا تھا کہ قرآن اُٹھ گئے ہیں۔ عہد و پیمان ہو گئے ہیں مجھ سے نہ ملنے کے۔ اب یقین ہوا مجھے بھی منظور نہیں کہ میرے ملنے سے بائی جی کے ایمان میں فرق آئے ..... بائی جی کو کنگ لینا آتا ہے۔ لگا رکھنا نہیں آتا۔"[2]

کئی مہینے کے بعد کامیابی کی ایک صورت نظر آئی۔ داغ ۱۰ ر نومبر ۱۸۸۵ء کے ایک خط میں منی بائی حجاب کو لکھتے ہیں :

"مہربانِ داغ قدردانِ داغ سلامت رہو۔

لو مبارک ہو۔ واہ میں بھی کیا خود غرض ہوں۔ اپنا مطلب نکلے اور دوسرے کو مبارکبادی۔ جی تو چاہتا تھا نہ لکھوں کہ سناٹا گزر جائے گا۔ خدا جانے کون کون اس رشک سے مر جائے گا۔ مگر کیا کروں۔ بغیر لکھے بھی تو بن نہیں آتی۔ وہ آرزو کہ سوا تین برس سے دل میں تھی۔ للّٰہ الحمد کہ اب بر آئی۔ بگاڑ کر جانا تمھارے پاس دشوار نہ تھا مگر نہ یہ میری آدمیت نہ تمھاری اجازت۔ حضور پر نور دام اقبالہ[3] نے جان لیا کہ اس کی جان مفت میں جاتی رہے گی۔ پرسوں بطیب خاطر فرمایا کہ تم کلکتہ جلد چلے جاؤ۔ بغیر وہاں کے جائے اور ہوا کھائے سنبھلتے نظر نہیں آتے۔ وہاں جا کر دو تین مہینے میں آ سکتے ہو۔ عدم کو جاؤ گے تو میں کہاں پاؤں گا (اندھا کیا چاہے دو آنکھیں) میں نے بسر و چشم منظور کیا۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ دو دن میں اُڑ کر چلا جاؤں مگر طاقت سفر

---

1. مکاتیب داغ قلمی غیر مطبوعہ۔ خط مورخہ ۴ ر ستمبر ۱۸۸۵ء
2. ایضاً (نسخہ رام پور)
3. نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور (۱۸۸۴ - ۱۸۶۵ء)

ابھی کہاں[1]۔

لیکن سید رفیق مارہروی کا بیان ہے کہ حیدر آباد کے قیام سے پہلے داغ کو حجاب کے حصول میں کامیابی نہیں ہوئی۔ انھوں نے مولوی افتخار عالم کے روزنامچے سے داغ کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جو حجاب کے نام ہے اور ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

" دشمن جانی۔ سلام شوق

عین انتظار میں تمھارا محبت نامہ دستیاب ہوا۔ کئی بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، چوما اور چھاتی پر دھرا رہا۔ تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ۔ یہ کرو گے جب ہی تمھارے پاس آؤں گی۔ خوب تم کو میں بھول جاؤں۔

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
ناداں کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آجاؤ۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے۔ جواب میں لکھو کہ کب آرہی ہو[2]"

بالآخر ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء کو منی بائی حجاب حیدر آباد پہنچ گئیں لیکن اب وہ زاہد مناجاتی بن گئی تھیں۔ قاضی عبدالحمید کو لکھتے ہیں:

"بی فرشتن مع بابو خدا بخش کے پہنچیں۔ میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے میں رند خراباتی اور وہ زاہد مناجاتی دیکھیے کیا ہو۔ ابھی مجھے اس پردے میں یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہی ہیں یا کوئی اور[3]۔"

مولانا احسن مارہروی مرحوم نے داغ کی رندی و ہوسناکی کی وجہ جواز ڈھونڈی ہے اور اس کا مقابلہ علامہ شبلی کی زندگی سے کر کے تحریر فرمایا ہے:

"مرزا داغ ہوں یا مولانا شبلی فطری اور پیدائشی جذبات و احساسات کے حمام میں سب ہی عریاں نظر آئیں گے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کسی کا تہبند

---

[1] مکاتیب داغ (قلمی) غیر مطبوعہ۔ خط مورخہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ۔ ۱۸۸۵ء۔
[2] نگار لکھنؤ، ج ۴۵، ش ۲، ص ۱۲۔ [3] انشائے داغ (مطبوعہ)

کھاروے کا ہو اور کسی کی لنگی تن زیب کی۔"[1]

احسن مرحوم نے جو طریقہ اس معاملہ پر پردہ ڈالنے کا اختیار کیا ہے وہ بدیہی طور پر اتنا قابلِ اعتراض اور غلط ہے کہ ہم اس سے بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن اگر اس طرح شبلی کی برائی ثابت ہو جائے تو بھی اس سے داغ کی اچھائی لازم نہیں آتی۔

داغ کے تعلقات معاصرین سے

حیدر آباد میں داغ کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی نظیر شعرائے اردو کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شروع شروع میں ان کی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیے ماہوار تھی لیکن کچھ روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئی[2] یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ "حاسد دل" کے دل میں نہ کھٹکتی۔ محمود رام پوری کو لکھتے ہیں:

" داغ نے پرانا ہو کر جلنا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ جلاتا ہے۔"[3]

خطوط مصفیٰ آئینے ہیں ان میں دل کا ذرا سا میل بھی صاف دکھائی دے جاتا ہے۔ داغ نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امیر مینائی کی طرف ایک اشارہ ہے جو دل میں کھٹکتا ہے۔

" امیر کو تو یہ مجال نہیں ہوئی۔ جلیل کیا داغ کو مٹا سکتے ہیں۔"[4]

داغ نے یہ خط ایک خاص ناخوشگوار واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور اس میں بالکل عارضی غم و غصہ کا اظہار ہے لیکن داغ کو امیر کے متعلق اکثر یہ خیالات فاسد پیدا ہوئے۔ اس کا ثبوت دونوں کی تحریروں سے ملتا ہے۔ امیر مینائی داغ کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ رشک و حسد سے نہ گزار یں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یک جائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔"[5]

---

[1] انشائے داغ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند)۔ [2] "داغ کی شخصیت" بیخود دہلوی۔ ساقی دہلی۔ یکم مارچ سنہ ۱۹۴۰ء
[3] انشائے داغ ص ۱۰۹۔ [4] ایضاً۔ ص ۳۷
[5] رسالہ نیرنگ دہلی۔ امیر نمبر۔

مضطر خیر آبادی سے بھی تعلقات کچھ خوشگوار نہیں تھے۔ احسن مرحوم کو لکھتے ہیں :

"مضطر صاحب ٹونک کے ملک الشعرا ہوئے مگر ملک مان لے۔ یہ بڑی شرط ہے...... مدتے باید کہ یار آید بکنار" [1]

شکایت کی اصل وجہ یہ تھی کہ "وہ لڑکا رئیس کا استاد بن کر میرے اشعار پر اعتراض کرتا ہے"۔

جاں نثار اختر خلف مضطر خیر آبادی کا بیان ہے کہ یہ ناگواری غلط فہمی کی بنا پر تھی۔ ورنہ مضطر باوجود امیر کے شاگرد ہونے کے داغ کے مداح اور متبع رہے۔ نجی صحبتوں اور شاعری کی محفلوں میں انھوں نے ہمیشہ داغ کی تعریف کی۔ اور ان کے طرزِ سخن کو سراہا۔ ان کے کلام میں بھی امیر سے زیادہ داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ علاوہ ازیں دیوانِ مضطر میں جا بجا داغ کی تعریف ملتی ہے۔

مضطر ایسا کوئی اب تک نہ ہوا اور نہ ہو
موت نے ہائے عبث داغِ سخن ور مارا

انشائے داغ میں کہیں کہیں ادبی معلومات کے جواہر ریزے بھی مل جاتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ ایجاد اور ارشاد مذکر ہیں اور طرز مونث۔ جوبن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ "اس کا استعمال بمعنی پستان۔ اہلِ لکھنؤ کا اختراع ہے۔ دہلی والے اس معنی میں نہیں بولتے .... دہلی کے استعمال میں بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح۔

عجب جوبن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں" [2]

یہ نکات ادبیہ امیر کے خطوں میں زیادہ ہیں اور داغ کے یہاں کم۔

طوائف اور ادب

داغ کے خطوں میں جو کچھ رنگینی ہے وہ خمارِ چشمِ ساقی کی بدولت ہے۔ ممکن ہے بعض طبائع کو یہ بات ناگوار گزرے کہ ان میں طوائفوں کا ذکر ہے لیکن اس زمانے میں عشق و محبت کے لوازم گھر کے بجائے بازار ہی میں نشو و نما پا سکتے تھے۔ بیوی صرف خاندان چلانے کا

---

[1] انشائے داغ۔ ص ۱۳۹۔ [2] ایضاً۔ ص ۱۲۴۔

ذریعہ تھی اور طوائف جذباتی دنیا کی مالک۔

مرزا شوق نے اس زمانے کی سماجی اور جنسی زندگی کی ترجمانی اس شعر میں بہت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔

عشق کا حال بیسوا جانیں   ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ طوائف جو ہمارے جذبات پر چھائی ہوئی تھی، ادب کی بھی معشوقہ بن گئی۔ غزل میں بھی جو معاملہ بندی۔ ہوس پرستی اور رقیب کا ذکر ہے اس کی بھی اصلی وجہ یہی ہے۔

اس زمانے میں ہندوستانی طوائف قدیم یونان کی طرح ایک تہذیبی ادارہ تھی۔ دیماس تھینس اور ہرکلز علی الترتیب سیس اور اسپاسیا سے محبت کرتے تھے اور یہ دونوں طوائفیں تھیں۔ روم کے حمام قحبہ خانے تھے اور وہاں جانا تہذیب کے منافی نہیں تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کی طوائفیں بھی رقص، موسیقی، علم مجلسی۔ لباس کی تراش خراش اور شعر و شاعری سے اچھی طرح واقف ہوتی تھی۔ اسی لیے شرفا اپنے بچوں کو وہاں تہذیب سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے۔

مشتری کے خطوط ناسخ کے نام

مکتوبات کی تاریخ میں حجاب اور مشتری کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ افسوس ہے کہ ہمارے پاس حجاب کے خطوط نہیں لیکن مشتری کے خطوط موجود ہیں۔ مشتری کے متعلق خان بہادر سید رضا علی وحشت کلکتوی نے لکھا ہے:

"مشتری سیتاپور ضلع خیرآباد (کذا) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی۔ نام قمر جان تھا۔ عرف بی نجو۔ علم موسیقی میں گھسیٹ خاں اور حیدر علی خاں قوال کی شاگرد تھی۔ ۔۔۔۔ شاعری کا سن شعور سے شوق تھا۔ آغا علی شمس[1] کی

---

[1] مالک رام نے ذکرِ غالب (طبع ثانی، ص ۱۴۶) میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمر جان مشتری اور امراؤ جان زہرہ (عرف بی چھٹن) نے قاطع برہان کے مباحث میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور مذکور الصدر آغا علی شمس کی شاگرد تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کیے تھے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے ان دونوں سے متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں ایک شعر تھا ؎

شعاعِ شمس زہرہ مشتری ہے   بڑی تو خیر ہے چھوٹی کھری ہے   ایضاً ۱۴۹۔

شاگرد تھی . . . مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم بہ خانۂ خیال طبع ہو گیا ہے۔ یہ شعر بہت جلد کہتی تھی۔ جب مہاراجہ مہندر سنگھ . . . . والیٔ پٹیالہ لکھنؤ میں آئے، مشتری نے سرِ محفل چند اشعار . . . . مدح میں نظم کیے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپیہ انعام میں مرحمت کیا۔ آخر میں تائب ہو کر ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا اور سید اعجاز حسین . . . . . اعجاز سے عقد شرعی کیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد کے مالک ہوئے۔ جہاں حسن و جمال نے اس کے کمالات کو چار چاند لگا دیئے تھے . . . . صفاتِ حمیدہ نے . . . . عزیز خلق کر دیا تھا۔ حسن شعر سے جیسا کہ اس کو انس تھا ویسے ہی وہ اہل فن کی قدرداں تھی۔ اطرافِ ہندوستان کے مشاہیر سے روشناس تھی . . . . لکھنؤ میں . . . . نساخ . . . . سے اس کا تعارف ہوا اور . . . . . دونوں کا تعلق بدرجہ تعشق پہنچ گیا۔ ہمیں چند خطوط مشتری کے دست خاص کے لکھے ہوئے مل گئے ہیں جو اس نے نساخ کے نام لکھنؤ سے روانہ کیے تھے۔ یہ مکاتیب نہایت عمدہ خط نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں . . . . مشتری کے حالات . . . . . محقق عصر . . . خواجہ عشرت . . . . سے دریافت ہوئے . . . . .[1]"

ڈاکٹر گارسن دتاسی کی تاریخ میں مشتری کا ترجمہ ماخوذ از بہارستان ناز مصنفۂ رنج "شاگرد شمس اور رقیب زہرہ" درج ہے[2]۔ رنج نے اشعار بھی دیئے ہیں۔ دتاسی کا بیان ہے کہ ۱ر جولائی ۱۸۶۹ء کو اودھ اخبار میں اس کی ایک غزل بھی چھپی تھی[3]۔ نساخ نے سخن شعرا میں مشتری و زہرہ دونوں کے تراجم اور اشعار دیئے ہیں۔ سیتاپور یا خیرآباد وطن ہونا دتاسی اور نساخ کے یہاں نہیں ہے۔ نساخ نے لکھنؤ میں مشتری سے ملاقات ہونے کا مجملاً ذکر کیا ہے۔ یہ بات کہ مشتری و زہرہ کے نام سے غالب کے خلاف

---

[1] رسالہ "جادو" ڈھاکہ مورخہ ستمبر ۱۹۲۳ء۔ [2] دتاسی۔ جلد دوم۔ ص ۴۰۰۔

[3] ایضاً۔ ص ۴۰۱۔

اعتراضات شائع ہوئے تھے تحقیق طلب ہے۔ مالک رام نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ البتہ شمس نے خود ایک مضمون اپنے نام سے اودھ اخبار میں غالب کے خلاف لکھا تھا جو ہنگامہ دل آشوب میں نقل ہوا ہے۔

مشتری اپنے خطوں کو احتیاط سے رکھتی تھی اور اس کو ان کی ادبی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ ایک خط میں ناسخ کو لکھتی ہے :

"ان روزوں میں آسمان نے عجب صدمہ و رنج دیا۔ خدا جانے کج رفتار نے کب کا بدلہ لیا کہ نثر کے مسودات کا جزو دان چوری گیا۔ ہر چند ڈھونڈھا اور تلاش کیا مگر نہ ملا۔ دس برس کی محنت برباد گئی۔ ناچار یہ صلاح و مشورہ تجویز کی جن شفیقان دور و نزدیک پاس میرا مزخرف تھا سب نے منگوایا اور سب کی نقل کچھ اپنے ہاتھ سے کی اور کچھ کاتب سے لکھوائی۔ نقل یہاں رکھی۔ اصل جہاں سے آئی تھی وہاں بھجوائی۔ آپ سے امید وار ہوں بلکہ لجاجت سے اتنی خواستگار ہوں کہ جس قدر حماقت نامے چھوٹے بڑے حضور میں ہیں سب بلا تکلف میرے سر کی قسم بھجوا دیجیے۔ میرے آنسو پونچھنے (کذا) کے واسطے فرط عنایت و نوازش سے اس سوال ناچیز کو رد نہ کیجیے۔"[1]

مشتری نے اکثر خطوط شعر سے شروع کیے ہیں۔ اس کا انداز بیان صاف اور شگفتہ ہے۔ یہاں ناسخ کے نام ایک خط بطور نمونہ کے درج کیا جاتا ہے۔

"باوفا دلربا۔ اگر عمر نوح پاؤں تو تھوڑی سی بے قراری دل کی تحریر کردں مطلب ضروری سناتی ہوں کہ کلکتہ سے آکر یہاں چار خط پلئے۔ دو نامے آپ کے اور دو جناب آزاد صاحب کے۔ جو حالات ادھر گزرے اور گزرتے ہیں واللہ بلا مبالغہ یہاں اس سے بڑھ کے ہیں۔ اس کے بیانات سے ضرر متصور ہے اس باعث سے قلم انداز بہتر ہے۔ خدا جانبین کو صبر عنایت کرے اور دونوں دلوں کو جبر پر اختیار دے۔ شیخ صاحب اور زہرہ کو

---

[1] رسالہ جادو ڈھاکہ۔ مورخہ مئی ۱۹۲۴ء

آپ کا تحفہ پہنچا دیا اور جو کچھ مناسب تھا وہ بیان بھی کیا۔ ابھی اسٹیشن پر سے آکر یہ خط لکھا۔ غلطی اور سہو کو معاف کیجیے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ دو تین روز کے بعد کلکتہ سے یہاں تک کی کیفیت لکھوں گی اور اپنے حالات بھی زبان قلم سے سناؤں گی۔ اب یہ دعا کیجیے کہ مجھ کو اور آپ کو خدا جلد ملائے اور اپنی بندہ نوازی اور کریمی سے عیش و عشرت کے سامان بھی دکھائے اتنی تکلیف ضرور گوارا کر لیجیے گا کہ اس کے دیکھتے ہی نامۂ خیر و عافیت روانہ کیجیے گا۔ زیادہ بہر حال خیریت ہے۔ مطلوب آپ کی عافیت ہے۔ فقط

عیش سے بری مشتری[1]"

یہ خطوط حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم ڈھاکہ کو نساخ کے ایک عزیز سے ملے تھے[2] اور ابو الفیض عبد العلی مرحوم برادر زادہ نساخ کی اجازت سے شائع ہوئے تھے۔ کل شائع شدہ خطوں کی تعداد ۱۵ ہے جو رسالہ جادو ڈھاکہ کی ستمبر، دسمبر ۱۹۲۳ء۔ فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، اگست، دسمبر ۱۹۲۴ء اور جنوری، جون، ستمبر ۱۹۲۵ء کی اشاعتوں میں چھپے ہیں۔ خطوں پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن خط (نمبر ۶) میں ایک قطعۂ تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء کا لکھا ہوا ہے۔

---

[1] رسالہ جادو ڈھاکہ مورخہ ستمبر ۱۹۲۳ء۔ [2] ایضاً۔

بابِ چہارم

(الف) سرسیّد اور اُن کے رفقا

سرسید احمد خاں ۱۸۹۸-۱۸۱۷ء

امیر و داغ پر اُردو کا ایک دَور ختم اور سرسیّد سے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اُردو کی فضائے ادب جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزیّن ہے ان میں "فرزانۂ علی گڑھ" سرسید احمد خاں کا نام بڑی شہرت اور وقعت رکھتا ہے۔ مولانا حالیؔ نے انھیں "نثرِ اُردو کا مورثِ اعلیٰ" قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ انھیں نے تقریباً تیس برس کے اندر اُردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور وہ زبان جو عشق و عاشقی کے جھگڑوں میں پھنسی ہوئی تھی اس میں اب یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ فنّی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین کو بخوبی ادا کر سکے۔ مولانا شبلی نے صحیح لکھا ہے کہ "سرسیّد کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ری فارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرّے سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک "اردو لٹریچر" بھی ہے۔[1]"

سرسیّد مرحوم نے باوجود اس کے کہ وہ امام بخش صہبائی کے جلیس اور ہم صحبت رہے تھے اور ہر وقت ظہوری اور بے دل کا کلمہ پڑھتے تھے قدیم تصنع نگاری پر ایک ضرب کاری لگائی اور نثرِ اُردو کا قصر سلامت اور سادگی پر قائم کیا۔

---

[1] "سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر" شبلی نعمانی مرحوم۔

اس وقت مغلیہ حکومت کا علم سرنگوں ہو چکا تھا اور تمام ملک میں انگریزی تسلط کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔ سیاسی نظام کے بدلنے سے تمام اجتماعی اور معاشرتی نظام متزلزل ہو چکا تھا۔ اس وقت زندگی کی دوبارہ تنظیم نظریات میں ضروری تبدیلی اور نئی باتوں سے تطابق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ ادب ان تبدیلیوں سے ہم آغوش نہ ہوتا۔ یہ قدم سرسید نے اٹھایا جو مدبر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھیں پوری قوم کو مخاطب کرنا تھا۔

سرسید کی تحریک

وہ قوم جو حکومت جانے کے بعد اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی تھی اور جس کے پاس اتحاد و اتفاق، نظم و انتظام، تعلیم و تربیت، ضبط و خودداری، صداقت و حق پرستی، ہمت و بلند نظری میں سے ایک شے بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کثیر التعداد مجمع کو (جس پر قوم کا اطلاق نہیں ہوتا) سادہ سے سادہ اور آسان سے آسان زبان ہی میں مخاطب کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے سرسید کی تحریروں میں الفاظ مطالب کے ماتحت ہیں اور مضمون پیرائے سے زیادہ اہم ہے۔ ان کا مقولا تھا کہ تحریر میں معنی زیادہ اور تصنع کم ہونا چاہیے۔

سیرت

آدم نثر جدید بانی مدرستہ العلوم اور حامیٔ ملک و ملت یعنی سرسید اعظم کو اگر بر افگندہ نقاب دیکھنا ہے تو "خطوط سرسید" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہاں انھوں نے اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ خطوط ان کے اخلاق و عادات، اعتقادات و نظریات اور عصری معلومات کا خزانہ اور گنجینہ ہیں۔

قوم پرستی

سرسید کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی اور ان کا کوئی لمحہ اس کی اصلاح اور درستی کے خیال سے علیحدہ بسر نہیں ہوتا تھا۔ ایک رہ نما اور مجتہد کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سرسید کو بھی کرنا پڑیں۔ سینکڑوں کا برا بھلا سنا۔

بہت سے مولویوں نے کفر کے فتوے دیئے۔ ہزاروں نے ان پر طرح طرح کے اتہامات رکھے لیکن ان کی دل سوزی اور محبتِ قومی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں :

"افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی۔ کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیوں کر آتا ہے اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کافر مردود و گردن مراوڑی ہوئی مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سُنے گا۔"[1]

نواب عماد الملک کو لکھتے ہیں :

"جناب مجھ کو قوم کی طرف سے اور اس کی بھلائی اور ترقی کی طرف سے بالکل مایوسی ہے لیکن اس خیال سے کہ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے کیے جاتے ہیں۔"[2]

مولوی نیاز محمد خاں وکیل نے سرسید کو حامد مرحوم کے انتقال پر تعزیت کا تار بھیجا اس کا جواب دیتے ہیں اور اس آزمائش کے وقت بھی قوم کے خیال سے غافل نہیں ہیں۔ "مخدومی و مکرمی نیاز محمد خاں صاحب آپ کا تار ہمدردی پہنچا۔ جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اس کا میں صرف شکر گزار ہی نہیں بلکہ میں بھی اس کو نہایت محبت اور قدر سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں

---

[1] خطوط سرسید، مطبوعہ نظامی پریس، ص ۵۸

[2] ایضاً ، ص ۱۳۳۔

زیادہ مصروف ہو۔کیونکہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کرو۔"[۱]

کم ظرف قومی لیڈروں میں غرور اور تکبر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔اس لیے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کی نظروں میں وقعت یا اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔سرسید اس نقص سے بالکل بری ہیں۔ایک مرتبہ مولوی سید شرف الدین بلخی کو معلوم ہوا کہ سرسید نماز مغرب میں جو مدرسے کی مسجد میں ہوتی ہے، شریک نہیں ہوئے۔انھوں نے شکایت کی اور طرح طرح کے سوالات کیے۔اس کے جواب میں سرسید مرحوم نے لکھا ہے:

"میں صرف ایک گنہ گار شرمسار آدمی ہوں۔ادنا سے ادنا مسلمان بھی مجھ گنہ گار سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"[۲]

اس کے بعد خاتمے پر لکھتے ہیں:

"بہ ہر حال میری اندرونی تفتیش بے جا ہے۔نہ میں مقدس ہوں نہ مقدس ہونے کا دعوی ہے۔نہ کسی کا ہادی بننا چاہتا ہوں۔ایک گنہ گار آدمی کے حالات کی تفتیش کیا۔البتہ مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے اس میں کوشش کرتا ہوں۔"[۳]

مولوی سید امداد علی سرسید کے سخت مخالف ہیں۔ان کو خطاب ملا ہے۔اس سلسلے میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"بلا تصنع آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد علی صاحب کی نسبت "اسٹار آف انڈیا" تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے خواہ اس کو کوئی میری ضد سے حاصل کرے خواہ میرے حسد سے خواہ میرے ذلیل کرنے کو چشم ما روشن دل ما شاد۔"[۴]

اعتراضات پر تحمل

ہادی اور مصلح کا کام بڑا سخت ہے جو صدیوں کے اوہام اور بری رسوم کی اصلاح

---

[۱] خطوط سرسید مطبوعہ نظامی پریس ص ۲۱۹-۲۱۸۔ [۲] ایضاً۔ ص ۲۵۰۔ [۳] ایضاً ص ۲۵۱
[۴] ایضاً۔ ص ۴۴۔

کرنا چاہتا ہو۔ اس کی ہر ہر بات کو شک اور شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کام کا بڑا اٹھانے کے لیے لوہے کا دل اور پتھر کا کلیجہ چاہیے تاکہ لوگ اعتراضات کرتے رہیں لیکن مصلح کے پیر ذرا بھی نہ ڈگمگائیں۔ سرسید میں یہ صبر و تحمل پوری طرح موجود تھا۔ انھیں کافر و زندیق کرسٹان اور دجّال کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں ہوئی اور انھوں نے ان لعنتوں اور ملامتوں کا بُرا نہیں مانا۔

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :

"نجم الاخبار کے مضمون کو جو سوسائٹی کے اخبار میں مندرج ہوا تھا میں نے دیکھا اور حیران ہو گیا کہ کون شخص میرا خریدار پیدا ہوا۔ مجھ کو تو اپنے ہم وطنوں اور بالتخصیص اپنے مذہبوں سے بجز لعنت کے پھٹ اور جوتی پیزار کے کسی چیز کی توقع نہیں ہے اور میں اس کے سننے اور کھانے میں خوش ہوں۔ نہ میرا دل رنجیدہ ہوتا ہے اور نہ میں ان کو بُرا جانتا ہوں[1]۔"

ایک اور خط میں نواب صاحب موصوف کو لکھتے ہیں :

"میں نے جو ایک خط علی گڑھ اخبار میں لکھا میں سنتا ہوں اس سے ناراضی پیدا ہوئی اور لوگ نہایت برا بھلا کہتے ہیں۔ ناچاری ہے۔ میری قسمت میں یہی ہے[2]۔"

خطبات احمدیہ کی تصنیف میں سرسید نے اپنا تن من دھن سب لگا دیا تھا۔ اس سلسلے میں قوم سے چندہ کرنا چاہا تو مولوی امداد علی نے اس کو "چندہ دست گیریٔ مسافر لندن" کے نام سے تعبیر کیا۔

نواب محسن الملک کو اسی تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں :

"میرے ہم قوم اس محنت کی جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہے، قدر

۱؎ خطوط سرسید، ص ۵۱۔ ۲؎ ایضاً، ص ۵۳

نہیں کریں گے بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافر بتلائیں گے کیونکہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں[1]"

نواب محسن الملک نے مدرسہ عربی دہلی کے متعلق ایک تقریر نہایت "دلسوز اور رقّت خیز و درد انگیز" کی۔ اس میں اہلِ دہلی کو خوب بُرا بھلا کہا اور ان کی بے حسی پر سخت ماتم کیا۔ اس کے متعلق سرسید نواب صاحب کو لکھتے ہیں:

"یہ اپنی قسمت ہے ہم ذرا سی بات کہیں تو فضیحت ہو اور تم دشنام کے قریب تک کے الفاظ کہو اور کوئی کچھ نہ کہے[2]"

سرسید کی تقلید دشمنی انگریز دوستی اور اجتہاد مذہبی تک نے دوستوں کے دل میں بھی شکوک پیدا کر دیئے تھے۔ ذبیح اور غیر ذبیح کی بحث نے اتنا طول کھینچا کہ نواب محسن الملک بھی شبہے میں پڑ گئے۔ لندن کے قیام نے مخالفوں کو اور بھڑکایا۔ سرسید نے جب لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا تو اپنے عزیز دوست محسن الملک کو بڑے رحم طلب انداز میں لکھا ہے:

"امید ہے کہ تم مجھ کو اگر اپنے پاس نہ بیٹھنے دو گے تو اپنی جوتیوں کے پاس بیٹھنے دو گے۔ اگر اپنے ساتھ بٹھلا کر نہ کھانے دو گے تو کتے کی طرح دوسری رکابی میں آگے رکھ دو گے ورنہ اور لوگ تو مجھ کافر کو روٹی پانی دینا بھی کفر سمجھنے لگے ہوں گے[3]"

سرسید کی مخالفت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کے دوست اور ہم نوا بھی بُری نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔ نواب صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی امداد علی صاحب نے جو کچھ آپ کو لکھا اس سے کیا ہوتا ہے۔ دونوں کی صورت ملا لو اور پوچھو کہ چاند کا سا مکھڑا کس کا ہے۔ پھر چاند پر کا تھو کا منہ پر آتا ہے۔ مگر مجھ کو اپنی شامتِ اعمال پر افسوس ہے کہ مجھ روسیاہ کی محبت سے میرے دوست بھی لعنت ملامت سنتے ہیں[4]"

---

[1] خطوط سرسید۔ ص ۶۶۔ [2] ایضاً۔ ص ۵۰۔ [3] ایضاً۔ ص ۴۷۔ [4] ایضاً۔ ص ۷۶۔

اس مجموعہ خطوط میں ایک جگہ جامِ صبر چھلک گیا ہے۔ نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:

"میں نے مولوی س۔ خ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ شاید کوئی شخص جس میں ذرا بھی نفسِ انسانی ہو نہیں کر سکتا۔ لیکن اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مجلس میں میں اور وہ جمع ہو جائیں گے تو آپ سن لیں گے کہ وہ معاملات پیش آئے جو پاجی سے پاجی اور شہدوں سے شہدوں میں بھی نہیں ہوں اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوجداری کے حوالات میں تشریف لے جاویں۔ میں قبول کر لوں گا کہ تمام نالائقی میری ہے۔ بہتر۔ میں بھی نالائق پاجی جو کچھ کہو سب صحیح ہے[1]"

اس موقعہ پر ہم سرسید کے دو ایسے خط درج کرتے ہیں جو "خطوط سرسید" مطبوعہ نظامی پریس میں موجود نہیں ہیں اور جن سے سرسید کی سیرت اور ان کے معاصرین سے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

از ضمیمہ نور الآفاق نمبر ۷۔ جلد ۱۔ ۲۲ر نومبر ۱۸۷۳ء

نقل خط اول سرسید احمد خاں بہ نام سید امداد علی ڈپٹی کلکٹر (ص ۲)

"جناب ڈپٹی صاحب مخدوم و مکرم بندہ سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام التماس ایں کہ آپ جو میرے مکان میں تشریف لائے مجھے کمال خوشی ہوئی کہ یہ ایک ذریعہ میرے یاد آنے کا ہوگا۔ بہرحال اگر ملاقات نہیں ہوئی تو مکان دیکھ دیکھ کر کیا کرو گے۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ کام بہت کم ہے تصنیف کتب کو بہت فرصت ہے۔ چھاپہ خانہ فضل الٰہی سے جاری ہو گیا ہے۔ تفسیر چھپ رہی ہے۔ مجھ کو بڑا اشتیاق اس بات کے دریافت کرنے کا ہے کہ آپ کے اور احباب ہمارے شفیق صدر الصدور صاحب بہادر ولی اللہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ میں سنتا ہوں کہ جناب ممدوح بڑی دھوم دھام سے کچہری فرماتے ہیں اور اگلوں کی نیک نامی کو مٹانا چاہتے ہیں یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواہہم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

---

[1] خطوط سرسید، ص ۹۶

امید کہ آپ اپنی خیر وعافیت سے مطلع فرماویں اور اطلاع دیں کہ مشفقی سوتی بہاری لال صاحب کے یہاں کون مرگیا ہے۔ تاکہ میں تعزیت نامہ لکھوں معلوم نہیں کہ منصف صاحب خاص شہر وہاں ہیں یا اپنے گھر گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب کی خدمت میں سلام نیاز اور یہ پرچہ ان کو بھی دکھلا دیجیے گا منصف صاحب امروہہ مراد آباد میں میرے بعد اگر آئے ہوں تو حال لکھنا کہ وہ کہاں رہے اور ملاقات ہو تو میری زبان سے یہ شعر پڑھنا۔

باسایہ ترا می پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

تحصیل دار صاحب مراد آباد تو ہم سے پہلے ہی خفا ہو گئے تھے۔ ان کی خدمت میں کیا لکھوں۔ والسلام۔

خاکسار

سید احمد ۳ جولائی ۱۸۶۲ء

غازی پور۔

اسی ضمیمہ نور الآفاق[1] میں ایک خط مولوی امداد علی کے نام ۱۶ر جولائی ۱۸۶۲ء کا غازیپور سے لکھا ہوا ہے لیکن وہ فارسی میں ہے (ص ۲ تا ۳)۔

نقل خط سوم سید احمد خاں بہ نام سید امداد علی صاحب (ص ۳)

"جناب ڈپٹی صاحب مخدوم مکرم بندہ سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے کہ بندہ فضلِ الٰہی سے بخیریت ہے۔

اخبارات مراد آباد سے جو جو الفاظ عنایت و شفقت آپ نے بعض اوقات

---

[1] نور الآفاق سرسید کی تردید کے لیے ۱۸۷۳ء میں جاری ہوا۔ اس پرچے کے مقاصد حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوں گے جو اس کے پہلے نمبر کے سرورق پر درج تھی۔ "ان دنوں ہندوستان میں ایک قرن شیطان پیدا ہوا جس کے سبب سے عجیب فتنہ پیدا ہوا۔ در الحاد باز ہوا الحادی باتوں کے شائع کرنے کو ایک پرچہ اخبار نیا ایجاد ہوا اور بمصداق "بر عکس نہند نام زنگی کافور" یہ تہذیب الاخلاق نام نہاد کیا۔ پس حامیان اسلام کی طرف سے نور الآفاق جاری ہوا۔" (ملاحظہ ہو نور الآفاق۔ نمبر ۱۔ جلد ۱۔ ۱۳ر اگست ۱۸۷۳ء)

نسبت میرے ارشاد فرمائے معلوم ہوئے۔ میں اس کا نہایت شکر گزار ہوں۔ مجھے آپ کی صفائی اور یک رنگی سے یہی توقع تھی۔ درحقیقت آپ بہ نسبت حضوری کے غیبت میں زیادہ تر پاس و لحاظ محبت اور دوستی کا رکھتے ہیں۔ برخلاف ابنائے زمانہ کے منہ پر کچھ پیٹھ پیچھے کچھ۔ میں ایک مسکین آدمی ہوں۔ کسی کی برائی میں نہیں البتہ حکام اپنی قدر دانی سے میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ اس پر حسد کرتے ہیں وہ اپنی کیوں نہیں ایسی لیاقت پیدا کرتے کہ حکام کی آنکھ میں ان کی عزت یا قدر ہو۔ واہیات بکنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میری تفسیر پہنچی ہوگی۔ اس کو مطالعہ فرما کر جو نقص نظر میں پڑے اس سے مطلع فرمائیے اور پانچ روپیے قیمت کے جلد بھیج دیجیے اور ہمیشہ اپنی خیر و عافیت سے جلد جلد مطلع فرماتے رہیے۔ منشی امام الدین کا بہت دنوں سے حال معلوم نہیں ہوا۔ ان کے حال سے مطلع فرما دیں کہ کس رنگ میں ہیں ہم سے تو وہ جبھی ناخوش ہو گئے تھے جب جناب یاور صاحب بہادر آزردہ ہوئے تھے مگر میں تو بدستور ان کا دوست ہوں۔ اس لیے ان کی خیر و عافیت چاہتا ہوں۔ والسلام۔

خاکسار

سید احمد غازی پور۔ ۳ اگست ۱۸۶۲ء

سید احمد خاں نے پہلے خط میں "ولی اللہ" مولوی پیغمبر بخش کو بطور طعن کے لکھا ہے۔ مولوی صاحب مرادآباد میں سید احمد خاں کی جگہ مقرر ہوئے تھے۔ دوسرے خط میں (جو فارسی میں ہے) مولوی پیغمبر بخش کی نسبت لکھا ہے کہ "مردمان را عادت است کہ کسے کہ بہ عنایت ایزدی نام آوردہ و نیک نام می باشد بر آں حسدی برند و بدگوئی نیک نامی می کنند و نمی دانند کہ ازیں لغویات ہیچ فائدہ شان و مضرت آں شخص نیست۔"

اسی فارسی خط میں مولوی عالم علی کے متعلق لکھا ہے کہ "مولوی عالم علی از حد طمع اور احسان فراموش اند۔ من در مرادآباد شنیدہ بودم کہ او شان شکایت من می کنند و دریں جا

متواتر شنیدم چناں چہ بہ جہت رخصت من ہم نیامدہ بودند۔ الحال اوشاں فراموش کردند کہ بہ طفیل من و بتصدیق جناب شکسپیر صاحب از پھانسی نجات یافتند۔"

خیالات و نظریات

مردار مرغی کا واقعہ ۔ ان خطوط سے ہم سرسید مرحوم کے ذاتی اعتقادات بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ ادب کی یہی وہ صنف ہے جس میں لکھنے والا اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے اور وہ اپنا کیریکٹر مافی الضمیر اور اپنی سچی رائیں بلا کم و کاست ظاہر کر دیتا ہے۔ لندن پہنچ کر سرسید نے بے ذبح کی ہوئی مرغی کھائی اور اس کی اطلاع نواب محسن الملک مرحوم کو بھی کی۔ ان کو بڑا رنج ہوا اور سختی سے محاسبہ کیا۔ سرسید اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جس سے آپ کو افسوس ہوا اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر ہندستانی نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجیے۔ جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کرو گے۔ بھائی کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں برا کروں اور اس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ برا نہ کہیں۔ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں وہ سن لیتا ہے۔ جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے۔ ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈرنا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ روایت شاذہ سے۔ بہ ہر حال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا۔ شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ سے نہایت

سچے دل سے التجا کرتا ہوں کہ بعضے آقاؤں کے نہایت بدخصلت اور بدکردار غلام ہوتے ہیں۔ وہ آقا اپنے غلام پر ناراض تو ہوتے ہیں مگر اس غلام کو غلام سمجھتے ہیں۔ اسی طرح گو آپ میری حرکات ناشائستہ سے ناراض ہوں مگر مجھ کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ "بر من منگر بر کرم خویش نگر" یہ الفاظ میں نے نہیں لکھے میرے دل نے لکھے ہیں۔[1]"

لیکن دراصل سرسید کا پختہ یقین یہی تھا کہ بغیر ذبح کی ہوئی مرغی جائز ہے۔ چنانچہ آیندہ ایک خط میں جو محسن الملک ہی کے نام ہے سید محمود کی طرف سے لکھتے ہیں:

"سوائے تقلید کے اور سوائے مرغی والی بات کے باقی سب مانی جاویں گی۔[2]"

نواب محسن الملک نے سرسید کی اس حرکت کے خلاف دوستانہ اور محبت آمیز انداز میں اعتراض کیا اور وہ کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ سرسید نے اس کا جواب ظریفانہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ نے جو کچھ میری مردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا، آپ یقین کیجیے کہ اس نے عجیب لطف مجھ کو دیا ہے۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولت عشق مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے کہ نہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اب جو مزہ آپ کے الفاظ نے دیا ہے اس کی مثال بیان کرتا ہوں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ عاشق اور معشوق میں آپس میں خفگی ہو جاتی ہے اور جوش محبت زیادہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں سناتے ہیں وہ لفظ تو بظاہر ٹیڑھے ہوتے ہیں مگر ان سب سے جوش محبت اور نہایت مزیدار الفت ٹپکتی ہے۔"

لیکن سرسید کو خدا اور رسول سے جو محبت تھی اس سے انکار کی مجال نہیں۔ محسن الملک کو لکھتے ہیں:

---

[1] خطوط سرسید، ص ۳۵۔ [2] ایضاً۔ ص ۷۱۔

"ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرت کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیَر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا حاضر کرو۔ مارا ہمین تمغۂ شہنشاہی بس است[۱]"

سرسید کے دل میں احکام خدا کی محبت بھی پوری جاگزیں تھی۔ نواب وقار الملک کا ایک انگریز آفیسر سے نماز کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"بھائی مشتاق حسین کل میں سارے دن متردد رہا کیوں کہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط اور حال معلوم ہوا گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی ملا کر بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت پھرتیا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ . . . نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے۔ جو کبھی بخشا نہ جائے گا تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں

---

[۱] خطوط سرسید، ص ۳۸ - مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۸۱ - ۴۸

> کیا تھا تو پھر بھلجانا اور گڑگڑانا کیسا" حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں"
> کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفاء دیتا تھا اور صاف کہہ دیتا تھا کہ میں
> اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا
> نوکری نہ میسر ہوتی۔ فاقے مرجاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔[1]

سرسید کی زندگی اور ان کی تحریک عہد وکٹوریہ کے جملہ اثرات کی آئینہ دار ہیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی اور روحانی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پرانے نظریوں پر دوبارہ غور وخوض کرنے اور زندگی کے مسائل کو نئے اسلوب پر ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ سرسید نے مغربی خیالات سے پورا پورا استفادہ کیا اور اس گری ہوئی عمارت کو نئے طرز پر بنانے کی کوشش کی۔

عہد وکٹوریہ میں سائنس کے سیلاب نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا اور علم کی روشنی نے تاریک گوشوں کو منور کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں جمہوریت کا شعور بھی پیدا ہوا اور تمام مسلمات پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ ڈارون کے اصولوں نے جبلت اور عقل کے درمیان کش مکش پیدا کر دی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس اور مذہب کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عقلیت پسندی کی زد میں تمام مذہبی عقائد خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔ لیکن ہنری ڈرمنڈ اور میتھو آرنلڈ وغیرہ نے مذہب کی حفاظت کا جدید اور سائنٹفک طریقہ نکالا اور مذہب کو سائنس سے ہم آغوش کر دینے کی کوشش کی۔ سرسید بھی ان خیالات سے متاثر ہوئے انھوں نے مذہب نیچر اور سائنس کی حدیں ملا دینے کی سعی بلیغ کی لیکن یہ بات اصولاً صحیح نہیں تھی اس لیے کہ سائنس کے نظریات روز بروز بدلتے رہتے ہیں.....۔

اس سیلاب کا زور گھٹنے کے بعد سر آرتھر ایڈنگٹن سر جیمس جینس (SIR JAMES JEANS) اور سر محمد اقبال کی تحریروں نے عشق وعقل کے امتزاج پر زور دیا اور بتلایا کہ اس محفل کی رونق اس مینائے محبت سے قائم ہے لیکن سرسید کی ان تحریروں سے یہ

---

[1] خطوط سرسید، ص ۸۱

ضرور فائدہ ہوا کہ ہمارا زاویۂ نگاہ بدل گیا اور گفتگو اور بحث کے ایسے اسلوب نکل آئے ہیں جن میں عقلیت پسندی کا بھی اصول کارفرما تھا۔

تقلید

سرسید تقلید کے سخت دشمن تھے اور اسے مسلمانوں کے لیے سخت مضر خیال کرتے تھے خطوط میں اس کا جابہ جا ذکر کیا ہے۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"بھائی جان سنو اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنی مکتوبات ضمیر (کذا) کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن اور احادیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔"[1]

پردہ

سرسید پردے کے حامی تھے اور اس معاملے میں مولوی عبدالحلیم شرر کے سخت مخالف تھے۔ شرر کہتے تھے کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہے اور گھر کی چہار دیواری میں عورتوں کو بند کر دینا پردہ نہیں بلکہ حماقت ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں "پردہ عصمت" نام کا ایک رسالہ بھی لکھنؤ سے جاری کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے پردے کی رسم اٹھا دی جائے۔[2]

سراج الدین احمد بیرسٹر ایڈیٹر "چودھویں صدی" اور سرمور گزٹ نے اس باب میں سرسید سے استفسار کیا۔ اس کا جواب ذیل میں درج ہے:

"مخدومی بے شک میں پردے کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہونچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ

---

[1] خطوط سرسید، ص ۵۵۔ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو اُردو نثر۔ سرسید کے زیر اثر "انگریزی" ص ۲۲-۲۳۔
[2] ترجمہ عسکری۔ تاریخ ادب اردو، ص ۱۳۵۔

منہ کو پردہ میں داخل کیا ہے۔ مولوی شہر صاحب نے میری نسبت ایک
لغو بات لکھ دی ہے میں نے کسی کے سامنے کہا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردے میں
داخل نہیں ہیں۔ ان کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔[۱]

درایت

اسی طرح یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ سرسید حدیثوں کے جانچنے اور صحیح قرار دینے میں اصول درایت کے قائل تھے یعنی وہ راوی کے معتبر ہونے سے قطع نظر کر کے نفس حدیث پر غور کرنا پسند کرتے تھے کہ وہ فی نفسہ صحیح ہو سکتی ہے یا نہیں۔[۲] ایسے ہی وہ جمع بین الصلوٰتین کو جائز سمجھتے تھے۔[۳]

یورپ کا اثر

سرسید کے خیالات پر انگلستان کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ وہ نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں: "اصول ایمانیہ اسلامیہ پر جس قدر یقین یورپ کے آنے سے اور یہاں کے حالات اور علوم اور علماء کی رائیں دریافت کرنے سے ہوتا ہے بلا تشبیہ نعوذ باللہ ویسا یقین حج سے نہیں ہوتا۔"[۴] اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں: "یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے اس میں بھی وہ حماقت اور نالائقی اور گمراہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے۔ پس کوئی کیا کرے۔ بد اقبالی اور بد نصیبی کا کچھ علاج نہیں۔"[۵]

اسی خط میں خطبات احمدیہ کے متعلق لکھتے ہیں: "اگر میری کتاب تیار ہو گئی جس میں دس باب ہیں تو میں لندن میں آنا دس حج کی برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔"[۶]

---

[۱] خطوط سرسید، ص ۱۶۰۔ [۲] ایضاً، ص ۲۴۸۔ [۳] ایضاً، ص ۲۵۱۔ [۴] ایضاً، ص ۴۱۔
[۵] ایضاً، ص ۴۲۔ [۶] ایضاً، ص ۴۳۔

سرسید کا بیان ہے کہ سید محمود پر بھی یورپ کا نہایت عمدہ اثر ہوا۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :

"آج رات کو اس (سید محمود) نے کہا کہ میں تو لندن میں آکر سچا اور پکا اور تصدیق قلبی سے مسلمان ہوا ہوں[۱]۔"

انگلستان کی فضا میں پہنچ کر سرسید کا یہ حال تھا جیسے ایک شخص اندھیرے کمرے سے نکل کر ایک دم بجلی کی روشنی میں پہنچ جائے۔ وہ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :

"انگریزوں کو ہندوستانیوں سے وہ نسبت ہے جو خوبصورت آدمی کو ایک وحشی جانور سے ہے۔"

اپنی ولایتی خادمہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"اگر یہ عورت جو نہایت غریب آدمی اور اصیل گیری کی نوکری کی محتاج ہے اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے نفرت کرے۔"

اسٹار آف انڈیا کے تمغہ ملنے کی اطلاع نواب محسن الملک کو اس طرح کرتے ہیں۔

"مجھ کو یقین ہے کہ اس امر سے آپ سب سے زیادہ خوش ہوں گے اس لیے کہ باقی حضرات کو عقل ذرا کم ہے۔"

لندن سے جو خطوط لکھے گئے ہیں ان میں عمائدین سے ہاتھ ملانے اور دعوتوں کی شرکت پر جو اظہار مسرت ہے اس کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے لیکن اس سے بحث کرتے ہوئے ہمیں انیسویں صدی کے مخصوص حالات سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے۔

سرسید کا انگلستان جانے کا مقصد یہ تھا کہ "وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نمونے اور اس کی ترقی بچشم خود دیکھیں۔ محسن الملک نے خوب لکھا تھا کہ "اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا۔ رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔"

---

[۱] خطوط سرسید، ص ۸۰

انھوں نے انگلستان کو قہوہ خانوں کے بجائے انجمنوں اور کتب خانوں میں دیکھا اور اپنا تمام وقت علمی تحقیقات اور مشاغل میں صرف کیا۔ علی گڑھ کالج کا نقشہ یہیں تیار ہوا۔ تہذیب الاخلاق کا بلاک بقول حالی "یہیں بنوایا گیا" کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا ملازم جولیس سیزر ہے اس کی تحقیق یہیں کی اور میور کی کتاب کا دنداں شکن جواب یہیں لکھا۔

سرسید نے انگلستان پہنچ کر ہر چیز کو عبرت اور حیرت کی نظر سے دیکھا کتب خانہ انڈیا آفس کے متعلق لکھتے ہیں: "کتب خانہ نہیں کتابوں کا شہر ہے"۔ برٹش میوزیم کے بارے میں لکھتے ہیں "ایک بڑا کتابوں کا جنگل ہے"۔ لندن کے متعلق لکھتے ہیں "لندن جنت ہے اور حوروں کا ہونا سچ ہے۔

۲۔ تاریخی معلومات

خطوط سرسید کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ آج جو طریقے تاریخ ماضی کی تدوین و ترتیب کے اختیار کیے جا رہے ہیں ان میں تاریخ کی کتابوں سے کہیں بڑھ کر ان چیزوں کو دخل حاصل ہے جو تاریخ کے طور پر نہیں لکھی گئی پھر بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس زمانے کے حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں شاہی فرامین سیاسی تحریرات اور مکتوبات خصوصیات کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی لیے پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیاتِ ایران جلد چہارم کی تالیف میں (منشات فریدوں) کا استعمال فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے اور سرکار نے اورنگ زیب کی تاریخ لکھتے وقت مکاتیب عالم گیر سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

خطوط سرسید کے ذریعے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت تحریک علی گڑھ مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند[۱] ریاست حیدرآباد[۲] تہذیب الاخلاق[۳] کالج کے غبن[۴] معاصرینِ سرسید اردو ہندی نزاع[۵] اور جدید اردو شاعری[۶] وغیرہ کے متعلق بہت سی تاریخی معلومات بہم پہنچ سکتی ہیں۔

---

۱ خطوط سرسید، ص ۲۸۔ ۲ ایضاً، ص ۱۰۴۔ ۳ ایضاً، ص ۴۳۔ ۴ ایضاً، ص ۲۲۲ و ۱۲۷۔ ۵ ایضاً، ص ۲۶۔
۶ ایضاً، ص ۲۲ و ۱۲۵۔

اُردو ہندی کی نزاع

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی رائج ہو جائے۔ جب اس مقصد کی اشاعت اور حصول کے لیے الہ آباد میں ایک صدر مجلس قائم کی گئی تو سرسید نے ۲۹ اپریل ۱۸۷۰ء کو ایک خط نواب محسن الملک کے نام لندن سے لکھا جس سے ان کے تاثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"ایک اور خبر مجھے ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندوؤں کے دل میں جوش آیا کہ زبان اُردو خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اُردو کے ہندی میں ہو تو ترجمۂ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو و مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اُردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے۔"[1]

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ سرسیّد مرحوم نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی اس وجہ سے یہ جھگڑا پیدا ہوا لیکن یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس وقت کانگریس کا کہیں وجود بھی نہ تھا۔ سرسیّد نے علی گڑھ کے تعلیمی سروے میں بھی اس نزاع پر روشنی ڈالی ہے۔ "تیس برس کے عرصہ سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور شہنشاہی ہندوستان کی باقیماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ اس وقت مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔

---

[1] خطوط سرسید، ص ۶۶

E

20 میں نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔"

جدید اُردو شاعری

اُردو شاعری کے جدید میلانات بھی ایک حد تک سرسید کے ممنون احسان ہیں۔ انھوں نے نیچرل خیالات نظم کرنے کی ترغیب اور تحریص دلائی اور یہی ہماری جدید شاعری کا روز اول تھا۔

جس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد پنجاب کے سرشتۂ تعلیم سے وابستہ تھے ان کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ کی تائید سے ایک بزم ادب پنجاب میں قائم ہوئی جس میں بجائے غزل کے نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس انجمن کا پہلا مشاعرہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا اور اس بزم ادب کی سرگرمیاں گیارہ مہینے تک جاری رہیں۔ سرسیّد نے مولانا آزاد کو بنارس سے ایک خط ۲۹ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو لکھا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس کا سنہ کتابت ۱۸۷۴ء ہونا چاہیے، اس میں تحریر فرمایا ہے:

"میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی خواب امن پہونچی بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اُردو زبان میں ادا کیے جاویں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم بیان کیا کرسکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔"[1]

---

[1] خطوط سرسیّد، ص ۲۲

سرسید کا ایک اور خط جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مولانا الطاف حسین حالی کو لکھتے ہیں :

"جناب مخدوم و مکرم من عنایت نامجات معہ پانچ جلد مسدس پہونچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ تشبیہات دوراز کار سے جو مایۂ ناز شعراء شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیونکہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ سے ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق یہ ہے جو جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نظم میں ہے اس کا شکریہ کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف ان ہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیئے کہ نمازوں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں[1]۔"

یہ خط ۱۰ رجون ۱۸۷۹ء کا لکھا ہوا ہے۔

---

[1] خطوط سرسید، ص ۱۲۵۔

اسلوب تحریر

سر سید نے قدیم انشا پر ضرب کاری لگائی ہے اور اس زمانے کے پر تکلف انداز کی اکثر جگہ مذمت کی ہے۔ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں :

"علم ادب و انشا کی خوبی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کی تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو..... بعض ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی بنا دیا ہے۔"[1]

سر سید نے ان برائیوں سے پرہیز کیا اور "جہاں تک ہو سکا سادگی عبادت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔"

اسی سادگی اور بے تکلف مدعا نگاری کو حالی نے "نیچرل انداز بیان" کہا ہے۔ جس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ مضمون کو طرز بیان پر ترجیح دی جائے۔ یہ اسلوب جذبات کی تہہ تک پہنچتا ہے اور استدلال میں کمی نہیں کرتا لیکن اس میں افادیت زیادہ ہے اور ادبی حسن کم۔ یہ اس زمانے کے حالات اور سر سید کی عملی زندگی اور کم فرصتی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ خطوں کی بے تکلفی اور آزاد فضا میں آکر اس اسلوب کی ادبیت اور بھی کم ہو گئی ہے۔

(الف) سر سید کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور بے ساختگی ہے وہ JOSEPH CONRAD کی طرح تمام ادیبوں میں سب سے زیادہ غیر ادیب واقع ہوئے تھے۔ ان کے یہاں فاضلانہ اور منشیانہ تراش خراش بہت کم نظر آتی ہے۔ تشبیہیں

---

[1] مضامین تہذیب الاخلاق، ج ۲، ص ۲۴۳ (لاہور)

یا تلمیحیں جو کچھ ہیں وہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلا قصد و ارادہ منصف کے قلم سے نکلی ہیں۔ یہ تصنع اگر ہے تو ایسا ہی ہے جیسے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ کوئی معمہ یا بدر چاچ کا شعر نہیں ہے کہ جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسن معمائی درکار ہوں۔"

نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ بھوپال اب تک ہمارے لیے کوفہ رہا ہے۔"

ایک اور خط میں نواب صاحب موصوف ہی کو لکھتے ہیں:

"آپ کا عنایت نامہ ملا "تاریخ پایا" اسے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی" جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے۔ ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا کہ گویا یہ سمجھنا آسان تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلہ کا عقدہ حل ہو جاتا تھا۔

میان احمد و مہدی نہ ہیچ ہیست حجاب
تو خود حجاب خودی احمد از میان برخیز"[1]

نواب محسن الملک کو ٢٦ر نومبر ١٨٦٩ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی اور کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہے۔ وہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی اور ایک ادنیٰ سی نزاکت بے التفاتی کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔"[2]

---

[1] خطوط سرسید، ص ٢٨۔ [2] ایضاً، ص ٢٩۔

(ب) انشائے سرسید کی دوسری خصوصیت دلنشینی اور تاثیر ہے۔ بقول مولانا حالی یہ اثر محض سادگی کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا بلکہ ان کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھی"۔ یہی خلوص ہے جو ان کے خطوط میں جلوہ گر ہے۔ سرسید کو مولوی زین العابدین صاحب سے بڑی خصوصیت تھی اس لیے ان سے سب سے زیادہ خفگی اور ناراضگی بھی رہتی تھی۔ ان کو لکھتے ہیں :

"مکرمی زینو بھیّا۔ ابھی تمھارا خط پہنچا کچھ شک نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں کہ اس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا ہے۔ صبح اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ "اے کہ ہرگز فراموشت نہ کنم" کا نقشہ ہوگیا ہے"[1]

سرسید کے خطوط بڑی حد تک سپاٹ ہیں لیکن سچائی اور خلوص نے بے جان لفظوں میں جان ڈال دی ہے اور بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریگستان میں کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہے جو پورے جوش کے ساتھ ابل رہا ہے۔

نواب وقارالملک کو لکھتے ہیں :

"میں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی قیامت میں خدا کے سامنے رسول کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا رسول خدا میں نے بغیر کسی غرض دینی و دنیوی کے تیری اُمت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہ رکھا جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا منجملہ ان کے ایک یہ انتصار جنگ ہیں کہ آپ کہیے گا کہ میں نے نہایت

---

[1] خطوط سرسید۔ ص ۱۱۸ –

نیک نیتی سے کیا تھا خدا یقینی آپ کو معاف کرے گا۔ گو میری اور میرے
دادا کی تشفی نہ ہوگی باللہ نہ ہوگی۔ ثم باللہ نہ ہوگی۔ یہ میری رائے ہے
آپ کی نسبت[1]"

حالی کا شملہ آنے کا ارادہ ہے ان کو لکھتے ہیں:

"آپ بلا تامل تشریف لائیں۔ مکان دل آنکھیں سب حاضر ہیں۔"

(ج) سرسید کے خطوط میں بول چال کا بھی لطف پوشیدہ ہے اور بعض جگہ صحیح اور غلط، فصیح اور غیر فصیح کا بھی لحاظ نہیں کیا ہے۔ بقول مولانا حالی "جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی۔" اغلاط سرسید سے ہم نے آگے بحث کی ہے۔ سرسید نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں:

"مسٹر مالک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی انھوں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا وہ گھر پر نہ تھے ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ کرایہ کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے۔ دس روپیہ روز میں نے کہا۔ اس لیے دوبارہ نہیں گیا۔ پھر کسی دن جاؤں گا۔[2]"

خان بہادر مولوی ذکا اللہ کو لکھتے ہیں:

"واہ جناب واہ آپ نے خواجہ وجیہ الدین سے فرمایا کہ گیارہ بجے کا وقت جو سبجکٹ میٹنگ کے لیے مقرر کیا ہے اچھا نہیں ہے۔ اگر ایک بجے کا وقت ہوتا تو اچھا تھا مطلب آپ کا یہ تھا کہ آپ نو بجے دلی سے چلتے اور اجلاس میں شریک ہو کر اسی روز واپس ہو جاتے۔[3]"

(د) خطوط سرسید مصنف کی افتادِ طبع کا آئینہ ہیں۔ ان میں ظرافت جو سرسید کی فطرت کا خمیر تھی جھلکتی ہے۔ نواب محسن الملک کے خط میں مولوی س۔ خ پر خفگی کا اظہار ہے لیکن یہ عتاب اور ملال بھی ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں ہے۔

"وہ بچے ہیں انھوں نے دنیا نہیں دیکھی۔ دوستی اور محبت کے معاملات

---

[1] خطوط سرسید، ص ۱۰۱-۱۰۰۔ [2] ایضاً، ص ۳۹۔ [3] ایضاً، ص ۱۳۳۔

اور برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ وہ کسی رنڈی پر عاشق نہیں ہوئے۔ کسی لونڈے پر عاشق نہیں ہوئے۔ ان کو مزہ دوستی اور محبت کا بالکل معلوم نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ نہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے اور نہ انسان کی دوستی کا۔[1]

اسی خط کے آخر میں لکھتے ہیں :

"مجھ کو مطلق یاد نہیں ہے کہ وہ کونسا خط ہے اور اس میں کیا مضمون ہے جس کو پڑھ کر میاں احمد جان صاحب روئے امید ہے کہ آپ مطلع فرماویں تو اس بات کو اپنی معجزات کی کتاب میں لکھ لوں۔[2]"

نواب محسن الملک ہی کو لکھتے ہیں :

"آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے ائمہ کنار تو درکنار مولوی محمو کی تقلید بھی کافی ہے۔"

نواب صاحب موصوف کو لکھتے ہیں۔ انگریزی وضع اختیار کرنے کی بحث ہے۔

"تبدیل وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب بجا ہے۔ بشرطیکہ میرا جادو تو یہ تو یہ میرا معجزہ نعوذ باللہ میری کرامت لاحول ولاقوۃ الا باللہ میری حماقت تم میں اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو تین مہینے خیر سے گذر جائیں جب الہ آباد کے اسٹیشن پر گلے ملو گے اور چھاتی سے چھاتی ملے گی اس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من (معاف کیجیے بیخودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہے۔"

(ر) سرسید القاب مختصر لکھتے تھے مثلاً جناب عالی مخدومی مکرمی عزیزی مشفقی لیکن وہ جو کچھ لکھتے تھے رسمی طور پر نہیں بلکہ اس کی اہمیت پوری طرح سمجھتے تھے۔ نواب وقار الملک سے اختلافِ رائے ہوا اس لیے کچھ کشیدگی سی ہو گئی۔ ۴ر اگست سنہ ۱۸۹۰ء کو سرسید لکھتے ہیں :

---

[1] خطوط سرسید، ص ۴۸

[2] ایضاً ، ص ۵۰

" عزیزی و مکرمی

نواب صاحب والاجاہ۔ ابھی تک میرے دل نے قرار نہیں پکڑا ہے کہ
دونوں القابوں میں سے کون سا القاب لیے۔ اس لیے دونوں لکھ دیئے ہیں "

جب کشیدگی رفع ہوگئی تو ۳۰ر نومبر ۱۸۹۰ء کو لکھتے ہیں:

" اب میرا دل صاف ہوگیا ہے مہدی حسن کے سامنے میں نے تم کو بہت
بُرا بھلا کہا اور بخارات نکال یئے اس لیے میں تم کو وہی القاب لکھتا ہوں
جو پہلے لکھتا تھا۔ عزیزی و مکرمی مولوی مشتاق حسین .... "

غایت محبت میں اس طرح کے بھی القاب ہیں۔ مثلاً مکرمی زینو بھیا۔ یا نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں: " قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش اصطلاح عشق بسیار است و من دیوانہ ام۔ قبلہ مخدوم میرے محبوب میرے محب .... "[۱]

تصویر کا دوسرا رُخ

(الف) خطوط سرسید کی یہ رنگینیاں بالکل ایسی ہیں جیسے کسی بے آب وگیاہ سرزمین میں کہیں کہیں نخلستان کے ٹکڑے نظر آجائیں۔ پوری کتاب کو پڑھنے کے لیے دل پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ ورڈز ورتھ کے مجموعہ نظم کی طرح کل سے زیادہ اس کا انتخاب دلچسپ ہے۔ سرسید کے بعض خطوط میں وہی بے نمکی ہے جو بالعموم ناصح اور واعظ کی گفتگو میں ہوتی ہے۔ سراج الدین احمد بیرسٹر کے نام خطوط نمبر ۳ اور نمبر ۶ میں پند و نصیحت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ منشی احمد جان عنایت اللہ اور نیاز محمد خاں کے نام بعض خطوط بالکل رسمی اطلاعی اور کاروباری قسم کے ہیں جو خطوط پُر از معلومات ہیں وہ بیشتر خشک اور بے نمک ہیں۔ بعض خطوط بالکل کسی مضمون یا مقالۂ علمی کا اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔ میر واحد علی کو لکھتے ہیں:

" کامن سنس ایک دوسری چیز ہے۔ اس کی اس تقسیم سے کچھ علاقہ نہیں
ہے۔ فطرت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ انسان کی عقل کے لیے یہی ایک

---

[۱] خطوط سرسید، ص ۳۰۔

حد ہے اور خود عقل ثابت کرتی ہے کہ جو باتیں اس حد سے بالاتر ہیں وہ عقل انسانی سے مافوق ہیں۔ پس عقل پر عقل انسانی کا اطلاق ہے۔

مگر یہ حد عقل کامل کی ہے بہت سے انسان ایسے ہیں جن کی عقل اس حد تک نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کی عقل کے درجات متفاوت ہیں۔ بلحاظ ان درجات متفاوتہ کے ہر شخص کی عقل کی نسبت عقل کا اطلاق کیا گیا ہے اور جبکہ اشخاص سے قطع نظر کی جاوے تو عقل کلی کو عقل انسانی سے تعبیر کیا ہے۔ والسلام[۱]۔"

(ب) اس کے علاوہ خطوطِ سرسید میں زبان اور قواعد زبان کی بڑی فاحش غلطیاں ملتی ہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے: "وہ قواعد اُردو کی پابندی سے فطرتاً آزاد تھے......" وہ تحریر یا تقریر کی رَو میں قواعد کی کچھ پروا نہ کرتے تھے.... اور ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہیں صحیح لفظ پر ترجیح دیتے تھے۔ ذیل میں ہم اغلاط کی ایک مختصر فہرست دیتے ہیں۔

"میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے" ص ۳۲۔ غل مذکر ہے مونث نہیں۔ (رشک کا مصرع ہے۔ ع میکدے میں غل مچا آندھی سے چھپر اُڑ گیا۔ ابراہیم ذوق فرماتے ہیں۔ ع بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا۔)

"آپ فی الفور (ص) پچاس روپیہ بھیج دو" ص ۳۵۔ بھیج دیجیے ہونا چاہیے۔

" دل کو باغ باغ خوش کیا" ص ۴۸۔

" میں دیکھتا ہوں کہ جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے دوں دوں نیکی بڑھتی گئی ہے" ص ۳۵۔

"پانی پت میں جو ذی وجاہت اور معزز مسلمان ہوں ان کے پاس سے میں رائے آنی چاہتا ہوں" ص ۱۲۴۔ "چھٹیات" ص ۱۹۸۔

---

[۱] سرسید کے خطوط، ص ۱۶۴۔

(ج) سرسید نے بعض الفاظ ایسے ثقیل ناما نوس اور غریب استعمال کیے ہیں جو جملے کی فصاحت میں خلل انداز ہوتے ہیں شبلی نے لکھا ہے کہ کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت ہیئت نشست سب کی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو۔ ورنہ قائم نہ رہے گی۔

سرسید کے یہاں یہ تناسب اور توازن نہیں ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ جو ٹھیٹھ اردو میں کم مستعمل ہیں وہ بھونڈے طریقے سے استعمال ہوئے ہیں اور ان کی غرابت بدستور موجود ہے مثلاً محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"دو سو روپیہ ماہواری خرچ قیام اینجا نہایت کافی ہے۔" ص ۳۱

بعض جگہ فارسیت کا ناگوار غلبہ ہے مثلاً:

"آپ اس قدر عذرات مغائرانہ درباب ادائے قیمت کیوں لکھتے ہیں۔" ص ۳۶

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"ایک امر نہایت ضروری لکھتا ہوں فی الفور بلا تامل ساعتے اس کی تعمیل فرمائیے۔" ص ۶۸

ص ۹۲ پر لکھتے ہیں: "تعداد اسکالرشپ متعاقب بتاؤں گا۔"

ص ۸۰، پر لکھتے ہیں: "اس کو مسئلہ شرعی ٹھہرانا اور اس کے مرتکبین کو اکل حرام قرار دینا مضر اور اسلام کے پاؤں پر بدست خود تیشہ زدن ہے۔"

بعض جگہ اچھا خاصا اُردو میں خط لکھتے لکھتے فارسی کے جملے شامل کر دیتے ہیں۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"بعد چھاپہ چند نسخے (مواعظ احمدیہ کے) آپ کے پاس بھیجوں گا۔ نادانم کہ مخدوم چہ می گوید خدایا مخدوم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست۔ زیرا کہ ایں معاملہ مرا باتست نہ با مخدوم من مہدی ......" ص ۲۴۔

اسی طرح خط نمبر ۸ (صفحہ ۳۷) کو فارسی میں شروع کر کے اُردو میں ختم کرتے ہیں۔

پروفیسر حبیب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اولین رہنما میں کچھ خامیاں ہوتی ہی ہیں۔"

سرسید بھی نثر جدید کے پہلے رہنما تھے۔ اس وقت کی پیہم تبدیلیوں اور نئی نئی ضرورتوں کے ہنگاموں میں حسن کاری اور نقش طرازی کا کسے ہوش ہوتا۔ یہ دور تو شکست و ریخت کا تھا۔ حالی، آزاد اور شبلی نے البتہ اس زمین کی آبیاری کی اور اس میں چمن کھلا دیا۔ سرسیّد کا صرف یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ظہوری اور بیدل کا طرز غیر مقبول اور ناپسندیدہ بنا دیا اور ثابت کر دیا کہ مافی الضمیر سادہ نثر میں بھی ادا ہو سکتا ہے۔ سرسیّد نے جو باتیں اُردو میں پیدا کیں ان کا ذکر خود انھوں نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں کیا ہے، لکھتے ہیں :

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا [illegible] اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

یہی انداز ان کا خطوط میں ہے۔ پیرایہ سے زیادہ مطلب کی فکر ہے اور اسلوب سے زیادہ مضمون کی جستجو ہے اور اس حد تک کہ بعض خطوط بالکل کاروباری اور رسمی سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ خطوط سرسیّد مرحوم کی تمام زندگی اور ان کی عملی جد و جہد کے بھی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے انداز طبیعت اور اس کے افکار کا صحیح پتہ صرف خط و کتابت اور مراسلت ہی سے لگ سکتا ہے۔ یہ مکتوبات ان کی سوانح عمری کا دلچسپ اور مفید حصہ بن سکتے ہیں۔

نواب محسن الملک ۱۹۰۱-۱۸۳۷ء نواب وقار الملک ۱۹۱۷-۱۸۳۹ء

سرسیّد کے اعوان و رفیقان کار میں مولوی سیّد مہدی علی (نواب محسن الملک) اور منشی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں جو یکے بعد دیگرے سرسیّد ہی کے جانشین ہوئے اور قوم نے

ان کو رہبر و قائد تسلیم کیا۔[1] دونوں کی افتادِ طبع اور طریق عمل میں یک گونہ اختلاف تھا لیکن منتہائے نظر اور منزلِ مقصود دونوں کی ایک تھی۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے جو "مکاتیب" محمد امین زبیری نے شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپس میں لڑتے تھے لیکن الفت موج و کنار بھی رکھتے تھے۔ ان کا اختلاف رائے کا اختلاف تھا۔ اس سے دلوں میں فرق نہ آتا تھا اور قوم اور ریاست کی زوال آمادہ سیاست کے باوجود ان کی "موج" اس "بحرِ پر آشوب" میں تر نہ ہوئی۔ ان کا جینا بھی قوم کے لیے تھا اور مرنا بھی قوم کے لیے۔ ان کی زندگی اپنی نہیں رہی تھی بلکہ قوم کی زندگی ہو گئی تھی بقول حالی انھوں نے بتا دیا کہ ؏

یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

سر سید نے ایک مضمون میں ان دونوں کی سیرت کا نقشہ کھینچا ہے۔

"اب ہمارے محبوب مہدی علی خاں اور ہمارے عزیز مشتاق حسین کا حال سنو۔ یہ ہمارے دونوں دوست ایسے ہیں جن کا حال کچھ چھپا نہیں ہے۔ مولوی مہدی علی کا علم اس کی ذاتی خوبیاں اس کی پیاری پیاری باتیں اس کی سچی ایمانداری اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتے۔

منشی مشتاق حسین کی ذاتی نیکی اور نہایت سخت دین داری بے ریا عبادت سچی خدا پرستی غایت تشدد سے نماز اور روزہ اور احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے کہ ایک رائے یا ایک مسئلہ یا ایک آبائی رسم و رواج کے اختلاف کے سبب ایک کو نہایت حقارت سے حواری جس سے اشارہ عیسائی کا رکھا ہے اور دوسرے کو ملحد کا خطاب دیا ہے۔ کبرت کلمہ

---

[1] تذکرۂ وقار از محمد امین زبیری۔ ص د۔

تخرج من افواہم ان یقولون الا کذبا۔ مگر ہمارے ان دونوں دوستوں کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ان کو بعوض سچائی اور دین داری کے یہ خطاب ان ہی کی قوم سے ملے ہیں جن کی وہ بہتری چاہتے ہیں۔

نیک باشی و بدت گوید خلق   بہ کہ بد باشی و نیکت گوید[1]"

محسن الملک کے خطوں میں علی گڑھ کالج کے حالات، انگریز اساتذہ کی ریشہ دوانیوں، ٹرسٹیوں کی پریشانیوں، اجتماعی مفاد، قومی داد، اصول پسندی، بے باکی، راست گوئی اور مذہبی عقیدت کا ذکر ہے۔ لیکن جب رگِ ہاشمی بھڑک اٹھتی ہے تو شمشیر کی یہ عریانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ محسن الملک ریاست حیدر آباد کی معدنیات کے متعلق کچھ معاملات حکومت اعلیٰ اور پارلیمنٹ سے طے کرنے انگلستان بھیجے گئے تھے۔ بعد میں اس وفد میں ایک جونیئر ممبر مہدی حسن کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے متعلق وقار الملک کو لکھتے ہیں:

"نہ مجھے نہ خود مہدی حسن کو آپ نے اطلاع دی کہ وہ میرے شریک مقرر کیے گئے۔ نہ انڈیا آفس سے ان کو یا مجھے ایسا حکم ملا۔ آپ نے کلیا میں گڑ پھوڑا ہو تو اس کی ہمیں کچھ خبر نہیں۔ اور اگر بفرض محال آپ نے ایسا کیا بھی تو کیا یہ مطابق اس تجویز کے تھا جب کہ میں بھیجا گیا تھا۔ کیا اس کی کوئی ضرورت بجز اس کے کہ مجھ پر اعتماد تھا نہ ہے۔ یہ سب جھگڑے اور قصے نوکری کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جو آدمی خود اس سے سیر ہو اور جس کی حالت ایسی باتوں کی متحمل نہ ہو وہ کیوں ایسی مصیبت اپنے اوپر گوارا کرے۔ اب آپ اپنی نوکری لیجیے اور جس کو دل چاہے دیجیے۔ خانہ آباد دولت زیادہ[2]"

ایک اور خط میں نواب وقار الملک ہی کو لکھتے ہیں:

"کچھ حیدر آباد ہی میں رزق نہیں ہے۔ آپ کو حیدر آباد اور حیدر آباد کی گورنمنٹ مبارک ہو۔ آپ اور آپ کے معشوق آزادی اور بے تکلفی سے یہاں چین کریں۔ بندہ کے لیے آٹا دال اور آدھ سیر آٹا کافی ہے[3]۔"

---

[1] تہذیب الاخلاق۔ مقالہ حال خود و یاران خود (سرسید)۔
[2] مکاتیب (منشی مشین پریس آگرہ) ص ۱۲۔ [3] مکاتیب، ص ۲۸۔

اگلے خط میں لب ولہجہ اس سے زیادہ سخت ہو جاتا ہے ۔

"مہدی علی کے نزدیک مشتاق حسین مر گئے اور مشتاق حسین کے نزدیک مہدی علی مر گیا۔ پھر اب اصلاح کس سے اور خط وکتابت کس کو..... نہ اب شکوہ باقی ہے نہ شکایت[1]"

لیکن اس کے بعد جو خط ہے اس میں اجتماعی مفاد نے دفتر گلہ وشکایت کو بالکل دھو دیا ہے ۔

"مخدوم بندہ ۔ آپ جس وقت مجھ سے بات کرتے تھے اس وقت جو کچھ آپ کے دل کا حال تھا اس کا اثر اس وقت مجھ پر اتنا ہوا کہ قریب تھا کہ میں رونے لگوں ۔ میں نے ضبط کیا اور دوسرا ذکر چھیڑ دیا۔ بھائی مشتاق حسین تم یقین جانو اور سچ سمجھو کہ مجھے ذرا بھی اس کا شبہ نہیں ہوا کہ آپ میری اس حالت کو پسند کرتے ہیں اور جو روحانی صدمہ آپ پر ہے اسے میں پورا نہیں تو بھی کسی قدر جانتا ہوں مگر مجھے بہ خوبی معلوم ہے کہ کن صاحبوں نے نواب صاحب کو بدگمان کیا اور آپ برابر کوشش کریں کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا اور آپ کے دل کو اور تکلیف ہوگی۔ البتہ آپ بھی سرکار سے جدا ہونے کا قصد کریں گے ۔ اور یہ بات مجھے خود منظور نہ ہوگی اس لیے خدا کے واسطے اب معاملے کو اس درجہ پر نہ آنے دیجیے ۔ گو میں ہزار رنجیدہ ہوں اور کتنا ہی غمگین مگر یہ امر ایک لحظہ کے لیے مجھے منظور نہ ہوگا کہ یہ ریاست عمدہ لوگوں کی خدمت سے محروم ہو خصوصاً آپ سا آدمی اس وقت جانے کا قصد کرے ۔ اگر معاملہ اس پر پڑتا ہے تو میں اپنی موجودہ ذلت اور رنج کی حالت پر قانع کرنے پر تیار ہوں ۔ یہ حالت نزع سے کم نہیں ہے اور شاید کبھی کبھی یہ تکلیف ظاہر ہو جائے مگر جس ریاست کا نمک کھایا ہے اور جس کی بدولت اس درجہ پر پہنچے ہیں اس کا نقصان مجھے منظور نہ ہوگا اور عین الیقین

---

[1] مکاتیب ، ص ۲۸ ۔

کے درجہ پر یہ بات پہنچی ہوئی ہے کہ آپ کے جانے سے نقصانِ عظیم ہوگا اور نہ صرف ریاست کو بلکہ مجھے اور میرے تمام عزیزوں اور قریبوں کو آپ نہیں جانتے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میرا حال کیا ہوتا۔ زیادہ کیا لکھوں یہ کچھ خوشامد کی بات نہیں آپ پر ہر طرح کا زور ہے اور ہر قسم سے آپ پر غصہ ظاہر کر سکتا ہوں اور کیا ہے۔ آپ کی پاک طینتی اور صاف دلی اور سچی محبت نے ہمیشہ میری غلطیوں کو معاف کیا ہے۔ یہ تو فرمایئے کہ آپ کے بعد کون ہے جو میری اغراض کا خیال رکھے گا[1]۔"

محسن الملک نے جو خطوط طلبائے مدرسۃ العلوم کے نام لکھے ہیں ان میں بھی یہی قیمتی خلوص ہے جو دراصل نیکوکرداری اور راست گفتاری سے پیدا ہوتا ہے۔ حامد حسین قادری نے لکھا ہے کہ وہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کے قائل تھے[2] لیکن ان کے خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا مسلک "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" تھا۔

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ نے ان کے خطوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان کے خاص خطوط جو انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اسی قابل ہیں کہ ایک جگہ جمع کیے جائیں اور کتاب کی شکل میں شائع کیے جائیں۔ ان خطوط سے ان کی بعض عادات و خصائل پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے دل رُبا طرزِ تحریر کے بہت سے عمدہ حصے ان خطوط میں موجود ہیں جو اس قابل ہیں کہ ان کو ضائع نہ ہونے دیا جائے[3]۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کے ادیب نہیں تھے۔ ان کے طرزِ تحریر میں روانی تسلسل بیان زور اور اثر ہے لیکن وہ دلربائی نہیں جو لٹریچر کو ابدی قدر و قیمت بخشتی ہے۔

نواب وقار الملک کے خطوں میں بھی خلوص کا جوہر ہے ان کو جو بات کہنا ہوتی ہے وہ روح کی پوری طاقت سے کہتے ہیں۔ الحاق بنگال کے متعلق سید فضل الرحمٰن

---

[1] مکاتیب، ص ۲۹۔ [2] داستانِ تاریخ اردو، ص ۳۹۸۔
[3] بحوالہ تذکرہ محسن، ص ۲۷۴۔

وکیل کان پور کو لکھتے ہیں :

"کم ازکم مسلمانوں کا یہ کام تو ضرور ہے کہ ایک مضبوط کوشش کے ساتھ بتلا دیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی مسلمانوں میں نہایت مایوسانہ خیالات کے ساتھ دیکھی گئی ہے کہ دونوں بنگالہ کے الحاق کے اعلان کے ساتھ گورنمنٹ نے مطلق بھی اس کی ضرورت نہ محسوس کہ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا کہ ان کی ترقی پذیر حالت اور حقوق کی حفاظت فلاں فلاں ذریعہ سے کی جاوے۔ گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا۔ بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون۔ کس کا مراکو اور کس کا ٹریپولی اور کہاں کا ایران۔ یہاں سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا[1]"

نواب وقار الملک کے بیشتر خطوں کا انداز بے لطف اور بے نمک ہے۔ محسن الملک کے مقابلہ میں ان کے یہاں ادبیت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے خطوط کاروباری قسم کے ہیں جن کے مافی الضمیر کے ادا کرنے پر زیادہ زور ہے۔ وقارِ حیات کے مولف نے ان کی مدد سے ان کی سوانح عمری اور سیرت کے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جو بڑی قابلِ قدر ہے۔ یہ خطوط مصنف کی سیرتِ شخصی ہی کے نہیں بلکہ تاریخ قومی کے بھی آئینہ دار ہیں۔

مسلمانوں کی سیاست اور تعلیم کے متعلق ان میں بیش قیمت مواد موجود ہے۔ ان کا انداز سیدھا سادہ سلجھا ہوا اور کہیں کہیں اکھڑا ہوا ہے جو ایک ایسے شخص کا لازمی ہونا چاہیے۔ جو رہنمائی اور رہبری کے عملی فرائض انجام دے رہا ہو۔ سرسیّد اور ان کے رفقاء نے اُردو نثر اور انشا کو فارسی کی تقلید سے آزاد کرانے

---

[1] مکاتیب (ص ۱۱۷) حصہ دوم۔

E
21

اور اس کو موثر اور مضبوط بنانے میں بڑی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادبی شخصیتیں بہت ہی "غیر ادبی" معلوم ہوتی ہیں۔ نواب وقار الملک مختلف قومی اور سیاسی خدمات کی وجہ سے کسی مستقل تصنیف کی طرف متوجہ نہ ہو سکے لیکن ان کے خطوط اور متفرق مضامین اس کی غمازی کرتے ہیں کہ اگر وہ اس میدان میں اترتے تو ان کا پایہ معاصرین میں کسی سے کم نہ ہوتا۔

حالی ۱۸۳۷-۱۹۱۴ء

سرسید کے دور کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حالی کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ عمر بھر علی گڑھ تحریک سے وابستہ رہے اور زندگی کے آخری دن بھی اسی دیوارِ حرم کے نیچے گزارنا چاہتے تھے۔ حالی اور سرسید میں جو عقیدت تھی وہ باہمی تھی، یک طرفہ نہیں۔ حالی ہی سرسید سے عقیدت نہیں رکھتے تھے بلکہ سرسید بھی حالی کے ارادت مند تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے ایک تقریر میں کہا تھا:

"ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا آئندہ زمانہ میں جب کہا جاوے گا کہ فخرِ قوم فخرِ شعرا فخرِ علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دلانے والا قوم کا کون ہے تو کہا جائے گا کہ حالی [1]"

سرسید کی زبردست شخصیت، مضبوط سیرت اور ان کے بلند مقاصد نے حالی کو بیحد متاثر کیا اور وہ دل و جان سے ان کے ساتھ ہو گئے [2] خود انھوں نے لکھا ہے:

"اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔"

حالی قدرت کی طرف سے غیر معمولی ادبی صلاحیتیں لے کر آئے تھے لیکن جو چیز ان کے لیے دلیلِ راہ بنی وہ سرسید کے قلم کی آوازِ بازگشت تھی۔ حالی کی ادبیا سرسید کی شخصیت کے عوارض ہیں۔ مہدی افادی نے صحیح لکھا ہے:

"سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں [3]"

---

[1] مجموعہ لکچرز سرسید احمد خاں۔ [2] یادگار حالی۔ ص ۴۱۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
[3] اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ ۔ مہدی افادی۔

اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں :

"لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصّے میں آئی۔"

یہ سلاست اور قدرت حالی کے خطوں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ ان کے مکتوبات کے دو حصّے ان کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے حالی پریس پانی پت سے ۱۹۲۵ء میں شائع کیے تھے اور ایک مجموعہ ابھی حال میں مکاتیب حالی کے نام سے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اُردو مرکز لاہور سے شائع کیا ہے۔ ان خطوط کی حیثیت جامِ جم کی سی ہے۔ ان کے ذریعے دل کے نہاں خانوں تک رسائی ہو سکتی ہے اور سیرت کے تمام خط و خال نظر آ سکتے ہیں۔ حالی کی زندگی بڑی پاک صاف اور بے ریا تھی اور وہ ان خطوں میں اس طرح جھلکتی ہے جیسے آئینہ میں تصویر یا شمشیر میں جوہر۔

سیرت

حالی کے مزاج میں بڑی قناعت تھی۔ انھوں نے کبھی نام و نمود اور شہرت کی خواہش نہیں کی۔ حیا اور انکسار کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ مولوی عبدالحق نے حیات جاوید پر افسر میں تبصرہ کیا اس پر لکھتے ہیں :

"حیات جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بتقاضائے محبت اور تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں۔"

(مکتوبات حالی، ج ۱۔ ص ۴۵)

مولانا حالی نئے اور اچھے لکھنے والوں کی قدر افزائی کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کو لکھتے ہیں :

"ہمدرد کے باقاعدہ جاری ہونے کی خبر سے اس لیے بے انتہا مسرت ہوئی کہ میری زندگی میں دلّی کو یہ عزت حاصل ہونے والی ہے کہ اُردو کا عمدہ ترین پرچہ یاس و امید کی سخت کشمکش کے بعد وہاں سے جاری ہونے والا ہے[1]"

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں :

"آپ کا آرٹیکل جو علی گڑھ کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی ۔ . . . . کہ حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت و بے پروائی کا ذکر ہے۔ ایک دانشمند کا قول ہے کہ جب کسی بدصورت آدمی پر لوگ پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو بدصورت کے لیے اس ندامت سے بچنے کا عمدہ گر یہ ہے کہ وہ بھی ان کے قہقہوں میں شریک ہو جائے۔ چونکہ میں بھی ٹرسٹیان میں ہوں اس لیے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہوں[2]"

ایک دوسرے خط میں ان کو ہی لکھتے ہیں :

"جہاں تک ہو سکے اصطلاحات علمیہ کی ڈکشنری ضرور مرتب کیجیے اور اس کے بعد معمولی اُردو زبان کی ڈکشنری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی کوشش سے یہ دونوں لغات تیار ہو جائیں تو آپ قوم کی ایک ایسی خدمت سے عہدہ برآ ہوں گے جو قومی ترقی کی جڑ ہے[3]"

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو علمائے سلف کی تصنیف پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے۔ شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے کہ کیا مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی صدہا کتابیں نہیں لکھیں مگر ایسا خیال کرنا سخت غلطی کی بات ہے۔ آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو

---

[1] مکاتیب حالی، ص ۱۰۸۔ [2] مکتوبات حالی، ج اول، ص ۷۱ و ۷۲

[3] مکاتیب حالی ، ص ۴۸

انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلفت یلپ کے لکھنے میں کیا ہے۔ اس نے بھی ہزاروں بائیوگرافیاں پڑھ کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی[۱]۔"

شیخ عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں :

"شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں اور میرے دوست ہیں۔ ان کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے بلکہ اُردو لٹریچر سے بھی ایک خاص مناسبت ہے اور اس کا ثبوت یہی ہے۔ جو انھوں نے جدید اُردو لٹریچر کے مصنفین پر لکھا ہے اور اس باب میں شمال مغربی اضلاع کے لوگوں پر جو کہ اپنے تئیں اُردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں اپنی فوقیت ثابت کر دی ہے کیونکہ آج تک دلّی سے لکھنؤ تک کسی شخص نے اس مضمون پر قلم نہیں اُٹھایا[۲] "

مولوی ظفر علی خاں کو لکھتے ہیں :

" اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کبھی کچھ طبع آزمائی کرتا۔ مولوی اسماعیل صاحب میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پا در رکاب ہیں صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ آپ کو فکر معاش دم لینے دے اور یہ جیٹک بھی دل کو لگی رہے[۳]"

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں :

"مولوی سید احمد میرے نہایت دوست ہیں اور اُردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال انھوں نے دکھایا ہے اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں[۴] "

---

[۱] مکتوبات حالی، ج ۱ - ص ۷ و ۸۔ [۲] ایضاً ، ص ۳۲

[۳] مکاتیب حالی ، ص ۶۱ و ۶۲۔ [۴] مکتوبات حالی ، ج ۱ - ص ۳۴ -

حالی دوسرے کی تعریف اس طرح نہیں کرتے کہ اس میں خود ان کی تعریف کا پہلو نکل آوے۔ ایسے موقع پر ان کا عجز اور انکسار بڑھ جاتا ہے۔ آغا شاعر دہلوی کو لکھتے ہیں:

"میں ایک دیہاتی قصباتی آدمی اور آپ دہلی کے رہنے والے۔ دریافت فرماتے ہیں مجھ سے۔ آپ خود اہل زبان ہیں۔ بینی و بین اللہ[1]۔"

حالی کے تعلقات اپنے معاصرین سے نہایت شگفتہ تھے۔ بعض حلقوں میں یہ بدگمانی رہی ہے کہ حالی اور شبلی میں ہم عصرانہ چشمک تھی۔ حالی کے جو خطوط ہم تک پہنچے ہیں وہ اس کے گواہ ہیں کہ ان کا آئینۂ دل گرد کدورت سے صاف تھا۔

مولوی عبدالحق جدید اُردو ادب کے مشاہیر پر تنقیدی مضامین لکھنا چاہتے تھے۔ اس فہرست میں انھوں نے شبلی کو شامل نہیں کیا۔ اس موقع پر مولانا حالی ان کو لکھتے ہیں:

"اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگزاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا[2]۔"

مولوی عبدالحق ہی کو لکھتے ہیں:

"شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہہ دیجیے گا کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کا مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے میرے نزدیک بہت بہتر ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملے گا اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے[3]۔"

مولانا شبلی کو لکھتے ہیں:

"دستہ اگل پہنچا..... غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ

---

[1] مکاتیب حالی، ص ۸۷۔ [2] مکتوبات حالی، ج ۱۔ ص ۳۴۔
[3] مکتوبات حالی، ج ۱۔ ص ۴۱ و ۴۲۔

میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالک را

خجل تبسم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایمان ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا۔ الاالذی ابتلی بمثل ما ابتلی بہ القائل۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ ہے اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں۔ مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں"

حالی کی اس تعریف میں دیانت داری اور خلوص بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ تعلقات محض ادب کی دنیا تک محدود نہیں تھے شخصی معاملات میں بھی یہی محبت اور شرافت تھی۔ شبلی کے پاؤں میں چوٹ لگ گئی تھی، اس کے متعلق قاری عبدالولی کو لکھتے ہیں:

"مکرمی رسالہ الندوہ میں مولانا شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر مجھے بھی خیال ہوا کہ ان کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کروں لہٰذا ذیل کے چار مصرعے موزوں کر کے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں..... رباعی

شبلی کہ گزند پاش پر دل شکن است — با خستگیش خجستگی مقترن است

چنداں کہ بکاہند فزایند ایں جا — کار استن جن زپیر استن است[1]"

جب یہ خط دسمبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں شائع ہوا تو اس کے نیچے مولانا شبلی کے قلم سے حسب ذیل نوٹ درج تھا:

"مولانا (حالی) کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا ان کی ذرّہ نوازی ہے۔ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا کرتے ہیں لیکن میری عزّت یہ ہے کہ وہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔

---

[1] مکاتیب حالی، ص ۸۶۔

اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے[۱]۔

حالی کو آزاد سے بھی خصوصیت تھی۔ آب حیات میں مومن کا حال نہ لکھنے پر مولوی محمد حسین آزاد کو لکھتے ہیں :

"یہ خیال اکثر حمقا کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصب کے سبب مومن کا حال نہیں لکھا مگر اس سے بڑھ کر کوئی سخیف اور پوچ خیال نہیں ہو سکتا۔

دریا باوجود خوبش موج دارد
خس پندارد کہ این کشاکش با وست[۲]"

سرسید سے حالی کو جو عقیدت تھی اس کا تو خیر ذکر ہی کیا یک جان دو قالب کا فرسودہ مقولہ صادق آتا ہے۔

خواجہ تصدق حسین کو لکھتے ہیں :

"یہ تمام قومی جلسے اور مجمعے جب ہی تک ہیں جب تک سرسید کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ اس کے بعد امید نہیں کہ کوئی شخص اس مجمع کو قائم رکھ سکے اور مسلمانوں کی نیشنلٹی کے کمزور پودوں کو پروان چڑھائے۔

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویران
ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی[۳]"

مولانا حالی کی سیرت کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی حق گوئی اور بیباکی ہے جو جوانمردوں کے آئین میں داخل ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد کو لکھتے ہیں :

"اے حضرت قواعد فارسی کی اصلاح ہو یا مذہب کی اصلاح ہو یا رسم و رواج کی اصلاح ہو غرض کوئی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک زید و عمرو کی مخالفت کا کھٹکا دل میں باقی ہے[۴]"

---

[۱] رسالہ الندوہ، دسمبر ۱۹۰۵ء
[۲] مکاتیب حالی، ص ۱۸۔
[۳] مکتوبات حالی، جلد دوم، ص ۲۳۔
[۴] مکتوبات حالی، ص ۲۱۔

شخصیت

حالی کے خطوں میں ان کی شخصیت پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ ان میں انکساری اور فروتنی کے ساتھ اظہارِ ذات کا بھی جذبہ تھا جو ادیب اور فن کار کے لیے عین حیات ہے۔ جب تک اس جذبے کی شمع روشن نہ ہو فن یا شاعری میں زندگی کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہ جذبہ جتنا متوازن اور ارتقا یافتہ ہوگا اتنا ہی منفرد اور تازہ فن پیدا کرے گا۔ وہ صرف ایک شرط کا پابند ہے کہ وہ جو فن پیدا کرے اجتماعی زندگی کے لیے افادیت رکھتا ہو۔ حالی اپنے مقام سے بے خبر نہیں تھے۔ خواجہ تصدق حسین کو لکھتے ہیں :

> "محسن الملک کو چوں کہ بہت سے ٹرسٹیوں کو انٹروڈیوس کرانا تھا اس لیے وہ میری نسبت اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکے کہ یہ فارسی اور اُردو دونوں کے شاعر ہیں اور ہندوستان میں ان کا کوئی مثل نہیں ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ایشیائی شاعری جو محض ایک بیکار چیز تھی اس کو مفید بنایا گیا ہے اور اس ذریعہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کیا گیا ہے[1]"

نگار کے ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ حالی کو اپنے مکتوب الیہ بے جان معلوم ہوتے ہیں[2]۔ یہ رائے سوچی سمجھی ہوئی نہیں ہے اور صرف چند خطوں کو سامنے رکھ کر قائم کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں نہ شبلی کا حسن الفاظ ہے اور نہ مہدی کا معتدل ہیجان لیکن اس کی ان سے توقع رکھنا فضول ہے۔ ہر شخص کے امیال و اذواق کو ایک ہی فیتے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ان کے خطوں میں وہ درد اور خلوص موجود ہے جو انسانیت کے لیے ضروری ہے۔ ان کے بعض خطوط اُبالی ہوئی کھچڑی اور بے مزہ سالن ہیں لیکن ان کے خلوص محبت اور گرمی سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ ان کے بیشتر خطوں میں خانگی معاملات اور نجی باتوں کا بیان ملتا ہے لیکن وہ بھی دلسوزی

---

[1] مکتوبات حالی۔ ج ۲ ، ص ۸۱۔

[2] رسالہ نگار لکھنؤ، نومبر ۱۹۲۹ء ، ص ۱۰

سے خالی نہیں ہیں اور ان میں بھی مخاطب کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اپنی پوتی کو لکھتے ہیں:

"تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے ....
کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں
کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کے یقین دلاؤ کہ میں وہی ..... ہوں"[1]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"تمھاری دادی بہت بہت دعائیں دیتی ہیں اور بلائیں لیتی ہیں اور جتنا
تمھیں یاد کرتی ہیں شاید انھوں نے عمر بھر میں اتنا کسی کو یاد نہ کیا ہوگا"[2]

یادگار حالی میں لکھا ہے کہ

"مولانا کے خط پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وسیع دل میں کس کس کی محبت
کے لیے کتنی گنجائش تھی۔ خواجہ سجاد حسین کے نام سینکڑوں خط ہیں اور ہر ہر
خط ان کی بے انتہا محبت اور شفقت آمیز نصیحتوں کا آئینہ ہے۔ دوسرے
بہت سے عزیزوں کے نام بھی سینکڑوں خط ہیں جن کو پڑھ کر اجنبی اور ناواقف
بھی بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ حالی کو خاندان کے ہر ہر فرد سے
کتنا انس تھا اور سب کی فلاح اور بہبود اور اصلاح کا کتنا خیال رہتا تھا۔"[3]

حالی کا خاندان بہت بڑا تھا "کئی سو آدمیوں کا حلقہ تھا جس کا مرکز حالی کی ذات تھی"[4] وہ مکروہات خانگی سے اتنے پریشان تھے کہ ہمیشہ تجرد اور آزادگی کی حسرت میں رہے۔ حافظ محمد یعقوب کی بیوی کا انتقال ہوگیا، ان کو تعزیت کے خط میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ یہ موقع نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہے مگر میں اس مقام پر خاموش
نہیں رہ سکتا۔ خدا کے تمام کام حکمت اور مصلحت سے بھرے ہوتے ہیں۔ بہت
سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے حق میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔

---

[1] مکتوبات حالی، ج اول، ص ۱۶۱۔ [2] ایضاً، ص ۱۶۸۔
[3] یادگار حالی، ص ۸۱۔ [4] ایضاً، ص ۷۹

اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے اس کی قدر کرنا چاہیے اور اس سے کچھ کام لینا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ (سرسید کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں) اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو یہ رتبہ ان کو حاصل نہ ہوتا۔ آپ کے لیے یہ نہایت عمدہ موقع ہے کہ آپ ہمہ تن اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جائیے اور نوکری بھی چاہو کرو چاہو نہ کرو اور اگر زیادہ ہمت ہو تو خود بھی تحصیلِ علم کرو اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (آخر میں لکھتے ہیں) میں نے اس نصیحت کے سوا جو اس خط میں لکھی ہے آپ کے ساتھ کبھی کوئی دوستی کا حق ادا نہیں کیا۔[1]

حالی نے اپنی خودی کو کبھی گوشت پوست کے سپرد نہیں کیا۔ اور نہ ان کا دامن کبھی غلطی سے تر ہوا۔ ان کی نیکیاں "مستی سے تہی اور سرشاری سے محروم ہیں" ان میں روایت کا لہو ہے۔ وضع داری ہے۔ بلا کا ضبط اور ٹھہراؤ ہے۔ ان کی شخصیت میں سورج کی سی چمک دمک نہ تھی۔ چاند کا سا نور تھا۔ وہ نہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں اور نہ اس زور شور سے روتے ہیں کہ ہمسایہ کی نیند حرام ہو جائے۔ حالی کے نزدیک زندگی مسلسل فرائض کا نام ہے۔ انھوں نے عمر بھر نیکیاں کیں لیکن اپنی نیکیوں سے دنیا کا کام نہیں لیا۔ انھوں نے زندگی بھر زوال کے مرثیے لکھے لیکن کبھی اپنی زندگی میں زوال نہیں آنے دیا۔

انگریزی تعلیم کے متعلق ان کی کتنی صحیح رائے ہے۔

"میرا یہ بھی خیال ہے کہ صرف انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں مشرقی تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔"[2]

تجربے نے حالی کی اس رائے کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ شبلی کو لکھتے ہیں:

"مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی

---

[1] مکتوبات حالی، ج اول، ص ۱۲۲ و ۱۲۳۔ [2] ایضاً، ص ۸۔

کی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی پیدا نہیں کر سکی[1]۔
نوکری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مسلمان طالب علموں کو جہاں تک ممکن ہو ترغیب دی جائے کہ وہ تعلیم کے بعد معاش کا مدار صرف نوکری پر نہ رکھیں بلکہ اور ذریعوں سے بھی معاش پیدا کرنے کی فکر کریں[2]۔"

حالی ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے اور یک جہتی کو ملکی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ شرر لکھنوی کو لکھتے ہیں:

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی اور یک جہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہو گئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کرنے کے وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں تعلیم کی ترقی ہوتی جائے گی، جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نااتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے اسی قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائے گا کہ بغیر اتحاد و یک جہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں وقعت اور توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی تعلیم جس نے بالفعل دونوں فرقوں میں زہر گھول رکھا ہے آگے چل کر یہی زہر ایک دن تریاق کا کام کرنے والا ہے[3]۔"

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

"جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان برہمن ہوں یا آریا[4]۔"

---

[1] مکاتیب حالی، ص ۴۱۔
[2] مکتوبات حالی، ج اول، ص ۲۸۔
[3] مکاتیب حالی، ص ۵۴۔
[4] مکتوبات حالی، ج اول، ص ۸۴۔

حالی کو قوم کی زبوں حالی کا رنج تھا۔ ان کے ہر جملے سے ان کا درد قومی تراوش کرتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی وہ صراطِ مستقیم سے کبھی نہ ہٹے۔ گبن کی تاریخ کے ترجمے کا مسودہ کالج کی لائبریری سے تلف ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں :

"یہ مسودہ میرے قبضہ میں آگیا ہے ..... اس کا ذکر یورپین پروفیسروں سے بھی کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وہی مثل ہے اپنا گھٹنا کھولیے۔ اور آپ ہی لاجوں مرے۔ سوا اس کے کہ مسلمانوں کی اور زیادہ رسوائی ہو اور کوئی نتیجہ نہیں معلوم ہوتا[1]۔"

تعزیت کے خط میں بھی وہ احساس فرض سے غافل نہیں ہیں۔ نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں :

"صاحبزادی کی وفات کا حال سن کر سخت افسوس ہوا مگر صبر شکر کے سوا چارہ کیا ہے ..... اگر خدا تعالیٰ کو اس درسگاہ کی بنیاد مستحکم کرنی منظور ہے تو امید ہے کہ وہ آپ کی عمر میں برکت دے گا اور جو نیک منصوبے کالج کی نسبت آپ کے دل میں ہیں ان کو پورا کرے گا[2]۔"

حالی کا نظریۂ زندگی ان جملوں میں پوری طرح واضح ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو لکھے ہیں :

"میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو بھلائی کی جائے۔"

ان کی پیشانی پر خلوص جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ ان کی نیکیاں خالص انسانی نیکیاں ہیں۔ "جن پر عمل کرنے کے لیے آسمان و زمین کی ماہیت دریافت کرنا ضروری ہے نہ مستحسن۔" ان خطوط کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز خالی ہے لیکن اگر

---

[1] مکتوباتِ حالی، ج اول، ص ۱۳ و ۱۴۔ [2] ایضاً، ص ۵۔

کسی چیز کو بقا ہے تو وہ استواری کے ساتھ وفاداری کو۔

مکتوباتِ حالی کے بیشتر خطوط اس وقت کے لکھے ہوئے ہیں جب وہ سرسید کی سوانح عمری "حیاتِ جاوید" لکھ رہے تھے۔ اس بے مثل کتاب کے لکھنے میں وہ باوجود اپنی بیماری، خانگی پریشانی اور ایک نواسے کی سخت بیماری کے برابر لیٹے رہے لیکن اس محنت کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی ملک میں نہیں ہوئی۔ حالی اس کے متعلق ایک رئیس کو لکھتے ہیں:

"اگرچہ میں صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارِ گراں کو اپنے ذمّہ لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرضِ کفایہ سے سبکدوش کیا ہے اور اس لیے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سرسید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے۔ مگر آج تک کسی نے اس کی بات نہیں پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃً پیش کی جائے ..... آپ یقین جانیے کہ میں اس زمانہ کی لٹریری ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو بیری طرح محض اُردو و فارسی کے مردِ میدان میں لائے محض جانتا ہوں۔ مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں منتہائے طاقت صرف کرتی ہے۔ وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ ان سے بھی زیادہ گراں قدر تصوّر کرتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔

اگر بریاں کند بہرام گورے
چوں پائے ملخ باشد ز مورے[1]"

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

"میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیوگرفی کا حق ادا نہیں

---

[1] مکتوباتِ حالی، ج اوّل، ص ۱۵ و ۱۶۔

ہو سکا لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا کسی متنفس نے قلم سے یا دام سے براہِ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی (الا ماشاءاللہ)..... میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں نے مسدس مدوجزر اسلام کا پہلا ایڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سرسید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں۔ میں نے جواب لکھ بھیجا۔ انھوں نے اسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ کر بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیج دو۔ اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیج دیجیے۔...... اب ان کے بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ ان کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔ بعضے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ تو کسی سے بھی امید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے۔

سوختم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نشد
چوں چراغاں شبِ مہتاب بے جا سوختم[1]"

یہ خط بقول مولوی عبدالحق "ہماری قوم کی ناقدری کا مرقع ہے"۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم ہے"

حالی کا نظریۂ شاعری

حالی کے خطوں سے ان کا نظریۂ شاعری بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر حالی کے لیے ایک نفسیاتی حادثہ تھا۔ اس نے ان کا ایک رخ ماضی کی طرف اور ایک حال

---

[1] مکتوبات حالی، ج اول، ص ۴۳ و ۴۴۔

کی طرف پھیر دیا۔ شاعری میں بھی وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے، کافور ہونے لگے۔ غزل اور تشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔

نئی ضروریات اور نئے محرکات نے حالی سے جدید اُردو شاعری کا سنگِ بنیاد رکھوایا۔ ان کے دل میں ملّت کا درد اور قوم کی اصلاح کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا اور وہ شعروادب کو بھی اسی اصلاحی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ حالی اسکن اور ٹالسٹائی کے ہم عصر تھے اور ان دونوں کی طرح ادب کو مقصدی بنانے کے خواہشمند تھے لیکن نہ وہ ٹالسٹائی کی طرح متعصب تھے اور نہ اسکن کی طرح سیاسی جانب دار۔ کہ کلاسیکی شہ پاروں کو اصلاح اور سیرت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے۔ ان کی رائے میں بڑا توازن ہے۔ حافظ سعد اکبر عثمانی کو لکھتے ہیں:

"اردو کی شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہوگئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بنائے جائیں اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے[۱]۔"

حالی کے نزدیک نیچرل شاعری کے حدود وسیع تھے۔ مولوی محبوب عالم کو لکھتے ہیں:

"نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے جا بجا مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے اور مضامین کی طرف بہت توجہ کی گئی ہے حالانکہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع اور ناپیدا کنار میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعرا طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں[۲]۔"

وہ خونِ آدم کو اپنا موضوع بنانا چاہتے تھے۔ ظفر علی خاں کو لکھتے ہیں:

"نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیئے اور جس کو "جادو" کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہیں نظر نہیں آتی لیکن (آپ کی) نظم کو دیکھ کر میں متحیّر ہوگیا

۱؎ مکتوباتِ حالی، ج ۱، ص ۱۴۱۔ ۲؎ مکاتیب حالی، ص ۵۰

"...... اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کبھی کچھ طبع آزمائی کرتا۔"[۱]

حقیقت بھی یہ ہے کہ حالی کی شاعری قومی شاعری سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اعلیٰ انسانی شاعری کی پرچھائیاں ان کے یہاں بہت کم ہیں۔

ادبی نکات

حالی کے خطوں میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی ہیں۔ ہاتھ اور ہات کی بحث ہے۔ تکان کے لفظ پر غور کیا ہے۔ قوافی کے اصول بتلائے ہیں۔ غالب اور میر انیس کی ملاقات کو غلط ثابت کیا ہے لیکن یہ ہریالی کہیں کہیں ہے بعض جگہ بالکل چٹیل میدان ہے۔ شبلی کے خطوں میں جو ادبی چاشنی موسیقی اور مصوری ہے وہ ان کے یہاں ناپید ہے۔ وہ حسین دیوانگی اور وہ کشمکش جو آسودگی سے تعبیر کی جاسکتی ہے حالی کے یہاں نہیں ملتی۔

ادبی حسن

حالی بلند پایہ ادیب تھے کہیں ان کے قلم سے ایسے جملے بھی نکل گئے ہیں جو ادب کی جان ہیں۔

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

"آپ سے اور نیز مکرمی محمد مزمل اللہ خاں صاحب سے ملاقات کا موقع نہیں ملا دہلی میں بھی جب کہ حکیم واصل خاں صاحب کے ہاں ہنگامہ رقص و سرود گرم تھا ایک بجلی کی سی چمک نظر آئی تھی پھر برابر آنکھیں ترستی رہیں[۲]۔"

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

"اگرچہ کوئی مہلک مرض سردست لاحق نہیں ہے لیکن ۷۵ - ۷۶ برس کی عمر کا آدمی چراغ سحری سے بھی زیادہ ناپائدار ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ آپ مع بخیر حسب وعدہ محرم کی تعطیل میں یہاں آجائیں اور اپنی ملاقات سے محظوظ فرمائیں۔

---

[۱] مکاتیبِ حالی، ص ۶۱ و ۶۲۔ [۲] مکتوباتِ حالی، ج اول، ص ۲۰۔

E
22

میں اپنی طرف سے اس وقت تک زندہ رہنے کے لئے بہت کوشش کروں گا۔[۱]

شبلی کو لکھتے ہیں :

"اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب سے کیا تھا۔

میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ میں آپ کے حقوق صحبت کو بھول گیا ہوں مگر مولانا یہ تغافل اسی قسم کا ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎ تغافلے کہ کم از صد نگاہ حسرت بست۔ میں اپنے حالات کی تفصیل لکھ کر آپ کو ملول کرنا نہیں چاہتا ہوں صرف چار مصرعے حسب ذیل لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

علم و عمل و کتاب سے نفرت ہے — لکھنے پڑھنے کے نام سے وحشت ہے
تونے ہر در در سے دی آکے نجات — بیری رحمت ہے تجھ کو صد رحمت ہے"[۲]

یہ رنگینیاں ان خطوں میں اس طرح آئی ہیں جیسے کوئی اپنے گناہ پر پشیمان ہو جائے۔ حالی کی شخصیت غالب کی طرح پہلو دار نہیں تھی۔ اسی لیے ان کے آئینے میں ہزار رنگ نہیں ملتے۔ ان کے خطوں میں نہ چشمک ہے نہ پندار نہ امنگ نہ چھیڑ چھاڑ۔ خلوص کی ایک سیدھی لکیر ہے۔ دردمندی کی فضا ہے۔ انسانیت کا نغمہ ہے راست روی اور فرائض کا ایسا احساس ہے جو فرشتوں کے لیے باعثِ رشک ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

حالی کے طرزِ تحریر کا عکس اگر کہیں صاف نظر آتا ہے تو وہ مولوی عبدالحق کے خطوط میں۔ ان کے یہاں وہی زبان کا چٹخارہ، بیان کی سادگی اور عبارت کی سبک روی ہے جو حالی کے خطوں میں ملتی ہے۔ ایک بات ان کے یہاں حالی سے مستزاد ہے۔ وہ ہے توانائی اور شگفتگی۔ اس میں ذکاوتِ حس۔ وسعتِ ذوق۔ ظرافت و ہمدردی۔ اثر آفرینی اور رجائیت شامل ہیں۔

۱؎ مکتوبات حالی، ج اول، ص ۹۵۔ ۲؎ مکاتیبِ حالی، ص ۳۸۔

مولوی عبدالحق کا نظریہ خطوں کے بارے میں

مولوی عبدالحق نے خطوں کے فن کو اچھی طرح سمجھا ہے اور اس کی ایک ایک ادا کو برتا ہے۔ وہ حالی کے خطوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادب میں سیکڑوں دلکشیاں ہیں۔ ان کی بے شمار راہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوں میں جو جادو ہے بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانہ میں زوال نہیں۔ بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں۔ یہ ہمارے خمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے...... خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے[۱]۔"

یہ جادو اور بے ریائی مولوی عبدالحق کے خطوں میں پوری طرح موجود ہے۔ یہ ان کے جذبات اور خیالات کا آئینہ ہیں اور ان سے ان کی سیرت اور گرد و پیش کے ماحول کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ خط "حسنِ اتفاق" کا نام ہے اور "حسن اتفاق" ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ ان میں معمولی معمولی باتیں اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں نہ ہوں تو کچھ نہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان لمحوں کو "زندگی سے چرا کر" ان کو جاوداں بنا دیا ہے۔

---

[۱] مقدمہ مکتوباتِ حالی، حصۂ اوّل۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنے بے مثل مضمون "حدیثِ دیگراں" میں لکھا ہے:

"مولوی عبدالحق صاحب ان بزرگوں میں ہیں جو انا الحق سے انا کو حذف کر دیتے ہیں[۱]

اور ان کو سمجھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ سرِ دلبراں کو حدیثِ دیگراں میں تلاش کیا جائے۔"

اس کے لیے نہ صرف ان کی تحریروں اور تنقیدوں کا مطالعہ ضروری ہے بلکہ ان کے نجی خطوں کو بھی دیکھنا چاہیے جن میں وہ خودی کے دونوں سروں یعنی خودنمائی اور خود پوشی کے بیچ میں جھولا کرتے ہیں[۲]

مکتوباتِ عبدالحق (قلمی)

اس وقت ہمارے سامنے مولوی عبدالحق کے اہم غیر مطبوعہ اور تین مطبوعہ خط ہیں[۳] جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) ۳۸ خطوط راقم الحروف کے نام۔ غیر مطبوعہ۔
(۲) ایک خط نجیب اشرف ندوی کے نام۔ غیر مطبوعہ۔
(۳) ۶ خط علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کے نام۔ غیر مطبوعہ۔
(۴) دو خط قاضی عبدالودود بیرسٹر کے نام۔ مطبوعہ۔
(۵) ایک خط سر مرزا اسماعیل کے نام۔ مطبوعہ۔
(۶) ایک خط افتخار احمد آفتاب کے نام۔ غیر مطبوعہ۔

مولوی صاحب نے جو خطوط راقم الحروف کے نام لکھے ہیں ان میں اردو لغت انجمن کی عمارت اردو نصاب انجمن کے حال اور مستقبل اور یونی ورسٹیوں کی تعلیم کے متعلق دلچسپ اشارے ہیں لیکن سب سے زیادہ دلچسپ وہ خط ہیں جن میں انھوں نے ایک تاجر رئیس کا ذکر کیا ہے۔

موصوف بہت مالدار آدمی تھے۔ قومی درد بھی رکھتے تھے اور مفید اداروں کی امداد بھی کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی بڑی قیمت وصول کرتے تھے عجیب عجیب چک پھیریاں

۱؎ مضامین عابد، ص ۱۰۴، ۱۰۵۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۰۹۔
۳؎ مکتوبات عبدالحق (غیر مطبوعہ) مرتبہ خواجہ احمد فاروقی

دیتے تھے اور ہر جگہ اپنے نام کی تختیاں آویزاں کرانا چاہتے تھے۔

ان رئیس کے تعلقات اپنے بیٹے سے اچھے نہیں تھے۔ وہ اپنے آپ کو شاہ جہاں کہتے تھے اور بیٹے کو اورنگ زیب۔ اسی کی ضد میں وہ مختلف اداروں کو روپیہ بانٹ رہے تھے۔

ان صاحب کا راقم الحروف پر غیر معمولی کرم تھا اور خیال تھا کہ وہ کوشش سے انجمن کو بھی ایک اچھی رقم دے دیں گے۔

مولوی عبدالحق ۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"ایک کمیٹی کے سلسلہ میں مجھے ۷۔ ۸ر جنوری ۱۹۴۶ء کو الٰہ آباد میں رہنا پڑے گا۔ کیا اچھا ہو کہ انھیں ایام میں یا ایک آدھ دن آگے پیچھے مجوزہ مشاعرہ سر تیج بہادر کی سرپرستی اور ..... کی صدارت میں ہو جائے۔ اس کے لئے ..... صاحب قدس سرہ العزیز کا عندیہ لینا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں سر تیج بہادر کو آمادہ کروں اور یہ خرناشخص عین وقت پر انکار کر دے۔ مہربانی کر کے اپنی رائے سے مطلع فرمائیے اور مشار الیہ سے بھی گفتگو کر کے دیکھ لیجئے۔ گفتگو کس انداز سے کی جائے یہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ وہ شاہ جہاں ہے اور آپ سعد اللہ خاں۔"

۲۶ر دسمبر ۱۹۴۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"ہر چند چاہا کہ ..... سے آنے کے بعد کچھ ان کی مدح میں لکھوں لیکن مجھ سے نہ بن پڑا۔ لوگ بھٹئی سمجھیں گے۔ کچھ دے نکلے تو پھر جو آپ فرمائیں گے لکھ دوں گا۔ خط لکھنے میں مضائقہ نہیں۔ آپ نے خط کا جو مسودہ بھیجا ہے اسے پڑھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ عبارت آرائی یہ فصاحت و بلاغت یہ بلند پردازی واللہ ابوالفضل یاد آ گیا۔ میں تو اگر پچاس سال اور مشق کروں تو ایسی پانچ سطریں بھی نہ لکھ سکوں گا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ یکم جنوری کا پرچہ تو چھپ گیا۔ اس میں گنجائش نہیں۔ میرا خط ملا ہو گا۔ ۵ر جنوری کی صبح کو ..... پہنچوں گا۔ مشاعرہ کی تجویز اور پختہ کر لیں گے۔ اس کے بعد الٰہ آباد جا کر سر تیج بہادر سپرو سے گفتگو کر کے کوئی تاریخ مقرر کر لی جائے گی ....."

۱۹ر جنوری ۱۹۴۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"ایک خط کل پہنچا اور ایک آج۔ بہت شکر گزار ہوں۔ حالت کچھ امید افزا معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے گفتگو بڑی خوبی اور ہوشیاری سے کی اور عین میری منشا کے مطابق۔ یہ شخص دوسروں کو تو الزام دیتا ہے مگر اپنی کڑی اور بے تکی شرطوں کو نہیں دیکھتا۔ آپ نے خوب کیا جو صاف کہہ دیا کہ چیک بلا شرط دیا جائے۔"

۲۵ر مئی ۱۹۴۶ء کے خط میں موصوف کے وعدۂ فردا سے تنگ آ کر لکھتے ہیں:

"مجھے افسوس اس کا نہیں کہ وہ واہی تباہی بک کر ہمیں ٹال رہا ہے اور وعدہ پورا کرتا نظر نہیں آتا کیونکہ مجھے شروع ہی سے اس کی طرف کچھ حسن ظن نہ تھا۔ میں ایسے بہت سے تماشے دیکھ چکا ہوں۔ میرے سامنے وعدوں کے ڈھیر ہیں۔ لیکن مجھے افسوس اور رنج اس امر کا ہے کہ میں نے اس ناہنجار کو سر سپرو سے ایسا خط لکھوایا۔ سر سپرو کی ہندوستان میں بہت بڑی شخصیت ہے، وہ معمولی آدمی نہیں ہیں۔ انھوں نے محض میرے لکھنے پر اسے ایسا اچھا خط لکھا اور اس نے پرواہ بھی نہ کی۔ اس کے بعد میں الہ آباد دوبارہ گیا لیکن شرم کے مارے ان سے ملا تک نہیں۔ اگر وہ پوچھ بیٹھتے تو کیا جواب دیتا۔ اب آپ صبر کر لیجئے اور اس کا خیال چھوڑیئے۔ اس سے ملنے ہی سے نہیں اس کے ذکر سے بھی ذلت محسوس ہوتی ہے۔ انا للہ....."

لیکن بالآخر پچیس ہزار وصول ہو گئے اور ہماری زبان دہلی مورخہ یکم اپریل ۱۹۴۷ء میں مخیر اعظم کا فوٹو اس عنوان کے ساتھ شائع ہوا۔

"مخیر اعظم جنھوں نے انجمن کے عمارت فنڈ میں ۲۵ ہزار روپیہ عنایت فرمائے۔"[۱]

ہندوستان و پاکستان کے الگ ہو جانے کے بعد موصوف نے اصرار کیا کہ ان کی شرائط پوری کی جائیں اور ان کے نام کا پتھر لگا دیا جائے۔ اس کے متعلق ۲۸ر فروری ۱۹۴۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

---

[۱] ہماری زبان دہلی، ج ۹، نمبر ۱، ص ۱۔

> "مجرِ اعظم کا خط میرے نام بھی آیا ہے۔ لکھتا ہے کہ میرے عطیہ کے متعلق جو وعدے کئے گئے تھے ان کی تکمیل میں دیر کیوں ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ الو کی دم فاختہ ایسے ہی شخصوں کے لئے کہا گیا ہے۔"

مولوی عبدالحق بے باک اور بے لاگ کام کرنے والوں میں ہیں۔ محشر خیال نہیں محض عمل۔ کوئی مصلحت، حالت کی کوئی تبدیلی، سود و زیاں کا کوئی اندیشہ، ان کی اس رائے میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی جو انھوں نے صحیح یا غلط قائم کر لی ہے۔ ۱۵ر فروری ۴۸ء کے خط میں لکھتے ہیں :

> "آپ میرا قیام زاہد حسین صاحب کے ہاں خلافِ مصلحت خیال فرماتے ہیں۔ میں ایسی مصلحت قابلِ التفات نہیں سمجھتا۔ اب مارچ میں کراچی میں جو کل پاکستان انجمن ترقی اُردو کا افتتاح کرنے والا ہوں۔ اور اس کا افتتاح غالباً قائد اعظم کریں گے تو اس اعتبار سے قابل دار ہو جاؤں گا۔ زاہد حسین صاحب ہائی کمشنر پاکستان سہی مگر وہ میرے عزیز قریب بھی ہیں۔ کیا میں چند کم نظر نو دولتوں کی خاطر اپنے دوستوں عزیزوں سے ملنا چھوڑ دوں۔ یو۔پی والوں کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے کبھی اپنے صوبہ پر ناز تھا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ایسے کم ہمت بزدل غافل کاہل بے حس شاید ہی کہیں ہوں۔"

مولوی عبدالحق نے مولانا محمد علی کے متعلق لکھا ہے[1]

> "وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت اور مروّت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا مگر بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔"

بعینہٖ یہی بات مولوی عبدالحق کے متعلق صحیح ہے۔ اسی جذباتی ہیجان کی وجہ سے وہ بعض اوقات علمی اور لسانیاتی مسائل میں بھی سختی اور ضد کا اظہار کرتے ہیں۔ راقم الحروف نے

---

[1] چند ہم عصر (طبع ثانی)

رسالہ نقوش لاہور کے آزادی نمبر میں لکھا تھا کہ وہ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۵ر جون ۱۹۴۸ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"مانتا ہوں کہ پاکستان کے کسی علاقے کی بھی مادری زبان اُردو نہیں لیکن جب میں پنجاب کو دیکھتا ہوں تو اس اعتراض کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رہتی۔ لاہور کے اخباروں اور رسالوں اور وہاں والوں کی پاکیزہ نظم و نثر دیکھ کر میری آنکھیں جھک جاتی ہیں اور مجھے رشک آنے لگتا ہے۔ کیا آپ کا صوبہ اس کے مقابلے میں کوئی اخبار یا رسالہ یا ان کی سی نظم و نثر اور ادبی و علمی کتابیں پیش کر سکتا ہے۔ دلّی کے بازاریوں اور لکھنؤ کے مرکیوں سے اس کی توقع عبث ہے۔ آپ اپنا دل خوش کرنے کو کہا کریں کہ اُردو کا مستقبل ہندوستان میں تاریک نہیں۔ وہ تو تاریک ہو چکا البتہ ہمیں اپنی سی کوشش کئے جانا چاہئے کہ کسی طرح وہ زندہ رہے......

جمنا اور گنگا کے کنارے اب آپ کے لئے نہیں۔ ایک پر گاندھی جی کی سمادھ ہے اور دوسرے پر پریاگ اور کاشی واقع ہیں۔ قلعۂ معلیٰ پر اب ہندی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اسے ڈنڈوت کیجئے۔

آپ کا کہنا صحیح ہے کہ حکومت کی سرپرستی اُردو کو کب حاصل تھی لیکن حکومت مخالف بھی تو نہ تھی۔ اور اب تو حکومت کے علاوہ ایک بہت بڑی اکثریت بھی اس کی مخالف ہے۔ پہلے یہ بات کب تھی .....

مجھے یاد نہیں کہ کان فرنس میں کسی نے اُردو کو اسلامی زبان کہا ہو لیکن اب وقت ایسا آ گیا ہے کہ یہ مسلمانوں ہی کی زبان ہو کے رہ جائے گی ....

پنڈت کیفی نے مجھے بمبئی سے ایک خط میں لکھا تھا کہ کفار بدکیش نے اُردو کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا ہے۔ انڈین یونین میں یہ زبان نہیں رہ سکتی۔ یہ اب پاکستان ہی میں فروغ پائے گی۔"

مولوی عبدالحق کے خطوں میں شعلہ افشانی بھی ہے اور چاک دامانی بھی جیسے دیوانگی

بھی ہے اور جنوں انگیز فرزانگی بھی۔ صبح کی صباحت بھی ہے اور جیٹھ کی دھوپ بھی زندگی کا کس بل بھی ہے اور پندار کی اکڑ بھی۔ سرانگشتِ حنائی کا تصور بھی ہے اور لہو کی بوند بھی۔ ان کی نیکیاں شورش و مستی سے معمور ہیں اور ان کی کامرانیاں سود و زیاں سے آسودہ حال۔ ان کا اسلوب حالی کے رنگ کی ارتقائی صورت اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔

(ب) محمد حسین آزاد۔ نذیر احمد۔ اکبر الہ آبادی اور اقبال

محمد حسین آزاد

سرسید کی تحریک اور ان کے اسلوب کو سب نے کلیتہً قبول نہیں کیا۔ مسیحائے اُردو[1] (۱) مولوی محمد حسین آزاد نے ان سے ہٹ کر ایک روش نکالی۔ ان کے اسلوب کی اگر کوئی تعریف مجمل طور پر ہو سکتی ہے تو ظہوری کی زبان میں صرف یہ کہ :

"ہر صفحش چمنے؛ ہر سطرے انجمنے۔ ہر حرفش فصلے۔ ہر فرعش اصلے۔"

ان کے خطوط کی طرف جب ہماری نگاہ شوق اٹھتی ہے تو توقعات کی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن یہ واقعہ بھی لطائف ادب میں شمار کیے جانے کے قابل ہے کہ یہ "مکتوبات" باندازۂ شوق" ہماری توقعات پوری نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ آزاد اس میدان میں درماندہ و عاجز ہیں بلکہ ان کے بہت سے خطوط ضائع ہو گئے اور جو ملے ہیں وہ بقول آغا محمد طاہر مرتب مکتوباتِ آزاد "چند بے سروپا۔ بے ترتیب سے خطوط ہیں" اور ان کو کل مجموعہ سے وہی نسبت ہے جو دریا کو قطرے سے ہے۔ اس کے باوجود ان خطوں کو قطعی طور پر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ان سے آزاد کی زندگی کے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ادبی زندگی۔ آبِ حیات

آزاد کی کتابوں میں آبِ حیات بہت اہم ہے۔ بہ اعتبار تنقیدی معلومات یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اور بہ اعتبار اسلوب نگارش آخری۔ کتاب کیا ہے سر تا سر موتیوں کی لڑی

---

[1] حالی نے آزاد کو مسیحائے اُردو کہا ہے۔

ہے جس کی آب و تاب ہماری تاریخ و تنقید کتنی ہی ترقی کرے ختم ہونے والی نہیں۔ یہ "نگارستان محبوبی" کس طرح مکمل ہوا۔ اس کی داستانِ تالیف و اشاعت خود آزاد کی زبان سے سُنیے:

"اے اہلِ وطن میں اس حال میں بھی (یعنی بندگی بیچارگی اور نوکری میں بھی) تمھیں بھولا نہیں۔ جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم سوتا تھا۔ اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے لکھتا تھا۔ اور رکھتا جاتا تھا۔ اسی میں یہ اوراقِ پریشاں نکالے اور آبِ حیات کا جام بنا کر تمھاری ضیافتِ طبع کے لیے حاضر کیا۔ اب افسوس ہے اور افسوس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں تھک گیا اور ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی، دل و دماغ فرسودہ ہو گئے۔"

آبِ حیات کے بعض حصے تنقید کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس کے بعض بیانات غلط اور مشکوک ہیں۔ ان چند در چند جانب داریوں اور غلط بیانیوں کے باوجود آبِ حیات کی اوّلیت اور اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا اس کے علاوہ تذکرہ کی اشاعت نے بہت سے شبہات اور شکوک کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔ ممکن ہے تذکرۂ خوش کے دستیاب ہونے سے چند اور غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں۔

دربارِ اکبری

آبِ حیات کی طرح آزاد نے دربارِ اکبری کے مواد کی فراہمی میں بھی بڑی محنت کی ہے اور ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ہے۔ علامہ آزاد میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے۔ مجھے کہاں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ماثر الامرا اور سوانحِ اکبری کسی زمانہ میں دیکھی تھی۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتہ لگا تھا۔ ۶ دن میں بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا۔ اور یادداشتیں لیتا گیا۔ ماثر الامرا بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور

قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے وہ ماثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو دربارِ اکبری کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو ماثر ہاتھ نہ آئی۔"[1]

مولانا حامد حسن قادری نے لکھا ہے :

"یہ تمام کتاب (دربار اکبری) ملا عبد القادر بدایونی کی تصنیف منتخب التواریخ پر مبنی ہے۔ بلکہ ملا صاحب کی تردید و تضحیک کے لیے لکھی گئی ہے۔ علامہ آزاد کو اکبر بادشاہ کی ذات و حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں۔ اس کے اس لیے مداح ہیں کہ وہ ابو الفضل فیضی، خانخاناں وغیرہ کا قدردان ہے۔ اور چونکہ ملا عبد القادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی اور اسلام کشی کو صداقت اور جوش کے ساتھ بیان کیا ہے اس لیے آزاد ملا صاحب سے بیزار ہیں۔"[2]

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) پوری دربارِ اکبری منتخب التواریخ پر مبنی ہے۔
(۲) یہ ملا صاحب کی تردید و تضحیک کے لیے لکھی گئی ہے۔
(۳) اکبر کی ذات اور حکومت سے آزاد کو کوئی خاص ہمدردی نہیں۔ یہ کتاب فیضی وغیرہ کی محبت اور بدایونی کی عداوت میں لکھی گئی ہے۔
(۴) آزاد، بدایونی سے اس وجہ سے بیزار ہیں کہ اس نے فیضی وغیرہ کی اسلام کشی اور زمانہ سازی کا ذکر کیا ہے۔
(۵) بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے وہ مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر صداقت اور جوش سے لکھا ہے۔

اس عبارت کے پہلے جزو سے بحث کی جا چکی ہے۔ دوسرے جزو کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ آزاد کے شوخ اور بیباک قلم نے بدایونی پر ضرور اعتراضات کیے ہیں لیکن

---

[1] مکتوباتِ آزاد (لاہور)۔ [2] داستانِ تاریخِ اردو، ص ۴۲۹۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کتاب لکھی ہی اس مقصد کے لیے گئی ہے کہ بدایونی کی تردید و تضحیک کی جائے۔ آبِ حیات میں آزاد نے غالب پر چوٹیں کی ہیں اور ذوق کی بے حد تعریف کی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آبِ حیات کا واحد مقصد تالیف غالب کی تضحیک اور ذوق کی توصیف ہے۔ اس قسم کی تعمیم اصولِ تحقیق و تنقید کے بالکل منافی ہوگی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ آزاد جیسے رنگین قلم انشاپرداز نے اکبر پر اس وجہ سے لکھنا پسند کیا کہ اس عہد کی تاریخ میں اس کو بہت سی رنگینیاں نظر آئیں۔ اکبر کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اتنا ہی رنگین دلچسپ اور نظر فریب ہے جتنا دولتِ عباسیہ کی تاریخ میں ہارون الرشید کا یا انگلستان کی تاریخ میں ملکہ ایلزبتھ کا۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں آزاد کا خامہ طاؤس رفتار زیادہ رعنائی اور دلکشی کا سامان فراہم کرسکتا تھا۔

یہ کہنا بھی انصاف سے بعید ہوگا کہ اکبر کی ذات اور حکومت سے آزاد کو کوئی خاص ہمدردی نہیں۔ اکبر کتاب کا ہیرو ہے جہاں کہیں آزاد نے اس کا ذکر کیا ہے نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ اگر تحریر میں یہ خلوص نہ ہوتا تو دربارِ اکبری کبھی بھی دلوں کو نہ لبھا سکتی۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ آزاد، بدایونی سے اس وجہ سے بیزار ہیں کہ اس نے فیضی وغیرہ کی اسلام کشی اور زمانہ سازی کا ذکر کیا ہے۔ اس بیان سے بالواسطہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آزاد نے اسلام کشی اور زمانہ سازی کی حمایت کی ہے۔ قادری صاحب نے ایک جگہ خود بھی یہی نتیجہ نکالا ہے۔ ادبیات آزاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آزاد نے اکبر کی بے دینی اور علماء کی توہین کو بہت سراہا ہے[1]" قادری صاحب کے الفاظ نامناسب ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزاد، بدایونی کی تنگ نظری اور تعصب سے ناراض ہیں۔ رہی بدایونی کی صداقت اور راستبازی اس کا طلسم بھی رفتہ رفتہ ٹوٹتا جاتا ہے۔ اس نے بہت سے واقعات کو تعصب کی عینک سے دیکھا ہے اور متعدد مباحث ایسے ہیں جن پر جذبات نے روغن چڑھا دیا ہے[2]۔

---

[1] داستانِ تاریخ اُردو، ص ۳۲۵۔

[2] شعر العجم حصہ سوم نیز A Bibliography of Moghul India by Sri Ram. P. 38.

لیکن یہ خیال غلط ہے کہ دربارِ اکبری تاریخ کی حیثیت سے بڑے مرتبے کی کتاب ہے۔ اس میں بعض واقعات کو افسانوی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور مصنف کی بیجا دخل اندازی اور جذبات کی نامناسب رنگ آمیزی نے ان کی اصل صورت کو چھپا دیا ہے۔ آزاد یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر تصنیف کے لیے خیالی رنگ مناسب نہیں ہے۔ ان کی "آبِ حیات" میں "نیرنگِ خیال" کا لطف ہے اور دربارِ اکبری میں آبِ حیات کا مزہ۔ وہ خود بھی اس کے معترف ہیں :

"دربارِ اکبری سات آٹھ سو صفحہ کی کتاب میں نے لکھی ہے۔ اس میں امرائے عہدِ اکبر کے حالات اس لطف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس طرح میر، سودا اور سید انشا کے حالات آپ نے آبِ حیات میں دیکھے ہیں۔"[1]

آزاد تاریخی حالات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان میں کلی پھندنے لگاتے جاتے ہیں۔ کہیں چٹکی لے لی۔ کہیں شوشہ لگا دیا۔ میجر سید حسن کو لکھتے ہیں :

"فیضی کے حال پر نظرِ ثانی کی تو مذہب کے سلسلہ میں مجھے خیال آیا تھا کہ دیکھئے آپ اور آپ کے بھائی صاحب اسے سن کر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں۔"[2]

ملّا عبدالقادر نے ابوالفضل کے حال میں لکھا ہے :

"و تفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق و نکات قرآنی دراں خیلے درج شدہ می گویند کہ تصنیف والدش بود گزرانیدہ عز تحسین یافت و تفسیر اکبری تاریخ آں شد۔"[3]

اس پر آزاد کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"مگر روئے حسد سیاہ تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو شوشہ لگا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہی ہے تو اس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا۔"[4]

---

[1] مکتوباتِ آزاد، ص ۹۰۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۔ [3] منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۹۸۔
[4] دربارِ اکبری، ص ۴۹۳۔

اس قسم کے جملے آزاد کے باوقار لٹریچر میں بدنما پیوند اور تاریخ نگاری کے آئین کے منافی ہیں۔

آزاد نے دربارِ اکبری چند در چند پریشانیوں کے عالم میں مرتب کی ہے۔ میجر صاحب کو ۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"وہ (آزاد) دربارِ اکبری لکھ رہا ہے۔ مگر اکیلا ہے۔ کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا کہ پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے جو ہم سے ہو سکتی ہے۔ ہم بھی کریں۔ میں درماندۂ تائید و تدبیر کیا کہوں کہ میرا کام سوا خدا مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد۔ چار بجے ہیں۔ صبح قریب ہے۔ وقت تو قبول کا ہے اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے[1]۔"

علامہ آزاد دربارِ اکبری کو سرسالار جنگ اوّل کے نام معنون کرنا چاہتے تھے میجر صاحب کے خط میں انتساب کی دو صورتوں کا ذکر کرتے ہیں :

"دو صورتیں یہ کہ ایک تو وہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا۔ مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویر موہوم ہے ..... اس کا مضمون یوں تصور فرمایئے کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اتر آئے۔ دسوں عقلیں پانچوں حواس غور و فکر وہم و خیال سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے دوربینیں اٹھائیں اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی مگر وہ ایوان عالی شان ...... وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو ایسی جسارت زیبا نہیں۔ آزاد نے کہا سحر کا نور شفق کی سرخی صبح کا عالم جب نظر آتا ہے اہل دل کہتے ہیں سبحان اللہ صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دل کہتا ہے صلِّ علیٰ۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۳۱۔

خود گل سے استمزاج کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح یہاں پایا۔ اسی کے دامن اقبال سے وابستہ کیا[1]"

لیکن یہ ارادہ ابھی خلوت کدۂ دماغ ہی میں تھا کہ سالار جنگ کا انتقال ہوگیا۔ آزاد میجر صاحب کو لکھتے ہیں :

"ہائے افسوس صد ہزار افسوس۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔ زمین تہ و بالا ہوگئی۔ خدا جانے کیا ہوا اور کیوں کر مر گئے[2]"

آزاد کو ذوق کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ غدر میں آزاد کے والد مولوی محمد باقر شہید ہوگئے اور انھیں دلی چھوڑنا پڑی۔ اس ہنگامہ دار و گیر اور شور نشور میں ہر طرف نفسا نفسی پڑی تھی لیکن آزاد کی ذوق کے ساتھ یہ محبت اور شیفتگی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ اس عالم میں بھی انھوں نے استاد کے کلام کا ورق ورق جمع کیا اور بستہ باندھ کر گھر سے نکل گئے۔

<u>دیوان ذوق</u>

آزاد نے ذوق کا دیوان ترتیب دے کر اُردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور ان کے کلام کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ اس سلسلے میں میجر صاحب کو یکم ستمبر ۱۸۸۸ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"میں نے سخن دان فارس کو نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہا کہ اب دربار اکبری کو سنبھالوں۔ مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیونکہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے بے موت مر جائے گا اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کیا ہوگا ان کے حال پر افسوس نہیں۔ یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے۔

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۹۔ [2] ایضاً، ص ۱۷۔

چنانچہ اس لیے اب اسے سنبھالا ہے اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقع پر کوئی تقریب کوئی معاملہ یا معرکہ خاص پیش آیا تھا وہ بھی نقل کر دوں۔ کیونکہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے۔ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا۔[1]

یہ دیوانِ ذوق کو مرتب کرنے کی دوسری کوشش تھی۔ سید ناصر نصیر فراق کے نام جو خط ۵ رجون ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کوشش رائیگاں ہو چکی تھی۔ استاد مرحوم کا دیوان ایک دفعہ مرتب کیا وہ ضائع ہو گیا اب فرصت پاؤں تو دوبارہ محنت کر دوں۔[2]

آزاد کے خطوں سے ان کی ادبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا انداز تحریر لاثانی اور ناقابلِ تقلید ہے۔ انتہائی خوبی ان کی انشا پردازی کی یہ ہے کہ سب اس کی خوبی کو مانتے ہیں لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ خوبی کیا ہے۔

ہر از نکتہ دریں کار و بار دلداری ست   کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری ست

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے یہ طرح داری اور بانکپن کہاں سے حاصل کیا۔ اس کا جواب خود ان کی زبان سے سنیئے۔ لالہ دولی چند کو لکھتے ہیں:

"انشا کا حقیقت میں تم کو وہم ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر باپ چاہے کہ بیٹے کو سکھاؤں اور اس میں مادہ نہ ہو تو کبھی نہیں بتا سکتا اور اگر اس میں مادہ قابل موجود ہے تو کتابیں بھی استاد کافی ہیں۔ میرے اوپر بھی جو کچھ تمھیں خیال ہے یہ فقط بھرم ہی بھرم ہے۔ میں نے اس کام کی کبھی اصلاح نہیں لی۔ نہ عربی میں نہ فارسی میں، ہاں اچھے اچھے صاحب کمالوں کے کلام دیکھتا رہا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک رنگ ایسا بے رنگ پیدا ہو گیا کہ سب سے الگ ہے۔ اب چاہے کوئی اسے بے رنگ کہے چاہے خوش رنگ

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۳۶، خط مورخہ یکم ستمبر ۱۸۹۸ء ۔ [2] ایضاً

بس یہی طریقہ اُستادی شاگردی کا ہے[1]۔"

آزاد تصنیف و تالیف کے کام میں بے حد محنت کرتے تھے اور اپنی کتابوں کو خونِ جگر سے سنوارتے تھے۔ وہ اپنا تمام وقت ادب کی خدمت میں بسر کر دینا چاہتے تھے۔ نوکری ان کے پاؤں میں ایک بیڑی تھی۔ ممتحن بننے اور کاپیوں کی جانچ پرتال سے انھیں سخت نفرت تھی۔ میجر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"فرصت کا حال یہ ہے کہ ۲۱ر جولائی کو یہاں امتحان ملازمت تھا۔ ۲، ۵ آدمی بیٹھے تھے۔ مجھے باوجود انکار کے فارسی کا ممتحن کیا۔ ۳ پرچے جس کے ۱۶ ، ۱۷ کاغذ دیکھنے پڑے ہیں۔ ایک پلنگ بھرا ہوا۔ دیکھتا ہوں اور لہو خشک ہو جاتا ہے کہ الٰہی یہ بوجھ کیوں کر اُٹھے گا۔ ۱۵ر اگست کو ریزلٹ دینا ہے۔ فرمائیے کہ اس چھٹی کا مزہ کیا ہوا۔ خدا گواہ ہے کہ بار بار انکار کیا۔ نہ قبول ہوا۔ ناچار

طفل بہ مکتب نمیرود و لے برندش[2]۔"

آزاد اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ جب ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی قائم ہوئی اور نظام تعلیمات میں ردوبدل ہوا تو آزاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ان کا کالج یونی ورسٹی کے ماتحت نہ ہو جائے اور ان کی جگہ تخفیف میں نہ آجائے۔ لیکن انھیں اس کی خوشی بھی تھی کہ اس طرح تصنیف و تالیف کے لیے زیادہ وقت ملے گا۔ میجر سید حسن کو ۱۰ر جنوری ۱۸۸۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"عام قاعدہ یہ ہے کہ مسلسل نوکری ۱۳ برس کی ہے اتنے مہینے کی تنخواہ لو اور سلام۔ اس تجویز کا عمل درآمد اپریل سے ہو جائے گا۔ اب خدا کی درگاہ سے امید ہے کہ تصنیفات کے لئے فرصت کا موقع ملا کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست[3]۔"

---

[1] مکتوباتِ آزاد، ص ۸۲ و ۸۳۔ [2] ایضاً، ص ۳۳۔
[3] ایضاً، ص ۱۴ و نیز ص ۳۱۔

آزاد کی طبیعت میں قناعت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ تھوڑے کو زیادہ پر ترجیح دیتے تھے۔ اگر اس میں انھیں ادبی خدمت کا موقع ملے۔ میجر صاحب ہی کو لکھتے ہیں :

"آپ دیکھتے ہیں یہ علم کی چڑیل (یونی ورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں سن لیجئے گا کہ نگل گئی ......

ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی عہدہ دے گی۔ خواہ سررشتہ تعلیم میں۔ خواہ سول لائن میں ..... لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو۔ تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو[1]"

مہاراجہ کشمیر ان سے اپنے خاندان کی تاریخ لکھوانا چاہتے تھے لیکن آزاد نے صاف انکار کر دیا۔

"میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان ان میں لگی ہوئی ہے۔ میں کسی کی کتاب لکھوں طمع کا منہ کالا ہے[2]"

اگلے خط میں لکھتے ہیں :

"آزاد روپیہ کا لالچی نہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے کئی دفعہ ممتحن کیا اور میں نے صاف انکار کر دیا[3]"

میجر صاحب نے آزاد کو لکھا کہ آب حیات کے نسخے فلاں فلاں صاحبوں کو بھیج دو۔ کچھ فائدہ ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"جن جن نسخوں کے لئے آپ نے ارقام فرمایا ہے بے شک حصولِ مقاصد اور مطلب برآری کا رستہ یہی ہے مگر کیا کروں کہ طبیعت ایسی واقع نہیں ہوئی میں ہمیشہ یک رخی بازی کھیلا ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے[4]"

میجر صاحب سے یہ پوچھنے کے بعد کہ آبِ حیات آپ نے بھی ملاحظہ فرمائی، لکھتے ہیں :

"(اس سے) کسی قسم کی طلب یا امید نہیں ہے۔ فقط اتنی ہی خوشی مطلوب ہے جو ہر مصنف کو اپنے کلام کے پھیلانے میں ہوتی ہے[5]"

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۱۵۔ [2] ایضاً، ص ۲۲۔ [3] ایضاً، ص ۲۳۔ [4] ایضاً، ص ۲۶۔ [5] ایضاً، ص ۲۸۔

پنشن کے ذیل میں پھر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے :

"نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونی ورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے ہیں۔ یہ ہے کیا تجبہ؟ آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت اس غلام زادہ کو آزاد کر کے وہ دست بردار نہیں ہوگی ......
خوشا بحال آزاد کہ ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجالائے گا اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

آہا۔ پھر انشا اللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگیٔ طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں[1]"

طریقۂ تصنیف و تالیف

ان خطوں سے آزاد کے طریقۂ تصنیف و تالیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ میجر صاحب کو لکھتے ہیں :

"تذکرۃ العورات کا حال آپ نے پہلے مرحمت نامہ میں لکھا تھا۔ معلوم نہیں کہ اس میں چاند بی بی کا بھی تذکرہ ہے یا نہیں۔ یہ بھی بڑی بالیاقت اور صاحب ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے اور اسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اس کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشا اللہ کبھی کام آئیں گے۔ اسی طرح مصالح اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"پھر یہی کہتا ہوں جو گھڑی اس کام میں صرف ہو جائے وہی غنیمت ہے۔ کاغذ گو پھیلے رہتے ہیں۔ آپ بیچ میں کبھی بیٹھا کبھی لیٹا رہتا ہوں اور کاٹ پھانس، کتر بیونت کئے جاتا ہوں۔ جو منشی میں نے رکھا تھا بہت خوب تھا۔

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۳۱۔

اس کے دادا اور پھر اس کے والد میرے والد مرحوم کے پاس تھے۔ اس کی سمجھ اور مزاولت اچھی تھی۔ ۱۵ پھر ۲۰ روپیہ مہینا اور کھانا وغیرہ ذمہ لیا اور بلا لیا۔ اس بھلے مانس کو تپ دق نکلی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد کچھ وہ گیا کچھ میں نے رخصت کر دیا۔ اب میں ہوں اور نامۂ اعمال[1]"

آزاد کے سامنے ادبی تصنیف کا ایک خاص معیار تھا۔ ذیل کے اقتباس سے خود ان کے "دل کا معاملہ" بھی کھل گیا ہے:

"میں نے اسے دیکھا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے ڈراما کے اصول کے بالکل مطابق لکھا ہے۔ اور نتیجہ بھی برجستہ نکالا ہے یعنی بڑھاپے کی شادی اور خصوصاً دوسری شادی کی تکلیفیں اور قباحتیں جتائی جاتی ہیں لیکن چوں کہ ابتدائی تصنیف ہے اس لئے تحریر میں پھیلاؤ اور بات کو بڑھانا اور مزے لے کر کہنا کوئی مصرع کوئی فقرۂ مقفیٰ کوئی لطیفہ کوئی چٹکلا وغیرہ وغیرہ یہ لطف ابھی نہیں پیدا ہوا[2]"

اس کے بعد ڈرامے کے متعلق لکھتے ہیں:

"عربی فارسی میں یہ شاخ انشا پردازی کی بالکل نہ تھی۔ بڑی بات ہے کہ زمینِ سخن میں ایک قلم تو لگائی شاخ و برگ بھی نکل آئیں گے گل پھول بھی کھل جائیں گے ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر زمانہ فرصت دے تو انشاءاللہ اُردو میں ایک ڈرامہ لکھ کر میں بھی نمونہ دوں گا۔ دل تو بہت کچھ چاہتا ہے مگر اکیلا آدمی اور بے سامان کیا کیا کچھ کرے۔

یک دل و خیلِ آرزو دل بہ کجا کجا نہم
سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم[3]"

آزاد کو کتابوں کا بے حد شوق تھا۔ انھیں بڑی سعی اور کوشش سے فراہم کرتے تھے اور اگر کوئی ضائع ہو جاتی تو اس کا نہایت ملال ہوتا۔ محمد دین صاحب کے نام جو خطوط ہیں ان میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ میاں غلام رسول نے آزاد کی الف لیلہ لے کر

[1] مکتوباتِ آزاد، ص ۲۶ - ۲۷۔ [2] ایضاً، ص ۴۱ - ۴۲۔ [3]

دبالی۔ اس بات کا انھیں بے حد رنج ہوا اور انھوں نے ضابطہ کی کارروائی بھی کرنا چاہی لیکن آخر میاں غلام رسول کی غریبی پر ترس کھا کر اس دعویٰ سے دست بردار ہو گئے۔ چنانچہ محمد دین صاحب کو لکھتے ہیں :

"اب فقط خدا سے دعویٰ ہے جس کا خزانہ بے شمار ہے اور کتب خانہ بے تعداد اور یقینِ واثق ہے کہ وہ دے گا اور ضرور دے گا اور بہت زیادہ دے گا۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔"[۵۹]

ادبی انہماک

آزاد ادبی کاموں میں نہایت مصروف اور مشغول رہتے تھے۔ اسی انہماک کی وجہ سے ان کی صحت پر بھی برا اثر پڑا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میرا حال یہ ہے کہ آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا ہوں اور ضعف نے نکما کر دیا ہے۔"

ان کی مصروفیت کی یہ انتہا تھی کہ انھوں نے اکثر خط رات کے تین بجے اور صبح کے چار بجے لکھے ہیں۔

آزاد کا اسلوب

آزاد کا اسلوب سخت ترین محنت اور اعلیٰ ترین تصوریت سے وجود میں آیا ہے۔ جس طرح گلاب کے پھول کا تجزیہ ممکن نہیں ہے اور یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی پنکھڑی دل میں سما جاتی ہے۔ ایسے ہی آزاد کا اسلوب نگارش ایسی گوناگوں دلآویزیوں کا مرقع ہے کہ اس کا احاطہ مختلف عنوانات کے تحت کرنا دشوار ہے تاہم مکاتیبِ آزاد کے جن خصائص امتیازی کا ذکر کیا جا سکتا ہے ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ گلاب کی خوشبو اور اس کا رنگ دوسرے پھولوں سے مختلف ہے۔

آزاد کا شمار اُردو نثر کے عناصرِ خمسہ میں ہے جس کے سرخیل سرسید احمد خاں ہیں۔ ان دونوں کے خاندانوں میں بڑا ارتباط اور اتحاد تھا۔ سرسید نے ایک خط اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ خلیفہ سید محمد حسین وزیرِ خارجہ ریاست پٹیالہ کو لکھتے ہیں :

"مولوی محمد حسین صاحب سے اور میرے خاندان سے ایک ربطِ خاص ہے۔
ان کے دادا اور میرے والد میں ایسی دوستی تھی کہ لوگ بھائی بھائی سمجھتے
تھے اور ان کے والد مولوی محمد باقر صاحب مرحوم سے مجھ سے اور خصوصاً
میرے بڑے بھائی مرحوم سے بہ سبب ہم عمری کے ایسا ہی ارتباط تھا۔
پس اگر سچ پوچھو تو مولوی محمد حسین صاحب میرے بھتیجے کے برابر ہیں مگر
چونکہ علم و فضل و نیکی و نیک ذاتی میں مجھ سے زیادہ ہیں اس لئے میں
ان کو مکرم و معظم اپنا سمجھتا ہوں[1]۔"

سرسید و آزاد کے اسلوب کا فرق

لیکن آزاد کا اسلوب سرسید سے مختلف ہے۔ وہ افادیت راستی اور دو ٹوک بات جو سرسید کے خطوں میں ہے آزاد کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں زلف کا سا پیچ و خم اور گہر کی سی آبداری ہے۔ بات کو مزے لے لے کر کہتے ہیں۔ کوئی مصرع کوئی فقرہ کوئی چٹکلا ضرور ہوتا ہے جس سے وہ عبارت کے حسن کو بڑھا دیتے ہیں۔ ادبی مصوری اور نازک کاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ میجر سید حسن کو جو خط انھوں نے انتساب کے متعلق لکھا ہے وہ زبان کی شیرینی اور طرز ادا کی بوقلمونی کی وجہ سے ایک نگارخانہ ہے۔ اسی طرح جزئیات نگاری پر بھی ان کو بڑی قدرت ہے۔ وہ واقعہ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ سارا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مہتمم پنجابی اخبار کو ایک واعظ کا حال لکھا ہے اور کہیں شوخی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

"اب کے ہولی کے بعد ایک عجیب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ یعنی قریب شام
میرا گزر مکان شکشہا سبھا کے آگے سے ہوا تو کچھ سواریاں باہر اور بہت سے
لوگ اندر جاتے ہوئے دکھائی دیے میں بھی مشتاق ہو کر اندر گیا۔ دیکھا
تو جلسہ کا سامان ہے ...... یہ بھی معلوم ہوا کہ جن کے لئے یہ سارا

---

[1] سرسید کا خط بنام مشیر الدولہ سید محمد حسین مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۷۳ء۔

کھٹراگ ہے ان کا انتظار ہے اور وہ ساڑھے سات بجے آئیں گے۔ لطف یہ ہوا کہ وہ صاحب خدا جانے دروازے میں کھڑے تھے یا صحن کے پیپل پر بیٹھے تھے کہ عین وقت معین پر دفعتہً دالان میں ہی بیٹھے نظر آئے۔ ہمارے خیال میں یہ تھا کہ وہ بھی ننگے سر آئیں گے مگر برخلاف اس کے کہ ان کے سر پر ابلق مخمل کی ٹوپی تھی بلکہ اس میں ایک طرہ بھی لٹکتا تھا۔ ان کا قد بہت چھوٹا سا چہرہ خشک رنگت جس قدر سخت سیاہ اتنے ہی کپڑے بہت اجلے۔ بغل میں اپنے ہی قد کے برابر کتاب پاؤں میں گرگابی۔ منہ پر فقط مونچھیں سر پر معمولی دو چار انگل بال تھے۔ مگر ٹوپی ان کی یہاں بھی نہ اتری۔ سیدھے آئے اور اپنے ٹھکانے پر جا کھڑے ہوئے ......
انھوں نے پہلے تو نیچے کے سُر سے کچھ کہنا شروع کیا کہ سب کے کان ادھر ہی لگ گئے کہ خدا جانے کیا اسرار کہتے ہیں۔ پیچھے سر جھکا اور سلسلہ چلا۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنے والے نے عبارت بری نہیں لکھ دی تھی پر بابو صاحب اسے اچھی طرح یاد کر کے نہ آئے تھے۔ جا بجا الجھتے تھے اور ٹھوکریں کھاتے تھے۔ خصوصاً چند فقروں کے بعد جب وہ کہتے تھے کہ اٹ فسٹسٹ اور دی فشٹ تو عجیب عالم ہوتا تھا جیسے مچھی کھاتے کھاتے منہ میں کانٹا آ جاتا ہے۔ کئی دفعہ لوگوں نے تالیاں بھی بجائیں مگر اکثر بے تال رہیں[1]۔"

آزاد واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ رات اور زلف کی کہانی معلوم ہوتی ہے اور افسانہ از افسانہ می خیزد ذیل کا خط انھوں نے جذب کی حالت میں مولوی ذکاءُ اللہ کو لکھا ہے لیکن طرزِ ادا کی دلفریبی وہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "چند خوش آب موتی ہیں جو نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر گئے ہیں" ملاحظہ ہو :

"لو بھئی اب آگے سنو۔ کل صبح کو میں بموجب معمول کے ہوا کھانے نکلا شہر کے باہر پہنچا تو دیکھتا ہوں ایک مرد مقدس متقی وضع پرہیزگار صورت جبہ

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۱۰۲ و ۱۰۳۔

پہنے ہیں۔ حاجیان عرب کا عمامہ سر پر ہے اور دانے کی تسبیح ہاتھ میں۔ آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرہ کو سفید داڑھی کے نور نے روشن کیا تھا جبہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ بھی ہیں۔ چونکہ بزرگوں کا ادب میری طبیعت میں خداداد ہے میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے میرا سلام لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی باوقار آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں ان سے محبت اور شفقت ٹپکتی ہے۔ بے اختیار آگے بڑھا اور مصافحہ کرکے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ چونکہ صبح کے وقت نور الٰہی کا جلوہ پھیلا ہوا تھا، دوسرے ان کی صورت اور لباس نے دل پر اثر کیا۔ اپنی بداعمالی اور دنیا کی سیہ کاری کا خیال کرکے ان سے عرض کی کہ مجھ روسیاہ کو کچھ نصیحت فرمائیں جو میرے کام آئے۔ وہ مسکرائے اور اس طرح میری طرف دیکھا کہ میرے دل و جان کو اپنا معتقد کرلیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم تمھارے حسن عقیدت سے بہت خوش ہوئے وہ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے اور میں نصف قدم ان سے پیچھے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا۔ چند لمحہ میں نے تامل کیا کیوں کہ ان کی متانت اور وقار مجھے زیادہ بولنے کی اجازت نہ دیتے تھے آخر پھر ہاتھ باندھ کر سوال کی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے فرمایا کہ قلم دوات تمھارے پاس ہے۔ عرض کی کہ نہیں۔ مگر جو کچھ آپ فرمائیں گے، بندہ صفحۂ دل پر نقش کرتا جائے گا . . . [1]"

آزاد جب زبان لکھتے ہیں تو کوثر میں دھلی ہوئی۔ سرسید کو لکھتے ہیں :

"آپ پیر و مرشد ہیں۔ سید ہیں۔ آلِ رسول ہیں اور سب کی بھلائی کے لئے محنت اور ہمت کرتے ہیں۔ یہ نذرانہ غریبانہ کے ماتھے کا پسینہ اور آنکھوں کا تیل ٹپکا کر جمع کیا ہے۔ آپ کے لائق نہیں لیکن ماں کا پان ہے اور سچے دل کی نیاز ہے[2]۔"

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۴۹ و ۵۰۔ [2] مکتوبات نیاز، ص ۹۳۔

آزاد نے جو تشبیہیں اور تلمیحیں اور استعارے استعمال کیے ہیں وہ موثر اور شاداب اور قریب الفہم ہیں اسی لیے دلکش ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں میجر صاحب کو لکھتے ہیں :

"یہ علم کی چڑیل (یونی ورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہے کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی۔ چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی۔"

آزاد دربارِ اکبری میں تصویریں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"دیکھیے تصویروں کے باب میں اتنا لکھا جناب سید صاحب نے جواب بھی نہ دیا۔ میں نے آٹھ دس تصویریں بہم پہنچائی ہیں جس طرح ہوگا انھیں سے اس گڑیا کو سنوار کر حاضر کردوں۔"

برہمو سماج کے واعظ کے متعلق جو خط ہے اس کا اقتباس اوپر گزر چکا ہے، اسی خط میں آگے لکھتے ہیں :

"جو جو باتیں مذاہب مذکورہ میں ثواب اور حسن عقلی کی معلوم ہوئیں وہ برہمو دھرم کا مال۔ باقی جو رہ گیا وہی بچوں کا کھیل کہ دودھ بھاتی منا کھائے بچی چپی چھی کو کو کھائے۔ اس پر وہ ناز کہ زمین و آسمان میں نہیں سماتا کہ جو میرے گھر سو راجہ کے نہیں[1]۔"

لالہ دونی چند کو لکھتے ہیں :

"یہاں کے جو حالات ہیں وہ ایسی پیچیدہ داستانیں ہیں کہ اگر شرح کشاف کو لفافہ کر کے بھیج دوں تو بھی سمجھ میں نہ آئیں[2]۔"

آزاد نے اپنے تخلص کو جا بجا ضمیر متکلم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ خصوصیت کچھ عجیب ہے اور خطوط میں جا بجا نظر آتی ہے مثلاً :

"کچھ دن تک پرلوس مقدس کا لاہور میں نزول رہا ایک عالم تہ و بالا تھا۔ آزاد بھی ان ہی کی گرفتاری میں رہا اس لئے نیاز نامہ نہ لکھ سکا۔"

میجر صاحب ہی کو لکھتے ہیں : "آپ یقین فرمائیے کہ آزاد روپیہ کا لالچی نہیں۔"

ایک اور موقع پر تحریر فرماتے ہیں :

---

[1] مکتوبات آزاد، ص ۱۰۳-۱۰۴۔ [2] ایضاً، ص ۷۹

"خوشا بحال آزاد کہ پچاس روپے بھی پنشن ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا
بجالائے گا اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔"

آزاد کے خطوں میں روانی اور بے تکلفی ہے۔ جس کی وجہ سے تحریر میں خلوص پیدا ہو گیا ہے اور مضمون کی دل پذیری بڑھ گئی ہے۔

دونی چند کو لکھتے ہیں:

"میاں میرے تم تدبیروں کے رستم ہو جو کوئی نہیں کرتا سو تم کر گزرتے ہو۔"

ایک اور خط میں لالہ صاحب ہی کو مخاطب کرتے ہیں:

"اجی آؤ صاحب آپ نے تو بڑی راہ دکھائی۔ میں نے تو جانا روٹھ گئے۔
اب دیکھئے کیوں کر ملیں گے۔ بارے الحمد للہ کہ آج ۲ کو خط آیا۔"

لالہ دونی چند نئے نئے تحصیلدار ہوئے تھے۔ لاہور آئے اور آزاد سے بغیر ملے چلے گئے۔ اس کی شکایت کرتے ہیں:

"تم لاہور میں آئے اور مجھ سے بے ملے چلے گئے۔ شاباش شاباش۔ خدا
تمھیں ایسا بڑا کرے کہ مجھے پہچان بھی نہ سکو۔"

آزاد کے خطوں میں القاب و آداب مختصر ہیں۔ مثلاً جناب من تسلیم۔ کہیں عالی جناب کا لفظ بھی ہے۔ بعض خطوں میں دعائیہ جملے بھی ہیں۔ مثلاً ادام اللہ اقبالکم وضاعف اجلالکم۔ لالہ دونی چند کے نام جو خط ہیں ان میں القاب نہایت بے تکلفانہ اور مختصر ہیں مثلاً صاحب۔ میاں میرے۔

آزاد کے خطوں میں زبان کی غلطیاں بھی ملتی ہیں مثلاً:

(۱) صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے مجھے فرمایا۔
(۲) میں نے کون سا پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے۔
(۳) صبح کے وقت انوار الٰہی نے جلوہ پھیلا ہوا تھا۔
(۴) آبرو کو چیچک نکل آئی۔

آزاد کا یہ عجیب کارنامہ ہے کہ انھوں نے حالت جذب میں بھی تصنیفات کا سلسلہ

جاری رکھا۔ فلسفہ الٰہیات سماک و نماک اور جانورستان اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ اس سے ان کا شوق تصنیف و تالیف کا ظاہر ہوتا ہے۔ جذب کی ابتدائی منزلوں میں انھوں نے جو خط مولوی ذکاؤاللہ کو لکھے ہیں وہ مکتوبات میں موجود ہیں۔ ان میں قلم نے لغزشیں کی ہیں لیکن جذبات و کیفیات کا اظہار بھی عجیب والہانہ انداز میں کیا ہے۔

"تھوڑی دیر آگے چل کر درختوں کی قطار نے سایہ ڈالنا شروع کیا۔ جاتے ہوئے جو ہوا سامنے سے زندگی دیتی تھی اب پشت پر ہوگئی تھی۔.... جو ہڑ کے کنارہ پر پہنچے تو ہوا کی لہریں پانی سے مباحثہ کر رہی تھیں۔ حکم ہوا کہ یہاں ٹھہرو اور ہوا تبدیل کر لو۔ لطفہائے مذکورہ کا اثر قوی ہوگا اور آنکھوں کی لذت نفع زائد ہے۔"[1]

شخصیت

یہ تو جذب و بے خودی کا انداز ہے لیکن آثار جنوں سے پہلے بھی وہ اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک طائر لاہوتی تھے جس کا مسکن اس دنیائے آب و گل میں نہیں ہے۔ یا ایک فرشتۂ ادب جو کچھ دیر کے لیے آسمان سے اتر آیا ہے۔

نذیر احمد (۱۹۱۲-۱۸۳۶ء)

مہدی افادی نے لکھا ہے کہ "انیسویں صدی کا پچھلا دور اردو کا نشاۃ الثانیہ ہے جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعہ خودرو تھا۔ منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطح امتیاز کے قریب قریب آپہنچ گئی۔ جہاں اردو کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکہ جما رہی تھیں۔"

یہ کام اقلیم سخن کی جن شریف ترہستیوں نے کیا ہے ان میں نذیر احمد کا نام کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اعلیٰ درجے کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں۔ لٹریچر کی جان ہیں۔ اس پر اضافہ کیجیے اردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

[1] مکتوبات آزاد، ص ۴۸۔

اسی مضمون میں آگے چل کر مہدی نے لکھا ہے :

"زمانہ کتنی ہی ترقی کرے اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کرسکتا جس کا کوئی رونگٹا بیکار نہیں۔ جہاں تک لائق ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے قوم کی آخری بہار تھی"[1]

مہدی نے یہ رائے نذیر احمد کی تمام تصانیف کو سامنے رکھ کر قائم کی ہے۔ اگر کسی طرح موخرالذکر کے وہ تمام خطوط جو انھوں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو مختلف اوقات میں لکھتے تھے مل جاتے تو اسی قسم کی رائے ان کے مکتوبات کے متعلق قائم کی جاتی۔

موعظۂ حسنہ کی حیثیت اور نوعیت

ان کی ظریفانہ نکتہ سنجیوں اور لائق ادب مشرقیت سے دلوں کا سرور اور آنکھوں کا نور بڑھ جاتا ہے لیکن ہمارے سامنے ان کے صرف وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے بیٹے کو موعظہ حسنہ کے نام سے لکھے ہیں۔ ان خطوں کی خاص حیثیت اور نوعیت ہے بقول محمد حسین آزاد :

"یہ ایک فاضل سن رسیدہ مصنف کے خط ہیں جس نے کاروبار زمانہ کو ہر حال میں دیکھا اور سمجھ کر دیکھا۔ برتا اور سمجھ کر برتا۔ ان میں عبارت آرائی یا ترتیب انشا کے لئے فرضی مطالب کو فقروں میں نہیں ڈھالا۔ اصلی خط ہیں کہ پیارے باپ نے پیارے فرزند کو سچی ضرورتوں اور واقعی مواقع پر بے تکلف عبارت میں کھلے دل سے تحریر کئے ہیں اس واسطے (موعظہ حسنہ) نوخیز جوانوں کے لئے نسخہ ہے تقویت دماغ۔ پرورش عقل اور ورزش فکر کا"[2]

انیسویں صدی کا تاریخی ماحول

مولوی نذیر احمد کے ان خطوں کو انیسویں صدی کے تاریخی ماحول سے الگ کرکے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس وقت کے ہندوستان اور عہد وکٹوریہ کے انگلستان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ جمہوریت دبے پاؤں آرہی تھی۔ اس کے قدموں کی آواز ان خطوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ پرانی روایات متزلزل ہورہی تھیں۔ ان کو قائم رکھنے اور

[1] افادات مہدی، اردو کے عناصر خمسہ۔ [2] موعظہ حسنہ، ص ۵

تباہی سے بچانے کی آرزو یہاں بھی موجود ہے۔ اخلاق اور آداب پر زور ہے۔ اس وقت عمل کی آزادیاں اور عقل کی آگاہیاں عام ہو چلی تھیں۔ ان کی روشنی میں تمام مسائل کو دوبارہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نذیر احمد کے خطوں میں بھی ہے۔ ہر چند کہ ان خطوں کا دائرہ وسیع نہیں لیکن یہ مصنف اور اس کے زمانہ کے سمجھنے میں ضرور معاون اور مددگار ہیں۔

مولوی نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم بڑی عسرت میں پرانے ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مشہور مضمون " نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" میں لکھا ہے :

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا..... مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے انگلیوں پر مارا۔"[1]

پھر ان کے والد نے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے (نذیر احمد) کا مرجانا منظور اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔ ان حالات میں جو کچھ انھوں نے پڑھ لیا وہ ان کا کمال تھا۔ ان ہی حالات نے ان کے دل میں سچی لیاقت اور محنت کی قدر بڑھا دی تھی اور وہ نئی تعلیم کی برکتوں کے قائل ہو گئے تھے۔ موعظہ حسنہ میں لکھتے ہیں :

"میں سرکاری تعلیم کا ایسا طرف دار نہیں ہوں کہ متعصبانہ اس کی حمایت کروں لیکن انگریزی کی بدترین تعلیم عربی کی بہترین تعلیم سے بہ استثنائے مذہب یقیناً عمدہ اور نافع ہے۔ عربی میں زبان اور منطق کے خیالی ڈھکوسلوں

---

[1] مضامین فرحت۔ نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی۔

کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ یورپ کو جو اس وقت معراج ترقی حاصل ہے
جانتے ہو کیوں ہے۔ ان لوگوں میں صرف یہ ہنر ہے کہ واقعات نفس الامری
میں تمام یورپ کی ہمتیں محصور ہیں۔ ہم لوگ خیالی مضمونوں کے پیچھے پڑے
رہتے اور آخر تک چکنی چپڑی باتیں بنانے اور جھوٹے بے اصل منصوبے باندھنے
کے کچھ نہیں سکیتے۔ جھوٹے القاب جھوٹے آداب جھوٹے اشتیاق۔ جھوٹی
تشبیہات جھوٹے استعارات ہمارا علم انشا ہے۔ شاعری جو کمال انشا ہے
اس میں معشوق وہ فرض کئے گئے جن کے کمر نہیں منھ نہیں جن کی زلفیں
سلسلۂ نامتناہی سے زیادہ دراز جن کے سرین پہاڑ، اگر ایسے معشوق
کہیں نظر پڑ جائیں تو لوگ ان کو بیچا اور بھوت سمجھیں[1]۔"

مشرق و مغرب کا آمیزہ

یہ رائے راجہ رام موہن رائے کی اس رائے سے ملتی جلتی ہے جس میں انھوں نے
مغربی علوم کی پُرزور الفاظ میں تعریف کی ہے لیکن مولوی نذیر احمد کورانہ تقلید کے
قائل نہیں تھے۔ حالی کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ مشرق اور مغرب کا آمیزہ تیار
ہونا چاہیے۔ انھوں نے نری انگریزی تعلیم پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی بھی کی ہے۔

"بشیر افسوس تم نے عربی نہ پڑھی۔ عجیب چیز ہے۔ نرے انگریزی داں
جہاں دیکھے بے تمیز اور مبہوت۔ نہ اپنی کہہ سکیں اور نہ دوسرے کی سمجھیں[2]۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"آج کل کے بی۔ اے، ایم۔ اے بات صاف تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کی
نظروں میں مطلق نہیں جچتے۔ محامل الفاظ اور تعلقات سابق ولاحق اور
عبارت کے اطراف وجوانب اور ضموں کے ...مالۂ وماعلیہ پر کبھی
ان کی نظر کو احاطہ کرتے نہ دیکھا۔ بس ان کی مثال اس غوطہ زن کی
سی ہے جس میں قعر دریا تک پہنچنے کا دم نہیں۔ ڈبکیاں لگاتا اور
در مطلب کو نہیں پاتا[3]۔"

---

[1] موعظۂ حسنہ، ص ۱۰۳ و ۱۰۴۔ [2] ایضاً، ص ۳۱۔ [3] ایضاً، ص ۱۲۵۔ ۱۲۶۔

یہ تنقید اس وقت تو صحیح تھی ہی۔ آج بھی صحیح ہے۔

مولوی نذیر احمد کو عربی سے بے انتہا محبت تھی اور اس کا بالواسطہ اثر ان کی انگریزی کی لیاقت پر بھی پڑا تھا۔

"مطالعے کی برکت تم کو اس سے ظاہر ہو جائے گی کہ مجھ کو ریڈ صاحب نے تعزیرات ہند کے ترجمے میں شریک کیا تو میری انگریزی استعداد اس قدر ناقص تھی کہ میں پینل کوڈ کی ایک سطر بھی بے مدد ڈکشنری نہیں سمجھ سکتا تھا اور ڈکشنری بھی وبسٹر کی نہیں بلکہ رومن اسکول کی ڈکشنری۔ مگر بات کیا تھی کہ طالب علمی کے مطالعے نے فکر کو ایسا غائر بنا دیا تھا کہ الفاظ کی جامعیت و مانعیت پر نظر خوب دوڑتی تھی۔ ریڈ صاحب اپنے پندار میں اس کو استعداد انگریزی کی عمدگی پر محمول کرتے تھے حالاں کہ جو کچھ تھا مطالعہ عربی کا طفیل تھا۔"[1]

نذیر احمد نے الہ آباد کی نوکری میں انگریزی سیکھی اور حیدر آباد کی ملازمت میں قرآن شریف حفظ کیا۔ پڑھنے لکھنے کا یہ شوق آخر زمانے تک رہا۔ اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں:

"اب جو میں سست اور کاہل ہو گیا ہوں تو اس وجہ سے کہ کوئی اختیاری تدبیر باقی نہیں ورنہ اس پیری میں بھی میری کتاب بینی جوان ہے۔ بار بار امتحان وکالت کو جی للچاتا ہے لیکن بیس برس کی خدمت اور تعزیر پر نظر کر کے ہمت قصور کرتی ہے۔ اب جو مجھ سے رہ گیا ہے تم کرو۔"[2]

مولوی نذیر احمد نے طرح طرح سے بیٹے کو نصیحتیں کی ہیں اور اس کو پڑھنے کا شوق دلایا ہے۔ کہیں سمجھایا ہے کہیں خفا ہوئے ہیں کہیں منت سماجت کی ہے کہیں غیرت دلائی ہے کہیں عزت کا واسطہ دیا ہے کہیں نام و نمود کا لالچ دیا ہے۔ غرض ان کا بس نہیں چلتا کہ سارا علم گھول کر پلا دیں۔ ساتویں [1] آٹھویں جماعت کے بچے کی بساط ہی کیا۔ لیکن اس معاملے میں انھوں نے وہ سخت گیری اور شدت برتی ہے جو اس زمانے کا خاص دستور تھا۔ ایک خط میں بیٹے کو سمجھاتے ہیں جو تعلیم

---

[1] موعظہ حسنہ، ص ۱۴۶ و ۱۴۷۔ [2] ایضاً، ص ۴۰۔

کی غرض سے باپ سے دور دہلی میں ہے۔

"میرا حال یہ ہے کہ ایک لمحہ طبیعت نہیں لگتی۔ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا اکیلا اداس بیٹھا رہتا ہوں اور حیرت میں ہوں اس طرح کی زندگی کیونکر اور کب تک بسر ہوگی۔ خدا کے لئے میرے اس حال پر رحم کرو یعنی جس غرض سے میں نے اس مصیبت کو اپنے اوپر گوارا کیا ہے اس مطلب کو فوت مت کرو۔ پڑھو اور محنت کرو اور دنیا میں نام اور نمود پیدا کرو۔"[1]

اگلے خط میں لکھتے ہیں :

"بشیر، قسم ہے خدا کی مجھ کو تمھاری آسائش جایز میں روپیہ خرچ کرنا ہرگز بار نہیں۔ تم مجھ پر جیسی سخت فرمائش چاہو کر دیکھو۔ ان شاء اللہ میں اس کو فی الفور بجا لاؤں گا۔ اس کے عوض تم میری صرف ایک فرمائش پوری کردو۔ وہ یہ کہ پڑھو اور لیاقت پیدا کرو۔"

یہ عجز و الحاح ملاحظہ ہو۔

"آدمی کے دل کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے۔ انسان کا بدن قید کیا جاسکتا ہے۔ اس کی آنکھ پر پٹی باندھ سکتے ہیں۔ کان میں روڑ ٹھونس سکتے ہیں۔ منہ پر مہر لگا سکتے ہیں پر دل کو قابو میں نہیں لا سکتے۔ بس نہ میں تم پر جبر کرتا نہ تاکید بلکہ بہ عجز و الحاح تم سے عرض کرتا ہوں کہ بشیر خدا کے لئے لیاقت پیدا کرو۔"[2]

خط نمبر ۳۴ میں بالکل دوسرا حربہ استعمال کیا ہے۔

"بشیر جہاں تک میں غور کرتا ہوں۔ دنیا میں اپنے رہنے کی ضرورت نہیں دیکھتا اور نہ دنیا میں کوئی کام مجھے کرنے کو ہے۔ نہ اب کوئی نیا علم میں حاصل کر سکتا (ہوں) اور نہ اب وہ اگلے ولولے میری طبیعت میں باقی ہیں۔ رہی خدا پرستی اس سے تو میں کوسوں دور رہا ہوں بس دنیا

---

[1] موعظۂ حسنہ، ص ۳۴۔ [2] ایضاً، ص ۶۰۔

کا کام اگر ہے تو یہ کہ تم میرے جیتے جی پڑھ لکھ کر فراغ حاصل کرو کہ میں تمھاری طرف سے حسرت لے کر نہ مروں اور مرتے وقت مجھ کو اس کی تسلی رہے کہ میرے بعد تم کو مطمئن زندگی کرنے کا سامان مہیا ہے۔[۱]

ایک دوسرے موقع پر اس طرح غیرت دلاتے ہیں :

"تم مجھ پر نظر مت کرو کہ میں ایک سگِ دنیا ہوں لیکن مجھ کو چھوڑ کر علم تمھاری دوھیال اور ننھیال کے لئے تمغائے شرف رہا ہے۔ کیا افسوس کی بات نہیں کہ تم خاندان علما میں ہو کر عربی میں خام رہو۔"[۲]

جب اس طرح بھی کام نہیں چلتا تو خفا ہوتے ہیں :

"تم نے ایسی خود رائی اختیار کی ہے کہ تم کو میرے کہنے کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ اگر یہی انگریزی ہے جو تم نے لکھی ہے تو لعنت بر ایں ہیچ۔"[۳]

آخر میں تنگ آ کر اپنے آپ کو کوستے ہیں :

"بشیر اگر تم پڑھنا نہیں چاہتے یا پڑھنا تمھاری قسمت میں نہیں ہے تو مجھ کو تم سے لڑنا منظور نہیں۔ تم جانو تمھارا کام جانے لیکن اے خدا مجھ کو اس مصیبت کے جھیلنے کو زندہ مت رکھیو کہ ایک اللہ آمین کا بیٹا اور وہ بھی جاہل یا کٹھ ملا۔"[۴]

بعض جگہ پند و موعظت کا اتنا شور ہے کہ اس کو پڑھ کر کوفت ہونے لگتی ہے اور بغاوت کو جی چاہتا ہے۔ قاری کو تو چھوڑیے۔ اس بچہ غریب پر کیا گزری ہوگی جس کو یہ خط لکھے گئے ہیں۔ اس کو یہ خط پڑھنا ہیں سمجھنا ہیں اور سمجھ کر ان پر عمل کرنا ہے۔ مولوی نذیر احمد نے بشیر کو ایک گھڑی بھیجی تھی، اس کے متعلق پانچ صفحوں میں نصیحتیں ہیں۔ ایسی گھڑی کی بچے کو کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

نذیر احمد کے خیالات و نظریات

مولوی نذیر احمد کا مطمح نظر تعلیم کے متعلق تھا بھی محدود اور فرسودہ سا۔ لکھتے ہیں:

---

[۱] موعظۂ حسنہ، ص ۷۰۔ [۲] ایضاً، ص ۴۹۔ [۳] ایضاً، ص ۲۹۔ [۴] ایضاً، ص ۱۰۸۔

"ہر زبان کی صرف و نحو بڑی اور مفید شے ہے اس پر زیادہ توجہ کرو۔ حساب کی
کتاب جو تم پڑھتے ہو اس کی عبارت بھی سبقاً سبقاً پڑھنی چاہیئے۔ تم اعمال
مشق کرتے ہو اور مطالب کتاب سے مطلق بے خبر"[1]

ان کے پیشِ نظر جو تعلیمی مقصد تھا وہ صرف نام و نمود اور دولت جس کا اظہار انھوں نے جا بجا کیا ہے "بشیر (تعلیم کا خرچ) تجارت راجعہ ہے"

"اے بشیر پیارے بشیر۔ پڑھو اور دنیا میں نام و نمود پیدا کرو"[2]

اسی قسم کی تنگ خیالی انھوں نے عورتوں کے متعلق بھی ظاہر کی ہے لیکن یہ رائے تقریباً وہی ہے جو اس زمانے میں سب کی تھی۔

عورتیں بوجہ نقصان عمل و جہل و ناوانی کے ممکن نہیں کہ امور دنیاداری کی تنہا متکفل ہو سکیں۔ یہی سبب ہے کہ مردوں کو ان پر غلبہ ضرور ہے[3]

مولوی نذیر احمد تعلیم اور زندگی کو نام و نمود شہرت اور دولت سے ناپتے تھے۔ بیٹے کو لکھتے ہیں:

"خدا کرے تم کو بھی اس کا خیال ہو کہ تم کو اقران و امثال میں نمود و امتیاز
پیدا کرنے کی کس قدر ضرورت ہے"

اپنے خاندان والوں کی غربت اور گم نامی سے اپنی دولت اور شہرت کا مقابلہ کرتے ہیں۔

"تمول کے اعتبار سے اپنے خاندان کے ہاتھ میں وہ لمبوتری انگلی میں ہوں۔
نہ آپ خوش رہ سکتا ہوں اور نہ اوروں کو خوش رکھ سکتا ہوں"

انھیں اپنے اعزا سے یہ شکایت تھی کہ وہ ان کی دولت کو بڑھانے میں اور زمینداری یا تجارت کے ذریعے اسے ترقی دینے میں مدد نہیں کرتے۔

"ان لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ میرے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں"

مولوی نذیر احمد اپنی بچت کا روپیہ پرامیسری نوٹ کی شکل میں جمع رکھتے تھے اور نفع اندوزی کا حال یہ تھا کہ نوٹ بینک میں رکھ کر قرض سے کام چلاتے تھے۔ اسی لیے ان کی اولاد اور بیوی کو ان کے بخل سے شکایت تھی۔

---

[1]: موعظہ حسنہ ص۔ ۲۵ [2]: ایضاً ص۔ ۸۲ [3]: ایضاً ص۔ ۱۳۰

لیکن مولوی نذیر احمد جب گھر کی تنگ فضا سے نکل کر باہر کی کھلی ہوئی فضا پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی نظر میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخیں جو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں ان کے متعلق فرماتے ہیں :

"مجھ سے اور سررشتۂ تعلیم کے کسی افسر سے اگر کبھی ملاقات کا اتفاق ہوا تو میں ضرور اس سے کہہ کر رہوں گا کہ ایسی تاریخیں بناؤ یا بفرمائش بنواؤ اور مدارس میں پھیلاؤ کہ یہ دونوں قومیں (ہندو مسلمان) پچھلی نااتفاقیوں کو بھلا کر آیندہ صلح کاری سے زندگی بسر کریں۔"[1]

مولوی نذیر احمد کو دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے اور اس کا احترام کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"یہ خیال کرنا بڑی بے انصافی اور ہٹ دھرمی کی بات ہے کہ دوسری قوموں کے رسم و رواج عموماً لغو و بے ہودہ ہیں اور اس سے بڑھ کر بے انصافی اور ہٹ دھرمی کی بات یہ ہے کہ کسی دوسری قوم کے آدمی سے نفرت کی جائے یا اس کو نظر حقارت سے دیکھا جائے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ دوسری قوم کا ہے۔ ہم کو ہندوؤں کے ساتھ بڑا قوی تعلق ہے جس کی لوگ کیسی عمدہ تشبیہہ دیتے ہیں کہ ہمارا ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارا ان کا ایک جگہ رہنا سہنا ملنا جلنا لین دین پشت ہا پشت اور سینکڑوں برس کا ہے۔ ہم آپس میں لڑیں یا جھگڑیں روٹھیں یا بگڑیں مگر کہلائیں گے ہندوستانی۔"[2]

ہندوؤں کے رسم و رواج کے متعلق لکھتے ہیں :

"سب سے پہلے گائے بیل کی بزرگ داشت سے چلو۔ ان منفعتوں پر نظر کرو جو بنی نوع انسان کو اس جانور سے پہنچتی ہیں۔ تو دنیا کا کوئی جانور اتنا بہ کار آمد نہیں۔ سب پر مقدم کاشت کاری کہ اس میں جتنے کام مشقت کے ہیں، تمامہا اسی جانور سے لئے جاتے ہیں۔ سواری، بار برداری، دودھ گھی یہاں تک کہ مرے پیچھے بھی ہڈی چمڑا سینگ کوئی چیز بے مصرف نہیں۔

[1] موعظہ حسنہ، ص ۱۵۲۔ [2] ایضاً، ص ۱۵۲۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص نے ہندوستان میں اس جانور کی بزرگ داشت کا قاعدہ جاری کیا' بڑا ہی دانش مند اور عاقبت اندیش ہو گزرا ہے۔ اس نے ملکی ضرورت پر نظر کی اور یہ بھی سمجھا کہ تاوقتیکہ داخل احکام مذہبی نہ جائے پوری پوری بزرگ داشت ممکن نہیں۔

اسی طرح گنگا جمنا کی تعظیم بھی بے اصل نہیں۔ میں اپنے نفس پر قیاس کرتا ہوں کہ مجھ کو بجنور کے تعلق سے گنگا کے ساتھ ایک انس خاص ہے۔ جب کبھی عبور کا اتفاق ہوتا ہے پیاس نہ بھی ہو تو بے اختیار اس ہاضم اور شفاف اور سبز پانی کو جی چاہنے لگتا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ نماز کا وقت نہیں ہے اور میں ٹھہرا رہا ہوں کہ دریا کے پانی گنگا جل سے اشنان نہیں وضو کر کے دو رکعت پڑھ لوں تو چلوں۔ ہندوستان کی کروڑوں بیگھہ زمین گنگا اور جمنا سے سیراب ہوتی ہے۔ معلوم ہے کہ پانی محاسن قدرت میں سے ہے اور لوگ مصنوعی تالابوں اور نہروں سے جی جوش کر لیتے ہیں تو کیا گنگا جمنا ان سے بھی گئی گزری ہوئیں۔ ملک کی گرمی اور آب و ہوا کے لحاظ سے ہندوؤں میں ہر روز کے غسل (اشنان) کا قاعدہ بھی پسند کرنے کے قابل ہے۔"[1]

اسی طرح ترکاریاں کھانے کے متعلق لکھتے ہیں:

"یورپ میں ڈاکٹروں کا اجماع نہیں غلبہ اس طرف ضرور ہے کہ انسان کو خدا نے گوشت کھانے کے لئے نہیں بنایا کیوں کہ اس کام کے لئے نہ تو اس کے دانت مناسب ہیں نہ معدہ۔"

چھوت کے متعلق لکھتے ہیں:

"آدمی کا جھوٹا آدمی کو طبعاً مضر ہے۔" (ص ۱۵۴)

انگریزی تمدّن کے متعلق نذیر احمد کی رائے

نذیر احمد نے اپنی قوم کے زوال اور انگریزی قوم کی ترقی پر بھی غائر نظر ڈالی تھی۔ ان کی نظر انگریزی تمدّن کی رنگینیوں میں الجھ کر نہیں رہ گئی تھی بلکہ انھوں نے اُن

[1] موعظۂ حسنہ، ص ۱۵۲ و ۱۵۳۔

حقیقی اسباب کو تلاش کیا تھا جو ایک کے زوال اور دوسرے کی ترقی کا باعث بنے تھے۔ بے تہہ انگریزی خوانوں کے متعلق لکھتے ہیں :

"ہماری آنکھ میں ناخنہ ہے تو ان کے ٹینٹ۔ ہم کانڑے ہیں تو وہ اندھے۔ ہم ہکلے ہیں تو وہ گونگے .... ارے عقل کے دشمنوں انگریزوں کی وہ صفتیں ہی دوسری ہیں جو ان کی ترقی کا سبب واقع ہوئی ہیں۔ محنت، جفاکشی، تفتیش و تلاش، استقلال، ضبطِ اوقات۔ توعلوم جدید میں توغل۔ قومی اتفاق"[1]

وہ انگریزی تمدن سے مرعوب نہیں تھے۔ اور اپنی اچھی اور کارآمد چیزوں کو کسی حال چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

"ایک حکایت اور اینڈ دی انگلش ڈنراز اوور۔ غدر سے پہلے امرا شاہی میں سے کسی امیر نے دہلی کالج کے پرنسپل کی دعوت کی۔ کھانے کی بہنگیاں بھجوا دیں۔ انگریزی قاعدے سے کھانا میز پر چنا جا چکا تو آدمی نے صاحب کو اطلاع دی۔ ہر قسم کا کھانا میٹھا سلونا شاہی رکاب داروں نے پکایا تھا اور دعوت تھی تو بلاشبہ اہتمام بھی ضرور ہوا ہوگا۔ سبحان اللہ اس کے ذائقہ کا کیا پوچھنا ہے۔ جس وقت سے کھانا آیا ساری کوٹھی مہک اٹھی تھی۔ مگر پیچھے سنا کہ جوں صاحب نے کھانے کے کمرہ کے اندر پاؤں رکھا اور مشک زعفران اور کیوڑے کی بھبک آئی۔ الٹے پاؤں باہر نکل آئے۔ اور کھانا کیسا انھوں نے آنکھ بھر کھانے کی طرف کو دیکھا تک بھی تو نہیں .... انگریز اپنی تمام حالتوں میں نمایاں ترقی کر رہے ہیں اور اپنے طرزِ تمدن کی اصلاح سے بھی غافل نہیں۔ بایں ہمہ یہ فرض کر لینا کہ ان کا تمدن اعلیٰ درجے کی شائستگی کو پہنچ گیا ہے فرض غلط ہے"[2]

علمی بحثیں

مولوی نذیر احمد نے ان خطوں میں علمی بحثیں بھی کی ہیں اور املا اور کتابت کے اصول

۱؎ موعظہ حسنہ، ص ۱۵۹۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۶۶ و ۱۶۷۔

سمجھائے ہیں۔ گول ۃ کے متعلق لکھتے ہیں :

"سوائے الفاظ عربی کے گول ۃ لکھنی روا نہیں کیوں کہ یہ رسم الخط عربی کی ہے[1]۔ خدمت بھی بہ قاعدۂ رسم الخط غلط۔ جتنی تا ر زائدہ ہیں سب گول ۃ یا چھوٹی لکھنی چاہئیں[2]"

ترک واؤ کے متعلق لکھتے ہیں :

"حرکات بالحروف اُردو میں نہیں تو اوس بالواؤ کیوں ہو اور اوس ہو تو اس کی جگہ ایس کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اٹھانا وغیرہ۔ ایک غلط دستور واؤ لکھنے کا رواج پا گیا ہے[3]"

املا کے متعلق ہدایت ملاحظہ ہو :

"تم نے ایک خط میں جنابمن لکھا۔ جناب اور من دو کلمے جداگانہ ہیں۔ ان کا ملانا خلاف قاعدہ ہے[4]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"میں طیار اور طوطا کو روبراہ سمجھتا ہوں۔ ہندی لفظ میں جس کا ماخذ عربی میں نہیں۔ فارسی میں طوطی دوسرا جانور ہے لیکن اگر کوئی تُوتا اور تیار لکھ دے تو غلط نہیں کہا جا سکتا ہے[5]"

نذیر احمد کے سامنے مراسلت کے خاص اصول تھے اور وہ پرانی روش کے تحت مخالف تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ہمارے یہاں بیسیوں انشائیں صرف القاب آداب معمولی خیر و عافیت رسمی شوق و انتظار کے لئے پڑھنی پڑتی ہیں۔ پھر اونٹ بے اونٹ تری کون سی کل سیدھی۔ طرزِ مراسلت ایسا بگڑا ہے کہ بچپن سے عادتیں پڑی ہوئی ہیں۔ اس سے احساس نہیں ہوتا ورنہ آدھا جھوٹ اور باقی آدھے

---

[1] موعظہ حسنہ، ص ۵۵۔ [2] ایضاً، ص ۴۹۔ [3] ایضاً، ص ۴۰۔
[4] ایضاً، ص ۵۱ [5] ایضاً، ص ۵۳۔

میں اپنی تذلیل بے سبب مخاطب کی مدح بلا استحقاق ۔"

انگریزی کا اثر

انگریزی نے جو اُردو انشا پر اثر ڈالا تھا اسے وہ اُردو کے حق میں فالِ نیک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فارسی کی تقلید کی وجہ سے یہ بچہ جوان ہونے سے پہلے بوڑھا ہوگیا اور ہمارے ادب میں کچھ ایسی خرابیاں پیدا ہوگئیں جن کا دور ہونا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں :

"اپنا تو مقولہ یہ ہے کہ فارسی لٹریچر نے ہماری تہذیب کو بالکل برباد کر دیا تھا اب اُردو پر انگریزی رنگ آتا چلا ہے۔ زبان مبالغے اور ابتذال کے عیوب سے بہت پاک ہوگئی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ سیدھی اور صاف بات میں لوگوں کو مزہ ملنے لگا ہے[1]۔"

اسلوب

ان کی عبارت برجستہ ہوتی ہے لیکن بعض جگہ ثقل سے خالی نہیں ہے۔ طرزِ تحریر مضبوط اور موثر ہے۔ بات اس طرح کہتے ہیں کہ دل میں اُتر جاتی ہے۔ بقول حامد حسن قادری ان کے موجد اور صاحبِ طرز ہونے میں شبہ نہیں۔

ان خطوں میں مولوی نذیر احمد نے تفریحی مسائل اور انضباطِ خیال کے ساتھ موضوعِ سخن کے حدود کو قائم رکھا ہے اور انشا پردازی کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔

بیٹے کو خط کے دیر ہونے پر لکھتے ہیں :

"آج ایک ہفتہ کے بعد تمھارا خط ملا ہے۔ جو شخص تمھاری طرح ایسے مکان میں رہتا ہو کہ وہاں سارے سارے دن کان پڑی آواز نہ سن پڑے۔ اس کو اس بات کا یقین کرنا سخت مشکل ہے کہ دنیا میں لوگ خط کے منتظر بھی رہا کرتے ہیں[2]۔"

ان کے خطوں میں ایک بے ساختہ پن ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں اس کی تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ محسن الملک کے متعلق لکھتے ہیں :

---

[1] موعظہ حسنہ، ص ۱۵۷ و ۱۵۸۔ [2] ایضاً، ص ۳۵۔

"(آگرہ میں) منشی غلام غوث صاحب کے یہاں میں نے مولوی مہدی علی صاحب کو دیکھا ایک جوان صبیح بے باکانہ مراۃ العروس کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ جوں میں خیمے میں پہنچا منشی غلام غوث صاحب نے کہا لیجئے حضرت مراۃ العروس کے مصنف صاحب بھی تشریف لائے۔ منشی غلام غوث صاحب کی تقریب سے ہم دونوں ملے تو مولوی مہدی علی صاحب منقبض سے رہے شاید ہنسی اڑانے سے کچھ جھینپے ہوں۔"[1]

یہ تشبیہ ملاحظہ ہو، کتنی مکمل ہے:

"طالب یعنی امیدوار خدمت کو چاہئے کہ بمنزلہ کنکوے کے ہو جس میں پرواز کا مادہ مہیا اور صرف ایک 'دریائی' کا محتاج ہے۔"[2]

یہ انداز محمد حسین آزاد سے مختلف ہے۔ اس میں وہ رنگینی نہیں لیکن دل نشینی ہے۔

نذیر احمد کے خطوں میں زبان کے محاورے کا بھی لطف ہے۔ خطوں کے تانے بانے چونکہ باتوں سے بنے جاتے ہیں اس لیے ان میں روزمرہ کی چاشنی لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"مکان کو چھنکاؤ۔ مجھ کو بہت آخور کی بھرتی پسند نہیں۔"[3]

"مسلمان جن پر انگریزی کی سنوار ہے وہ انگریزوں سے بڑھ کر پردے کی برائیوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔"[4]

نذیر احمد کے یہاں بے ساختگی اور برجستگی سلسلۂ بیان میں جذب ہو جاتی ہے۔ ان کا زورِ بیان اس بلا کا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چشمہ ہے جو پہاڑوں سے پھوٹ نکلا ہے۔

"ہماری بیبیاں بلا سے پھوہڑ ہوں۔ بے ہنر ہوں۔ بے سلیقہ ہوں۔ بے علم ہوں کہ بچوں کا ہاتھ منہ دھلانے، پھٹا ادھڑا سینے، روٹی دال پکانے کے

---

[1] موعظہ حسنہ، ص ۹۸۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۲۔ [3] ایضاً، ص ۱۰۲۔
[4] ایضاً، ص ۱۶۲۔

سوائے اور کچھ نہ جانتی ہوں۔ ساری دنیا میں وکٹوریہ کی جوبلی کا غل ہوا
اور ان کو خاک خبر نہ ہو۔ سوڈان اور بلغاریہ اور برہما کے نام تک ان
کو معلوم نہ ہوں۔ روس کے جھگڑے اور ٹنٹے ان کے کانوں تک نہ پہنچے ہوں
غرض ہماری بیبیاں جانور ہوں، پتھر ہوں بلکہ ان سے بھی بدتر ہوں
ہم کو قبول ہے[1]

مولوی نذیر احمد کے یہاں خطیبانہ بلند آہنگی ہے۔ عبارت میں مضبوطی، قوت اور ایک انفرادی شان ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ ظرافت جو ان کی طرزِ تحریر کی بڑی خصوصیت ہے ان خطوں میں بہت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ خط بڑھاپے میں لکھے گئے ہیں۔ وہ خود اس کے معترف ہیں کہ" وہ اگلی سی گدگدی مجھ میں باقی نہیں[2]۔" دوسرے یہ خط اپنے بیٹے کو لکھے گئے ہیں اور اس زمانے میں بچوں کے ساتھ سنجیدگی ہی سے گفتگو کی جاتی تھی۔

نذیر احمد کے خطوط تاریخ ادب میں نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ ان میں ہندی کی چاشنی انگریزی کی راستی اور عربی کا جوشیلا پن ہے۔ اسی طرزِ تحریر کے سہارے ان کی اکثر نصیحتیں حلق کے نیچے اُتر جاتی ہیں۔ یہ خطوط لکھنے والے کے ذوق و رجحان کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اکلوتے بیٹے کے سامنے انھوں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے اور اپنی چھپی ہوئی تمناؤں اور آرزوؤں کے سامنے سے بھی نقاب ہٹا دیا ہے۔ ان کی سیرت اور شخصیت میں مضبوط ہوش و خرد امثال و اقران میں نام و نمود دنیوی زیرکی اور عقل معاش کی جو اہمیت تھی اس پر اتنی اچھی روشنی اور کسی ذریعے سے نہیں پڑتی۔

مولوی نذیر احمد نے زبان اُردو اور محاورۂ دہلی پر خاص زور دیا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں میر ناصر علی خاں کے یہاں یہ رنگ کم اور مولوی سید احمد اور ناصر نذیر فراق کے یہاں زیادہ ہے۔ آغا شاعر، راشد الخیری، آغا حیدر حسن، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ عبدالمجید اور خواجہ محمد شفیع کے یہاں جو عمارت ہے اس کی بنیاد بھی یہی ہے۔ یہ اسلوب بلاشبہ دلکش اور دلآویز ہے لیکن اس کے برتنے کے لیے بڑے سلیقے اور لیاقت کی ضرورت ہے۔

[1] موعظۂ حسنہ، ص ۱۴۳۔ [2] ایضاً، ص ۱۰۱۔

مولوی سیّد احمد صاحب فرہنگِ آصفیہ

مولوی سیّد احمد صاحب فرہنگِ آصفیہ لفظوں اور محاوروں کی نوک پلک سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کو خدا نے وہ حسن تناسب بھی دیا تھا جو اچھے ادب کی لازمی شرط ہے۔ ان کا یہ خط ملاحظہ ہو۔

"ابھی دادی جان تمھارے قربان۔ یہ تو کہو تم نے اب کی عید میں میرے واسطے کیا بنایا ہے جو بی آپا ایک ایک سے کہتی پھرتی ہیں کہ صاحب چاہیتی پوتی کے نئے جھمجھماتے گوٹے کناری کے کپڑے گھنگھروں کی ناٹ بانی جوتی ہاتھوں کے کنگن پاؤں کے لچھے بنوائے گئے ہیں، جب میں نے کہا اور بی تمھارے واسطے تو بولیں بوا ہمسار غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ بھلا دادی جان اس میں جلنے کی کیا بات تھی۔ چھوٹوں کو تو سب ہی چاہا کرتے ہیں۔ انھیں اتنی بڑی بیوی کو کون پیار کرے۔ تم دیکھنا جب میں لال لال کپڑے اور گہنا پہن کر چھم چھم کرتی ہوئی عید کے دن آداب کو آؤں گی اور ڈھیر سے عیدی کے روپے لے کر جاؤں گی تو کتنا انگاروں پر لوٹیں گی۔

فقط۔ اصغری بیگم[1]"

یہ اقتباس سیّد احمد دہلوی کی ہادی النسا سے لیا گیا ہے جو انھوں نے ۱۸۷۵ء میں ڈاکٹر فالن کی فرمائش سے لکھی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خط اصلی اور واقعی نہیں ہے لیکن اس کے محاورے ایسے برمحل فقرے ایسے برجستہ اور اس کی عبارت ایسی رواں اور شگفتہ ہے کہ اس کے اوپر اصلی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

مولوی بشیر الدین احمد

عورتوں کے لیے خطوط مولوی نذیر احمد کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین احمد نے بھی لکھے ہیں[2] لیکن ان میں وہ فصاحت اور سحر کاری نہیں ہے جو مولوی سیّد احمد کا طرۂ امتیاز ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے خطوں[3] میں بھی جدت طرازی کا مزہ اور زبان و بیان

---

[1] ہادی النساء از سید احمد دہلوی مصنف فرہنگِ آصفیہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۵ء۔ [2] انشائے بشیر، ص ۲۴۷ تا ۳۲۳۔ [3] خطوطِ حسن نظامی، مطبوعہ دہلی نومبر ۱۹۲۹ء۔

کا لطف ہے لیکن اعجاز نگاری نہیں ہے۔

سرسید کی تحریک بڑی وسیع اور ہمہ گیر تھی۔ اس نے ہمیں تعلیمی، تہذیبی اور ادبی قدریں دیں۔ اس کے سامنے ایک "کامل سویلزیشن" کا نقشہ تھا لیکن اس کی مخالفت بھی بڑی شدید ہوئی۔ مولوی نذیر احمد نے ابن الوقت میں اور اکبر نے اپنے اشعار میں اس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن یہ تحریک چونکہ ذہن اور شعور رکھتی تھی اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کر رہی تھی اس لیے رفتہ رفتہ مقبول ہوئی اور مخالفت کا زور گھٹ گیا۔ نذیر احمد کی موعظۂ حسنہ میں یہ مصالحت صاف نظر آتی ہے۔ وہ مذہب و معاشرت کو چھوڑ کر باقی اور سب معاملوں میں سرسید کی تحریک کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ تھے۔ اکبر نے طنز و ظرافت کا سارا ترکش ختم کر دیا۔ لیکن ان تاریخی حقائق کے سامنے وہ بھی تھک کر بیٹھ رہے۔ اکبر مشرقیت سے بڑی والہانہ اور جذباتی محبت رکھتے ہیں اور اس میں وہ ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ نہ اس کے کمزور پہلوؤں پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں اور نہ مغرب کی اچھی باتیں خندہ پیشانی سے قبول کر سکتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار لکھنؤ سے محبت کرتے ہیں لیکن اس پر اعتراض بھی کر سکتے ہیں۔ اقبال مغرب کے خوشہ چیں ہیں لیکن اس کو سراب بھی سمجھتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی، ۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء

اکبر کا ذہن خانقاہی اور تقلیدی تھا۔ وہ علوم تازہ کی سرمستیوں کو گناہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں وہ تیزی نہیں تھی جو ضمیر وجود کو چیر سکتی ہے یا حلقۂ شام و سحر سے آگے دیکھ سکتی ہے۔ اسی لیے ان کے شعلۂ نم خوردہ سے کوئی شرر پیدا نہ ہو سکا لیکن اکبر نے مغربیت پر یا سرسید احمد پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اس لیے کہ وہ اپنی قومی اور تہذیبی میراث کو کسی طرح ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ انھوں نے اندھی تقلید انگریز اور انگریزیت پر بڑی کاری ضرب لگائی اور ہمیں اپنی چیزوں سے دوبارہ محبت کرنا سکھائی۔ اکبر کا یہ کارنامہ معمولی نہیں ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کی ساری تہذیبی کشمکش کو اپنے کلام اور خطوں میں محفوظ کر لیا ہے۔

اکبر کے خطوں کے ابھی تک چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

سلہ : موعظۂ حسنہ۔ ص ۱۴۹-۱۵۰

(۱) خطوطِ اکبر۔ خواجہ حسن نظامی کے نام۔ مطبوعہ حلقۂ مشائخ بک ڈپو، دہلی۔
(۲) مکاتیبِ اکبر۔ عبدالماجد دریابادی کے نام۔ مطبوعہ حلقۂ مشائخ بک ڈپو، دہلی۔
یہ خطوط ۸۰ نئے خطوں کے ساتھ، خطوط مشاہیر کے نام سے ابھی حال میں لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔
(۳) مکتوباتِ اکبر۔ عزیز لکھنوی کے نام۔ مطبوعہ دائرۂ ادبیہ، لکھنؤ۔
(۴) مکتوباتِ اکبر۔ مرزا سلطان احمد کے نام۔ مطبوعہ مرغوب ایجنسی، لاہور۔
(۵) رقعاتِ اکبر۔ مرتبہ محمد نصیر ہمایوں، مطبوعہ قومی کتب خانہ، لاہور۔
(۶) خطوطِ اکبر۔ مرتبہ مختار الدین احمد آرزو، ضمیمہ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر ۱۹۵۰ء
(۷) خطوطِ اکبر عزیز لکھنوی کے نام

اکبر کے خطوط نفسیاتی اور سوانحی اہمیت رکھتے ہیں

ان خطوں میں علمی و ادبی مباحث ہیں۔ سیاست و معاشرت پر تبصرے ہیں۔ تہذیبی آویزش پر زہر خند ہے۔ مذہبی عقائد کا ذکر ہے۔ اتحاد و اتفاق کی تلقین ہے۔ روحانیت اور مشرقیت کا عشق ہے لیکن ان میں نہ طرزِ ادا کی ندرت ہے نہ بے تکلفی کا جادو ہے، نہ ظرافت کی بہار ہے۔ ان کی اگر کوئی اہمیت ہے تو صرف یہ کہ وہ اکبر کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

اکبر نے ہمیں ہنسا ہنسا کر اشکبار کیا ہے اور رُلا رُلا کر ہنسایا ہے۔ وہ در اصل جس چیز کے خلاف ہیں وہ کورانہ تقلید اور مغربی سطحیت ہے یا مشرقی اقدار سے بیگانگی۔

معنی اجڑ رہے ہیں صورت سنور رہی ہے

ان کے خطوں میں اس کی طرف جا بجا اشارے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"میں نے لا مذہبی اور تبدیلِ وضع کے خلاف قلم اٹھایا ہے" [۱]

"اس وقت مسلمانوں کو عظیم خطرات کا مقابلہ ہے۔" ع

اے قصہ گوئے بدر ضرورت حرا کی ہے

[۱] خطوطِ اکبر، ص ۱۳۳، دہلی۔

پولیٹیکل پہلو کو چھوڑ کر روحانی مذاق کی حفاظت کے لئے جماعت قائم کیجئے۔"[1]

مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں :

"اس وقت تو تعلیم یا فنون کا رخ صرف دنیا اور پالیٹیکس کی طرف ہے خدا کا ذکر بھی تو مقصودِ دنیا ہی ہے۔"[2]

خواجہ حسن نظامی کو ایک اور خط میں تحریر کرتے ہیں :

"مسلمانوں کو اخلاقی اور روحانی تعلیم کی بہت ضرورت ہے۔"[3]

ایک اور موقع پر اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہیں :

"اگر دین صرف حصولِ دنیا کا ذریعہ سمجھا جائے تو بے دینی ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ کالج کے ذریعہ سے فکر معاش کی جائے جیسا کہ خود مصنف نے کیا ہے اور سب کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔"[4]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ اکبر کا زمانہ "ہندوستان میں مغربیت کے انتہائے عروج کا زمانہ ہے۔ ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلّط کے شکنجہ میں پورے طور پر کسا ہوا ہے۔ اسلامی اخلاق اسلامی آداب اسلامی شعائر مدّت ہوئی رخصت ہو چکے ہیں۔ عقائد میں تزلزل آچکا ہے۔ ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے۔ نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں۔ تعلیم کے لئے انگریزی مدرسے ہیں۔ علاج کے لئے انگریزی شفا خانے ہیں۔ رسل و رسائل کے لئے انگریزی ڈاک خانے ہیں۔ مہاجنی کے لئے انگریزی کوٹھیاں ہیں اور بینک ہیں۔ ماضی سے واقفیت کے لئے انگریزوں کی کتابیں ہیں۔ حال سے بے خبر رہنے کے لئے انگریزوں کے اخبارات ہیں۔ مستقبل کی پیشین گوئی کے لئے انگریزی سائنس ہے ... غرض جس طرف بھی رخ پھر تا حدِ نظر تک ایک غیر محدود نامتناہی پرچم انگریزی

---

[1] خطوطِ اکبر، ص ۱۶۲ ۔ [2] مکتوباتِ اکبر، ص ۹۴ ۔ [3] خطوطِ اکبر، ص ۴۷، (دہلی)۔
[4] ایضاً، ص ۲۵ (دہلی)۔

اقبال کا ابرا آتا ہوا نظر آتا ہے .... سوئے ہوئے شخص کے کمرہ میں دفعتاً تیز روشنی کردی جائے تو وہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اس وقت قوم کا تھا۔ اضطرارِ قلب۔ اختلالِ حواس و اجتماعِ حوادث کے وقت دیو میں پری کا حسن و جمال معلوم ہوا اور عجوز ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دھوکہ ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے علوم و فنون شعائر و رسوم اور عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلرُبا پر نثار کر دیا۔[۱]

اس وقت نوحہ خوانی کا دور ایک حد تک ختم ہو چکا تھا اور قلوب پر صبر و اطمینان نے تسلط جما لیا تھا۔ زخم مرورِ ایام سے مندمل تو ہو چکے تھے لیکن داغ باقی تھے۔ اس صورت میں آہ طنز ہی کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ اکبر نے مغربی تہذیب اور حکومت کے خلاف آواز اُٹھائی اور اس وقت اٹھائی جب کسی کو اس کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سامراجی چالوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی طرف انھوں نے چشمِ سخن سے اشارے بھی کیے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :

> "برن صاحب کمشنر بنارس کلکٹر الہ آباد کے پاس آئے تھے مجکو لکھا تھا کہ ۱۷ کو ۱۰ بجے صبح کو ملئے گا۔ مسرت ہوگئی۔ میں اپنی شکایت بول و براز کے سبب سے تردد میں تھا لیکن بہر حال تیار ہوا۔ خبر آئی کہ سواری نہیں ملتی۔ نہ اِکہ۔ نہ تانگا۔ نہ گاڑی۔ بلکہ سواری کو سڑک پر سے گزرنے ہی نہیں دیتے۔ بعض مسلمانوں کو ہندوؤں نے سواری سے اُتار دیا۔ میں نے چھٹی بھیج دی کہ یہ حالت ہے کیونکر آؤں۔ صاحب نے افسوس ظاہر کیا۔ لکھا کہ ملاقات کی اور تاریخ مقرر ہو گی جب آپ مل سکیں گے۔ یہ بھی لکھا کہ اس واقعہ پر آپ کچھ لکھئے۔ میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ آپ تو خود مصنف ان واقعات کے ہیں۔"[۲]

۱۔ اکبر کی شاعری۔ عبدالماجد دریا آبادی بحوالہ مقدمہ نئی شاعری مرتبہ خواجہ احمد فاروقی۔ دوسرا ایڈیشن۔

۲۔ خطوطِ اکبر، ص ۱۳۹۔ دہلی۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :

"اگر ہم لوگ اس قدر نہ بلبلائیں۔ لاٹر جارج اور پوپ کے حضور میں رونا نہ روئیں تو ان کو اپنی دست درازیوں اور فتاحیوں کا پورا مزا نہ ملے"[1]

تعلیمی محکمہ کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہیں :

"وحید کی ناکامیابی کا سخت افسوس ہوا۔ اس بیچارے پر جو الزام چاہیئے لگائیے لیکن میں تو درحقیقت اس قدر زیادہ ناکامیابیوں کو سررشتۂ تعلیم کی پولیٹیکل پالسی سمجھتا ہوں"[2]

لیکن اکبر نے اس کا جو علاج تجویز کیا تھا وہ غلط اور اس سیلاب کے روکنے کے لیے جو بند باندھے تھے وہ کمزور۔ وہ منفی تنقید کر کے زمانے کے وار روکنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب فطری طاقتوں سے اس طرح پناہ نہ ملی تو مجہول اور پُرسکون روحانیت کو ملجا و ماوا سمجھنے لگے۔

<u>اکبر کی مجہول روحانیت</u>

اکبر ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :

"بے اختیار دل چاہتا ہے کہ آپ کی خانقاہ میں رہ کر سادہ زندگی اور یادِ الٰہی میں شریک ہو جاؤں"[3]

"پیارے خواجہ صاحب اللہ کے حفظ و امان میں رہیئے۔ میں خوش ہوا کہ آپ حضرت غوث اعظم کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ آپ نے دانشمندی کی کہ اس وقت گزشتہ صدیوں میں قیام اختیار کیا"[4]

"آپ کی لو اللہ سے لگی رہے۔ فنا پر نظر ہو"[5]

ایک جگہ تو انھوں نے صاف لکھ دیا ہے کہ یہ ذوق فنا خوں شدہ ارمانوں کے لیے سپر رہے۔

"عشرت میاں کا خط ابھی آیا ہے ..... لکھا ہے کہ ..... زندگی پر بہت بھروسا

---

[1] خطوطِ اکبر، ص ۱۶۴۔ [2] رقعاتِ اکبر مرتبہ نصیر ہمایوں، ص ۱۲۰۔ [3] خطوط اکبر، ص ۳۳ (دہلی)
[4] ایضاً، ص ۹۴۔ [5] ایضاً، ص ۱۳۵۔

نہ کرنا چاہیئے۔ میں خوش ہوں کہ اس عمر میں ان کو یہ خیال آگیا۔ لکھوں گا کہ جب پلنگ نہ ہو اس وقت بھی یہی خیال ضروری ہے۔ کاش یہ خیال دل میں اس قدر جاگزیں ہو کہ دنیاوی مصائب کی پروا نہ رہے اور خواہشوں کے پورا نہ ہونے سے جو ملال ہوتا ہے وہ نہ ہو[1]۔"

اکبر کی طبیعت بڑی صلح پسند اور سکون آشنا ہے۔ وہ عمل پر خاموشی کو اور حرکت کے مقابلے میں سکوت کو ترجیح دیتے ہیں۔

"میرا وعظ قناعت محنت توکل سکوت عبادت ہے[2]۔"

آخر میں ان کے اندر خواہشِ مرگ پیدا ہو گئی تھی اور وہ عبرت فنا کے مضامین میں غرق رہتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"دنیاوی مشغولی اور اس کی لذت مقدر ہوتی تو والدۂ عشرت کیوں مر جاتیں۔ ہاشم کیوں مر جاتا۔ چاہا تھا کہ آستانۂ نظامیہ پر بسترِ مرگ لگاؤں ہنوز نہیں پہنچ سکا[3]۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"وزیر اعظم برطانیہ نے دنیا کو عیسائیت کی طرف بلایا ہے اور کہا ہے کہ بغیر اس کے امن و امان قائم نہ ہوگا۔ اس کے متعلق میرا لطیفہ سنیئے۔ امن و امان قائم ہوگا جب جہنمی جہنم میں بند کر دیئے جائیں گے۔ بہشتی بہشت میں پہنچ جائیں گے۔ یہ بات قیامت میں ہوگی۔ اس کے لئے حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری ضروری ہے۔ لہٰذا میں بعوض اس کے کہ دنیا کو عیسائیت کی طرف بلاؤں حضرت عیسیٰ کو دنیا کی طرف بلاتا ہوں۔ اس کے لئے دعا کرتا ہوں۔ کہیئے آمین[4]۔"

افسوس یہ ہے کہ اکبر کا یہ تصوف بھی وہ تھا جس کو "برن صاحب" پسند کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

---

[1] خطوط اکبر، ص ۱۲۸ - دہلی۔ [2] ایضاً، ص ۱۳۲۔ [3] ایضاً، ص ۹۳۔
[4] ایضاً، ص ۱۴۵۔

"بڑی بات یہ ہے کہ آپ برن صاحب سے ملیں گے۔ برن صاحب نے کہا کہ میں تصوف کو پسند کرتا ہوں" [1]

اسی سلسلے میں وہ دوبارہ لکھتے ہیں:

"میں نے عشرت سے کہا کہ کیا خوب ہو کہ برن صاحب کو حامی بیسٹرن بنا کر خواجہ صاحب فلسفہ تصوف کو ہند میں پھیلا دیں اور ایک جماعت مدد کو اٹھ کھڑی ہو" [2]

آلام و اوہام

اکبر آخر زمانے میں اس قدر آلام و اوہام میں گرفتار تھے کہ ان کی رائے میں صحت اور مزاج میں اعتدال باقی نہیں رہا تھا۔ ان کی عزیز بیوی اور عزیز بیٹے ہاشم کی بے وقت موت نے ان کا زمین و آسمان سب کچھ چھین لیا اور ان کا شعار و شعور وہ نہ رہا جو ایک نارمل اور تندرست آدمی کا ہوتا ہے۔ ان کے خطوں میں بیماری اور پریشانی کا ایسا لق و دق صحرا ہے کہ پڑھنے والے کے لیے یہ راستہ پہاڑ ہو جاتا ہے۔ غالب کے خطوں کی سی وہ تابناکی اور چاندنی ان کے یہاں نہیں ہے جس میں آگ بھی گلزار معلوم ہوتی ہے اور پھوڑے بھی سرو چراغاں۔ اکبر کو خود بھی اس کا احساس تھا۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"میرے تمام خیالات اور فلسفے پر ہنوز شدت الم غالب ہے۔ سینے میں الجھن دماغ میں گرمی محسوس ہوتی ہے۔ بہت کم روتا ہوں لیکن دل ہر وقت بھرا ہوا اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہاشم کے بدلے ہاشم آفریں کا تصور کر کے اس سے فریاد کروں۔ مدد چاہوں لیکن وہ بھی بھولی صورت اور پیاری آواز چشم و گوش پر ہنوز محیط ہے پھر اس بچے کے ارمان اس کی بے بسی اس کا اللہ اللہ کرتے رہنا۔ نازوں کو چھوڑ کر اس چودھویں سال کی عمر میں بے کسانہ اور عاجزانہ فریاد پر آجانا، معاذ اللہ ان باتوں کی یاد دل پر بجلیاں گراتی ہے۔ میں تو اس کا مذہبی فلسفہ تلاش کرتا ہوں یا قرآن و حدیث سے

---

[1] خطوط اکبر، ص ۶۵۔ [2] ایضاً، ص ۷۰، بنام خواجہ حسن نظامی۔ شاہ جہانی پریس، دہلی۔

کوئی توضیح تاکہ دل کو فی الجملہ تسکین ہو[1]

غالب کے یہاں واقعہ سخت سہی لیکن جان بھی عزیز ہے۔ اکبر کے یہاں یہ بات نہیں ہے مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:

"مرحوم بچے کے ساتھ جو تھوڑی بہت حلاوت زندگانی باقی تھی وہ بھی جاتی رہی۔
مجھ پر گویا ایک شدید آپریشن ہوا اور خارِ تعلقِ دنیا نکل گیا۔ لیکن خود آپریشن
کا زخم قیامت ہے[2]۔"

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"غم نے میری حالت جو کر رکھی ہے اور جس آلام میں مبتلا ہوں، اگر آپ کو معلوم
ہوں تو تعجب کیجئے کہ جس قدر حواس باقی ہیں یہ بھی کیوں باقی ہیں[3]۔"

ان واقعات کی روشنی میں ہم اکبر کے خیالات کی رو کو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان پر الزام نہیں لگا سکتے ہیں۔ انھوں نے خود بھی اس اندیشے کا جواب دیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"دل شکستہ ہوں۔ صرف آخرت کا امیدوار ہوں۔ غربت اور فنا کی باتیں پسند ہیں۔
تکلیفوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ عیش و نمود کا طلبگار نہیں ہوں۔ ایسا آدمی
نئی اصطلاحوں اور عقائد کی رو سے دشمنِ ملک و قوم ہے[4]۔"

"بہت افسردہ و ناتواں ہوگیا ہوں۔ اسی سبب سے ایسے خیالات ہوگئے ہیں[5]۔"

بعد میں ان کے اوپر اوہام کا اس قدر غلبہ ہوگیا کہ وہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور[6] کا اور قیامت کے آنے کا انتظار کرنے لگے[7]

اکبر کے خانقاہی مزاج میں جو عدم توازن تھا اور ان کی رائے میں جو فکر کی کمی تھی اس کا اثر ادب پر بھی پڑا ہے۔ اسی قسم کی غلطیاں ان کے علمی معاملات میں بھی سرزد ہوئیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کا یہ شعر:

خودی و بیخودی دونوں ہیں عکسِ صورتِ جاناں　　　اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

---

[1] خطوطِ اکبر، ص ۱۴ (دہلی)۔ [2] مکتوباتِ اکبر، ص ۵۰۔ [3] رقعاتِ اکبر، ص ۲۵۔ [4] خطوطِ اکبر، ص ۳۵۔ (دہلی)۔ [5] ایضاً، ص ۱۰۰۔ (دہلی)۔ [6] مکتوباتِ اکبر، ص ۳۸۔ [7] خطوطِ اکبر، ص ۱۴۵۔ (دہلی)۔

اکبر کے خانقاہی مزاج کا اثر ادب پر

اقبال کی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی دونوں پر حاوی ہے[1] یا مرزا سلطان احمد کی کتاب فن شاعری کا طرز و اسلوب حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری سے بہتر ہے[2] یا جوش ملیح آبادی کی روح ادب میں معرفت کی جھلکیاں ہیں۔ اکبر نے اقبال کے سمجھنے میں جو دیر کی وہ بھی دراصل ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ بعد میں بھی وہ داد دینے کے لیے آمادہ تھے لیکن ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے[3] اقبال آئینۂ ایام میں اپنی ادا دیکھنا چاہتے ہیں اور جبرئیل ان کے یہاں زبونِ صید ہے لیکن اکبر کی سعی اور جد و جہد صبر سے آگے نہیں بڑھی۔

صاحب کی رفاقت ہو جو پسند آسام میں جاکر چائے چنو
اکبر کی جو مانو بیٹھ رہو جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

اکبر اور اقبال

اقبال گوسفندی تصوف کے مخالف ہیں۔ اکبر اس کے دلدادہ۔ ایک کے یہاں تسخیر خاکی و نوری کو اہمیت حاصل ہے دوسرے کے یہاں آب و گل سے مہجوری کو خطوں میں یہ زاویہ نظر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اکبر اور اقبال کے تعلقات ابتدا میں نہایت شگفتہ تھے۔ وہ ان کی مشغولیت فی الطاعۃ سے بہت خوش تھے۔ مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں :

"حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرزِ ادا ہے کیا بلاغت ہے۔ مغربی لٹریچر کی تکمیل اس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو۔ ان کا یہ مصرعہ

در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند

میں کبھی نہیں بھولتا"[4]

---

[1] مکتوباتِ اکبر، ص ۹۳۔ (لاہور) [2] ایضاً، ص ۲۹۔ [3] ایضاً، ص ۵۹۔۔
[4] ایضاً، ص ۴۷ (لاہور)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر اقبال صاحب بلاشبہ نہایت عالی خیال بزرگ ہیں اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی ہے۔ خدا مدد کرے۔[۱]"

لیکن یہ اتحاد و اتفاق زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اقبال مزاج خانقاہی کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ کبھی ایسے تصوف کے موئد نہیں رہے جو تخلیق خودی میں معاون نہ ہو۔ اس نظریے کی زد میں اکبر کا متصوفانہ عقیدہ اور خواجہ حسن نظامی کی خانقاہ دونوں چیزیں تھیں۔ اکبر کو اس معاملے میں اتنا غلو تھا کہ وہ اپنی رائے پر تنقید تو کجا دوسرا نقطۂ نظر بھی سننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ وہ خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"تصوف اور بے خودی کے ذکر میں جو لذت ہے اسی لذت کو گود میں میرا خیال پلا ہے اور میرے نزدیک تو سارے معنی اسی میں ہیں۔ کوئی فلسفہ اس کے خلاف ہو تو ہم کو ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ہم تو اس کو صریح غلط سمجھیں گے۔"

اسی سلسلے میں ۳ر اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :

"نیو ایرا جو لکھنؤ سے انگریزی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ ۲۸ر جولائی کا پرچہ حضرت اقبال نے میرے پاس بھجوایا ہے۔ اس میں ان کا ایک آرٹیکل تصوف کے خلاف چھپا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کون سا اسلامی مقہور تصوف ہے جو انسان کو دنیا میں سعی سے روکتا ہے۔ بہرحال پڑھے لکھوں کا یہ پرانا شغل زندگی ہے۔ انسان کو ضرور مردانگی سے کام لینا چاہیئے لیکن کالج کی پروفیسری عرب کی مردانگی نہیں ہے جس کا وعظ کہا جاتا ہے۔[۲]"

اقبال نے جو بحث چھیڑی تھی وہ سراسر علمی تھی وہ کسی کو آزار پہنچانا نہیں چاہتے تھے اس لیے جب انھیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں کو اس سے رنج پہنچا ہے تو انھوں نے اپنے مسلک کی وضاحت کی۔ اکبر نے جو خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا ہے اس سے

---

[۱] مکتوبات اکبر، ص ۸۰۔ لاہور۔ [۲] خطوط اکبر، ص ۹۱ ۔ دہلی

تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

"اقبال صاحب کا خط آیا ہے لکھتے ہیں میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں صرف چند مسائل سے اختلاف ہے۔ جو کچھ ہو شکستگی دل بری چیز ہے یا گداز دل کہئے۔ یہ نہیں کہ وہ رنگ نہیں ہے۔ میں نے لکھ دیا کہ خواہش یہی ہے کہ آپ محبوب قلوب رہیں۔"

اکبر کی دلی خواہش یہ تھی کہ خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے درمیان جو خانقاہیت اور رہبانیت کے مسئلے میں تلخی پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوجائے اور بات زیادہ نہ بڑھے۔ مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی صاحب کو میں نے بار بار یہی لکھا کہ حضرت اقبال کی مثنوی پر قلم نہ اُٹھائیں۔ حضرت اقبال کو بھی میں نے نہ چاہا کہ بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا درد اٹھائیں۔ بعوض اس کے کہ ہم رندانِ بے سامان کے ساقی بنے رہیں۔ ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں ہم کو ان سے محبت ہے۔" (ص ۶۹)

لیکن بات رفع دفع نہیں ہوئی اور حسن نظامی اس طنز پر اُتر آئے۔

"ڈاکٹر اقبال کا اور میرا کیا مقابلہ۔ ان کے ہاتھ پاؤں ہیں میں بے دست و پا ہوں۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ بحث نے طول کھینچا اور مضمون اور جواب مضمون کی ٹھن گئی۔ اکبر خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی مضمون لکھوں گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے۔ زوالِ اقبال سے مجھ کو بہت ہی ملال ہوا۔ اس باب میں پھر لکھوں گا۔ میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کو کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں صرف کریں۔" (خطوط اکبر: ص ۲۲)۔

اس بحث میں اکبر خواجہ حسن نظامی کے ساتھ تھے۔ کچھ تو عقیدت کی وجہ سے اور کچھ

مروت کی وجہ سے۔ موخر الذکر کو جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں ان میں اس کی وضاحت کی ہے بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دل وجگر دونوں سے آشنائی ہے اور وہ اقبال کی عظمت کے قائل ہو چکے ہیں۔

"محرم نامہ[1] اسرار خودی تک نہیں پہنچا مگر ہے قابلِ داد۔ اچھا ہے اقبال کا کچھ جواب ہو جائے۔" (خطوطِ اکبر، ص ۶۱)

محرم نامہ کی طرح حسن نظامی نے کرشن بیتی لکھی۔ اکبر اس کا مقابلہ اسرار خودی سے کرتے ہیں۔

"وہ زیادہ پولیٹیکل ہے۔ آپ کے رنگ میں سادگی ہے۔" (خطوطِ اکبر، ص ۸۰)

لیکن اکبر کی تنقید کی سب سے زیادہ افسوسناک مثال وہ ہے جہاں انھوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر طنز کیا ہے۔

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہوگا لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلۂ وحدت وجود اور مسئلۂ روحانیت پر گفتگو کریں گے۔ حضرت اقبال ہی خودی کو بڑھا کر "ہمہ منم" کہہ دیں مطلب حاصل ہے۔" (خطوطِ اکبر، ص ۲۴)

اس ترکش کے آخری تیر سے انھوں نے اقبال کی فارسی شاعری کو گھائل کر دیا ہے۔

"اقبال صاحب کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لیے بھیانک ہو گئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے۔"[2]

اکبر اس بات سے بھی متاثر نہیں تھے کہ اقبال کے کمالات کا اعتراف انگلستان کے علمی حلقوں میں ہوا ہے۔ شیخ عبد القادر کو لکھتے ہیں:

"مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی۔ مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا۔

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

---

[1] خواجہ حسن نظامی کی تصنیف ہے۔ [2] خطوطِ اکبر، ص ۲۵۔ دہلی۔

ہیں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں ؎ طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا

سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا[1]

اکبر کو حسن نظامی کا بڑا پاس اور لحاظ تھا اور انھوں نے اقبال کو سمجھایا تھا کہ "حسن نظامی سے محبت رکھنا چاہئے" لیکن دقت یہ تھی کہ حسن نظامی مخالفت بری طرح کرتے تھے۔ اقبال لکھتے ہیں: "محبت تو رکھتا ہوں لیکن وہ بڑے برے طریقے سے اظہارِ مخالفت کرتے ہیں" ان سب باتوں کے باوجود اکبر اس بات سے خوش تھے کہ اقبال نے اپنی سعادت مندی کی روش نہیں چھوڑی۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"اقبال صاحب کے خط آتے رہتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ ہم غریبوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اللہ استقامت عطا فرمائے[2]"

راقم الحروف نے پروفیسر نعیم الرحمٰن مرحوم کی مہربانی سے ڈاکٹر اقبال کے وہ خطوط دیکھے تھے جو انھوں نے اکبر الہ آبادی کو لکھے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ اب تک شائع نہ ہو سکے۔ ان کا انداز کافی نیازمندانہ تھا لیکن ان مطبوعہ خطوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے رُخِ سخن پر رنگِ ادب کو ہر حال میں برقرار رکھا ہے۔ اکبر اقبال کے متعلق حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"میں مخدومیت کا مستحق نہیں لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی (اقبال کی) عظمت اور محبوبیت قائم رہے[3]"

جن خطوں میں اکبر نے اقبال کا ذکر کیا ہے وہ اکبر کی سیرت کے بہت سے اہم گوشوں کو کھول دیتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسروں کا ذکر کرنے میں خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا بھی حجاب اُٹھ گیا ہے۔

یہ خطوط انیسویں صدی کے سب سے معروف شاعر کے خطوط ہیں، ان میں جو صاف اور رواں خطوط ہیں ان میں ایک ادا ہے۔ اور وہ ظرافت کی مہک سے خالی نہیں ہیں۔

---

[1] رقعاتِ اکبر، ص ۱۳۰ (لاہور)۔ [2] خطوطِ اکبر، ص ۱۱۰ (دہلی)۔ [3] ایضاً، ص ۹۷ (دہلی)۔

چند نمونے ملاحظہ ہوں۔
خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :

"بہت بڑا لیڈر ہے۔ چاہتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈروں۔ لیکن بیوقوف مشہور ہونے بھی ڈرتا ہوں[۱]۔"

"امریکن پھر حبفت برہمن اس دو آتشہ لیڈی نے صرف نیکی اور بدی کی تمیز کو حسن قرار دیا[۲]۔"

"شکستہ حالی بحال۔ داتا کا خیال۔ فقر کا رنگ۔ طاعت کی امنگ۔ اللہ ہی کے آگے ہاتھ۔ زندگی کے لئے دنیا کا زبانی ساتھ۔ درویشوں کا جتھا۔ حق حق اور برہم کتھا۔ خواجہ جیئں لاکھ برس۔ اللہ بس، باقی ہوس[۳]۔"

"علی گڑھ میں آپ نے کیا دیکھا۔ میں بھی اخبار میں دیکھوں گا۔ طاقت کی جولانیاں تو دیکھ ہی رہے ہیں ضعف کا ہیجان بھی دیکھئے[۴]۔"

اکبر کے خطوں میں اور شاعری میں بڑا فرق ہے۔ شاعری میں ایک چٹخارہ ہے جو خطوں میں نہیں ہے۔ اکبر نے جہاں کورانہ تقلید پر طنز کیا ہے اور مشرق کے صالح عناصر کو اجاگر کیا ہے وہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ ایک بڑی تہذیبی خدمت بھی ہے۔ لیکن فکر و خیال کی وہ گہرائی نہ ان کے خطوں میں ہے اور نہ شاعری میں جو جذبات کو ذہنی اور اعلیٰ معنویت سے متوازن بنا دیتی ہے۔ اقبال کی اور ان کی خط و کتابت اس نکتہ کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے۔ اکبر کے خطوں میں نہ وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہا جائے اور نہ وہ "بہار ایجاد" اسلوب جس نے غالب کو مکتوباتی ادب میں جاوداں بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۵ء)

اکبر کے ساتھ اقبال کے خطوں کا ذکر ضروری ہے۔ جو دراصل سرسید کی تحریک کا

۱؎ خطوط اکبر، ص ۱۱٦۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۵۰۔ ۳؎ ایضاً، ص ۱۲۰۔ ۴؎ ایضاً، ص ۱۴۱۔

گلِ سرسید ہیں۔ اقبال نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے اُس وقت ایشیا، کا سیاسی مادی اور اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ یہاں اگر کچھ رہ گیا تھا تو صرف اوہام کا تار و پود۔ قوائے عمل شل ہو چکے تھے اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ اس مرقع میں ہندوستان کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اس وقت سرسید احمد خاں نے جو قوم کی سطحی کمزوری کی تہہ میں فولاد کی قوت دیکھ رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو "اس پر اُبھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی تمدن سے رگڑ کھانے دیں[1]۔" اس رگڑ سے ابتدا میں انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ جس کے خلاف اکبر نے آواز اٹھائی مگر اس سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں جنھوں نے فروغ جاوداں حاصل کیا۔

سرسید، حالی، اکبر اور اقبال کے خیالات کا بنیادی فرق

سرسید کی تحریک نے ہمیں ادبی اور تہذیبی قدریں دیں۔ حالی نے عظمتِ دیرینہ کی یاد دلائی۔ اکبر نے زبوں حالی اور زبوں سازی کے تذکرے سے غیرت کی آنکھ کھولی اور اقبال نے مستقبل کی امید افزا تصویر کھینچ کر صبحِ عید کی خبر دی۔

حالی اور اکبر اور اقبال تینوں کو اپنے ماضی سے محبت تھی لیکن ان کی محبتوں میں فرق بھی تھا۔ حالی اس پر تنقید و نکتہ چینی کر سکتے تھے۔ اکبر کو یہ نکتہ چینی گوارا نہ تھی۔ حالی جدت پسند تھے۔ اکبر قدامت پسند، حالی نئی چیزوں کو لینے کے لیے تیار تھے۔ اکبر ہر نئی چیز سے خفا تھے۔ وہ انھیں ٹیڑھی بگڑی اور بدنما معلوم ہوتی تھی۔ اقبال "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے نظریے کو "حدیثِ بے خبراں" سمجھتے تھے۔ اگر زمانہ موافق نہیں تو وہ ماضی کی صالح روایات کی مدد سے "با زمانہ ستیز" کی تعلیم دیتے تھے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ حالی اور اکبر دونوں نے عزّتِ نفس کو بیدار کیا اور خود اعتمادی پیدا کی جو اُس حزن و یاس کے عالم میں بہت بڑی خدمت ہے۔

لیکن بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "ان دونوں کی نظر یات کی تہہ تک نہیں پہنچی تھی انھوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا لیکن اس مرض کا سبب نہیں پہچان سکے۔ اکبر نے

---

[1] مضامین عابد، ص ۴۔

ان کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور حالی نے یہ کہا کہ وہ اجتہادِ فکر اور وسعتِ نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر ان کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ اس وجہ کے معلوم کرنے کے لیے اقبال کی فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی۔[1]"

اقبال کو مشرق و مغرب دونوں کے علم و حکمت سے واقفیت تھی۔ انھوں نے اس مرض کو سمجھنے کی کوشش کی اور محسوس کیا کہ عملی اور روحانی انحطاط سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ انھوں نے مشرق کی درماندہ اقوام میں پھر جان ڈالنا چاہی۔ عالمِ اسلامی کی عروقِ مردہ میں خودی کے ذریعہ خونِ زندگی دوڑانا چاہا اور عملِ پیہم اور کوششِ ناتمام کا درس دیا۔ انھوں نے فرد کی اہمیت اور خودی کی تربیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ نظامِ عالم میں انسان کے مقامِ بلند اور اس کے استعمال کے وسیع اور لامحدود امکانات کو ظاہر کیا۔ مادی ترقی کی کوششوں میں تزکیۂ روحانی کی ضرورت سمجھائی جس کے بغیر مادی ترقی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ انھوں نے اقوامِ یورپ کو یہ پیغامِ عبرت دیا کہ اگر وہ روحانیت سے بیزار ہو کر ایسی جہانی تصورِ حیات پر مصر رہیں گے تو ان کی تہذیب تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اقوامِ مشرق اور خاص طور پر مسلم اقوامِ مشرق میں روحانی فضیلت اور برتری کا احساس از سرِ نو پیدا کرنے کی کوشش کی اور تمام مسائل کو قرآن کی کسوٹی پر جانچ کر حیات افروز اور خودی پرور ترانوں میں اپنا فیصلہ صادر کیا۔[2] اقبال نے ان حکیمانہ اور فلسفیانہ مسائل کو اس سلیقے کے ساتھ آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے کہ دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور بعض وقت سخن آرائی خود طرزِ ادا کی ندرت اور طرفگی پر وجد کرنے لگتی ہے۔ لیکن ان کی یہ شاعری بغیر نثر کی مدد کے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ نثر میں انھوں نے بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کے مضامین ہیں، تقریریں ہیں، خطبے ہیں، بیانات ہیں لیکن ان کے علاوہ

---

[1] مضامینِ عابد، ص ۵ و ۶۔ [2] ماڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ بحوالہ نئی شاعری مرتبہ خواجہ احمد فاروقی دوسرا ایڈیشن، ص ۲۴

خطوط کا بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ جن میں ان کی سیرت اور شخصیت کے اصلی خط و خال جھلکتے ہیں۔

اقبال کے خطوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) شادِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور، مطبوعہ ادارۂ ادبیات حیدر آباد دکن

(۲) اقبال نامہ۔ مجموعہ مکاتیب اقبال مرتبہ شیخ عطاءُ اللہ مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور

(۳) اقبال کے خطوط عطیہ بیگم فیضی کے نام (انگریزی) مطبوعہ اکادمی آف اسلام بمبئی

(۴) اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی)

چوتھے مجموعے سے اقبال کے سیاسی خیالات پر روشنی پڑتی ہے لیکن اس اقبال پر نہیں جو "فرشتوں کو آدم کی تڑپ اور آدم کو آدابِ خداوندی" سکھاتا ہے۔ پہلا مجموعہ مہاراجہ کشن پرشاد اور ڈاکٹر اقبال کی باہمی مراسلت پر مشتمل ہے۔ اس سے جہاں اقبال کی پاک مشربی اور فقر دوستی ظاہر ہوتی ہے وہاں حیدر آباد کی غلط بخشی اور قدر ناشناسی پر بھی روشنی پڑتی ہے[1]۔ اقبال کے ساتھ یہ چوچلا محض زبانی تھا۔ بیگار سب لینا چاہتے تھے۔ لیکن عملی امداد یا خدمت کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان خطوں کی ادبی اہمیت کم ہے، سوانحی زیادہ ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے صحیح لکھا ہے کہ اقبال بزرگوں کا ادب کرتے تھے۔ وہ خود درویشی، فقر، قلندری، سادگی کے دل دادہ تھے۔ شاد صوفی تھے۔ بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ ان کا احترام کرنا اس وجہ سے مناسب تھا کہ وہ احترام کے آداب سے واقف تھے۔ مگر اقبال نے شاد کو اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیا۔ غالباً اس سے زیادہ کے شاد مستحق بھی نہ تھے۔ اسی لیے یہ خط اقبال کی پوری شخصیت کو سمجھنے کے لیے زیادہ مفید نہیں[2]۔

دوسرا مجموعہ اقبال نامہ نہایت اہم اور دلچسپ ہے اس لیے کہ اس سے اقبال کی

---

[1] شادِ اقبال، ص ۴۴، ۷۷، ۸۸۔ [2] رسالہ اُردو، دہلی، جنوری ۱۹۳۶ء

شاعری کے پس منظر اور دل و دماغ کی سرگزشت کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے تیسرا مجموعہ انگریزی میں ہے لیکن اس سے اقبال کی شخصیت اور سیرت پر بے مثل روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔

نظریۂ فن

اقبال کے خطوں سے ان کے نظریۂ فن کے متعلق بیش قیمت مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے قدیم یونان اور جدید مغرب کے تمام فلاسفہ کے ساتھ ساتھ ان کے فنی نظریوں کو غور سے پڑھا تھا۔ اسی لیے ان کے نظریۂ فن میں غیر معمولی شادابی اور توانائی ہے اور ان کے ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر میں شروع سے آخر تک زندگی، تازگی، صحت اور انفرادیت ملتی ہے۔

اقبال فن برائے فن کے مخالف تھے۔ اور وہ آرٹ کو اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے اس مہلک نظریے پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے۔

> "مصور فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگار آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے افیون کی جسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے[1]"

اسی قسم کے خیالات کا اظہار اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں کیا ہے:

> "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ

---

[1] جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ، مطبوعہ مضامین اقبال، ص ۸۰

نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں[۱]۔"

اقبال شاعری کے لیے حیات بخشی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے آرٹ کو اہمیت نہیں دیتے جس کی کوئی غایت نہ ہو۔ ان محدود معنوں میں وہ اپنے آپ کو شاعر بھی نہیں کہتے۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جس کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کرلیا ہے ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست[۲]"

اقبال شعر کے لیے ایک نصب العین[۳] ضروری سمجھتے تھے اور اس آرٹ کو مضر خیال کرتے تھے جو ہمتوں کو پست اور جذبات کو مردہ کردے[۴]۔ زبان کے معاملے میں بھی ان کا نظریہ زندگی سے علیحدہ نہیں ہے۔ وہ اسے جامد اور میکانکی چیز نہیں سمجھتے۔ سردار عبدالرب خاں نشتر کو لکھتے ہیں:

"آپ کا جواب درست ہے۔ میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا سوائے اس کے کہ زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہوجاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے[۵]۔"

---

۱ اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۱۰۸۔ ۲ اقبال نامہ، ص ۱۹۵ و ۱۹۶۔ ۳ ایضاً، ص ۳۷۔ ۴ آثار اقبال، ص ۶۹ و ۷۰۔ ۵ اقبال نامہ، ص ۵۶۔

اقبال حرکت اور ارتقا کے قائل ہیں۔ اس کا پرتو ان کے ادبی نظریہ میں بھی موجود ہے۔ وہ آزادیٔ تخلیق کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن لاقدر اور بے مقصد آزادیٔ تخلیق کو نہیں۔

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

"میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیا کیجیے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔ بادۂ نارسا کے لئے مجھے کوئی سند یاد نہیں۔ بادۂ نارس یا میوۂ نارس (بمعنی خام) لکھتے ہیں۔ لفظِ مینار غلط ہے۔ صحیح لفظ منار (بغیر ی کے ہے)۔ یہ الفاظ اس زمانہ کی نظموں میں واقع ہوئے ہیں جس زمانہ میں میں سمجھتا تھا کہ لٹریچر میں ہر طرح کی آزادی لے سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نظموں میں میں نے اصول بحر کا بھی خیال نہیں کیا اور ارادۃً۔"[1]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ادا کرنے کے لئے قدیم فارسی اسلوب بیان سے مدد نہیں ملتی۔ بعض تاثرات کے اظہار کے لئے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔ اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضرور ہے کہ اہل زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔ بعض اشعار کے لکھتے ہیں تو مجھے اس قدر روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔"[2]

یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال کی جدت طرازیوں سے دہلی اور لکھنؤ کے لوگ خفا تھے۔ اکبر اور حسن نظامی کی متصوفانہ مخالفت میں ایک دبی ہوئی چنگاری اس احساس کی بھی تھی کہ اقبال اہلِ زباں نہیں ہیں۔

اقبال اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتے تھے جس سے لوگوں کو ان کی شاعری اور افکار کے سمجھنے میں سہولت ہو[3] لیکن یہ کام وہ نہ کر سکے۔ تاہم ان کے

---

[1] اقبال نامہ، ص ۱۰۱۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۵۔ [3] ایضاً، ص ۱۰۹۔

خطوں میں ایسا مواد موجود ہے جو ان کی نظموں اور تنقیدی صلاحیتوں پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

عطیہ بیگم فیضی کو لکھتے ہیں :

"مجھے نظموں کے انتخاب میں بے حد مشکل پیش آرہی ہے۔ گزشتہ ۵-۶ برس کے عرصہ میں جتنی بھی نظمیں کہی ہیں۔ وہ نجی حیثیت رکھتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ عوام کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے بعض میں نے ضائع بھی کر دی ہیں تا کہ ایسا نہ ہو کوئی چرا کر چھپوا دے.....

والد صاحب نے فرمائش کی ہے کہ بو علی قلندر کے رنگ میں ایک مثنوی لکھوں ..... کام بے حد مشکل ہے تاہم کوشش کر رہا ہوں۔ شروع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

نالہ را انداز تو ایجاد کن | بزم را از ہائے و ہو آباد کن
آتش استی بزم عالم برفروز | دیگراں راہم ازیں آتش بسوز[1]

کشن پرشاد شاد کو لکھتے ہیں :

"اس تنہائی میں مثنوی اسرار خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا "اقلیم خاموشاں" یہ نظم اردو میں ہوگی اور اس کا مقصود یہ دکھانا ہوگا کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں، ان کے عام حالات و جذبات و خیالات کیا ہوتے ہیں[2]"

منشی سراج الدین کو پرندہ کی فریاد کے متعلق لکھتے ہیں :

"مندرجہ بالا نظم کی بندش ملاحظہ فرمائیے۔ چوں کہ بچوں کے لیے اس واسطے اضافات اور دقت مضمون سے خالی ہے۔ علاوہ بریں فریاد کرنے والا آخر پرندہ ہے[3]"

پیام مشرق کے متعلق لکھتے ہیں :

"فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم، ص ۷۳۔ [2] شاد اقبال، ص ۳۲ [3] اقبال نامہ، ص ۲۲۔

قریباً نصف حصّہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اُردو میں۔[1]

خضرِ راہ کے متعلق لکھتے ہیں :

"جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا (کم ازکم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور جناب خضر کے انداز طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصّہ بن جائیں گے۔[2]"

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بند کس نظم کا حصہ بنے۔ اسی طرح اقبال نے ضربِ کلیم کے آرٹ کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ راس مسعود کو لکھتے ہیں :

" یہ ایک اعلانِ جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام اور " ناظرین " سے میں نے خود کہا ہے کہ " میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے جنگ "، نوائے جنگ یہاں موزوں نہیں ہے۔ اس کتاب کا REALISTIC ہونا ضروری ہے اور نوائے جنگ کی تلافی EPIGRAMMATIC STYLE سے کی گئی ہے۔"

جاوید نامہ کے متعلق لکھتے ہیں :

" آخری نظم جاوید نامہ جس کے دو ہزار شعر ہوں گے۔ ابھی ختم نہیں ہوئی ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈوائنڈ کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہوگا اور اس میں غالباً ہند و ایران بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لئے نئی باتیں ہوں گی۔ ایرانیوں میں حسین ابن منصور حلاج

---

[1] اقبال نامہ، ص ۱۰۷۔ [2] ایضاً، ص ۱۱۹۔

قرۃ العین ناصر خسرو علوی وغیرہ کا نظم میں ذکر آئے گا۔ جمال الدین افغانی کا پیغام مملکت روس کے نام ہوگا۔[1]

اقبال کا نظام فکر

اقبال کے خطوں سے ان کے افکار و امیال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ تصوف کے ذوق سے آشنا تھے لیکن گوسفندی طبیعت اور خانقاہی مزاج کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے نظام فکر میں مسکینی و محرومی و محکومی کو دخل نہیں ہے اسی لیے انھوں نے عجمی تصوف کی افیونی خصوصیت کی جا بجا مخالفت کی ہے۔

ادب اور تصوف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی۔ تو پھر اس قوم کا نکتۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو زندگی کی کشمکش میں ہو [تنازع للبقا] چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"[2]

محمد اسلم جے راجپوری کو لکھتے ہیں :

"جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے ایک کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"[3]

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

"اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی

---

[1] اقبال نامہ، ص ۲۰۶۔ [2] ایضاً، ص ۴۴۔۴۵۔ [3] ایضاً، ص ۵۴۔

پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔[1]"
ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :

"ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔[2]"

مولانا ظفر علی خاں نے تصوف پر کچھ مضامین لکھے۔ بعض لوگ یہ سمجھے کہ یہ اقبال کے لکھے ہوئے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کو خاص طور پر یہ بدگمانی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اقبال مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو لکھتے ہیں :

"تصوف پر جو مضامین انھوں نے لکھے یا لکھ رہے ہیں ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ..... خواجہ صاحب کو یہی بدظنی تھی مگر کچھ عرصہ کے بعد جب ان کی بدگمانی رفع ہوگئی تو انھوں نے مجھے معذرت کا خط لکھا جس کے جواب میں میں نے انھیں مزید یقین دلایا کہ اس بحث سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے دو سال کا عرصہ ہوا تصوف کے بعض مسائل سے کسی قدر اختلاف کیا تھا اور وہ اختلاف ایک عرصہ سے صوفیائے اسلام میں چلا آتا ہے۔ کوئی نئی بات نہ تھی مگر افسوس ہے کہ بعض ناواقف لوگوں نے میرے مضامین کو تصوف کی دشمنی پر محمول کیا۔ مجھے تو اس اختلاف سے ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی محض اس وجہ سے کہ اپنے پوزیشن کا واضح کرنا ضروری تھا کہ خواجہ صاحب نے مثنوی اسرار خودی پر اعتراض کئے تھے چونکہ میرا عقیدہ تھا اور ہے کہ مثنوی کا پڑھنا اس ملک کے لوگوں کے لئے مفید ہے اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ خواجہ

---

[1] اقبال نامہ، ص ۸۰۔ [2] ایضاً، ص ۲۰۳۔

صاحب کے مضامین کا اثر اچھا نہ ہوگا اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔[1]

اقبال کا خیال ہے کہ حیات اس لیے وجود میں آئی ہے کہ وہ کائنات کی غیر منظم قوتوں کو تسخیر کر کے ان میں حسین نظم و ضبط پیدا کرے اور انھیں اپنے کام میں لائے۔ عجمیت اس نظریے کے خلاف ہے۔ وہ ہمیں جگاتی نہیں سلاتی ہے۔ بیدار نہیں کرتی غافل اور کاہل کر دیتی ہے اسی لیے اقبال نے اس کی شدت سے مخالفت کی ہے اور اس کو قومی زوال کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ اسی عجمی اثر سے ہمارے ادب میں غیر متوازن جمالی نقطۂ نظر پیدا ہوا ہے جسے اقبال نے رد کر کے حسن کو حرکت، اور ارتقا سے وابستہ کر دیا ہے۔

اقبال عجمیت کے متعلق لکھتے ہیں :

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منھ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشا اللہ دوسرے حصہ میں دکھاؤں گا کہ یہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے۔"[2]

سراج الدین پال کو لکھتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔

---

[1] شاد اقبال، ص ۷۶، و ۷۷۔ [2] اقبال نامہ، ص ۳۴۔

یہ ایک نہایت SUBTLE طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جس کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ہوا۔ یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔[1]"

اقبال کے نزدیک مسلمان کی تعریف یہ ہے:

"گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن۔ اس سوال کے جواب کے لئے حسب الحکم مراقبہ کیا گیا جو انکشاف ہوا عرض کیا جاتا ہے۔ گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت ایک نورانیہ ہے جو جامع ہے۔ جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو بردو اسلام بن جائے پانی اس کی ہیبت سے خوش ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے۔ عدم بود کو کھا جاتا ہے۔ پستی بلندی میں سما جاتی ہے مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقصات کی ہو۔ اسے کون جذب کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات و موت

---

[1] اقبال نامہ، ص ۳۵ و ۳۶۔

کو اپنے اندر جذب کرکے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے۔"[1]

اقبال کے خیالات کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے اور انھوں نے اکثر جگہ اس کے صحیح مطالعہ پر زور دیا ہے۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے (قرآن کے) کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔۔۔
۔۔۔ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔"[2]

وہ خود بھی چاہتے تھے کہ عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں قرآن کی تشریح کریں۔ راس مسعود کو لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ اس طرح میرے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔"[3]

اقبال شاعر ماضی و شاعر حال اور شاعر مستقبل تینوں حیثیتوں کے جامع ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ماضی کے سرمایہ سے قطع نظر نہیں کیا۔ حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے لیے وسعت پیدا کی۔ ان کا ایک رخ ماضی کی طرف اور دوسرا مستقبل کی طرف ہے۔ انھوں نے مشرق کے علاوہ مغرب سے بھی خوشہ چینی کی ہے

---

[1] اقبال نامہ، ص ۱۳ و ۱۴۔ [2] ایضاً، ص ۴۹ و ۵۰۔ [3] ایضاً، ص ۳۵۷، ۳۵۸۔ نیز ص ۳۶۱ و ۳۶۲۔

اور اس کا اعتراف جا بجا کیا ہے۔ صوفی غلام مصطفٰے تبسم کو لکھتے ہیں :

میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔[1]

ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں :

"انگریزوں کو چاہئے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لئے جرمن مفکر کے بجائے اپنے ایک ہم وطن فلسفی کے افکار کو رہنما بنائیں۔ میری مراد الگزینڈر سے ہے جس کے گلاسکو والے خطبات پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں۔[2]"

باوجود مغرب سے خوشہ چینی کے اقبال مغربی تعلیم کی خرابیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو لکھتے ہیں :

"دیکھا مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ اسلامیت کیا ہے اور وطنیت کیا چیز ہے۔ وطنیت ان کے نزدیک لفظ وطن کا محض ایک مشتق ہے اور بس۔[3]"

حافظ فضل الرحمٰن انصاری کو لکھتے ہیں :

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان طالبعلم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔[4]"

اقبال کی نظر وقت کے اہم تقاضوں پر تھی اور وہ ایک جدید معاشرتی نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ نئے نظام میں مذہب کے اعلیٰ اور صحت مند تصور کو باقی رکھنا چاہتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ ماضی کے تندرست عناصر کی مدد سے مستقبل کو

---

[1] اقبال نامہ، ص ۴۷۔ [2] ایضاً، ص ۳۵۷ و ۴۵۸۔ [3] ایضاً، ص ۲۳۲۔
[4] ایضاً، ص ۳۹۸۔

سنوارا جائے۔ وہ قوموں کی زندگی میں نئے اور پرانے دونوں عناصر کو برابر کی اہمیت دیتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں پیش کیا جائے۔

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

"میرا مقصود یہ ہے کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں[1]۔"

سید صاحب ہی کو ۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالتِ نزع میں ہے غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے[2]۔"

<u>جدید معاشرتی نظام کی تلاش</u>

ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں :

"میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید، ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے[3]۔"

اقبال کے متعلق اکثر یہ کہا گیا ہے کہ وہ جنگ کے حامی ہیں لیکن انھوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی ہے[4]۔ امن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابندی نہ ہو امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ اقبال نے

---

[1] اقبال نامہ، ص ۱۴۷۔ [2] ایضاً، ص ۲۸۱۔ [3] ایضاً، ص ۲۷۲۔ [4] ایضاً، ص ۲۰۳ و ۲۰۴۔

اپنے خطوں میں خودی[1]، سخت کوشی[2]، فقر پسندی[3]، غلامی[4]، وطنیت[5] اور مادیت[6] پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کوئی ادا شناس مبصر جو اقبال کے ذہنی افق کو دیکھنا چاہتا ہے وہ ان خطوں سے قطع نظر نہیں کرسکتا۔

سیرت و شخصیت

اقبال کے خطوط ان کے سوانح نگار کے لیے بھی بے حد اہم ہیں۔ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا لیکن وہ اسے برابر وسیع کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ جو خطوط انھوں نے سید سلیمان ندوی اور دوسرے علما کو لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں علم کی کرید اور تحقیق کی لگن تھی۔ وہ عمر بھر سیکھنے اور سمجھنے میں لگے رہے۔ وہ اپنے تنقید نگاروں سے خفا نہیں ہوئے بلکہ ان سے استفادہ کیا۔ انھوں نے سید سلیمان ندوی اور نواب حبیب الرحمٰن خاں کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اس تعریف سے ان کا مرتبہ گھٹا نہیں بلکہ بڑھ گیا ہے۔ ان کے بعض کم نظر نیاز مندوں نے صرف اسی وجہ سے ان کے کچھ خطوط اقبال نامہ سے خارج کر دیئے ہیں، حالانکہ دوستوں کی عظمت کا اعتراف کرنے سے اقبال کی عظمت گھٹتی نہیں، بڑھ جاتی ہے۔

اقبال نے سخن شناسوں کی تنقید سے ہمیشہ استفادہ کیا ہے۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

> "لفظ چبھ کے لئے میں خصوصیت سے آپ کا مشکور ہوں کیوں کہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی ...... آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں۔ اگرچہ جلسہ میں ہر طرف سے لوگ حسب معمول ان کی تعریف کرتے تھے مگر جو مزہ آپ کی داد سے ملا ہے اسے میرا دل ہی جانتا ہے[7]۔"

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے۔ نظر ثانی کے وقت آپ

---

[1] اقبال نامہ، ص ۲۰۲ و ۲۰۴۔ [2] ایضاً، ص ۹۸ و ۱۰۰۔ [3] ایضاً، ص ۲۰۶۔ [4] ایضاً، ص ۲۰۱۔
[5] ایضاً، ص ۲۴۰۔ [6] ایضاً، ص ۳۱۹۔ [7] ایضاً، ص ۸۔

کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔"[1]

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کے بعد آپ استاذالکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔"[2]

سید صاحب کو ایک اور خط میں تاکید کرتے ہیں کہ غلطیوں سے آگاہ کیا جائے "صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔"[3]

یہ بات اقبال نے رسماً نہیں لکھی تھی جب ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا اور سید سلیمان ندوی نے اغلاط نہیں لکھے تو انھوں نے دوبارہ توجہ دلائی۔

"رموزِ بے خودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہوگیا امید کہ توجہ فرمائی جائے گی۔"[4]

اقبال کی سیرت کی ایک اہم خصوصیت ان کی وسیع القلبی ہے۔ انھوں نے اپنے معاصرین کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے جتنے مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں ایک خط بھی ایسا نہیں جس سے ہم عصرانہ چشمک کا اظہار ہو۔ اس اعتبار سے وہ اپنے معاصرین سے بہت بلند تھے۔ سید سلیمان ندوی کو انھوں نے "استاذالکل"[5] اور "علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد"[6] کہا ہے اور ان کے علمی کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔"[7]

سید صاحب نے پیام مشرق کی تعریف کی، اس کے شکریے میں لکھتے ہیں:

"مگر میرے لئے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابل افتخار ہے۔"[8]

---

[1] اقبال نامہ، ص ۵۔ [2] ایضاً، ص ۸۰۔ [3] ایضاً، ص ۸۱ و ۸۲۔ [4] ایضاً، ص ۸۴۔ [5] ایضاً، ص [6] ایضاً، ص ۱۶۶۔ [7] اقبال نامہ، ج اول، [8] ایضاً، ص ۱۲۰۔

اقبال کے خطوں سے ان کی محبت، نیک نفسی اور دردمندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ یہ دردسوز شاعری کی جان اور انسانیت کا جوہر ہے۔ شاد کو لکھتے ہیں :

"مجھے جو خلوص سرکار سے ہے اس کا راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ یہ راز مضمر ہے اُس دل میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے، سرکار کی قبائے امارت میں میرے دل کو مسرت ہے، مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے۔ اور اُس چیز پر جاکر ٹھہر جاتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے۔ الحمد للہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں۔ اور نہ انشاءاللہ ہوگا۔ انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا خلوص پروردۂ اغراض و مقاصد ہو جائے۔[1]"

لیڈی مسعود کو راس مسعود کی وفات پر تعزیت کا خط لکھا ہے۔ چند سادہ سے لفظ ہیں لیکن ان میں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے :

"میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیوں کر کروں جب کہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔ مرحوم سے جو میرے قلبی تعلقات تھے ان کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اس بنا پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔[2]"

اقبال کی زندگی کے بہت سے حالات پردۂ خفا میں ہیں لیکن انھوں نے جو خطوط عطیہ بیگم فیضی کو لکھے ہیں ان سے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور یہ شراب، جام بلور کے باہر بھی عکس ریز ہونے لگتی ہے۔

اقبال نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کا ذکر شاد کے نام ایک خط میں کیا ہے :

"اس عرصہ میں بہت سے آلام و مصائب کا شکار رہا۔ بیوی کا انتقال ہوگیا

---

[1] شاد اقبال، ص ۳۳۔ [2] اقبال نامہ، ص ۳۹۱۔

جس سے اب تک قلب پریشان ہے۔ دوسری بیوی کے ہاں خدا کے فضل و کرم سے لڑکا ہوا جس سے کسی قدر تلافی ہوئی۔ خدائے تعالیٰ کا شکر ہے۔ خوشی ہو یا غم، سب کچھ اسی کی طرف سے ہے اور

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

بچہ کا نام جاوید رکھا گیا ہے۔[1]" (خط مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۴ء)

لیکن پہلی بیوی سے ان کے تعلقات شگفتہ نہیں رہے۔ وہ اس قیدِ گراں بار سے سخت پریشان تھے اسی لیے نہ وہ ملازمت کے خواہش مند تھے اور نہ ہندوستان میں رہنے کے۔ عطیہ کو لکھتے ہیں: (عطیہ کے نام خطوط)

"ہاں میں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں فلسفہ کی کرسی صدارت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چند روز پہلے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی کرسیِ صدارت بھی پیش کی گئی تھی لیکن میں نے قبول نہیں کی۔ دراصل میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھ پر اپنے بھائی کی طرف سے اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے جو مجھے باہر جانے سے روک رہا ہے۔ میری زندگی حد درجہ قابلِ رحم ہے۔ مجھ پر خواہ مخواہ بیوی ٹھونسی جا رہی ہے۔ حالانکہ میں نے والد صاحب کو لکھا ہے کہ میرے انکار کے باوجود آپ کو شادی کے انتظامات کرنے کا کیا حق ہے۔ میں اُسے گزارا دینے کو تیار ہوں۔ لیکن اسے پاس رکھ کر میں اپنی زندگی کو عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ ایک انسان کی حیثیت سے میرا حق ہے کہ اپنی خوشی اور مسرت کا خیال رکھوں لیکن قدرت یا سماج اسے چھیننا چاہتی ہے۔ میں دونوں کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ میرے سامنے اب ایک ہی راستہ ہے۔ اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا جاؤں یا شراب میں پناہ لوں تاکہ خودکشی میں آسانی ہو۔ مجھے ان خشک کتابوں کے ویران صفحات سے مسرت

---

[1] شاد اقبال، ص ۱۶۲۔

نہیں ہوسکتی۔ میری روح میں ایک شعلۂ جوالا بھڑک رہا ہے جو ان کتابوں اور سماجی بندھنوں کو پھونک دینے پر قادر ہے۔ ایک اچھے خدا نے یہ سب پیدا کیا ہے۔ آپ یہی کہیں گی نا، ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن اس زندگی کے حقائق بالکل دوسرے نتائج کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ عقلی طور پر ایک قادر مطلق اہرمن کا تصور یزداں سے آسان ہے۔ مجھے اس گفتگو کے لئے معاف کیجئے گا۔ مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چند سطریں محض اپنے آپ کو سبکبار بنانے کے لئے لکھی ہیں[۱]۔" (خط مورخہ ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء)

اقبال نے اس خط میں امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا اور وہ خدا کی رحمت کے بجائے اہرمنی تصور میں پناہ لینے لگے تھے لیکن یہ کیفیت عارضی اور ہنگامی تھی۔ اگلے ہی خط میں انھوں نے اس کمزوری پر قابو پالیا اور ان کا لب ولہجہ سنبھل گیا۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر مس عطیہ۔ آپ کے ڈھارس بندھانے والے الفاظ کا شکریہ۔ آپ کے خط سے مجھے بڑا سکون پہنچا۔ آپ نے لکھا ہے میں بہت سے سوال کرنا چاہتی ہوں تو پوچھئے نا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتا۔ اور ایسا کرنا ایک گناہ سمجھتا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے خطوط اطمینان بخش نہیں ہوتے۔ لیکن ان اسباب کی بنا پر جن کا آپ نے گزشتہ خط میں حوالہ دیا ہے ایسا ہونا لازمی ہے۔ بھول جانے کا الزام مجھ پر نہ لگائیے۔ میں بھولتا نہیں آپ سے صرف اس لئے جواب سننا چاہتا ہوں کہ دیکھوں آپ کس طرح جواب دیتی ہیں۔

کل رات میں جنت میں گیا تھا، راستہ میں دوزخ کے دروازے سے ہو کر گزرنا پڑا۔ میں نے اس مقام کو بے حد سرد پایا۔ جب میں نے حیرت کا اظہار کیا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ مقام اپنی ذات سے بے حد سرد ہے

---

[۱] اقبال از عطیہ بیگم، ص ۳۶ و ۳۸۔

لیکن بعد کو بہت زیادہ گرم ہو جائے گا کیوں کہ ہر شخص دنیا سے اپنی آگ اپنے ساتھ لائے گا چنانچہ میں بھی اس ملک میں جہاں کوئلہ کی کانیں یوں بھی کم ہیں زیادہ سے زیادہ دہکتا ہوا کوئلہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں۔

چیف کورٹ کے بار روم میں عبدالقادر سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے مگر عرصے سے آپ کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اب میں دوسروں سے بات چیت نہیں کرتا۔ میری اپنی ذات، پریشان خیالات کی کان ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ خیالات میری روح کے گہرے اور تاریک سوراخوں سے سانپوں کی طرح نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں سپیرہ بن جاؤں گا۔ گلی گلی گھوما کروں گا اور شوقین بچوں کے گروہ میرا تعاقب کریں گے۔

یہ خیال نہ کیجئے کہ میں قنوطی ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مصیبت میں انتہائی لذت ہے۔ میں اپنی بدنصیبی سے محظوظ ہوتا ہوں۔ اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو اپنے آپ کو خوش سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ میں کس طرح اپنی مسرت کے سامان فراہم کر لیتا ہوں[1]"

عطیہ بیگم نے لکھا ہے کہ اپریل ۱۰ سے جولائی ۱۱ء تک اقبال کی زندگی مختلف افکار اور آلام کا ہدف رہی ہے۔ اس کا اثر ان کے خیالات اور تخلیقات پر بھی پڑا۔ وہ شیلے اور بائرن کے بجائے نطشے اور شوپن ہار میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ان کے یہاں مسرت کی ترنگ کے بجائے فلسفیانہ گہرائی آتی جاتی ہے۔ ان ہی مصائب نے ان کی خودی کے گہر کی پرورش کی اور ان کو "منکر خویشتن مشو" کا سبق سکھلایا۔

اصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں اقبال مختلف قسم کی پریشانیوں میں گرفتار تھے۔ ان میں مالی پریشانیاں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ ان کا ارادہ یہ بھی تھا کہ حیدرآباد جائیں اور جا کر نوکری کر لیں لیکن عطیہ بیگم نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی دیسی ریاست میں جا کر پھنسیں۔ اور اپنے اعلیٰ مقاصد کو بھول جائیں۔ ۱۰ اپریل ۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم، ص ۴۱ و ۴۳۔

"میں نے یہ کہاں کہا ہے کہ نظام کا میرے کمالاتِ علمی کا اعتراف کرنا باعثِ اعزاز ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے شاعر کی حیثیت سے جانے۔ ... میں شاعری کے لئے اپنے اندر کوئی جوش و خروش نہیں پاتا اور اس کی ذمہ دار آپ کی ذات ہے۔ ....

میرے پاس ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے خط آرہے ہیں کہ اپنا مجموعہ چھپوادوں۔ ایک صاحب نے جن سے غالباً آپ مل چکی ہیں، یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ میرا سب کام کردیں گے یعنی اس پر مقدمہ لکھوادیں گے۔ ہندوستان کے سب سے اچھے پریس میں چھپوادیں گے اور جرمنی میں اس کی جلد بندھوادیں گے لیکن شاعری کے لئے اب میرا جی نہیں چاہتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میری لیلیٰ سخن کو ہلاک کردیا ہے اور میرے تخیل کی ساری رنگینیاں ختم ہوگئی ہیں[1]۔"

۷رجولائی ۱۹۱۱ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود پریشانیوں کے اقبال نے اس عارضی صورتِ حال پر قابو پالیا ہے اور وہ مجموعہ چھپوانے کے انتظامات میں مصروف ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے کرم ناموں کا اب تک جواب نہ دے سکا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے دنوں بے حد پریشان رہا۔ میری بدنصیبی وفادار کتے کی طرح میرا تعاقب کرتی رہی ہے۔ اسی لئے مجھے بھی بدنصیبی سے محبت ہوگئی ہے۔ تفصیل پھر لکھوں گا۔

اپنی نظموں کی ایک نقل آپ کو بھجوانے میں مجھے خوشی ہوگی .... (لیکن) آپ میری نظمیں لے کر کیا کریں گی۔ یہ میرے دکھے دل کی پکار ہیں..... مجھے نظموں کے انتخاب میں بے حد مشکل پیش آرہی ہے۔ گذشتہ ۵ و ۶ برس کے عرصہ میں جتنی بھی نظمیں کہی ہیں وہ نجی حیثیت رکھتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ عوام کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی ہے[2]۔"

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم، ص ۶۳ و ۶۸۔ [2] ایضاً، ص ۷۱ و ۷۲۔

عطیہ بیگم کے نام جو آخری خط دستیاب ہوا ہے وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر صرف یہ شعر درج ہے :

"پرائیوٹ

عالم جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

محمد اقبال۔ بمبئی۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو خط کتابت اقبال نے عطیہ بیگم کے ساتھ ۱۹۰۹ء میں شروع کی تھی وہ ۲۲ سال میں فلسفۂ حیات کی بہت سی منزلوں کو طے کر چکی تھی اس لیئے کہ (بقول نیاز فتح پوری) شاعر کی دنیا میں بسا اوقات اظہارِ حال مستفسرانہ انداز میں بھی کیا جاتا ہے[۱]

اقبال کے خطوں میں عبارت اور اشارت کے محاسن نہیں ہیں۔ خالص انشا اور ادب کے نقطۂ نظر سے ان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ اکثر جگہ ان میں زبان اور بیان کی غلطیاں بھی ہیں۔ ان خطوں میں حالی کی نثر کا سا وہ حسن بھی نہیں ہے جس کی آب و تاب زمانہ کے انقلاب میں بھی قائم رہتی ہے۔ لیکن (بقول آل احمد سرور) وہ مجنوں کے خطوط نہیں ہیں جو کسی لیلیٰ کے جواب میں لکھے گئے ہوں۔ ان میں البیلا پن رنگینی اور شوخی نہ سہی، خیال کی گہرائی اور عظمت ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کس طرح لکھے گئے ہیں۔ ان میں خیال اور فکر کی وہ خوبصورتی ہے جو گہرے سمندر سے حاصل کیئے ہوئے موتی میں ہوتی ہے۔

---

[۱] رسالہ نگار لکھنؤ، ج ۵۸، ص ۱۔ [۲] اُردو دہلی، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۳۳۔

باب پنجم

شبلی اور مہدی

انیسویں صدی میں مسلمانوں کے اندر جو معاشرتی تعلیمی اور ادبی شعور نظر آتا ہے اس کا نقطۂ آغاز سرسیّد کی ذات ہے۔ ان کی تحریک نے غور و فکر کے نئے سانچے اور ترقی کے نئے معیار پیدا کیے۔ جدید اصولوں کو رائج کیا اور پرانے اصنام خیالی کو توڑ دیا۔ تعلیم میں، اصلاحِ معاشرت میں، ادب میں، جہاں کہیں پچھلی صدی میں کسی صحیح حرکت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اس کا سلسلہ سرسیّد ہی سے ملتا ہے۔ شروع میں ان کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ بعد میں شدت سے تائید۔ لیکن اس درمیان میں شبلی[۱] جیسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو قدیم و جدید میں اختلاط و آمیزش کے خواہشمند تھے اور کسی ایک چیز کو من و عن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ہر ادبی کارنامہ ایک خاص ذہن ایک خاص شعور رکھتا ہے۔ یہ ذہن ہوا میں لٹکا ہوا طلسمی گنبد نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ کا ایک خاص نقطہ ہے۔ اس کی حد بندی اور ترقی میں عمرانی قوتوں نے حصہ لیا ہے۔ اسی لیے ہمیں خارجی ماحول کو جاننے کے بعد فنکار کی نجی دنیا کا عرفان حاصل کرنا چاہیے کیونکہ خارجی اور داخلی ماحول کے عمل اور ردِ عمل ہی سے وہ سانچہ تیار ہوتا ہے " جس میں فنکار کا مخصوص ادراک اپنے آپ کو ڈھالتا ہے جس سے اس کا مخصوص مزاج نیا آب و رنگ پاتا ہے اور جس سے اس کے مخصوص شعور کی سمت متعین ہوتی ہے۔"

---

[۱] شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷ء)

اس اصول کے پیش نظر اگر دیکھا جائے تو سرسید اور حالی کے خطوں میں ایک قسم کی یکسانیت ملے گی۔ رنگارنگی نہیں درد اور خلوص کا ایک دریا ہے جو وقار کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ نہ سختی ہے نہ درشتی۔ نہ لاگ ہے نہ لپٹ۔ ان کا ظاہر اور باطن یکساں ہے۔ جو پرائیویٹ زندگی ہے وہی پبلک۔ چناں کہ می نمایم ہستم۔ سرسید اور حالی کی شخصیت سادہ اور یک رنگ ہے۔ لیکن قومی محبت کا یہ رنگ اتنا گہرا ہے کہ ساری شخصیت اسی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اکبر اور شبلی ان سے مختلف ہیں۔ اکبر کی نجی زندگی بڑی پُرآشوب تھی۔ خانگی راحت ان کی قسمت میں نہیں تھی۔ تاریخی قوتوں کے اس سیلاب میں جو ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا ان کے پیر اکھڑ گئے تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ محض زبان کی تلوار سے زمانے کا رُخ بدل دیتے۔ لیکن زمانے کی قوت بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ انھیں خود اس کا احساس تھا کہ "آئی ہوئی ٹلتی نہیں" اور ان کی نظمیں انقلاب کی آئینہ بردار نہیں" انقلاب کی یادگار ہیں۔ ان کی بے چین اور محروم فطرت کو ہم آہنگی نہ داخلی ماحول میں مل سکی اور نہ خارجی ماحول میں۔ اس مستقل اندرونی پیکار اور مسلسل آہ اور کراہ نے طنز کی صورت اختیار کرلی۔ ان کی شگفتگی دراصل افسردگی کا ایک غلاف ہے۔ شاعری میں یہ غلاف قائم رہتا ہے لیکن خطوں میں اتر جاتا ہے اور ان کی ڈری ہوئی اور کھنچی ہوئی شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ان کی مذہبیت ایک ٹیک ہے جو ان آندھیوں میں ان کے کمزور وجود کو سہارا دیتی ہے۔ ان کی خانقاہیت ایک دیوار ہے جس سے وہ اپنی دکھتی ہوئی پیٹھ لگا سکتے ہیں۔ اس سے ان کی زندگی کا نہ سہی عاقبت کا راستہ ضرور روشن ہو جاتا ہے۔ اقبال نے محسوس کیا کہ ان ہنرِوروں کا تخیلی عشق و مستی کا جنازہ ہے اور ان کے جام و سبو میں گریۂ طفل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ سوزشِ جگر کے ساتھ دلِ باخبر ضروری ہے اور اضطرابِ موج کے ساتھ سکون گہر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوں میں ایسا نغمہ ہے جو لالہ و گل کی آگ بھڑکا دے اور ایسا ذہن ہے جو نئے چراغوں کو روشن کردے۔ ان خطوں سے اقبال کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن پوری شخصیت کا نہیں بعض

ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر تہہ بہ تہہ نقاب پڑے ہوتے ہیں۔ بقول آلِ احمد سرور "ایسے چکنے ہاتھ میں آتے آتے پھسل جاتے ہیں"۔ عالمِ استغراق کے اس لمحۂ تنویر میں بھی جب ہم ان کی روحوں سے حجابات کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں ہماری محرومی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ "دھند شوق والے رخصت نظر نہ دھند" اقبال بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جو صرف اپنا دماغ دکھاتے ہیں دل نہیں۔

شبلی کی زندگی سرسید اور حالی کی طرح سادہ سپاٹ اور یک رنگ نہیں تھی۔ وہ الفاروق اور سیرت النبی کے مصنف ضرور تھے لیکن شاعر بھی تھے۔ مولویوں میں ضرور رہے لیکن زاہد خشک نہیں تھے۔ مومن کی طرح ان کی زندگی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ موخر الذکر شاہ عبد القادر دہلوی کے شاگرد شاہ عبد العزیز کی مجالس وعظ کے حاشیہ نشین مولوی سید احمد کے مرید اور مولوی اسماعیل شہید کے ہم سبق تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ "ہجر پردہ نشین" میں مرتے تھے اور کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے آمادہ تھے۔ وہ مثنوی جہادیہ ہی لکھ سکتے تھے اور "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے گیت بھی گا سکتے تھے۔ اسی وقت رندی و زہد میں وہ تضاد نہیں تھا جو آج ہے[1] روزہ داری اور شراب خوری ساتھ ساتھ ممکن تھی اور بخشائش کے عجیب عجیب بہانے ڈھونڈے جاتے تھے۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست زصہبا کشودۂ (غالب)

سماج کا معیار ہی یہ تھا اور ان اعمال کے متضاد پہلوؤں پر کسی کی نظر نہیں جاتی تھی۔

<u>شبلی کا اندرونی تضاد</u>

شبلی کے اندرونی گوشوں میں بھی تضاد ہے۔ وہ علما کی رہنمائی کرتے ہیں اور اپنی تاریخوں کے ذریعے ماضی کو دوبارہ عالمِ وجود میں لاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ

---

[1] نیا ادب (حلقۂ ادب لکھنؤ) انیسویں صدی کے اردو ادب کا سماجی پس منظر از فیض احمد فیض۔ ص ۲۶

داغ کے شعروں اور پیام یار کی غزلوں پر بھی سر دھنتے ہیں۔ شبلی کے یہاں اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے جذبے کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کا رومان بھی ہے۔ انھوں نے سیرت النبی اور ندوہ کے موسس ہونے کے باوجود اس قسم کے شوخ اشعار بھی کہے ہیں۔

بے حاصلی نگر کہ بپایں دوری از رخش
صد جائے بہر بوسہ نشاں کردہ ایم

اور حدیث و فقہ کی درس و تدریس اور فرشتوں سے سرگوشیوں کے باوصف آشوبگاہ بمبئی میں اپنے زہد کو عاشقی سے آشنا کر دیا ہے۔ اور اس پر فخر کیا ہے کہ

سنگ بر تیشہ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام

اس سے شبلی کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ بلکہ ان کی بھرپور بشریت کا نقش اور گہرا بیٹھ جاتا ہے۔

شبلی کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

(۱) مکاتیب شبلی جلد اول و دوم

(۲) خطوط شبلی

مکاتیب میں وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں عزیزوں اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں اور خطوط میں وہ مکتوبات بھی شامل ہیں جو انھوں نے بمبئی کی عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام لکھے ہیں۔

موخر الذکر مجموعہ بہت کچھ بحث و تمحیص کا موضوع رہا ہے۔ یہ خطوط ۱۹۳۵ء میں محمد امین زبیری نے شائع کیے اور مولوی عبدالحق نے اس پر مقدمہ لکھا جو شبلی سے کبھی خوش نہیں رہے۔ اس کے بعد حیات شبلی شائع ہوئی اور ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی اکادمی الہ آباد نے اسے اول انعام بھی دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوئی ہوئی مخالفتیں جاگ اٹھیں۔ اور سید سلیمان ندوی اور ان کے بعد شبلی کی ذات پر پے بہ پے حملے ہونے لگے۔ نگار میں سید سلیمان ندوی کے خلاف مضامین نکلے۔ رسالہ کتاب لاہور میں عبدالوحید قریشی نے ایک تفصیلی مضمون "شبلی کی حیات معاشقہ" کے

عنوان سے لکھا[۱]۔ اس کے بعد محمد امین زبیری نے سید سلیمان ندوی کا وہ خط شائع کر دیا جو انھوں نے یادِ ایام کے مولف مولوی عبدالرزاق کے نام لکھا تھا[۲]۔ یادِ ایام میں مصنف نے ان تمام مشاہیر اہل علم و قلم کا ذکر کیا ہے جن سے وہ خود مل چکے ہیں اور اس سلسلے میں مولانا شبلی کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا تھا وہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کے پاس بھی بھیج دیا تا کہ مولانا شبلی کے شاگرد خصوصی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی اس کو دیکھ لیں۔ اس میں سید صاحب نے لکھا تھا کہ "(محبت کے) گناہ کا ستر چاہیے نہ کہ تشہیر" اس کے بعد گویا ساقی کوثر سے فتوی مل گیا۔ اور لوگوں نے خوب خوب حاشیہ آرائیاں کیں۔ خالد حسن قادری اور غلام ربانی عزیز نے نگار میں مقالات لکھے[۳] امین زبیری نے حیات شبلی پر معاندانہ تبصرہ کیا۔ ایک گمنام ٹریبونل آف جسٹس بیٹھا۔ نیاز صاحب نے اس پر محاکمہ کیا۔ شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ شائع کیا۔ اور اس میں خوب دل کھول کر شبلی کی تنقیص کی اور سب سے آخر میں عطیہ بیگم نے یہ لکھ کر کہ علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی ظاہر نہیں ہوتی[۴] گویا شبلی کی ہوس کاری اور بد طینی پر مہر توثیق ثبت کر دی۔

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

شبلی کے تعلقات فیضی بہنوں سے

شبلی اور فیضی خاندان کے تعلقات کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب شبلی ۱۸۹۲ء میں استنبول گئے تھے اور فیضی بہنوں کے والد حسن آفندی مرحوم نے جو بارگاہِ سلطانی میں رسوخ رکھتے تھے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تعارف خاص حلقوں میں کرایا تھا[۵] لیکن یہ تعلقات ۱۹۰۶ء میں استوار ہوئے اور پھر بڑھتے ہی رہے۔ عطیہ نے لکھا ہے:

"(لکھنؤ میں) شیخ مشیر حسین قدوائی بار ایٹ لا و تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانہ پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے۔ ہم بہنیں

---

[۱] رسالہ کتاب لاہور، اپریل ۴۵ء۔ [۲] نگار لکھنؤ، اکتوبر ۴۵ء۔ [۳] نگار، اگست ۲۶ء۔
[۴] ادبی دنیا لاہور، جون ۲۶ء۔ [۵] شبلی نامہ، ص ۲۷۳۔

ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک پرانے
خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے۔ ہم سب نے
بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا
اور جب وہ واپس ہوئے تو سلسلۂ خط و کتابت جاری ہوگیا۔[1]

چھوٹی بہن عطیہ کے نام ان کا پہلا خط ۱۷ر فروری ۱۹۰۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ ان خطوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرا سے زیادہ انھیں عطیہ سے تعلق خاطر تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں "آپ" کی بجائے "تم" کا لفظ لکھوں گا۔ "آپ" کے لفظ میں بیگانہ پن ہے۔"[2]

شبلی کی مراسلت دونوں بہنوں سے تھی لیکن وہ عطیہ کے خطوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔

"تمھارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ آنکھوں سے لگالیا۔ دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔ افسوس دیر تک ملنے کی امید نہیں۔ میں وطن احباب و آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیونکر چھوڑ دوں ورنہ بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر تھے۔"[3]

شبلی کو ان دونوں بہنوں سے محبت ان کے کمالات کے سبب سے تھی اور انھوں نے کبھی قومی کاموں کو اس محبت کے اوپر قربان نہیں کیا۔ ۹ر جون ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"عزیزی اب تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پالی ٹیکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات میں نے حیدر آباد اور الہ آباد بھیجے۔
ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ

---

[1] شبلی نامہ، ۲۷۳۔ [2] خطوط شبلی، ص ۴۲۔ [3] ایضاً، ص ۵۰۔

تم کو پوجیں واناا ول العابدین (اور میں تمھارا پہلا پجاری ہوں گا) ......
اگر بالفرض تم کبھی لکھنؤ آؤ تو موسیقی کو ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو جن سے سیکھنا
عیب میں داخل نہ ہو۔ بیشک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات
ہے۔ وہ لوگ سوسائٹی سے خارج ہیں ..... تم نے یہ اچھا کیا کہ ایک عملی
کام ہاتھ میں لیا۔ خالی خیالات سے کچھ فائدہ نہیں۔ تمھارے کمالات پر حیرت زدہ۔

شبلی" [1]

<u>حدیث دیگراں سے سر دلبراں شبلی کی سیرت</u>

ان خطوں کے ذریعہ عبدالوحید قریشی اور بعض مقالہ نگاروں کو آرائشی گفتار کا ایک سرمایہ بہم پہنچا ہے۔ انھوں نے خطوں کے فقرے بیچ میں سے نکال کر اور سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کر دیئے ہیں اور اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شبلی کا دامن جنسی محبت سے آلودہ تھا اور وہ چشم بد بیں رکھتے تھے۔ وہ یہ بالکل بھول گئے ہیں کہ شبلی کو فیضی بہنوں سے تعلق خاطر محض ان کے کمالات کی وجہ سے تھا۔ عطیہ بیگم کی حیثیت ایک آئیڈیل خاتون کی سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی رایوں کے اقتباسات دوستوں کو بھیجتے تھے اور ان کے خطوط بلا تکلف اپنی بیٹی کو پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میری لڑکی علاج کے لئے آئی ہے وہ تمھارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے اس کا بھی یہی جواب دیا ہے کہ وہ عورت کب ہیں" [2]

شبلی کے متعلق خورشید الاسلام نے صحیح لکھا ہے کہ وہ پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے[3]۔ محبت کا جذبہ ان کے خمیر میں داخل تھا۔ ان کے دیدہ ور اور اہل نظر ہونے میں شبہ نہیں۔ جہدی افادی نے لکھا ہے :

"حسن کہیں ہو کسی حیثیت سے ہو فطرت کا وہ پاکیزہ مظہر ہے جس سے حافظ

---

[1] خطوط شبلی، ص ۶۶، ۶۷۔ [2] ایضاً، ص ۷۲۔ [3] نگار، ج ۵۴، ش ۶، ص ۹۔

کی شراب معرفت کی طرح قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔ مولانا (شبلی بھی) ادبی حیثیت سے اس کا صحیح مذاق رکھتے تھے۔[1]

شبلی آلودگیوں کے ڈر سے دامن سمیٹے نہیں رہے۔ آلودگیوں نے ان کا دامن تر کیا لیکن دامن پکڑا نہیں۔ اس کا اندازہ ایک دلچسپ واقعے سے ہوگا۔ عطیہ کی بڑی بہن ہزہائی نس رفیعہ نازلی بیگم شبلی کی بڑی معتقد تھیں اور اسی لیے انھوں نے ندوہ کے لیے ایک گراں قدر رقم عنایت کی تھی۔ شبلی نے اس کے شکریے میں ایک قطعہ لکھا اور اس کے ایک شعر میں عطیہ بیگم کا نام بڑی خوبی سے کھپایا۔ وہ شعر یہ ہے :

نازم کہ ایں عطیۂ فیض امیر است
کاوازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

شبلی اس کے متعلق عطیہ کو لکھتے ہیں :

"شعرا اور اہلِ ادب عموماً کنایہ سے نام لینا نہایت بلاغت اور لطافتِ خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ جہانگیر بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے عموماً نورجہاں بیگم کا نام لاتے تھے۔ لیکن ہمیشہ کنایۃً کبھی کسی نے تصریح نہیں کی مثلاً سعیدا کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :

اے سایۂ خدا ز تو پر نور شد جہاں
بادا ہمیشہ نورِ خدا سائبان تو

اسی اصول پر میرا شعر بھی ہے اور یوں تو فراحتہً تمھارے لئے دداعیہ غزل خیر مقدم وغیرہ سب لکھ چکا ہوں اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمھاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے[2]۔"

عطیہ بیگم نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد ان کی ہمشیرہ رفیعہ نازلی بیگم سے رکھوایا جائے لیکن ندوۃ کے مقدسین اس کے لیے راضی نہیں تھے۔ جب شبلی نے مولویوں کی برہمی کا عذر پیش کیا تو عطیہ نے انھیں بدہمتی کا طعن دیا۔

---

[1] افادات مہدی۔ [2] خطوط شبلی، ص ۸۷۔

اس کے جواب میں شبلی نے اپنی پوزیشن کو اس طرح واضح کیا کہ نہ تردامنی کی گرانی باقی رہتی ہے اور نہ خشک دامنی کی سبک سری۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے میزانِ قدر میں ندوہ کی کتنی اہمیت تھی۔

"تم کہتی ہو کہ میں بدہمت ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔ خیر یہ بار بار کہنے کی بات نہیں۔ اس سے فخر کی بو آتی ہے اور اس کو میں ناپسند کرتا ہوں[1]۔"

ڈاکٹر عبدالحق نے شبلی کی اس مصلحت شناسی کو ان کی کمزوری پر محمول کیا ہے اور لکھا ہے کہ پاک نفوس صداقت کی خاطر آبرو دولت اور جان سے قربان کر دیتے ہیں ..... میں مولانا کے اس عذر کو قابلِ قبول خیال کرتا ہوں۔ یہ کم سے کم صداقت پر ضرور مبنی ہے .... (مگر) بات یہ ہے کہ وہ مولویوں کے گروہ سے بھی الگ نہیں ہونا چاہتے تھے اور اصلاح بھی چاہتے تھے اور یہ ناممکن تھا[1]۔

ان مخصوص تاریخی حالات سے جن میں شبلی کام کر رہے تھے ان کی کمزوری کے بجائے ان کی مجبوری اور راہ کی دشواری کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اس وقت کوئی انتہاپسندانہ یا مجاہدانہ اقدام یقیناً ندوہ کی تحریک کے لیے مضر ہوتا۔ اس کی تائید دوسرے خطوں سے بھی ہوتی ہے۔

"جناب بیگم صاحب نے ندوہ کی جو اعانت کی بدل اس کا مشکور ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ دارالعلوم کی جدید عمارت ان کے ہاتھ سے کھلتی لیکن قوم میں اتنی وسیع الخیالی نہیں آئی۔ عطیہ کو لوگوں نے جلسہ میں نہ آنے دیا تو یہ تجویز کب منظور کریں گے حالاں کہ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں[3]۔"

---

[1] خطوطِ شبلی، ص ۸۰۔ [2] ایضاً، ص ۱۹۔ [3] ایضاً۔

ان مولویوں کی ذہنیت کا اندازہ شبلی کے اس بیان سے ہوگا۔

"پسرِ ناظم ندوۃ العلماء جا بجا خطوط بھجوا رہے ہیں کہ خط و کتابت میرے نام کی جائے۔ بھوپال سے جو ماہوار مقرر ہوئی تھی بیگم صاحب نے سند میں میرا نام لکھوا دیا تھا اور میرے ہی نام منی آرڈر آتا تھا۔ اب کی مہینے میں اپنے نام سے منگوایا ہے۔ ندوہ کے پاس مکان لے کر رہنا چاہتے ہیں لیکن یہ سب کیوں۔ علاوہ تمنائے نظامت کے اس لئے کہ تعمیر میں لکڑی وغیرہ ان کے کارخانے سے خریدی جائے۔ یہ ہیں ہمارے مقدسین[1]"

شبلی کے خلاف یہ فردِ جرم بھی ملاحظہ ہو۔

"فردِ جرم بہت بڑی ہے۔ خورد برد کا بھی الزام ہے۔ بھاول پور کے عطیہ کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے۔ گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط کتابت اکبر الجرائم قرار دی گئی ہے اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ۔ جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات الاولیا حق۔ حالاں کہ میں تو کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں۔ ہاں انھیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔ بھائی حقیقت یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا۔ کہاں تک صبر کروں[2]۔"

شبلی کے متعلق کوئی قطعی رائے ظاہر کرنے سے قبل اس زمانہ کی عامیانہ اور حاسدانہ ذہنیت کا ضرور خیال رکھنا چاہیے جس سے اخباری افق کی فضائے بسیط تیرہ و تار تھی۔ شبلی ابراہیم ادھم اور بایزید نہیں تھے۔ ان کے تنقید نگاروں نے ان کی بشریت کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کو نور و ظلمت اور سفید و سیاہ کے اس خوبصورت پس منظر میں نہیں دیکھا جس کا عکس ہر انسانی طبیعت میں موجود ہوتا ہے۔ خود شبلی کو بھی اپنے دستوں اور مخالفوں سے یہی شکایت تھی۔

"دونوں میری تصویر غلط کھینچتے ہیں۔ ایک فرشتہ بناتا ہے۔ ایک دیو لیکن ابھی

---

[1] مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۷۴۔ [2] مکاتیب شبلی، ص ۲۷۵، ج اول۔

تک تو میں انسان ہوں۔ ترقی و تنزل کی وہ دونوں منزلیں ابھی آگے ہیں[۱]۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"میں کچھ ابراہیم ادھم اور بایزید نہیں ہوں۔ میرا تو رُواں رُواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہوا ہے۔ لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں[۲]۔"

اس سلیقے کے لیے ایک خاص توازن کی ضرورت ہے۔ وہ ہر آرام چھوڑ سکتے تھے، ہر عیش کو تج سکتے تھے لیکن قومی کاموں کو چھوڑنا ان کو گوارا نہ تھا۔ شبلی کا یہ فخر بے جا نہیں ہے۔

"اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشہ پھر رہا ہے۔ خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں[۳]۔"

شبلی جذباتی آدمی تھے لیکن ان کو جذبات پر قابو رکھنے کی بھی بڑی صلاحیت تھی۔ عطیہ سے جو ان کو تعلق خاطر تھا وہ مسلّم ہے لیکن ہر خط میں سرابن شیشہ فرو بند کا اصول کارفرما ہے۔ کوئی بات اعتدال یا شاعرانہ شوخی سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ ان کا دل خلوص اور محبت سے معمور ہے لیکن اس دوآتشہ کا اثر ان حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔

"زہرا صاحب نے تھوڑی سی رد و کد کے بعد منظور کر لیا ہے کہ پھر کبھی لکھنؤ آئیں لیکن تم اتنی غریب نوازی کیوں کرو گی۔"

عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی۔"

ایک خط کے آخر میں بڑے شوق اور پیار سے لکھتے ہیں :

"میں وہی شبلی نعمانی ہوں۔"

عطیہ لکھنؤ آ کر مشیر حسین قدوائی کے یہاں ٹھہرنے والی تھیں شبلی کو یہ بات کیسے گوارا ہو سکتی تھی۔ باسایہ ترا نمی پسندم۔ فوراً عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں :

---

[۱] مکاتیب شبلی، ج دوم، ص ۲۲۳۔ [۲] ایضاً، ج ۱، ص ۱۷۰۔ [۳] ایضاً، ج ۱، ص ۱۷۰۔

" (مشیر حسین صاحب قدوائی) نے کہا کہ وہ میری مہمان ہوں گی۔ اس لئے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو میں اس زمانہ میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

دیکھیے کس طرح محبت کا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

" میرا ہر خط جواب طلب نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے لکھتا ہوں کہ تم کو میرا خط بار نہ گزرا کرے کہ ہر وقت لکھنے کی تکلیف ہوتی ہے۔ جب فرصت ہو اور جی چاہے جواب لکھو لیکن مجھ کو اجازت دو کہ میں ضرورت بے ضرورت جب جی چاہے لکھوں۔"

عطیہ یورپ جانے لگیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ بمبئی جا کر ان کو خدا حافظ کہیں لیکن رخصت کے وقت کا خیال آتا ہے تو ہمت نہیں پڑتی۔ لکھتے ہیں :

" کسی عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت میں تحمل نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ میں دور سے خدا حافظ کہوں۔ خدا کرے کہ جب واپس آؤ تو میں وہاں موجود ہوں۔ وہ البتہ مسرت بخش حالت ہوگی۔"

پھر لکھتے ہیں :

" باوجود اس کے کہ ولایت کی عین روانگی کے وقت میں بمبئی میں رہنا نہیں چاہتا تاہم چاہتا ہوں بمبئی آؤں اور روانگی سے پہلے اور کہیں چلا جاؤں۔"

وداعیہ نظم لکھ چکے ہیں لیکن چین نہیں آتا چنانچہ خط میں لکھتے ہیں :

" عزیزی الوداع۔ وداعیہ نظم پہنچی ہوگی۔ جانے سے پہلے ایک خط جس میں روانگی کی تاریخ اور وقت متعین ہو، آنا چاہیے۔ نظم کی رسید بھی۔ اچھا خدا حافظ۔

میروی و گریہ می آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد "

عطیہ کے یورپ سے واپس آنے پر لکھتے ہیں :

"ایک بے ریا دل ایک مخلص دل وفا شعار دل کی طرف سے مراجعت کی مبارکباد قبول ہو۔ میری زندگی کا یہ سخت افسوسناک واقعہ ہے کہ یہ مبارکباد میرے لب کے بجائے زبان قلم ادا کرتی ہے .... تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے۔ جس کے ساتھ ایک اور مختصر ہدیہ ہے۔ کیا تم ان دونوں حقیر چیزوں کو قبول کر سکتی ہو۔ شہنشاہ ایڈورڈ اور پریذیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبہ سے اُتر نہیں سکتا۔ ہاں یہ سچ ہے لیکن یاد رکھو آفتاب ذرّہ پر بھی چمکتا ہے۔ میں خود نہ آسکا۔ لیکن عن قریب اپنی ایک تصویر جو ۳۰ برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے۔ بھیجتا ہوں وہ میری قائم مقامی کرے گی۔"

ان الفاظ میں حسرت کے ساتھ ساتھ فرض شناسی اور خدمت قومی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

"میری زندگی کا یہ سخت افسوسناک واقعہ ہے کہ یہ مبارکباد میرے لب کی بجائے زبان قلم ادا کرتی ہے۔ واقعات ایسے ہیں کہ ان کے لئے یہاں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔"

شبلی عطیہ کے نام سے بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرہ بنوانا چاہتے تھے۔ اپنی کوئی گراں قدر تصنیف ان کے نام معنون کرنے کے خواہشمند تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ بیگم صاحبہ جنجیرہ ندوہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھیں لیکن مولویوں نے وہ قیامت برپا کی کہ شبلی کا ایک ارمان بھی پورا نہ ہو سکا۔

ان حالات میں جب ہم شبلی کے ان خیالات کا اندازہ کرتے ہیں جن کا اظہار ان خطوں میں ہوا ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے طبقے سے کتنے آگے تھے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے سوائے ان خطوں کے اور کہیں نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاموش اصلاح کے ضرور خواہشمند تھے لیکن بگیر و بزن کی ہمت ان کے اندر نہیں تھی۔ یہ خیالات وہ ہیں جن کا اظہار سرسید اور اقبال

نے بھی برملا نہیں کیا۔ لیکن "بدقسمتی یہ ہے کہ نئی زندگی کا یہ رومان کچے ریشمین دھاگوں سے بنا گیا ہے ..... وہ نئے میلان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن انھیں پھر کسی گوشہ میں شمس تبریزی کی عبا نظر آتی ہے اور وہ نئی دنیا پر عاجزانہ طنز کے ساتھ مسکرا کر اسے پہن لیتے ہیں[۱]۔"

شبلی نے ایک خط میں تعلیم نسواں کے نصاب پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"عورتوں کے لئے ایک نصاب ہو۔ یہ اصولی غلطی ہے جس میں یورپ مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونا چاہیے دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ اور بڑھتا جائے ..... البتہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں داخل ہونے چاہئیں۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے[۲] ہیں:

"عورتوں کے متعلق تمھاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیئے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی دلیری اور دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے بچے خاندان سے اجنبی ہو جاتے ہیں لیکن خاندان سے زیادہ چیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں مہات امور رک جاتے ہیں[۲]۔"

---

[۱] نگار، ج ۴۵، ش ۶، ص ۱۰۔ [۲] خطوط شبلی، ص ۶۶۔

اسی خط میں موسیقی کے متعلق لکھتے ہیں :

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں و انا اول العابدین[1]"

شبلی عورتوں میں کن صفات کو دیکھنا چاہتے تھے اس کے متعلق لکھتے ہیں :

"میری اسکیم یا تجویز جو آپ کے متعلق ہے وہ یورپ سے آنے کے بعد قابلِ اظہار ہو گی یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں لیکن اُردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے[2]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"جو خط ضائع ہو گیا۔ اس میں تم سے ایک پرائیویٹ بات پوچھنا چاہتا تھا یعنی یہ کہ تم نے اپنی زندگی کا ایم (مقصد) کیا قرار دیا ہے۔ کیا ریفارمیشن یا اشاعتِ تعلیم یا تصنیف و مضمون نگاری۔ اس میں پہلے مقصد کے سوائے جس کا میں اہل نہیں ہوں۔ باقی تمھارے مقصد میں تمھیں کافی مدد دے سکتا تھا[3]"

شبلی کا بس نہیں چلتا کہ عطیہ کو فارسی پڑھا دیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ولایت سے آجاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا استاد بنا دوں۔ گو خود شاگردی کے قابل نہیں۔"

بقول مولوی عبدالحق مولانا شبلی جیسے اکل کھرے اور تنگ مزاج یہ لکھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے اخلاص و محبت کی نوبت کہاں تک پہنچ گئی تھی۔ فرماتے ہیں :

"بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھا دوں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے۔ تاج گنج کی صناعیوں سے ایک گنوار بھی لطف اٹھاتا ہے لیکن وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی

---

[1] خطوطِ شبلی، ص ۶۵ ۔ ۶۰ ۔ ۶۴ ۔ [2] ایضاً ۔ [3] ایضاً ۔

جو ایک انجینئر اور ماہر فن کو ہوتی ہے۔ بوئے گل بھی اگر تم سمجھ کر پڑھو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں معلوم ہو جائیں لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے۔ میں عرش (جزیرہ) تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم عرش سے اتر نہیں سکتیں۔ تاہم نامیدی نہیں۔ کبھی تو ندوہ کے جھگڑوں سے فرصت ملے گی"

شبلی بے پردگی کو معیوب خیال نہیں کرتے۔ دیکھیے کس انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔

"ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ جامع عام میں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں۔ اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو"

ان خطوں میں کوئی بات ایسی نہیں جو قابل گرفت ہو بلکہ وہ حقیقتاً اچھے انسانی پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں لیکن نگار کے ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ

"جب شبلی کے وہ خط ہمارے سامنے آتے ہیں جو انھوں نے اپنے بے تکلف احباب کو لکھے ہیں اور اس میں کافروں اور ظالموں کا ذکر بھی کرتے ہیں تو ہمیں سخت حیرت ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور ہماری نگاہیں جھک جاتی ہیں[1]"

آئیے اتمام محبت کے لیے شبلی کے ان خطوں پر بھی نظر ڈال لی جائے جو انھوں نے عالم اسرار مولانا ابوالکلام آزاد اور اپنے عزیز دوست مہدی حسن افادی کو لکھے ہیں اور جہاں گویا

آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

ممکن ہے اس حدیث دیگراں ہی سے سر دلبراں کا اصل سراغ مل جائے۔

شبلی کی شعر العجم کے متعلق بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ "وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے" اس کے بعض نقوش بمبئی کی حسن بیز اور عشق خیز سرزمین میں ابھرے ہیں۔ وہ بمبئی کو غزل کدہ سمجھتے تھے اور وہاں کی

---

[1] نگار ستمبر ۱۹۲۶ء، ص ۱۹۔

دلچسپیوں کو غضب کا محرک۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھتے ہیں:

"بہشت سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ افسوس آپ ایمان بالغیب کو ایمان بالحضور پر ترجیح دیتے ہیں۔ شعرالعجم کے اجزا ساتھ لایا ہوں گو حیدرآباد کی منزل اصل وجہ سفر ہے تاہم چاہتا ہوں کہ دوسرا حصہ اسی بہشت زار میں مرتب ہو جائے[1]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:

"میں آج بمبئی جا رہا ہوں۔ گو آپ کے بغیر وہ ویرانے سے بدتر ہے لیکن موسم بدلنے کے علاوہ کچھ وقت کا کام بھی کرنا ہے۔ مسودہ وقف میں بہت سے نقص ہیں۔ وہ مصرعہ غلط ہے۔ جزیرہ پہنچ کر آب و ہوا کی لطافت نے اسی وقت ارتجالاً ایک غزل لکھوائی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف یہ سبزہ یہ منظر یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

شعرالعجم کا چوتھا حصہ مطبع میں گیا۔ باوجود اس کے ابھی زیر تصنیف ہے[2]۔"

مہدی افادی نے ایک نقلی تصویر عطیہ کی فراہم کر کے شبلی کو بھیجی۔ اس پر جھلا کر لکھتے ہیں لیکن دیکھیے کہ تنقید اور جمالیات کا ربط کس خوبی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔

"استغفراللہ وہ تو کسی بیچا یا لوبو کی تصویر ہے۔ آپ کے حسن ظن کی داد دیتا ہوں۔ اس مذاق کا آدمی شعرالعجم لکھ چکا[3]۔"

شبلی بمبئی کی جاں بخشی کے دل و جان سے قائل تھے اور اس کے لیے "ہر متاع کہنہ و نو" کو قربان کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ انھوں نے "جلوۂ نیرنگ ہائے بمبئی" کا ذکر اکثر جگہ کیا ہے۔

---

[1] مکاتیب شبلی، ص ۱۷۳، ج اول۔ [2] ایضاً، ج ۱، ص ۲۷۹۔ [3] ایضاً، ج ۲، ص ۲۱۹۔

زہے جاں بخشیِ آب و ہوائے بمبئی شبلی
طراز و خلخل و نوشاد و فرخار است پنداری
ز ذوق طبع شبلی من در اول روز دانستم
کہ در آشوب گاہ بمبئی در باز د ایمان را
بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ ان کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے۔

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی
حالیا شبلی شدم رند غزل خواں نیستم
ز بمبئی چو بہ ہندوستاں رسم شبلی
زیادہ بگزرم و باز پارسا گردم

بمبئی کی آب و ہوا نے ان کی حسن پرستی، شعر گوئی اور سخن سنجی کی صلاحیتوں میں زبردست ہیجان پیدا کیا اور اس میں شک نہیں کہ ان کے بعض تخلیقی کارنامے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

"۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا۔ اپالو یہاں ایک عجیب سیر گاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے۔ کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

بہر سو از ہجوم دلبراں شوخ بے پروا
گذشتن از سرہ مشکل افتاد ست رہرو را

تین چار غزلیں کہی ہیں جو کبھی آپ کی نظر سے گزریں گی[1]"

مہدی ہی کو ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"بمبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ ۱۶ صفحے ہو گئے

---

[1] مکاتیب شبلی، ج دوم، ص ۲۰۷۔

تو چھپنے کو دیدیئے۔ اس میں کچھ پچھلے سال کا بھی حصہ ہے۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہوگئیں جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں۔ لیکن حافظ تو کہتے ہیں ع

ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

اور ایک پرانا تجربہ کار کہتا ہے ع

عشق در ہنگام پیری چوں بہ سرما آتش است

کیا یہ فلسفہ صحیح ہے۔ ابھی نہیں ۱۵ برس کے بعد جواب دیجئے گا۔"[۱]

شبلی کی دستۂ گل اسی کارگاہ ذوق آفریں کی مرہون منت ہے۔ پروفیسر عبدالقادر کو لکھتے ہیں :

"کتاب چھپ رہی ہے۔ لیکن نام بدل دیا ہے یعنی دستۂ گل۔"[۲]

مہدی کو لکھتے ہیں :

"بوئے گل کی نسبت تمام اہلِ نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کے شان نزول اسی قدر مختلف ہیں جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔ ایک شعر میں خود یہ راز کھل پڑا ہے

با جگر کاوئ آں نشترِ مژگاں کم شد

با کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں وہ بوئے گل کو حال بتاتے ہیں اور دستۂ گل کو قال۔"[۳]

مولانا حالی نے دستۂ گل کے متعلق لکھا تھا :

"کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو

---

[۱] مکاتیب شبلی، ج دوم، ص ۲۱۴۔ [۲] ایضاً، ج اول، ص ۲۱۶۔ [۳] ایضاً، ج ۲، ص ۲۲۱۔

ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں "خمارِ چشمِ ساقی" بھی ملا ہوا ہے۔
غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن
ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو
یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔[1]

اس خمارِ چشمِ ساقی کا ذکر خطوں میں بھی ہے۔ اسی کی بدولت وہ خطوں میں "وانا اول العابدین" لکھ سکے اور اشعار کا مطلب اس طرح سمجھا سکے کہ دل کی کہانی پردے میں بیان ہو جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:

"بدرِ کامل حیدر آباد سے دِلّی پہنچ کر غروب ہو گیا۔ مرتبۂ ابراہیمی کہاں سے ہاتھ آئے کہ لا احب الافلین کہہ سکوں۔"[2]

اسی قسم کے اشارے محض شاعرانہ اندازِ بیان کا نتیجہ ہیں اور ان کی وہی حیثیت ہے جو ریاض کی مے خوارانہ شاعری کی۔

شبلی اور عطیہ کی خط و کتابت کوئی چھپی ڈھکی چیز نہیں تھی۔ وہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے اور ان کی سیاسی رایوں کی قدر کرتے تھے اور ان کے خطوں کے اقتباسات دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔ ایک خط میں خود عطیہ کو لکھا ہے۔

"اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پانی ٹیکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے حیدر آباد اور الہ آباد بھیجے۔"[3]

مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

"ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جمال کی رائے بالکل عام دنیا کے مخالف ہے۔ یہاں بھی یکتائی کی شان ہے۔ ان کا خیال بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ٹرکی ایک یورپین طاقت کا بازیچہ ہے اور یہ

---

[2] مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۲۰۵۔ [3] خطوط شبلی، ص ۶۵۔

پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں۔ جدید قرض نجہاں ستانی کا کام انجام دیا ہے اور دیتا جاتا ہے۔

لیکن باوجود اس "عبودیت" کے اس مسئلہ میں اب تک صاحب ایمان نہیں۔ یہ ضرور نہیں "سیاست" اور "حسن" کا ایک ہی فرماں روا ہو۔[1]

شبلی عطیہ بیگم کی قابلیت، ذہانت اور وسعت معاملات کی دل وجان سے قدر کرتے تھے اور وہ ان کی انشا پردازی اور علم وفضل کی وجہ سے ان کی عزت کرتی تھیں۔ شبلی کے سامنے ان کی حیثیت ایک آئیڈل خاتون کی سی ہے۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتے کہ ان میں کوئی خامی باقی رہے۔ وہ ان کی غلطیوں پر ان کو متنبہ کرتے ہیں۔ فارسی کے اسرار و رموز سمجھاتے ہیں۔ اور جہاں خیالات کی ہم آہنگی دیکھتے ہیں اس کا ذکر بڑی خوشی سے کرتے ہیں اور اس خوبی کو جابجا سراہتے ہیں۔

"تمھارے مضمون کا ترجمہ خاتون میں نکلا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تم خود اُردو میں کیوں نہ لکھو۔ یہ خیال غلط ہے کہ تم اُردو میں عاجز ہو۔ عطیہ خویشتنی را بشناسی۔"

زہرا بیگم کو لکھتے ہیں :

"آپ کو رہنمائی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اور عطیہ جیسی اردو لکھ لیتی ہیں کاش ہمارے صوبہ بھر میں کوئی خاتون لکھ سکتی۔"

زہرا بیگم ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"عنایت نامہ عین اس وقت پہنچا جب میں حیدر آباد روانہ ہو رہا تھا۔ اور احباب کا ایک مجمع کثیر میرے رخصت کرنے کو جمع تھا۔ ان میں مسٹر شرر اور مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری بھی تھے۔ آپ کا خط میں نے استعجاباً سنایا۔ اور لوگوں نے آپ کی انشاپردازی کی متحیّر ہو کر داد دی۔[2]"

---

[1] مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۲۰۔ [2] خطوط شبلی، ص ۱۱۸ و ۱۱۹۔

عطیہ کو لکھتے ہیں :

"میں تم کو بار بار ٹوکتا ہوں، ممکن ہے تم کو گراں گزرے لیکن جی نہیں مانتا کہ تمھاری اردو کے روشن چہرہ پر داغ باقی رہ جائیں بس دو چار بار کی اور کسر ہے"

پروفیسر عبدالقادر کو لکھتے ہیں :

"اس اثنا میں زہرا اور عطیہ فیضی کے بہت سے خطوط آئے اور بعض میں علمی مضامین بھی تھے۔ ان ظالموں کی اُردو نویسی پر مجھ کو تعجب ہوتا ہے۔ آپ کو شاید کبھی دکھلا سکوں"

ایک اور خط میں عطیہ کے متعلق لکھتے ہیں :

"بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزو کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا لیکن بد قسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ، حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزرے ہیں۔ اُردو، فارسی، انگریزی، فرنچ، مصوری، نقشہ کشی، پالیٹکس، قوت تحریر

ع۔ آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری

افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی ورنہ آپ بھی وہی دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں"

بمبئی کے اسی مہمان کا ذکر سیاست کے ذیل میں اس طرح کیا ہے :

"ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جمال کی رائے بالکل عام دنیا کے مخالف ہے .... لیکن باوجود اس "عبودیت" کے اس مسئلہ میں میں اب تک صاحب ایمان نہیں"

ایک دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں بھی ایمان لے آئے تھے۔

"آپ میرے جس دوست کے پولیٹکل خیالات کے قدرداں ہیں..... اس کے ایک خط..... کے الفاظ یہ ہیں کانفرنس اور مسلم لیگ سخت ڈھکوسلے ہیں بزدل اور جاہل لوگوں کے۔ انگریز جس قدر مسلمانوں کو بناتے ہیں اسی قدر یہ بنتے جاتے ہیں۔ ...... عبدالحمید جس نے ۲۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہے اس کی اور ینگ ٹرکی کی نسبت میرے دوست کی رائے صحیح ہے تو شاید کم وقعت فرقہ جدیدۂ ہند کی نسبت بھی اس کی رائے قابل وقعت ہوگی۔ میں تو بخدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں گو"کافر" کے منہ سے نکلے ہیں....."

یہ ہیں وہ خطوط اور کنایات جن کی بنا پر عبدالوحید قریشی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شبلی کا عشق کم و بیش جنسی ہے[۱]۔

اس میں شک نہیں کہ شبلی نے جو خطوط عطیہ اور زہرا کے نام لکھے ہیں ان میں عشق کی احتیاط پورے طور پر موجود ہے اور دوستوں کو جو لکھے ہیں وہ زیادہ بے تکلفانہ ہیں لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے اور یہ اس بے تکلفانہ انداز بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی محبت جرم و معصیت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سرسیّد کے برخلاف شبلی کی زندگی کے دو رخ تھے۔ پبلک اور پرائیویٹ۔ اس سے بقول آل احمد سرور "شبلی کو منافق سمجھنے کے بجائے زندگی اور ان کی دشواریوں کا اندازہ کرنا چاہیے"[۲]۔ دوسرے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ شبلی کو قدیم روایات ورثہ میں ضرور ملی تھیں لیکن وہ مولویوں کے طبقے سے بہت آگے دیکھ سکتے تھے اور وہ ان کی تنگ خیالی کے کبھی مؤید نہیں رہے۔ وہ حامل عرش ہوں یا نہ ہوں لیکن جدت پسندی، نفاست اور شاعرانہ مزاج کے حامل ضرور تھے۔ بمبئی کی دلچسپیاں ان کی شاعری کا اصل سبب نہیں۔ زبردست محرک ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹ برس کے بعد پھر غزل لکھی اور کنار آب چوپاٹی اور گل گشت اپالو اور خوبانِ زردشتی اور دلبرانِ شام و ایران

---

[۱] شبلی کی حیات معاشقہ۔ عبدالوحید قریشی۔ [۲] تنقیدی اشارے (دوسرا ایڈیشن)، ص ۶۳۔

کے ساتھ ماہِ تمام اور سلطان جمال کا بھی ذکر کیا۔ یہ سب ان کی شاعرانہ طبیعت کے کرشمے ہیں اور اس معاملے کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ وہ حسن پرست شاعر اور طرح دار انشا پرداز پہلے تھے اور فقیہہ و مدرس بعد میں۔ ان کا مقولہ یہ تھا کہ "جو حسین شے ہے وہ میری رشتہ دار ازلی ہے۔" وہ حسنِ فطرت کے سچّے پرستار تھے۔ ان کی بمبئی کی غزلوں میں ان ہی نفیس تجربات کا دلکش بیان ہے اور اسی جذبے نے ان کے خطوط کو "خم کدۂ محبت" اور شعر العجم کو "داستان حسن و عشق" بنا دیا ہے۔ اس وقت معاشرت کے پرانے بند ٹوٹ رہے تھے اور "حامدہ" چراغ خانہ کے بجائے شمع محفل بن رہی تھی۔ شبلی کی آنکھیں اس نور سے خیرہ تو ہوئیں لیکن اس سے انھوں نے اپنے دل کی شمع کو بھی روشن کیا اور زندگی کی دشواریوں کو آسان بنا لیا۔ مہدی کو لکھتے ہیں:

"کچھ دنوں آپ اور جوان رہتے۔ سبحان اللہ تو گویا اب جوان ہوں
اور اگر اب جوان ہوں تو قسم لیجیۓ جو مرتے دم تک بوڑھا ہوں
آں قدر عشق بروزم کہ جواں گردم باز" [1]

ان کے ان خطوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ندوہ کو بمبئی کی دلچسپیوں سے زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ اور قومی کاموں کے لیے ہر آرام کو قربان کرنے کے لیے موجود تھے۔ ان کے دل میں اگر چور ہوتا تو وہ ان خطوں کو فاطمہ اور صغری کو نہ سناتے۔ شبلی کی یہ محبت اردو کے مکتوباتی لٹریچر میں نایاب ہے۔ یہ صحت مند اور فطری ہے۔ اس سے جینے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ بارِ حیات ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہمیشہ حافظ کے الفاظ میں "ز کنارِ تو جواں برخیزم" ہوتا ہے۔

شبلی مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے شاگرد تھے۔ مؤخر الذکر مشہور معقولی خوش گو شاعر اور زبردست ادیب تھے۔ انھوں نے سرسیّد کی تحریک کی شدت سے مخالفت کی تھی اور حالی کے مسدس کا جواب مسدسِ عوالی کے نام سے لکھا تھا۔

---

[1] مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۱۶۔

استاد کو فخر تھا انا اسد وانت شبلی یعنی میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ۔ اس جملے سے دونوں کے ربط و اتحاد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شبلی اور سرسید کی تحریک

اس وقت شبلی جدید کے مقابلے میں قدیم کے حامی تھے غیر مقلدوں کے سخت دشمن تھے۔ اور اودھ پنچ کے صفحات کو جو ۱۸۸۵ء میں جاری ہو چکا تھا۔ بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے لیکن سرسید کی تحریک ایک سیلاب کی طرح امڈ پڑی تھی اور اس کی موجیں شبلی کے گھر سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ خود سرسید کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ مولوی اقبال سہیل نے سیرت شبلی میں لکھا ہے کہ "شبلی کے لئے شیخ صاحب کے خیالات میں یہ جدید تغیر سخت سوہان روح کا باعث تھا" سرسید بنارس میں ملازم تھے اور تہذیب الاخلاق نے ان کے خیالات کو مشرقی اضلاع میں بہت شہرت دے دی تھی۔ شبلی کے بھائی ۱۸۷۶ء سے علی گڑھ میں تعلیم پا رہے تھے اور شبلی نے علی گڑھ کی ملازمت سے قبل سرسید کی تعریف میں ایک عربی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ لیکن انھیں علی گڑھ اور فرزانہ علی گڑھ سے پوری طرح فیضیاب ہونے کا موقع وہاں ملازم ہونے کے بعد ملا۔ اس وقت علی گڑھ مشرق و مغرب کا سب سے بڑا علمی سنگم تھا اور وہاں سرسید اور آرنلڈ جیسی ہستیاں موجود تھیں جنھوں نے "شبلی کی صلاحیتوں کے استعمال کا رخ بدل دیا"

سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے:

"اگر علی گڑھ نے شبلی کو شبلی بنایا تو کیا وجہ ہے کہ اس بزم میں آ کر کسی اور کا قد و قامت نہیں بڑھا" [1]

اس رائے میں صحت کم ہے اور طنز زیادہ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی علی گڑھ کے دارالعلوم میں خالی ہاتھ نہیں آئے تھے۔ انھوں نے قدیم علوم کا شوق اور محنت سے مطالعہ کیا تھا اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے

---

[1] حیات شبلی، سلسلۂ دارالمصنفین ۶۶ —

آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ علی گڑھ نے ان کو مناظرے کی دنیا سے نکال کر قومی خدمت کے راستے پر لگا دیا۔ اور ان کی شاعری کو جو ابھی گیسو اور زلف میں الجھی ہوئی تھی ایک مقصد دے دیا۔ انھوں نے خود ایک تقریر میں ان احسانات کا اعتراف کیا ہے۔

"حضرات یہ سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز اس کی نشو و نما اس کی ترقی اس کی نمود اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اس کالج سے ہوا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا آپ کے مذہبی جھگڑے بڑھانا۔ مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو قوت اور استحکام دینا۔"

میں آج سے بہت پہلے فارسی شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجہ کے تھے یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو عالی رتبہ کی خیال کرتا ہوں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو اس وقت پست تر تھی غرض یہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت ہے[1]۔"

وہ ۱۸۸۶ء کے ایک خط میں علی گڑھ کی اسلامی شان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے۔ اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔"

سرسید نے اپنا کتب خانہ شبلی کے سپرد کر دیا تھا۔ اوّل الذکر کو تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور وہ آئین اکبری تزک جہاں گیری اور تاریخ فیروز شاہی کو مرتب کر چکے تھے۔ شبلی کو یہ تاریخی ذوق سرسید سے ملا۔ پروفیسر آرنلڈ نے ان کو جدید اصول سے

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۹۴ء نیز شبلی نامہ، ص ۵۷ و ۵۸

آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ "جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں" شبلی سرسید کی تحریک کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ نیک نیتی کے ساتھ اس کی اصلاح کے خواہاں تھے۔

یہ شبلی کی انفرادیت بھی تھی کہ وہ علی گڑھ کے ماحول یا جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کو علی گڑھ سے جو اختلاف تھا وہ عجیب یا انوکھا نہیں ہے۔ سمجھ میں آنے والا ہے۔ شبلی علی گڑھ اور مغرب کی سطحیت سے نالاں تھے اور یہ اعتراض ایسا ہے کہ خود سرسید نذیر احمد اکبر اور ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے۔

شبلی نے ایک خط میں مولوی محمد سمیع کو علی گڑھ کے متعلق لکھا ہے:

"معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاحول ولا۔ وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"[1]

یہی رائے عطیہ بیگم کی ہے۔ انھوں نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں شبلی کے متعلق یہ اندراج کیا ہے:

"بیچارے بڈھے میاں گو کہ پرانی وضع کے ہیں مگر خیالوں کی وسعت ایسی ہے کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرہ سی یہ بات ہوتی۔"[2]

---

[1] مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۵۱۔ [2] شبلی نامہ، ص ۲۰۹۔

شبلی کی نظر بہت گہری نہ سہی لیکن اپنے حلقے میں ضرور گہری تھی۔ مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں :

"افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے۔ میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں۔ خوب دیکھا اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے۔"[1]

تعلیم کے متعلق شبلی کے صحیح خیالات کا اندازہ اس خط سے ہوگا جو انھوں نے ۱۵ر جون ۱۸۹۲ء کو قسطنطنیہ سے سرسید احمد خاں کے نام لکھا ہے :

"افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقۂ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا رکھی گئی ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔"[2]

شخصیت

شبلی کی زندگی بڑی ہمہ گیر تھی اور انھوں نے قومی حیات کے ہر گوشے پر اثر ڈالا۔ انھوں نے مناظرے کیے۔ علی گڑھ میں مذہبی جوش کو برانگیختہ کیا۔ ندوہ کی اصلاح اور تنظیم میں لگے رہے۔ وہ علما کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن یہ اقدام بڑا مبارک تھا۔ اعظم گڑھ کے اسکول کی ترقی کے لیے کوشش کی۔ رسالہ ندوہ کا انتظام کیا۔ وقف علی الاولاد کی حمایت کی محبت کے شعر کہے کتابیں لکھیں۔ وہ عمر بھر خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے لیکن کبھی ایک ایسا بلائے جاں مقصد ان کے سامنے نہیں رہا جو شورش و سرمستی کا تہلکہ مچا دیتا یا جس کے لیے وہ اپنے آپ کو وقف کر دیتے۔ اسی لیے وہ اثبات ذات کے لیے نئے نئے میدان ڈھونڈتے رہے۔ ندوہ ان کے لیے چھوٹی جگہ تھی وہ اس سے زیادہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ بادشاہت کو نہیں وزارت کو پسند کرتے تھے۔[3] ان کی خواہش یہ تھی کہ ندوہ سے

---

[1] مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۱۴۲۔ [2] ایضاً، ج اول، ص ۴۔
[3] ایضاً، ج اول، ص ۱۳۹

الگ ہونے کے باوجود اس کے ہر کام میں ان سے مشورہ کیا جائے۔ وہ عمل کا اتنا بڑا میدان اور کام کا اتنا بڑا پیمانہ چاہتے تھے کہ اس میں ان کی پوری شخصیت سما جائے۔ ان کو آج مغرور، خودپسند اور جاہ طلب جو کچھ بھی کہا جائے ان کے خطوں میں کافی مواد اس بات کا موجود ہے کہ انھوں نے قدیم اسکول کو بچا لیا۔ ان کے اندر قومی خدمت کا سچا جذبہ تھا۔ ان کی پیشانی چمکتی ہوئی اور دل دھڑکتا ہوا تھا۔ وہ حریص اور طامع نہیں تھے۔ عالی ہمت اور بلند حوصلہ تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کی ترقی پسند تحریکوں کا ساتھ دیا اور سیاست میں خوداعتمادی کا درس اس وقت دیا جب لوگ عصائے خضر کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ شیخ محمد اکرام ان کی دوعملی اور انگریز دوستی کا کتنا ہی نقارہ پیٹیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی یہ نظمیں

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

اب تک سامعہ سے ٹکرا رہی ہیں۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ جب بلقان مشن ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں گیا ہے تو وہ ان کے جوتے سے لپٹ گئے اور اس کے گرد و غبار کو اپنے آنسوؤں سے دھو دیا۔[۱] اسی طرح شبلی کی تصانیف ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

شبلی کے خطوط ان کی سیرت کا آئینہ ہیں۔ وہ اکبر الہ آبادی کی طرح زندگی سے منہ موڑ لینے کے قائل نہیں تھے بلکہ اس کو حاصل کرنے کی جائز خواہش کو زندگی کے لیے فال نیک سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا عام رجحان یہ تھا کہ وہ اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتے تھے۔[۲] ان میں رعونت اور خودنمائی نہیں تھی۔[۳] اپنی اہلیت کا صحیح احساس تھا، ہمت اور استقلال تھا۔ وہ مصیبتوں میں مسکرا سکتے تھے۔ حادثۂ گزندپا اتنا سخت ہے کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں[۴] لیکن اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

۱؎ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی، ص ۵۱۵۔ ۲؎ مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۱۰۲۔
۳؎ ایضاً، ص ۲۰۳۔ ۴؎ ایضاً، ص ۱۶۰-۱۶۲۔

"تکلیف گو سخت ہے لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے سر کٹوائے تھے پاؤں کٹنے پر کیا روؤں۔ فصبرٌ جمیل" ۱؎

"خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا۔ ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کچھ عمر پائی۔ بہت چلا پھرا۔ دوڑا۔ دھوپا دبلا جلا۔ آخر کہاں تک۔ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا نہ بیٹھا تو قسمت نے بٹھا دیا۔ گر نستانی بستم می رسند" ۲؎

شعر العجم حصۂ اوّل کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو ۷؍ مئی ۱۹۰۶ء کو صدمہ پا کا واقعہ پیش آیا یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامات تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہ نامہ کا یہ مصرع "درید و برید و شکست و ببست" قلم کی زبان پر تھا"

۱۵؍ جولائی کو جو خط شبلی نے شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن کو لکھا ہے ان کے چند جملے یہ ہیں:

"اب تک ہاتھ پر قابو نہیں، خط سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک غزل حاضر ہے لیکن اپریل ۱۹۰۶ء کی ہے۔"

یہ شبلی کی طبعی زندہ دلی تھی کہ انھوں نے اس عالم میں بھی جو غزل بھیجی وہ بڑی رنگین ہے۔ مطلع یہ ہے:

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چکنم
میل با لالہ رخاں گر نکنم تا چکنم

شبلی کم آمیز تھے۔ ان کے بے تکلف خطوں میں بھی وہ شوریدگی اور والہانہ انداز نہیں

۱؎ مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۱۶۳۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۶۴۔

ہے جو اشعار میں ہے اس لیے کہ خطوں میں ضوابط حدود کا پاسباں نگراں ہے لیکن شبلی کی سیرت کا بہترین اندازہ ان خطوں سے ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنے معاصرین کے متعلق رائے زنی کی ہے۔ یہ بالواسطہ شہادت ان کی شخصیت کے پیچ و خم کے سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے۔ محمد اسحاق کو لکھتے ہیں :

"افسوس ہے کہ تم نہ آسکے دسمبر میں شاید آنے کا قصد اس لئے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہو سکو۔ لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے۔ کانفرنس اب کی غالباً پھیکی ہوگی۔ مولوی حشمت اللہ و مرزا حیرت کی بڑ بہت سن چکے مولوی حالی کا کوئی پارٹ نہیں ہے۔ مولوی نذیر احمد بھی غالباً چپ رہیں اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا۔"[1]

مولوی نذیر احمد کا طرز ان کے زمانے میں بہت مقبول تھا۔ مولانا شبلی کی رائے معاصرین کی رائے سے الگ ہے لیکن ان کی طبیعت میں یہ بات عجیب تھی کہ وہ اپنے پنجہ شکن حریفوں کی تالیفات کی کھل کر داد نہیں دیتے تھے۔ شبلی نے حیاتِ سعدی کی تو تعریف کی[2] لیکن حیاتِ جاوید کی مرمت کی اور اس میں وہ برائیاں ڈھونڈھیں جو حقیقتاً اس میں نہیں ہیں۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھتے ہیں :

"اختلاف آرا بھی کیا چیز ہے۔ حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔"[3]

"حیات جاوید میں مولانا نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعروں میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے ہیں واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے۔ بہر حال میں حیات جاوید کو محض مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔"[4]

---

[1] مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۲۰۔ [2] ایضاً، ص ۷۵۔ [3] ایضاً، ص ۱۳۳ و ۱۳۵۔ [4] ایضاً، ص ۱۳۲

حیرت ہے شبلی نے حالی کی لکھی ہوئی سعدی اور غالب کی سوانح عمریوں کو تو پسند کیا[1] جن کے متعلق حالی خود یہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے اصحاب تذکرہ کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن حیات جاوید ان کی نگاہ میں نہیں جچی جس کے متعلق مصنف نے (بہ خلاف صراحت شبلی) لکھا ہے کہ

"ایسے شخص (سرسید) کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے[2]"

لیکن افسوس ہے کہ حالی اس معیار کو پوری طرح نباہ نہ سکے اور بعض جگہ کتاب اعتذار معلوم ہوتی ہے تاہم وہ کسی طرح بھی کتاب المناقب اور کذب وافترا کا آئینہ نہیں ہے جیسا کہ شبلی سمجھتے تھے۔

جس زمانے میں شبلی شعر العجم لکھ رہے تھے ہندوستان سے آزاد کی سخن دان پارس نکلی اور انگلستان سے براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ شبلی ۱۶ رمئی ۱۹۰۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آزاد کا سخن دان پارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ لیکن الحمد للہ کہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا[3]"

براؤن کی کتاب کے متعلق ان کی رائے اس سے زیادہ عجیب ہے۔ مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

"آزاد کی کتاب آج ہی آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم وہ ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا۔ بارھویں میں یہ میدان میں اترا ہے۔ لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا۔ اس لئے یوں ہی

---

[1] مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۵، و ۳۲۳۔ [2] حیات جاوید۔ دیباچہ
[3] مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۱۳۰۔

سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔ میرے لیے بہت وسعت ہے۔ بہ حالتِ مجموعی کتاب براؤن کی کھتونی سے کہیں بہتر ہے[۱]۔"

مہدی ہی کو براؤن کے متعلق زیادہ تفصیل سے لکھتے ہیں :

" بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سنا اور خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعۂ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں۔ میں مع سود اور ہرجہ کے آپ سے اس کے دام واپس لوں گا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ[۲]۔"

شبلی نے غضب کیا ہے کہ براؤن کے متعلق فیصلہ خود ورق الٹ کر اور بھائی اسحاق سے پڑھوا کر دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا میدان الگ الگ ہے۔ براؤن نے ایران کی تہذیب اور تمدن کی روشنی میں زبان اور ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ شبلی نے علم معانی کی روشنی میں فارسی شعر پر تنقید کی ہے۔ نہ شبلی ایران کی ادبی تاریخ لکھ سکتے تھے اور نہ براؤن شعر العجم۔ شبلی مورخ سے زیادہ نقاد تھے۔ اسی لیے ان کی تحقیقی اور تاریخی غلطیوں پر پوری ایک کتاب تنقید شعر العجم لکھی جا چکی ہے۔ پروفیسر براؤن کا میدان تاریخ ہے تنقید نہیں۔ اس لیے ان کے یہاں شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں پر بحث نہیں۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے :

"ان خطوں میں ایک اور بات بھی قابلِ قدر ہے وہ ادبی نکات ہیں جو کہیں کہیں ان کے قلم سے نکل گئے ہیں اور ان میں سب سے دلچسپ وہ تنقید ہے جو اپنے یا اپنے کلام کے متعلق نہایت بے تکلفی اور سچائی سے کر جاتے ہیں[۳]۔"

۱۔ مکاتیبِ شبلی، ج ۲، ص ۲۱۲۔ ۲۔ ایضاً، ص ۲۱۱ و ۲۱۲۔ ۳۔ خطوطِ شبلی۔ مقدمہ۔

شبلی نے زہرا بیگم کو لکھا ہے :

"ریاست بھاول پور کے عطیہ کا کاغذ میں نے عطیہ کو بھیجا ہے آپ بھی دیکھئے گا۔ کسی قدر لٹریچر کا بھی مزہ ہے[۱]"

اپنی فارسی غزلوں کے متعلق زہرہ بیگم کو لکھتے ہیں :

"میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے برعکس نہند نام زنگی کافور ان کانٹوں کا نام دستۂ گل رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں اس لئے ان کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے[۲]"

ان ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"مسز لقمانی صاحب نے بھی دستۂ گل مانگا تھا۔ میں نے ان سے بھی انکار کر دیا۔ کالائے بد بہ پیش خارند "[۳]

دوبارہ یہ ہی مضمون لکھتے ہیں :

"بوئے گل کہئے تو بھیج دوں۔ دستۂ گل کی نسبت مہذب ہے۔ شاعری درحقیقت ایک خوردبین ہے جس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑی بن کر نظر آتی ہیں۔ اس کو لوگ مبالغہ کہتے ہیں لیکن وہ مبالغہ نہیں بلکہ اس خوردبین کا اثر ہے[۴]۔"

شبلی کے خطوط سے ان کی تصانیف پر بھی روشنی پڑتی ہے[۵] اور بعض ایسی باتیں سامنے آجاتی ہیں جو اور کسی ذریعے سے نہیں معلوم ہو سکتیں۔ مثلاً شعر العجم جو آج شبلی کی تصانیف میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اشاعت کے بعد اتنی نامقبول ہوئی کہ لاگت بھی وصول ہونے کی امید نہیں تھی۔

مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں :

"شعر العجم کا نامقبول ہونا معلوم تھا۔ لیکن یک مردہ باشد مردہ باشد۔ از قاعدہ حکمت نماید گزشت۔ ایک علمی کتاب ناول نہیں بنائی جاسکتی۔ جب سے شائع

---

۱ خطوط شبلی۔ مقدمہ۔ ص ۱۰۶۔ ۲ ایضاً، ص ۱۱۰۔ ۳ ایضاً، ص ۱۱۱۔ ۴ ایضاً، ص ۱۲۰۔
۵ مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۸۳-۹۴-۸۷-۱۰۶-۱۰۷-۲۱۵-۲۳۲-۱۰۸-۲۴۲-۱۰۷-۲۱۶-۲۶۳۔

E
29

ہوئی ہے ہر طرف سناٹا ہے۔ حسن ظن کی بنا پر کچھ لوگوں نے منگوائی۔ وہ بھی پچھتائے ہوں گے۔ لاگت بھی وصول ہونے کی امید نہیں۔ مقدور والوں کو کتاب مستعار دینا یورپ کے اصول کے خلاف ہے۔[۱]"

شعر العجم کی اصلی خوبی شعرا کے حالات نہیں۔ ان کے کلام پر تبصرہ ہے۔ شبلی اس بات سے ناواقف نہیں تھے۔ پروفیسر عبدالقادر کو لکھتے ہیں :

"شعر العجم کا ترجمہ آپ کریں۔ یہ شعر العجم کی قسمت۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حالات تو یورپین بھی لکھ چکے ہیں جو چیز اصل ہے وہ شعرا کے کلام پر ریویو ہے جس میں اصل اشعار کو نقل کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ اس کی تدبیر کرسکیں تو اس سے کیا بہتر۔[۲]"

شعر العجم پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں خاقانی، جامی اور قاآنی کے کمالات کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ شبلی نے ایک خط میں اپنے انتخاب کے اصول سے بحث کی ہے۔ سید احمد مرتضیٰ کو لکھتے ہیں :

"میرے انتخاب کا اصول یہ ہے کہ فردوسی کے زمانہ سے لے کر آخر تک انہی کو لیا ہے جو ایک طرز خاص رکھتے ہیں جامی کا کوئی خاص طرز نہیں۔"

"خاقانی کا انداز سب سے الگ ہے لیکن میں اس کو شاعری نہیں سمجھتا بلکہ لفاظی اور تلمیحات کی بھرتی ہے۔ قاآنی یوں رہ گئے کہ میں نے دو سو برس ادھر کا زمانہ ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ بہر حال ایک اور جلد باقی ہے کہ دوسرے کے لئے بھی کام کرنے کا موقع ہے۔[۳]"

<u>شبلی کا اسلوب نگارش</u>

شبلی کی تصانیف ان کے خیالات اور نظریات مختلف اعتراضوں کا ہدف رہے ہیں لیکن ان کی لائف رشک انشا پردازی سے کسی کو انکار نہیں۔ ان کی عبارت ایسی صاف وشستہ اور برجستہ ہوتی ہے کہ بقول سرسید" دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا

۱۔ مکاتیب شبلی، ج اوّل، ص ۱۰۷۔ ۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔ ۳۔ ایضاً، ص ۳۲۲۔

ہوگا۔" خطوں میں یہ حسن اور زیادہ نمایاں ہے۔ ان میں ان کی زندگی کے ایسے حسین اور رنگارنگ پہلو آگئے ہیں جو اور کسی جگہ نہیں ملتے۔ ان میں نجی باتوں کا ذکر ہے لیکن اس طرح جیسے تیر کمان سے نکل جائے۔ نجی باتوں کا ذکر حالی کے یہاں بھی ہے لیکن دونوں کے اسلوب اور اندازِ فکر نے ان کو مختلف بنادیا ہے۔ ہمیں فوراً معلوم ہوجاتا ہے یہ شریف النفس حالی ہیں جو جوان ہونے سے پہلے بوڑھے ہوگئے اور یہ رند غزلخواں شبلی ہیں جو بڑھاپے میں بھی جوان رہے۔

آں قدر عشق بورزم کہ جواں گردم باز

حالی کے اسلوب میں متانت اور بہہ داری ہے۔ اسی کی بدولت انھوں نے مختلف موضوعات کو نباہ دیا لیکن یہ محض نباہنا ہی ہے۔ شبلی حسن وجمال سے علاقۂ ازلی رکھتے ہیں اسی لیے ان کے یہاں حسنِ تناسب اور ذہن متوازن ہے۔ وہ ہر موقع کے مطابق اسلوب اختیار کرتے ہیں اور اپنے لطیف ونازک استعارہ وتشبیہ اور روزمرہ اور محاورے کی چاشنی سے عبارت کو چمکا دیتے ہیں۔ اکبر کی طرح ان کے خطوں میں کافور و کفن کی بو نہیں ہے۔ شعر وسخن کی لطافت ہے۔ غالب کے خطوں کی ادا سب سے الگ ہے۔ ان کے نالے میں سرور ہے۔ اور وہ برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرسکتے ہیں۔ شبلی کے یہاں ظرافت کا وہ چمن زار تو نہیں لیکن اس کی سادگی، بے تکلفی اور شگفتگی ہے مثالوں سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔ شیخ حبیب اللہ کو قسطنطنیہ سے لکھتے ہیں:

"آج میں نے عجیب دلآویز خواب دیکھا ہے۔ عجیب اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دلآویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہوچکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے[1]۔"

اس کے بعد انھوں نے موکب سلطانی نظارہ گاہ کی تصویر لفظوں میں ایسی موثر کھینچی ہے کہ اس میں حرکت پیدا ہوگئی ہے اور باصرہ اس سے بار بار لطف اندوز ہوتا ہے۔

---

[1] مکاتیب شبلی، جلد ۱، ص ۱۴ و ۱۵۔

شبلی تلمیحات کے استعمال میں کمال رکھتے ہیں وہ ان کو اس سلیقے سے کھپاتے ہیں کہ مضمون کی دلربائی اور وضاحت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اعظم گڑھ کے اسکول کے متعلق لکھتے ہیں:

"سردست میرے نزدیک بھی وہ (اسکول) ایک حقیر صورت رکھتا ہے لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اور جو بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا[۱]"

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

"آپ نے شعر العجم کی وہ مدح سنجی کی کہ میں نے خود اس پر دوبارہ اس لحاظ سے نظر ڈالی کہ یہ خط و خال اس میں ہیں بھی یا چشم مجنوں کی قوت اختراع ہے[۲]"

اعظم گڑھ کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ شہر منا اور عرفات کی طرح صرف کچھری کے زمانہ تک آباد رہتا ہے۔ تعطیلوں میں بالکل ویران ہو جاتا ہے[۳]"

حادثہ گزند پا کے بعد سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"میں لکھنؤ میں اگر کوٹھے پر چڑھوں تو حضرت ادریس کی طرح پھر کبھی اترنا نصیب نہ ہوگا۔ کوئی مکان ملتا تو میں فوراً آتا[۴]"

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں۔

"عین اس وقت کہ چمن زار بمبئی کی گلگشت نے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا۔ بھاول پور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے بہشت عدن کو خیرباد کہا تھا[۵]"

---

[۱] مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۲۵۔ [۲] ایضاً، ص ۱۷۶۔ [۳] ایضاً، ص ۱۸۷۔ [۴] ایضاً، ج ۲۔ ص ۶۵۔
[۵] ایضاً، ج اول، ص ۱۱۹۔

مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں :

"بھئی سب نے خط لکھنے کی قسم کھائی ہے یا کسی منت پر روزہ سکوت رکھا ہے؟"[1]

کبھی کبھی شبلی اپنی بات کو ایک لطیفے کے ذریعے بھی ادا کرتے ہیں جس سے لطف دوبالا ہوجاتا ہے اور اس کے تمام پہلو واضح ہوجاتے ہیں عطیہ کو لکھتے ہیں :

"زیب النساء کے مضمون کے متعلق آپ نے بہت صحیح لکھا کہ بے مزہ ہے لیکن واقعیت اسی قدر بے مزہ ہوتی ہے۔

اشعب نے ایک دفعہ بہت جلدی سے نماز ادا کی۔ ایک شخص کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "اتنی جلدی نماز پڑھتے ہو" اس نے کہا "بے ریا کی نماز اتنی ہی مختصر ہوتی ہے۔"[2]

نجی تحریروں میں زبان اور محاورے کی چاشنی ان کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے اور ان کے بے ساختگی کے جوہر کو چمکا دیتی ہے۔ شبلی کے خطوط اس اعتبار سے بھی ممتاز ہیں کہ ان میں صاف اور بامحاورہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ مہدی کو لکھتے ہیں :

"میں ذرا کی ذرا باہر گیا تھا آپ آئے اور نکل گئے۔ میں دو ہی تین دن کا مہمان ہوں وہ بھی آپ کا نہیں۔ الہ آباد کا۔ کل ایک غزل قلم سے نکلی میر اکبر حسین صاحب کو بھیجی وہ بہت ریجھے۔ ان کا خط بھیجتا ہوں لیکن اس پر یقین نہ کر لیجئے گا ورنہ پھر غزل پھیکی نظر آئے گی۔"[3]

شبلی کے اندازِ نگارش کی امتیازی خصوصیت شوخی اور شگفتگی ہے۔ ان کی ظرافت میں متانت اور وزن ہے۔ بقول مہدی افادی "عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ان کی حکیمانہ شوخیاں سرمایۂ ادب ہوتی تھیں" چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک خط میں مہدی بیگم کو سلام لکھتے ہیں :

"حرم سے گو اب تک نامحرم ہوں لیکن ایمان بالغیب کا سلام کہہ دیجیے۔"[4]

---

[1] مکاتیب شبلی، ج اول، ص ۵۷۔
[2] خطوط شبلی، ص ۸۶۔
[3] مکاتیب شبلی، ج دوم، ص ۲۱۱۔
[4] ایضاً، ص ۲۱۱۔

مولوی ریاض حسن خاں کو لکھتے ہیں :

"کل میر اکبر حسین صاحب جج سابق کے یہاں سے دعوت کا رقعہ آیا تھا میں نے یہ جواب لکھا۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال — لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں — حلقہ دار گوش ہوں ممنوں ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا — اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کو بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ — جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں۔"[1]

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو نعت لکھنے سے روکتے ہیں لیکن عجیب پیرائے میں۔

"علمائے ادب کہتے ہیں کہ حسان بن ثابت جاہلیت کے نامور شعرا میں تھے لیکن اسلام آیا اور نعت کہنا شروع کی تو ان کا کلام مرتبہ سے گر گیا۔ فارسی میں دیکھئے نعت گو بہت کم پھلے ہیں۔ خسرو کے سوا اور خیر جامی بھی سہی۔ باقی اور جتنے ہیں بہت کم رتبہ ہیں .... مقصود اس درازنفسی سے یہ ہے کہ آپ اس میدان میں نہ آیئے۔ ثواب مقصود ہے تو درود پڑھ لیا کیجئے۔"[2]

مہدی کو لکھتے ہیں :

"مجھی مجھ کو بڑی شکایت تھی کہ آپ الٰہ آباد میں ہیں اور ہاتھ نہیں آئے، آج معلوم ہوا کہ گورکھپور رقیب نکلا.... ٹرکی کے ہاتھ سے برائے نام چند صوبے نکل گئے۔ بلگیریا مدت سے آمادہ تھا۔ عبدالحمید کی دھاک کے سامنے ہمت نہیں پڑتی تھی۔ خیر یہ نظر بد کا اسپند ہے۔ اندرونی حالت کی درستی کے بعد یہ ریزے پھر ہاتھ آجائیں گے۔"[3]

یہ جملے بھی ملاحظہ ہوں۔

"چمنستان بمبئی کو چھوڑنا فردوس کو چھوڑنا ہے جو ایک زاہد سے ممکن نہیں۔"

---

[1] مکاتیب شبلی، ج دوم، ص ۱۸۷۔ [2] ایضاً، ج ۱، ... [3] ایضاً، ج ۲، ص ۲۱۹۔

"افسوس یہ ہے کہ ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ زندگی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔"

انیسویں صدی کی اُردو نثر کا ایک بڑا حصہ مذہبی مناظروں سے متعلق ہے۔ اس وقت سیاسی شکست ہو چکی تھی اور ہر طرف غیر ملکی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس ہار کا بدلہ مذہبی جیت سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ تو اس لیے کہ دنیا ہاتھ سے نکل جائے تو دین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور کچھ اس لیے کہ سائنس و عقلیات کی ترقی اور مغربی فکر و خیال سے روشناسی نے مذہب کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ شبلی نے اپنے طبقے کو ماضی کی عظمت کا دوبارہ احساس دلانا چاہا اور اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی کہ جو حال کی درخشانیوں میں تھیں لیکن وہ ماضی سے اس طرح نہیں چمٹے جس طرح اکبر۔ وہ سیاست میں تعلیم میں انشا میں سوانح نگاری میں تنقید میں پرانی لکیر کو چھوڑنے اور ایک حد تک جدید سے مفاہمت کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ اکبر نے افراد کی ہجویں نہیں لکھیں۔ مغربیت پر اعتراض کیا ہے اس لیے ان کی حیثیت ایک ادارے اور ایک تحریک کی سی ہے۔ دوسرا رجحان وہ ہے جس کی آئینہ دار سرسید کی ذات ہے۔ وہ ماضی کے بجائے مستقبل کو دیکھتے ہیں اور نئے نیم صنعتی دور کے تقاضوں کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہیں۔ شبلی کی حیثیت ان دونوں کے درمیان برزخ کی سی ہے۔ انھوں نے اس توازن کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ان دونوں کو میسر نہ آسکا۔ یہی رجحانات شبلی کے اسلوب میں بھی کارفرما ہیں۔ انھوں نے ماضی سے طرح داری حال سے افادیت اور مستقبل سے توانائی لے کر اپنے اسلوب کا تانا بانا بنا ہے۔ اسی لیے یہ دیرپا ہے۔ وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں اس لیے ان کے خطوں میں چشم ساقی کا خمار و لہک اور مہک ہے۔ ان کا مزاج بڑا نفیس اور ان کی معاشرت نہایت پاکیزہ ہے۔ ایسے ہی ان کا آرٹ رچا ہوا ہے۔ عطیہ آزاد اور مہدی سے خط و کتابت ان کی خوش ذوقی کی دلیل ہے۔ ان کے یہاں ایک عام انسان کا پندار اور اس کی کمزوریاں ہیں لیکن ان میں ادیبانہ شوخی کی آمیزش نے حسن پیدا کر دیا ہے۔ ان کی عبارت کا اختصار

"تار" کے درجے پر پہنچتا ہے اور دلکشی سے خالی نہیں ہے۔ غالب کا ڈرامائی انداز ان کی گرد و پیش کی عکاسی اور ان کی ذہنی شگفتگی کی ایک جھلک شبلی کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن غالب کی حیثیت مہر نیم روز کی ہے۔ ان کے سامنے بڑے ستارے بھی بے نور ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی شبلی کے ترشے ہوئے جملے اور نگینے کی طرح جڑے ہوئے الفاظ اور گفتگو کا مسکراتا ہوا انداز مکتوباتی ادب میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے جو ان کے حسن نظر اور ذوق سلیم کا ثبوت ہے۔

شبلی کی شخصیت بڑی رنگین اور جامع ہے۔ اس کا اندازہ ان کی مذہبی تاریخوں سے نہیں خطوں سے ہوتا ہے۔ وہ نئے حالات اور نئی ضروریات سے متاثر تھے۔ یورپ کی ترقیوں کی قدر کرتے تھے لیکن اس سے مرعوب نہیں تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ قدیم و جدید کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت پیدا کر دیں۔ اپنے جامد طبقے میں وہ کوئی انقلاب تو نہ پیدا کر سکے لیکن یہ اصلاحی کوشش بجائے خود ایک مبارک قدم تھی۔ انھوں نے ادب میں جذبے کی گرمی اور فکر کی روشنی کو ملانا چاہا اور سرسید کی سادگی میں رعنائی اور شوخی کو شامل کر کے سنجیدہ لٹریچر میں ایسی شادابی و بلندی پیدا کر دی جو ابھی تک دلوں کو لبھاتی ہے۔ لیکن مکتوباتی ادب کی تاریخ میں "نئی روشنی کی شعاع" مہدی افادی کی ذات ہے جو "جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی برقی لہروں کے ملنے سے نکلی ہے۔" اور جن کی شہرت کا تمام تر انحصار خطوط و مضامین پر ہے اور جو بلا شبہ غالب کے بعد ہمارے سب سے اچھے مکتوب نگار ہیں۔ شبلی خود اس "سنگم" کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے جا بجا مہدی کے اسلوب کی تعریف کی ہے۔ ۱۸ / مارچ ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

شبلی و مہدی! خدا آپ کو آپ کے دست قلم کو آپ کی صنعت گری طبع کو قائم رکھے۔ بخدا مجھ کو خوشی سے زیادہ آپ پر رشک ہوتا ہے۔ کبھی کبھی خط بھی لکھا کیجئے۔"[۱]

---

[۱] مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۱۹۹۔

اس فقرے کو بھی دیکھئے :

"البشیر میں ناموس الاسلام کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا۔ نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔[۱]"

شبلی ایک اور خط میں مہدی کو لکھتے ہیں :

"عنایت نامہ کیا میری ہیچ مدانی کا قابل قدر سرٹیفکیٹ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں اس کو پڑھ کر پہلا خیال جو میرے دل میں آیا یہ تھا کہ یہ لٹریچر کسی تصنیف میں صرف ہوتا تو وہ نہایت عمدہ تصنیف خیال کی جاتی۔[۲]"

مہدی نے ایک مضمون دائرہ ادبیہ کے عنوان سے لکھا تھا۔ شبلی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے نصیب ہوتے۔ دائرۂ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کرنے کی بات نہیں۔[۳]"

شبلی کا یہ ظلم کسی طرح قابل معافی نہیں کہ انھوں نے مہدی کے خطوط محفوظ نہیں رکھے۔ حالاں کہ ان کے بہترین خطوط وہی تھے جو انھوں نے شبلی کو لکھے تھے۔ اس کا انھوں نے خود بھی ایک خط میں اعتراف کیا ہے۔ جس کے مخاطب محمد افراغ ہیں۔

"شبلی کے ۸۰ خط میرے نام کے دنیا کے سامنے ہیں لیکن میں نے ان کو سینکڑوں خط لکھے۔ دل سے لکھے اور اس طرح کہ شبلی کو لکھنا پڑا "کاش شعر العجم کے مصنف کو اس قسم کے دو فقرے نصیب ہوتے" جانتا ہوں یہ محض میری حوصلہ افزائی ہے لیکن اس کی تہہ میں جس قسم کا خلوص تھا آج اسے کہاں تلاش کروں۔[۴]"

---

[۱] مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۱۹۸۔ [۲] ایضاً، ص ۱۹۰۔

[۳] ایضاً، ص ۲۲۸۔ [۴] مکاتیب مہدی، ص ۲۳۵۔

مہدی افادی شبلی محمد حسین آزاد میر ناصر علی اور ریاض کے اسلوب سے بے حد متاثر تھے اور یہ رنگ ان کی انشا میں چمکتا بھی ہے لیکن شبلی کا ذکر غالب کے پری وش کا ذکر ہے۔ ان کے متعلق رائے زنی مہدی کے موثرات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ شبلی کو لکھتے ہیں :

"آپ کے لائق ادب کارڈ بھی اس قدر جامع و مانع ہوتے ہیں جیسے چنے کی دال پر قل ہو اللہ لکھی ہو..... آپ دو سطریں بھی ایسی نہیں لکھ سکتے جن میں چشم سخن کسی نہ کسی لٹریری مسئلہ کی طرف اشارے نہ کرتی جائے اور یہ انشا پردازی کا کمال ہے[1]"

حقیقت یہ ہے کہ یہ رائے خود مہدی کے متعلق بھی لفظاً بہ لفظ صحیح ہے۔ انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنی شخصیت کو پیش کر دیا ہے اس لیے کہ وہ اسی سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ اناطول فرانس نے شاید اسی موقع کے لیے لکھا ہے کہ تنقید ایک قسم کا رومان ہے اور ہر رومان اگر ٹھیک سمجھا جائے تو آپ بیتی ہے جس طرح کوئی خارجی آرٹ نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی خارجی تنقید بھی نہیں ہو سکتی[2]

مہدی نے اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے۔ دیکھیے کیسی جچی تلی رائے ہے۔

"مجھ کو ہمیشہ اس کا صدمہ رہے گا کہ حیدر آباد سے علیحدگی کے بعد آپ علی گڑھ کو اپنا مستقر نہ بنا سکے اور یہ کالج کی انتہائی بدنصیبی ہے میں ان کا ہم خیال نہیں ہوں جو سمجھتے ہیں کہ آپ نے "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی" یا یہ کہ موجودہ مشاغل آپ کے لئے ناموزوں ہیں۔ میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ علمی مقاصد کے لئے مختلف موضوع کے لحاظ سے ملک میں ایک سے زیادہ انسٹی ٹیوشن موجود نہ ہوں لیکن یہ میرے دل کا چور ہے جسے آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ میں آپ کو کالج میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا[3]"

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۵ [2] ON LIFE AND LETTERS BY ANATOLE FRANCE

[3] مکاتیب مہدی، ص ۶

شبلی اور مہدی میں کوئی راز نہیں تھا۔[1] اس لیے دونوں میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ مہدی میں خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے بڑے زاہدوں کو بھی کچھ دیر کے لیے رند بنا لیتے تھے اسی طرح انھوں نے شبلی کو بھی بے تکلف کر لیا تھا۔ غزل کدۂ بمبئی کے پس منظر میں مہدی کے یہ جملے دیکھیے جو انھوں نے ایڈیٹر صلائے عام کے ایک مضمون کے متعلق لکھے ہیں۔

"پچھلے پرچہ میں "مسکرانے" پر اس نے جو کچھ لکھا ہے بمبئی کو پیش نظر رکھ کر دیکھئے لیکن اس دفعہ کا آپ کا رنگ وہاں کچھ پھیکا رہا کیوں کہ آپ نعم البدل ڈھونڈتے ہیں وہ الہ آباد میں موجود ہے۔ لیکن جب تک پردہ کا گلا نہ گھونٹیں اگر وہ آنکھوں میں نہ آئے تو میرا قصور نہیں۔[2]"

یہ صاف گوئی بھی دیکھیے۔

"بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ فلسفۂ قدیم کے عامل ہیں یعنی منہ پر کچھ اور دل میں کچھ اور۔ اور میرے ہاں مقتضائے نفس اور شایان حال دونوں ایک چیز ہے یعنی ہم لوگ کہیں سے لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ دل و زبان گویا صرف ایک چیز کے دو نام ہیں۔[3]"

عطیہ بیگم کی تصویر کے لطیفے کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مہدی نے اس فرضی تصویر کے متعلق مولانا کو لکھا تھا کہ میں تو انھیں نسائیت اور جذبات کا مرقع یعنی ایک لچک دار شاخ صندلی سمجھا تھا بس اوقات معلوم ہو گئی۔ اس پر شبلی نے جھلا کر ایک جملہ لکھا تھا جو بھولنے کی چیز نہیں ہے۔

اس خیال کا آدمی شعر العجم لکھ چکا۔ مہدی اس پر رائے زنی کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"کیا یہ ایک فقرہ صرف ایک فقرہ ممدوح کے مذاق ادب کی سائیکلوپیڈیا نہیں ہے۔ غور کیجیے جس قدر کہا اس سے زیادہ تخیل کے لئے گنجائش

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۱۰۔ [2] ایضاً، ص ۷۔ [3] ایضاً، ص ۸۔

چھوڑ دی۔ کیا آپ اس قسم کے نکات کو پس پردہ رکھیں گے۔ لیکن یہ گھونگھٹ لٹریچر کا خون کر دے گا۔[۱]"

مہدی شعر العجم کو صحیفہ عشق[۲] اور شبلی کی تصنیفات میں اسے "گل سرسبد[۳]" سمجھتے تھے۔ شعر العجم کے متعلق لکھتے ہیں :

"شعر العجم دیکھی نہیں۔ آنکھوں سے لگائی۔ اگلے پچھلے بہتیرے نکتے یاد آگئے اور صدمہ ہوا کہ یہ نعمت ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔ صوفیانہ شاعری کی نزاکتیں جس نفاست سے دکھائی گئی ہیں ان سے بہت متاثر ہوا۔ میں تصوف متعارف سے ذرا گھبراتا ہوں لیکن مولانا کے انتقادات پڑھنے کے بعد ایک دزدیدہ اور خاموش اثر دل میں پاتا ہوں جس سے قوت انحراف قریب قریب زیر ہو چکی۔ اخلاقی شاعری میں زیادہ پھیل نہ سکے۔ مواد بہت کچھ تصوف کے نذر ہو چکا تھا۔ عشقیہ شاعری میں تو دریا بہایا ہے اور وہ بھی موتیوں کا۔[۴]"

مہدی کے یہاں ایک نازک جمالیاتی احساس اور گہرے ادبی شعور کے ساتھ تنقید کی ذمہ داری کا بھی لحاظ ہے۔ باوصف اس عقیدت کے مہدی نے شبلی کی سیرت پر منحرفانہ نظر ڈالی ہے اور اس طرح بعض ایسی گتھیوں کو سلجھایا ہے جو ان کی سیرت نگار کے لیے دقت کا باعث تھیں۔ یہ جملے ملاحظہ ہوں :

"شبلی اوروں کے غیر معترف تھے یہاں تک کہ سلسلۂ تصنیف میں دوسروں کا ذکر بھی نہیں آنے پاتا تھا۔[۵]"

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"ہم لوگ شبلی کو غزالی و رازی جہاں تک سمجھتے ہیں معلوم ہے۔[۶]"

مولانا عبدالماجد کے خط میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے :

۱؎ مکاتیب مہدی، ص ۱۳۔ ۲؎ ایضاً، ص ۳۷۔ ۳؎ ایضاً، ص ۱۴۔ ۴؎ ایضاً، ص ۴۱۔
۵؎ ایضاً، ص ۵۰۔ ۶؎ ایضاً، ص ۵۱۔

"شبلی کے ساتھ میری عقیدت معلوم ہے تاہم وہ حالی کے ساتھ جس طرح پیش آئے مجھے ناگوار سا ہے۔ میرا خیال ہے شبلی کی بریت میں ان کے سوانح نگار کو دقت پیش آئے گی۔[۱]"

لیکن مہدی شبلی کے علم و فضل کے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس علم کے پتلے کا کوئی رونگٹا بیکار نہیں[۲]۔ وہ اس کے بھی معترف تھے کہ ان کی ادبی سرگرمیاں زیادہ تر شبلی کی بدولت تھیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مجھ کو جو کچھ لٹریچر سے شوق تھا ممدوح کے بل پر تھا۔[۳]"

مولوی محمد افراغ کو لکھتے ہیں :

"مجھے خوف تھا مرحوم کے بعد لکھنے پڑھنے کا مشغلہ باقی نہ رہے گا لیکن دار المصنفین کے سرمایہ ناز حضرت مولانا سلمان ماجد وعبادی کے دم سے یہ سلسلہ قائم ہے لیکن وہ بات کہاں کی گئی کو ہکن کے ساتھ۔[۴]"

مہدی کے ادبی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور ریاض خیرآبادی کے متعلق کیا لکھا ہے۔ ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ وہ کن کن ادیبوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی کون سی صفات سے متاثر ہیں۔

مہدی اور آزاد

آقائے اُردو آزاد کے متعلق مہدی نے لکھا ہے کہ وہ صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ یہی بات مہدی کے متعلق صحیح ہے۔ ان کی بھی عظمت کا ایوان صرف انشا پردازی پر قائم ہے۔ وہ شبلی سے عقیدت رکھتے تھے لیکن اُردوئے معلیٰ کے ہیرو آزاد کی زرنگار نثر سے اتنا متاثر تھے کہ خود ان کے ادبی کمالات پر قلم آزمائی کرنے کے خواہش مند تھے۔

اس زمانے کے مشہور ادیبوں میں میر ناصر علی بھی تھے جو اپنے رسالے صلائے عام

---

۱ مکاتیب مہدی، ص ۵۸۔ ۲ ایضاً، ص ۱۸۲۔ ۳ ایضاً، ۴ ایضاً، ص ۲۳۵۔

کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ وہ نثر میں "شاعری" کرتے تھے۔ انھوں نے شرر کی طرح نئے خیالات اور خیال آفرینی کے اسالیب جو انگریزی کے اثر سے پیدا ہو رہے تھے اُردو میں اس خوبی سے سموئے کہ پیوند کاری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ میر ناصر علی کے یہاں صرف زبان کی لطافتوں پر زور نہیں ہے بلکہ خیال آفرینی بھی اہم ہے۔ انھوں نے خود "صلائے عام" میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

"زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خون جگر کھانا پڑتا ہے اس کے سمجھنے کے لئے دل و دماغ چاہئے اور دل و دماغ بخت عرفی کی طرح ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔"

مہدی افادی میر ناصر علی کے متعلق لکھتے ہیں:

"اکتوبر کا "صلائے عام" عروس جمیل در لباس حریر لاجواب نکلا صنعت گری یعنی آرٹ کا اچھا خاصا مرقع ہے جو یہاں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اکثر جگہ آپ کی نزاکت خیال میری آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکی لیکن دل کا درد نہ گیا۔ خدا جانے کیا بات ہے آپ کی تحریر سے دل کو چوٹ لگتی ہے جیسے مجھ پر گزری ہوئی کوئی پتہ پتہ کی کہہ رہا ہو۔ آپ لکھتے نہیں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ نکال لیتے ہیں۔"

(یہ محاورہ غلط ہو تو خبر نہیں۔ بے خودی میں ادائے خیال کر دیا ہے۔[۱])

ایک اور خط میں میر ناصر علی خاں ہی کو لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں سنجیدہ لٹریچر تو کچھ پیدا ہو گیا ہے لیکن خالص ادب کا آپ کے سوا کہیں اس وقت تک پتہ نہیں ....

میری غرض مستقلاً لطائف ادبی BELLS LETTER سے ہے۔ غالب نے اپنی مشکل پسندی کے ساتھ اس رنگ کو کس حد تک نباہا۔ لیکن نفس لٹریچر جو خود ایک مستقل چیز ہے خاص طرح کی شرافت اور نزاکت خیال چاہتا ہے۔ نرے روزمرہ اور محاورہ کی الٹ پھیر سے کام نہیں چلتا۔ یہ بات میں آپ

---

[۱] مکاتیب مہدی، ص ۱۵۳۔

میں پاتا ہوں یعنی آپ جو کچھ لکھتے ہیں خالص ادیب کی حیثیت سے اور کمال انشاپردازی کا اقتضا بھی یہی ہے کہ ادب یعنی لٹریچر اور اصناف سخن کی طرح خود مستقل بالذات ہو[1]"

مہدی اور ریاض

اس زمانے میں ریاض خیرآبادی کی انشاپردازی اور شگفتہ نگاری کی بھی دھوم تھی۔ مہدی نے ان کی ادبی فتوحات کا بھی فیاضانہ اور شناسانہ اعتراف کیا ہے۔ دلگیر اکبرآبادی کو لکھتے ہیں :

"مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں جلائے) عروس سخن کا آشنائے ازلی ہے۔ آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں وہ ریاض کے قلم کی آواز بازگشت ہے ..... وہ جس طرح نظم کا مالک ہے آقائے نثر بھی ہے اور یہی امتیاز فائقہ ہے جس کی بنا پر وہ انشاپردازی کا مسلم الثبوت ہیرو ہے[2]"

مہدی کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ اس لیے کہ زندگی کی طرح تغیر کا اصول ادب میں بھی کارفرما ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے اسلوب کی قبا ان ہی تاروں سے مزین تھی۔ ان تمام ادبی شخصیتوں نے جن کا سہارا محض انشاپردازی ہے مہدی کے ذوق کی مشاطگی میں حصّہ لیا ہے لیکن یہ حسنِ ظن نہیں، واقعہ ہے کہ ان کے اسلوب کی تعمیر میں یہ تمام رنگ "زمین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پر جو نقش ابھرا ہے وہ قطعی منفرد اور ممتاز ہے۔ زہرۂ صبح اور جامِ بلور کا یہ اجتماع "خداساز" بات ہے اور اس کی جلوہ صرف مہدی کے یہاں ہے۔

مہدی کے خطوں سے نہ صرف ان کے موثرات خارجی واضح ہو جاتے ہیں بلکہ ان کا ادبی نقطۂ نظر بھی سامنے آجاتا ہے۔

"نری باتیں کتنی ہی دلچسپ ہوں، مزیدار نہیں ہوتیں[3]"

"انشاپردازی کے لئے یہ کس قدر ضروری ہے کہ تہے الفاظ کا انبار نہ ہو بلکہ

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۱۵۹-۱۶۰۔ [2] ایضاً، ص ۱۸۹۔ [3] ایضاً، ص ۵۶۔

مسائلِ عصریہ کے لحاظ سے خیالات کا معیار اتنا اونچا ہو کہ بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی قسم کی "بے گانہ وشی" محسوس نہ کرے اور یہ کسی قدر مشکل ہے لیکن لوگ نہیں سمجھتے۔[1]"

"مجھ کو آپ سے بالکل اتفاق نہیں کہ آپ اپنی فلسفیانہ تصنیفات کے لٹریچر کو عام فہم بنانا چاہتے ہیں۔ جو چیز "خاصہ" کی ہو اس کا وقفِ عام ہونا ایک عیب ہے۔ کیا حکماء متقدمین کی مثالیں آپ کے سامنے نہیں ہیں۔ میرا مطلب بے معنی الفاظ کے انبار سے نہیں ہے۔ لیکن فلسفیانہ موشگافیوں کے لئے جس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے وہ انشاپردازی کی معمولی سطح سے یقینی فائق تر ہوگا۔ اس لئے اس امتیاز کو قائم رکھنا ہوگا۔ خود فلسفہ کے حقوق سفارشی ہیں۔ شراب جامِ سفالین بھی شراب ہی ہوگی۔ لیکن بلور کے شفاف اور تراشیدہ ساغر کی بات ہی اور ہے۔ ہاں درسی کتابکا لب و لہجہ جس قدر چاہئے آسان کر دیجئے۔ نازک دماغوں پر بار نہ پڑے یعنی موم پر نرمی سے نقش ابھرتا رہے۔[2]"

آج تک "ارتقا" کا مسئلہ ہمارے ثقہ اہلِ قلم کے لیے بندر کا کھیل ہے۔ کوئی صاحب لکھتے ہیں تو پہلو بچا بچا کر یعنی یہ لغویت اس لائق نہیں کہ ان کے ذاتی مجتہدات کا ایک جزو ہو سکے۔ سُنی سُنائی بات ہے جو بسبیلِ تذکرہ قلم سے نکل گئی۔ ارکانِ ندوہ نے جرأت کر کے کچھ لکھا بھی تو آیات قرآنی سے بھڑانا شروع کر دیا۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو آخر میں "واللہ اعلم بالصواب" سے سارے مضمون پر پانی پھیر دیا۔[3]

"کمال انشاپردازی کا اقتضا یہی ہے کہ ادب یعنی لٹریچر اور اصنافِ سخن کی طرح خود مستقل بالذات ہو۔[4]"

افسوس عمر نے مہدی کے ساتھ بے وفائی کی اور یہ دلربا ادائیں کسی مستقل تصنیف پر صرف نہ ہو سکیں۔ لیکن اس کے نقطۂ نظر کو نباہنے کے لیے خطوط بھی نہایت موزوں

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۵۹۔ [2] ایضاً، ص ۷۷۔ [3] ایضاً، ص ۱۰۱۔ [4] ایضاً، ص ۱۲۰۔

صنفِ ادب ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جی لگا کر خطوط ہی لکھے اور آج ان کی شہرت کا تمام تر انحصار ان ہی خطوں پر ہے۔ مہدی خطوں کی ادبی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

"خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ اس لئے سرسری اظہار خیال بھی اگر اس پایہ کا ہو کہ انشا پردازی اس کی بلائیں لیتی ہو تو یہ بھی کمال کا ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔"[۱]

مکاتیب شبلی پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔

"نج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہار خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے[۲]"

مہدی نام عشق لیلی اور ذوق خامہ فرسا کے قائل تھے۔ ان کا حلقہ احباب بہت بڑا نہ تھا لیکن پھر بھی چند اچھے اور چوٹی کے ادیبوں سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ کبھی کبھی آدمی دوستوں کے انتخاب سے بھی رسوا ہو جاتا ہے۔ ان کے مجموعہ میں حالی شبلی سید سلیمان ندوی عبدالماجد دریا آبادی دلگیر اکبر آبادی پروفیسر عبدالباری ہوش بلگرامی ریاض خیر آبادی اور میر ناصر علی کے نام خط موجود ہیں جو ان کے اعلیٰ مذاقِ ادب کی غمازی کرتے ہیں۔ مہدی خود بھی اپنی اس لائقِ رشک صلاحیت سے بے خبر نہیں تھے۔ محمد افراغ کو لکھتے ہیں۔

"آپ کی ستائشی جنبش لب میری زندگی کی آخری بہار ہے۔ اس خط کو محفوظ رکھئے گا۔ اس کا افسوس ہے کہ میرے خیالات پریشاں اور خاص کر خطوں کے انبار سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہو سکتا تھا کہ دنیائے ادب میں کچھ دنوں چرچا رہتا

---

[۱] مکاتیب مہدی، ص ۱۰۵۔ [۲] مکاتیب مہدی۔ مقدمہ، ص ۱۱۔

اور یہ ایک فانی ہستی کا بڑے سے بڑا تخئیل ہے۔"[۱]

مہدی کی نامہ طرازی

ان کو اپنی انشاپردازی کا راز بھی معلوم تھا۔ مہدی بیگم کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔

"ایک صاحبہ جو پاس بیٹھی ہیں اس خط کو دیکھ کر فرماتی ہیں۔ تم سرسری خط میں جو کچھ لکھ دیتے ہو بڑے مضمون میں بھی اس کی سمائی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ سچ ہے؟"[۲]

ان اقتباسات سے کم سے کم یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ مہدی کے خطوط بے ساختہ نہیں ہیں۔ ان میں تکلف ہے۔ لیکن ایسا ہی ہے جیسے گلاب کے پھول پر رنگ یا ناک میں ہیرے کی لونگ یا آنکھ میں سرمہ کی لکیر۔ مہدی جس انشاپردازی کے قائل تھے اس میں تکلف ضرور تھا وہ خوش آب موتیوں کے نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانے کو روانی آب سے زیادہ دلکش سمجھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہ غلط ہے کہ فلسفۂ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے۔ عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن بیوگی کے بعد وہ جوبن نہیں رہتا۔ ہیرا تراش لونگ کے اُترتے ہی اس کی سج دھج تراش خراش سب میں فرق آجاتا ہے۔"[۳]

مہدی کی نامہ طرازی کا اصلی آرٹ چست فقروں اور ادبی لطیفوں کا ہے۔ یہ آب دار اور ترشے ہوئے فقرے ان کے مکاتیب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ ادب و انشا کی جان ہے۔ انشاپردازی ان کی بلائیں لیتی ہے اور دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایک خاتون کی عمر کی طرف چشم سخن سے اشارہ کرتے ہیں لیکن دیکھیے تخئیل کے لیے کتنی گنجائش چھوڑی ہے۔

"چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی ہوئی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ یہ حسن و عشق کا نہایت ہی نازک نکتہ ہے۔ عورت اتنی باکیف تو ہو۔

من فدائے بت شوخی کہ بہ ہنگام وصال   بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را "[۴]

---

[۱] مکاتیب مہدی، ص ۲۲۵۔ [۲] ایضاً، ص ۱۱۱۔ [۳] ایضاً، ص ۳۴۔ [۴] ایضاً، ص ۲۱۔ یہ مولانا شبلی کا شعر ہے۔

مولوی عبدالماجد حیدرآباد کی ملازمت کی کشاکش سے نجات پاکر لکھنؤ آگئے۔ ان سے جلد جلد خط لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔

"جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک لقمہ تر جلد جلد حلق سے نیچے نہیں اتار لیتا اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپ کے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے اس میں میرے "کنگلے پن" کو اس قدر دخل نہیں جس قدر آپ کے بخل کو کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حصہ میں نہیں آتی۔ خوش ہوا قفس کی تیلیاں ٹوٹیں اور پر شکستہ طائر کو ہوائے وطن نصیب ہوئی۔ وطن بھی لائقِ رشکِ لکھنؤ۔"[1]

اس آخر فقرے کی بلاغت کی داد وہ لوگ دیں گے جو ریاستوں کی نوکریوں کی تکلیف کو جانتے ہیں۔

شاہ دلگیر اکبرآبادی کو نقاد نکالنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

"نقش اول ..... بہت پسند آیا۔ ضرورت تھی کہ ارضِ تاج ادبی حیثیت سے عروسِ سخن کے میکے اور سسرال یعنی دِلّی لکھنؤ سے پیچھے نہ رہے۔ آپ کی "وطنیت" کا یہ شریف تر اقتضا تھا کہ آپ کو لٹریری جلوہ گری کا خیال آیا جو آج کل کے دماغی دور میں ارتقائی زندگی کا عنصر لازمی ہے۔"[2]

شیخ محمد کو مدت کے بعد لکھنے پر کس خوبی کے ساتھ ٹوکتے ہیں۔

"جس طرح شراب جتنی پرانی ہو تیز ہوتی ہے۔ تمہاری تاخیر بھی دیرینہ روابط اتحاد کے لحاظ سے "بے کیف" نہیں ہوتی۔ لیکن روز کے پینے والے کو "منہ کی لگی" ہفتوں اور مہینوں نہ ملے تو خمار مستی قائم نہیں رہ سکتا اور یہ آئینِ رندی۔ وفا کے خلاف ہے۔ اب ذرا خیال رکھئے گا۔"[3]

شوخ نگاری

یہ نازک کاری ہر خط میں ہے۔ جو صفحہ کھولئے وہاں ایک دو نور آگئیں اور

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۶۵۔ [2] ایضاً، ص ۱۰۰۔ [3] ایضاً، ص ۲۸۷۔

طرح دار فقرے ضرور مل جائیں گے۔ مہدی نے خط نہیں لکھے۔ ادب کے دامن میں بلاغت کے موتی ٹانکے ہیں۔ مہدی کی پیراتراش انشاپردازی میں وہ لطف نہ سہی جو پھول کی خوشبو اور شفق کی رنگینی میں ہوتا ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس میں میرحسن کی شاعری اور تاج محل کی صناعی کی ساری خوبیاں سما گئی ہیں۔ مہدی کی انشاپردازی کا سب سے بڑا وصف ان کی شوخ نگاری ہے۔ اس شوخی میں ادبیت اس طرح لہریں دیتی ہے جیسے کوئی پانی میں چوٹی کھول دے۔ پھر کہیں بھی سوقیت اور ابتذال کا نام نہیں ہے حالانکہ انھوں نے بعض ایسی باتیں بھی کہیں ہیں جو کہنے کی نہیں ہیں لیکن بقول اسکر وائلڈ "گفتگو کا آرٹ یہی ہے کہ وہ چیز نہایت خوبصورتی سے کہی جائے جسے نہ کہنا چاہیے۔" مہدی کے ان شوخ جملوں کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب مسرت سے دھڑک رہا ہے اور جو نبض ہے وہ خون صحیح لیے ہوئے تڑپ رہی ہے۔ مہدی اثر آفرینی میں تبسم زیرلب سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ تبسم کیا یا مزہ آگہی کی اولین شعاعیں ہیں جن سے ادب کا سارا چمن نکھر جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ" ان کا یہ اسلوب تحریر جس قدر لطیف اور نازک ہے اسی قدر پرخطر ہے۔ وہ اس راستے میں غار کے منہ تک آجاتے ہیں مگر قلم کا محتاط قدم اس طرح تل تل کر پڑتا ہے کہ لغزش نہیں ہونے پاتی۔[1]"

سید سلیمان ندوی شب زفاف میں بیمار ہوگئے۔ ان کو چھیڑتے ہیں:

"میں سنتا تھا" مولوی" خلوت کے رنگیلے ہوتے ہیں لیکن آپ کی روداد عروسی جہاں تک معلوم ہوئی غیر حوصلہ افزا ہے۔ یہ کیا کہ مرعوب ہوکر" صنف قوی" کی آبرو کھوئی۔ خیر گزری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا لیکن دوستوں کو قلق رہے گا کہ جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصلاح میں" شکن بستر" نکلا۔[2]"

شبلی کو اپنی دوسری شادی کی اطلاع کرتے ہیں۔ طنز ملاحظہ ہو۔

"میں نے شاید آپ کو اپنے احرام جدید کی خبر نہیں دی یعنی لذت کی تلاش کے بعد وہ "جنس لطیف" ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی۔[3]"

---

[1] مکاتیب مہدی۔ مقدمہ [2] مکاتیب مہدی، ص ۴۲۔ [3] ایضاً، ص ۶۔

مہدی کے طنز میں زہرناکی نہیں ہے۔ کشادہ قلبی ہے اور ڈرائیڈن کی سی تہہ در تہہ بات ہے۔ مولانا شبلی کو لکھتے ہیں۔

"کوئی نئی حرکت آپ نے اس درمیان میں سوچی۔ ہندوستانی ماؤں کی طرح کہ ایک گود میں ایک پیٹ میں آپ کی طبع زاد معنوی بھی انہی ترکیب سے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ نئی امید ہو تو پتہ دیجئے گا۔[۱]"

سید سلیمان ندوی کو جلد بندی کے متعلق ہدایت کرتے ہیں۔

"انسٹی ٹیوٹ پریس کے پریشان خیال منیجر کی "خچریت" یعنی آدھے چمڑے اور آدھے کپڑے والی ترکیب نہ ہو۔ یہ صرف مذاق کا بھونڈا پن ہے[۲]"

سید صاحب ہی کو لکھتے ہیں۔

"شملہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ لیکن مجھے تو نام سے بھی دلچسپی ہے۔ دیکھئے پھولوں کی سیج پر جوانی کی ورزش کی شائقہ اپنے چاہنے والے سے کیا کہتی ہے۔

دوسرا تیسرا یہ حملہ ہے   یہ بھی کیا کوئی شہر شملہ ہے[۳]"

اسی خط میں اپنے مذہب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"آپ کو میرے مذہب کی فکر ہے۔ حضرت شبلی کی طرح تمام دنیا سے الگ ہوں۔ محرم یا رام لیلا۔ دونوں غیر ضروری۔ اصیل مرغ کی ایک ٹانگ صرف بندۂ عشق ہوں۔ زوائید سے غرض نہیں رکھتا[۴]"

دیکھیے یہ جملہ کتنا شگفتہ اور خیال انگیز ہے۔ ایک انگریز افسر کی رپورٹ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"گورے کی دل کی سیاہی جب قلم سے ٹپکتی ہے تو زیادہ پھیلتی ہے[۵]"

سید سلیمان کو لکھتے ہیں کہ سیرت النبی کا سائز وہ نہیں ہونا چاہیئے جو بوستانِ خیال اور فسانۂ آزاد کا ہے۔

"کیا سیرۃ کی طبع ثانی میں اس کا کچھ لحاظ ہوگا۔ یا اصیل مرغ کی ایک ٹانگ۔

---

[۱] مکاتیب مہدی، ص ۸۔ [۲] ایضاً، ص ۲۵۔ [۳] ایضاً، ص ۲۹۔ [۴] ایضاً، ص ۲۹۔ [۵] ایضاً، ص ۳۴۔

مولویت اپنے مرکز ثقل سے نہیں ہٹے گی۔ خوب یاد رکھئے شائستہ طبقہ کی نگاہ میں (اگر کوئی ایسا طبقہ ہو) بوستان خیال اور فسانۂ آزاد کا سائز کھٹکتا ہے۔
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"[1]

مہدی جب شگفتہ نگاری کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں تو سنجیدگی ان کی بلائیں لیتی ہے۔ ان کا مذاق بہت اعلیٰ تھا اور طبیعت بڑی نفیس پائی تھی۔ وہ کور ذوقی پر ٹوکنے، ذوق ادب کو سنوارنے اور زہد کو میانجیت کے پھندے سے نکالنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ لیکن بات اس طرح کہتے کہ ناگواری کے بجائے ادبی نشاط اور سرور حاصل ہوتا۔

اپنی تنہائی کا ذکر کرتے ہیں۔

"موسم نہایت توبہ شکن ہے اس لئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ لیکن آج کل کچھ حصہ میں نہیں صرف عالم خیال سے اٹھکیلیاں کرتا رہتا ہوں جس نے اس زہر کو چکھا ہے وہی اندازہ کر سکتا ہے کہ شب امید عید سے زیادہ باکیف ہوتی ہے۔"[2]

سنجیدہ ظرافت اور شگفتہ متانت مہدی مرحوم کا حصہ ہے۔ سید سلیمان کو دوسری شادی کے موقع پر لکھتے ہیں۔

"دو آتشہ اچھی کھچی ہوئی ہو تو نشاط ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں"[3]

مولوی عبدالماجد حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ آئے تو ان کو لکھتے ہیں۔

"آپ لکھتے ہیں" وقت اپنا ہے قلم اپنا ہے دماغ اپنا ہے" ایک صاحبہ فرماتی ہیں صاف کیوں نہیں کہتے "بیگم اپنی ہیں"[4]

مہدی کو زاہدوں سے چھیڑ چھاڑ میں بڑا لطف آتا ہے۔ مولوی عبدالماجد کو لکھتے ہیں۔

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۳۵۔ [2] ایضاً، ص ۳۸۔ [3] ایضاً، ص ۴۲۔ [4] ایضاً، ص ۶۵

"معارف میں" دین حنیف" کی بھرمار ہو رہی ہے" عقلیات" کا کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ سنبھالئے۔ گرا چاہتا ہے[1]۔"

مکتوب الیہ کو شکایت تھی کہ مہدی کی انشا عریاں قسم کی ہے۔ اس پر گل افشانی ملاحظہ ہو۔

"انشائے عریاں کی بہت رہی۔ آپ کی فلسفیت قطعی الثبوت سہی لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ میرے مذاق کی سنجیدگی کی طرف سے غیر مطمئن ہوں۔ میں نے عورت کے سینے (حبابے خاستہ از بحر کافور) کے لئے آپ سے ایک لفظ مانگا تھا اسی سلسلہ میں یہ بات بھی طے ہونے کی تھی کہ "کرتے" (یائے مجہول) کے مقابلہ میں "کرتی" (یائے معروف) کیوں غیر سنجیدہ ہے جب اس سے صرف اس فرق کا اظہار مقصود ہے جو مردانہ اور زنانہ لباس میں ہوتا ہے۔ زبان بالخاصہ جن نزاکتوں کی کفیل ہو سکتی ہے ان کے لحاظ سے آپ کو کیا حق ہے کہ دستانے کی طرح چپھی ہوئی محرم پر" قبائے تنگ" کا اطلاق کیجئے گو مقصود ذہنی کچھ اور ہو۔"

اظہارِ خیال ایک مستقل مضمون چاہتا ہے۔ نوک جھونک کے لیے تیار رہیے[2]

سنجیدگی عبارت اور شوخی اشارت کا یہ نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

"مولانا رزاق اور یاد مہدی ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے مولویوں میں بڑا عیب یہ ہے کہ جب تک "خشکہ" ان کو ملتا رہے یہ آدمی رہتے ہیں۔ جہاں بریانی کی چاٹ لگی اور ایک سے دو وقت ہوئے کہ یہ ہاتھ سے گئے۔ پیٹ کے ساتھ خوش ظرفی نہیں بڑھتی۔ ایسا خوش بیان کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ ایسا قابل جو نہایت لائق رشک تالیفات کا مالک ہو پھر بھی برسوں سے دنیائے ادب سے بالکل بیگانہ۔ سمجھ میں آنے کی بات نہیں[3]۔"

ہوش بلگرامی کو لکھتے ہیں۔

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۶۷۔ [2] ایضاً، ص ۵۰۔ [3] ایضاً، ص ۱۷۲۔

"خدا کرے آپ وہاں جم جائیں جس کی نگاہیں "فلک نما" سے الجھی رہی ہوں اس کا ٹھکانا "بہشت ارضی" (بھوپال) کے سوا کہیں ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ آپ نے کیا لکھا کہ "راتیں مشکل سے کٹتی ہیں۔ انیس زندگی یاد آتی ہے"۔ سرکاری مہمان کو کوئی کنیز نہیں ملتی۔ یہ تو قوائد رسمیہ کی ایک لائق افسوس خلاف ورزی ہے[۱]۔"

شیخ محمد کو ایک دوست کے متعلق لکھتے ہیں۔ طنز یہ مصوری کا کمال ہے۔

"اس دفعہ میں نے اس کو بہت رئیس پایا۔ مکان اچھا سال گیا ہے۔ ایک تخت پر بنیائن اور دھوتی میں لیٹا لیٹا یا بیٹھا رہتا ہے۔ جس شام کو میں زیارت کر سکا تھا ذرا حبس تھا۔ اس لئے دوران ملاقات میں اس نے بے تکلفانہ خلوص کے ساتھ بنیائن بھی اُتار ڈالی۔ خدا کی مشرقی صنعت اور خط و خال کا پورا مرقع میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گہری شام ہوگئی اور مجھ کو آنکھیں بند کر لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی[۲]۔"

مہدی کی شوخی میں انشا اور ادب کا لطف بدستور قائم رہتا ہے۔ مولانا عبد الماجد کو لکھتے ہیں۔

"معاصرانہ چشمک میں ایک فقرہ رہ گیا۔ یہ اس وقت کا خیال ہے جب شبلی کی فکر باکرہ لذت آشنائے تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ حضرت سلیمان کی مولویت اظہار خیال کے اس پیرایہ کو "استیلائے مولویت" سمجھتی ہے[۳]۔"

مہدی بہت نفیس مزاج رکھتے تھے۔ وہ کبھی دوسرے درجے کی چیز پر راضی نہیں ہوئے۔ اچھے کاغذ اور لفافے استعمال کرتے تھے۔ لباس معاشرت ہر چیز میں پاکیزگی اور نفاست کو ضروری سمجھتے تھے۔ "مبا نجیت" سے انھیں سخت نفرت تھی۔ کور ذوقی اور نچریت پر ہمیشہ ٹوکتے تھے۔ کتابیں ان کی نازنین حرم تھیں اور

---

[۱] مکاتیب مہدی، ص ۱۷۱۔ [۲] ایضاً، ۲۵۳۔ [۳] ایضاً، ص ۷۹۔

رسالے عروس جمیل، صوبہ متحدہ میں وہ نئے قسم کے تحصیلدار تھے کہ "کاغذات پٹواری کے ساتھ ادب کا مشغلہ بھی بیگم کے ساتھ گلے کا ہار رہا۔" وہ نئی کتابوں کی ٹوہ میں رہتے، نئے لکھنے والے کی ہمت افزائی کرتے۔ پرانے لکھنے والوں کے ذوقِ ادب کو سنوارتے اور ان کو مسائل عصریہ کی طرف متوجہ کرتے۔

ان کی زندگی ڈرامائی نہیں ہے۔ سیدھی سادی لیکن نفیس اور باوقار ہے۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اس کے بعد دوسری شادی کی۔ اس "دو آتشہ" کا اثر ان کے لٹریچر میں بھی ملتا ہے۔ شبلی کی تخلیقات میں جو جادو ہے وہ بھی اس چشمِ فسوں سازی کی وجہ سے ہے۔ مہدی اس معاملے میں خوش قسمت تھے۔ انھیں ایسی بیوی ملی تھیں جو صحیح معنوں میں ان کی رفیق اور شریکِ حیات تھیں۔ محمد افزاغ کو لکھتے ہیں۔

"نور جہاں کے قصے ہیں کہ جب تک بیٹھ پر ہاتھ نہ رکھتی رنگیلے جہاں گیر سے دربار میں بیٹھا نہ جاتا۔ مگر میں واقعی اس قدر عزیز کا عادی ہو رہا ہوں کہ ایک منٹ بھی بغیر اس کے گذر نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ہی وقت میں میری بیوی میری خادمہ میری سکریٹری میری مصاحب غرض زندگی کے ہر شعبہ کے ہر صیغے کی انچارج ہے۔ یہی آج کل متمدن زندگی کا بڑے سے بڑا ریاض ہے جو ہزاروں میں ایک کو بھی حاصل نہیں[1]۔"

مہدی نے جابجا ان کا ذکر بھی کیا ہے جس سے ان کے حسن انتخاب کا اندازہ ہوتا ہے۔

"آپ لکھتے ہیں وقت اپنا ہے قلم اپنا ہے دماغ اپنا ہے۔ ایک صاحبہ فرماتی ہیں صاف کیوں نہیں کہتے بیگم اپنی ہیں۔"
یہ نکتہ رہ گیا تھا کمی پوری کئے دیتا ہوں[2]۔"

مولوی عبدالماجد کی صحت یابی پر لکھتے ہیں۔

"شکر ہے آپ نے ایک خطرناک مرض سے نجات پائی .... بیگم کہتی ہیں

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۲۱۳۔ [2] ایضاً، ص ۶۵۔

ان ہاتھوں کی چوڑیاں خدا نے رکھ لیں جن کی مہندی بھی ابھی اداس نہیں
ہوئی تھی۔ میری ادبی دلچسپیوں میں وہ شریک رہتی ہیں۔ آپ کے عنایت نامے
ان کی نظر سے بھی گزرتے ہیں۔ بہر حال غیر متوقع صحت پر مشفقہ دلی مبارکباد[1]"

مولوی مقبول احمد کو انھوں نے ایک کتاب علم المعیشت بھیجی تھی۔ وہ انھوں نے واپس کر دی۔ اس کی شکایت کرتے ہیں۔

"افسوس ہوا کتاب واپس آئی (برابر سے ایک آواز) اس لئے واپس کی ہوگی
کہ بڑے ہیں بات نیچی نہ ہونے پائے۔ بس یہی خلوص تھا جس پر آپ اس
قدر اتراتے ہیں۔
خلوص میں تو شک نہیں لیکن مولویت کا کیا علاج ہے۔ یہ سخت پیچیدہ
چیز ہے[2]۔"

مہدی بیگم نے ادبی معاملات میں بھی جو رائے زنی کی ہے اس سے ان کی خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے اور بے اختیار مہدی کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔

کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نکرد

<u>مہدی کے خطوط اپنی بیگم کے نام</u>

ہمیں خوش قسمتی سے مہدی کے وہ خطوط مل گئے ہیں جو انھوں نے اپنی بیگم کو لکھے تھے۔ دیکھیے تعلقات جنسی کو ان کے شعور نے کتنا لطیف اور رنگین بنا دیا تھا۔
تحصیل سورلم سے ۱۸ر نومبر ۱۹۱۰ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میری جان خط نمبر ۱۹ ملا.....
اس حور لقا کو گھر لائے ہو تم کو مبارک اے اکبر
لیکن یہ قیامت کی تم نے جو گھر سے نکلنا چھوڑ دیا
یہ شعر حضرت اکبر کا ہے۔ مجھ پر چوٹ کی ہے جسے دلگیر نے مشرق میں چھکایا ہے
....."خیال عیش" سے سیری ہو چکی۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ کھسیانی بلی تھے

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۶۰۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۵۔

نو بچے کا مصداق ہے۔ گھر کی مرغی ہی تو نہیں ہو سو رلم کو گھر آنگن بنا کے رہتی۔ ایک طرف یہ کج ادائی ہے اور پھر یہ دعویٰ کہ " دنیا میں آپ پر یوں مٹنے والی دوسری پیدا ہی نہیں ہوئی " ترساؤ اور کہو کہ " جان دیتی ہوں "

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خط نمبر ۱۵ اور ۱۶ ملے۔

" بلا کی کمزوری ہے جس سے طبیعت ہر وقت گری گری سی رہتی ہے۔ چار پانچ روز سے کھانسی بھی آتی ہے "

بجلی کی طرح یہ فقرے چمک کر آنکھوں کے سامنے آئے اور جان ہی تو نکل گئی۔ پیاری۔ سینہ تو محفوظ ہے۔ ڈاکٹر کو دکھاؤ اور بواپسی ڈاک مجھے اطمینان دلاؤ۔ انشا پردازی سر دست رخصت۔ صرف ایک فقرہ اور۔ بو۔ ملٹیق کے نام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہارون رشید کی حرم ہو گی لیکن یہ وہی بی سندر جان ہیں۔ سفید رنگ والیوں سے بھی کہہ رکھو۔ مہدی "

ذیل کے خط میں بھی وہی تخئیل کی رنگینی اور جذبے کی گرمی ہے جو مہدی کی خصوصیت کا خاصہ ہے۔

" الہ آباد ۳۱ $\frac{۷}{۱۲}$

جان مہدی۔ کل ۱۱ بجے پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ تمھیں کارڈ پر رسید بھیجی۔ پھر غسل اور تبدیل لباس کے بعد کھانا کھایا اور تازہ دم ہو کر کچہری میں بیٹھ گیا۔ لیکن دل بہ یار و دست بکار کی حیثیت سے شب کو سویا تو کسی کے خیال میں۔ اٹھا تو کسی کے خیال میں۔

آج ۴ بجے صبح کا اٹھا ہوا ہوں۔ ایک راجہ گورنمنٹ کا مہمان ہو کر آرہا تھا۔ ۵ بجے کا وقت اسٹیشن پر کلکٹر بھی پیشوائی کو بھی موجود۔ ٹرین آئی۔ مگر راجہ صاحب غائب۔ معلوم ہوا درمیان کے کسی اسٹیشن پر جہاں گاڑی بدلتی تھی دھوتی میں لپٹے ہوئے پڑے رہ گئے۔ ساری شان یہ تھی کہ ریل میں نوکر پاؤں دبا رہا تھا۔ ابھی ہم لوگ واپس آئے ہیں۔ ۸ بجے تشریف فرمائی کی

خبر ہے۔ تحصیلدار غریب پھر جارہے ہیں لیکن میں نہیں گیا۔
موسم نہایت خوشگوار ہے۔ کالے بادلوں کے ساتھ پانی کے جل تھل سے
دن رات ہو رہا ہے۔ برآمدہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں لیکن کان چھڑے کی
خیالی آواز پر لگے ہیں۔ تم گویا کمرے میں موجود ہو۔
عزیز تمھاری جدائی مجھے اس قدر شاق ہے کہ کسی بات کو جی نہیں چاہتا۔
آج ہز آنر کی پارٹی ہے۔ کس کمبخت کا دل جانے کو چاہتا ہے۔ کون کپڑے
نکالے۔ بن ٹھن کر کسے دکھاؤں۔ اور مغربی تراش خراش کی کس سے داد لوں۔
مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تجھ سے پہلے یعنی تیرے ملنے سے پہلے آخر کیوں کر جیتا
تھا۔ لیکن یقین کی اکلوتی بیٹی امید چہک کر کہہ رہی ہے کہ اتنا بنتے کیوں ہو۔
بی عزیز تو اب تمھاری ہیں۔ اختیاری چیز کے لئے رونا کاہے کا۔ آج
نہیں تو کل۔ میں کہتا ہوں بس اسی کل پر تو مجھے اعتراض ہے۔ میں آج
چاہتا ہوں۔ کل تو عاشق کے لئے فردائے قیامت سے کم نہیں — ہاں
ولایتی شلجم تو پورے رقیب نکلے۔ تمھارا جہدی[1]"

جہدی کی "کافر بیانی" کے سب سے دلکش نمونے ان ہی خطوں میں ہیں۔ ایک
جگہ لکھا ہے۔

"کیسے شگفتہ خط لکھ سکتا ہوں لیکن امتحان میرے لئے "پائے طاؤس"
ہو رہا ہے۔ ان خطوں میں گھر کے معمولی واقعات کا ذکر کیا ہے لیکن اس
خوش اسلوبی اور شگفتگی کے ساتھ وہ لمحے معمولی نہیں رہتے۔ معلوم ہوتا
ہے کہ کائنات کی مسرت کا انحصار ان ہی پر ہے۔

حسن بیان ایسا ہے کہ یہ مسرت محدود نہیں رہتی۔ سب ہی اس سے محظوظ
ہوتے ہیں۔ چپراسیوں کے متعلق اپنے کیمپ باڑہ سے لکھتے ہیں۔

" اب روح الامین اور سیتارام ہیں۔ دونوں سنجیدہ اور غریب مزاج ہیں

---

[1] رسالہ "بھائی" گورکھپور، ج ۱، ش ۳، ص ۱۵۔

آخر الذکر کی بندوق میرے دسترخوان کو ہمیشہ گراں بار رکھتی ہے۔ جب دیکھو چڑیا چلی آرہی ہے۔"

اگلے خط میں لکھتے ہیں۔

"آج میں نے تم کو بہت یاد کیا۔ ایک رئیس نے تازہ رہو بھیجا جو اتنا تھا کہ تمھارے دونوں گھروں کے لئے لڑکیوں کی افراط کے ساتھ بھی کافی ہوتا۔ چچی صاحبہ کی تیل اور کھٹائی کی ہنڈیا الگ لیکن میں نے ماتحتوں میں تقسیم کردی۔ تلے ہوئے ٹکڑے۔ کھڑے آلو کا نہایت خوش ذائقہ بھنا ہوا گوشت میں نے کھایا۔ لیکن خوش دلی سے نہیں۔ میز کے پاس ننھی سی قامت کا ایک فرشتہ جب تک کھڑا تقاضے نہ کر رہا ہو کہ ابا جان کھلائیے۔ کھانے پینے کا لطف نہیں لے۔"

اُردو مکتوبات میں محبت کا یہ نغمہ بالکل نیا ہے اور اس پر ہماری زبان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ اس محبت میں لہک اور مہک ہے جو اور کسی جگہ نہیں ملتی۔ ایک ترِ دماغی کی کیفیت ہے جو ہر چیز کو شبنمی طراوت حسن کے ملبوس میں پیش کرتی ہے۔

مہدی غالب کی طرح اس گر سے اچھی طرح واقف تھے کہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو دلچسپ کس طرح بنایا جاتا ہے۔ انھوں نے جو خط اپنی لڑکیوں اور عزیزوں کو لکھے ہیں ان میں اسی "فن کاری" کا پورا ثبوت دیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے اس قسم کے چند خطوط مہدی مرحوم کے اعزہ کے پاس دیکھے تھے۔ اور ایک مضمون میں ان کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ ذیل کا اقتباس ان ہی کے مضمون سے لیا گیا ہے اس میں کم سن بچوں کی شرارت کا ذکر کرتے ہیں۔

"ایک لڑکا آگے آگے بھاگا جاتا ہے۔ ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کچھ اختلاف ہوگیا ہے۔ اس لئے دانت سے کاٹنے کی فکر میں ہے۔ دری کے فرش تک پگھٹنوں چلا (جسے تم بکیاں کہتی ہو) اس کے بعد ٹاٹ کی رگڑ سے بچنے کے لئے یہ چھوٹا سا

لہ رسالہ عالمگیر لاہور، ج ۴، نمبر ۲ و ۳۔ ص ۹۹۔

دو ٹانگ کا حیوان چوپایہ بن گیا ہے اور اب شاہد کی پنڈلی پر دانت جمانا چاہتا ہے لیکن مدد پہنچ گئی۔ نافذ کا وار خالی گیا[1]"

مہدی کے ان خطوط کو فراہم کرنا درحقیقت ان کی سوانح اور سیرت کو قلم بند کر دینا ہے۔ ان کے اخلاق مذاق نظریات جذبات کا انکشاف جیسا ان بے تکلفانہ خطوں سے ہوتا ہے ایسا کسی اور ذریعہ سے نہیں۔ ان خطوں میں مہدی تحصیلدار انشا پرداز باپ شوہر دوست رازدار سب ہی حیثیتوں سے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے یہ خطوط سدا بہار ہیں۔

لذتیت

مہدی نے اپنی عبارت کی رنگینی کو عورت کے ذکر جمیل سے چمکایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی معطر صباحتوں جاں ستاں اداؤں اور پاکیزہ نزاکتوں کی طرف چشم سخن سے اشارے کرنا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ ان کی انشا میں تلذذ کی ایک خاص کیفیت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی عبدالباری کو لکھتے ہیں۔

"آپ کے جوڑی دار پر فلسفیت کا رنگ اس قدر چڑھ گیا ہے کہ لکھنؤ میں بیٹھ کر "جوبن" سے خوش نہیں معلوم ہوتے۔ ان سے پوچھئے۔

آڑی ہیکل کو چوم لے گی وہ چیز جو کچھ اٹھی اٹھی ہے

اس کے لئے کسی لفظ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ایک چیز جو قائم بالذات ہو جو جسمِ محرم (دوسرا کفر) کا قالب بن جائے اور اسے سانچے میں ڈھال دے جس کی سرکشی دبانے پر بھی پردے پردے میں راز سربستہ کو فاش کرتی ہو۔ انشا پردازی کو "لغات العیش" سے کوئی لفظ دینا ہوگا۔[2]"

ان ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"ہاں جناب ماجد ہوں یا آپ۔ دونوں صاحبوں کی یہ "مدرسیت" میرے

---

[1] نیرنگ آئندہ خطوط (کتابی دنیا، دہلی) ص ۲۲۵۔ [2] مکاتیب مہدی، ص ۱۱۶۔

سمجھ میں نہیں آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کی جائے اور اس سے انشا پردازی کی سنجیدگی پر استدلال ہو۔ میں نے عورت کے سینہ کے لئے جس پر سبزۂ خودرو" نہیں ہوتا" آپ لوگوں سے ایک لفظ مانگا تھا اسی طرح مجھ کو اصرار ہے کہ وہ کرتا نہیں کرتی پہنتی ہے۔ کیا یہی حیاسوزی ہے جسے باوصف لذت کشی آپ بے نقاب دیکھنا نہیں چاہتے [1]

بیگم بھوپال نے تین ہزار روپیے دار المصنفین کو سیرت کی جلد اوّل کی اشاعت پر عطا کیے تھے۔ اس موقع پر لکھتے ہیں۔

" ذرا ایک پھڑکتا ہوا نوٹ معارف میں دیدیجئے لیکن صرف شکریہ نہیں۔ پان سفید کرارے اور خوش ذائقہ ہوں تو لطافت کا کیا کہنا لیکن خوبصورت ہاتھوں سے ملیں تو کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ عورت کے متعلق ان کا تخیل یہ ہے۔

عورت اتنی تو ہو جسے آپ مجسم شاعری کہہ سکیں جس کی دل کش آواز کانوں میں موسیقی کا مزہ دے جو اپنی لطافت اور نزاکت کے لحاظ سے شائستگی کا انتہائی تخیل ہو [2] "

ایک اور جگہ لکھا ہے۔

"کسی حکیم کا قول ہے کہ عورت کو صرف " عورت " ہونا چاہئے۔ اس مختصر تعریف میں جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ وہ زندگی کا ایسا آلۂ متحرک ہوتی ہے جس کے تصرفات پس پردہ روکھی پھیکی زندگی کو "فسانہ" بنا دیتے ہیں اور جب دو طرف عشق کی چاشنی بھی اس کے ساتھ موجود ہوں تو اس حالت کے اندازے کے لئے موجودہ دنیا کی لطافتیں بھی مشکل سے رہبری کریں گی۔ میری زندگی " خوابِ شیریں" بن کر میرے حصہ میں آئی۔" دو آتشہ" نے پچھلے نشہ کو اور چمکایا جس کا خمار مرنے کے بعد بھی

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۱۱۸ - [2] ایضاً ، ص

شاید باقی رہے گا۔ اور میرے خاک کے ذرے بھی عطر محبت میں بسے ہوں گے۔
کیا انسانی ہستی کی غایت اس کے سوا کچھ اور ہے[۱]"

مہدی نے عورت کا ذکر اتنا زیادہ کیا ہے کہ وہ ان کی عادت ثانیہ بن گئی ہے اور بعض جگہ اس کی سوقیانہ تکرار ناگوار ہوتی ہے[۲] مہدی نے بعض فقروں کو مختلف خطوں میں اتنا دہرایا ہے کہ وہ چبائے ہوئے نوالے معلوم ہوتے ہیں[۳] بعض فقرے ایسے ہیں جو مہدی اور شبلی کے یہاں مشترک ہیں۔ مہدی ۳۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پیارے افراغ تمھاری دونوں تحریریں اس قدر دلچسپ تھیں کہ میں نے ان کو بار بار پڑھا لیکن اگر میں اس کی داد دوں تو ہم دونوں "حاجی" ہوئے جاتے ہیں[۴]"

شبلی نے ۱۱ مئی ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں مہدی کو لکھا ہے۔

"آپ کا خط بھی ایک دلچسپ آرٹیکل ہوتا ہے لیکن اگر اس کی داد دوں تو ہم دونوں "حاجی" ہوئے جاتے ہیں[۵]"

مہدی کا ایک مشہور جملہ ہے جو انھوں نے مولانا شبلی کو لکھا تھا۔

"جو آگ برف کے ٹکڑوں پر سلگائی جائے وہ جل چکی[۶]"

یہ جملہ میر ناصر علی کا ہے اور مہدی خود اس کے معترف ہیں۔

"بیس برس پہلے آپ فرمایا تھا کہ "جو آگ برف کے ٹکڑوں پر سلگائی جائے وہ جل چکی" آج تک اس فقرے کی آواز بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی ہے[۷]"

اصل یہ ہے کہ مہدی کو انشا پردازی سے ایسی قوی مناسبت تھی کہ ان کو اچھی عبارتیں ازبر یاد ہو جاتی تھیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

---

۱ مکاتیب مہدی، ص ۲۲۴۔ ۲ ایضاً، ص ۱۱۰، ۲۲۹۔ ۳ ایضاً، ص ۸۹ و ۱۱۲۔ ۴ ایضاً، ص ۲۰۵۔
۵ مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۰۱۔ ۶ مکاتیب مہدی، ص ۱۰۵۔ ۷ ایضاً، ص ۱۲۷۔

"کبھی حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد میں آزاد اور نذیر احمد
کی عبارت بلفظہ ادا کر سکتا تھا"

یہی وجہ ہے کہ یہ جملے ان کی زرنگار عبارت کا جزو بن گئے ہیں۔ ان تاروں کو بناوٹ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

انگریزی کا اثر

آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "مہدی کا دماغ مغربی تھا اور دل انگریزی" انھوں نے مغربی اسالیب کو اس خوبی کے ساتھ اُردو میں کھپایا ہے کہ کسی جگہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے انگریزی کے آئین نامہ نگاری کو سامنے رکھا ہے اور القاب تک ترجمہ کر دیئے ہیں مثلاً پیارے جناب۔ لیکن کہیں سے بیگانے نہیں معلوم ہوتے۔ سگریٹ کے لیے وسائل دود کشی، ماسٹر پیس کے لیے اختراع فائقہ، ایٹی کیٹ کے لیے عوائد رسمیہ، کلاسیکس کے لیے ادب العالیہ، ہائر کریٹی سیزم کے لیے تنقید عالیہ، ہنی مون کے لئے عہد زفاف، موٹو کے لیے طراز، انڈفرنس کے لیے بے رخی، لپ سروس کے لیے وظیفہ لب، جوائننگ ٹائم کے لیے وقفۂ سبکدوشی۔ یہ سب ترجمے ان کی جدت طرازی کے کرشمے اور اُردو میں گراں قدر اضافے ہیں۔

مہدی فصاحت کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ثقالت جہاں بھی نظر آتی تھی اس پر ٹوک دیتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔

"ایک خلش رہ گئی۔ اکابر کی خفیف الحرکتی تک تو مضائقہ نہیں لیکن لغت کبری تو الہلال کی زبان ہے جو آپ کے لب و لہجہ کی نفاست اور موقع کلام کے لحاظ سے بیگانی سی معلوم ہوتی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی الہلال کی آتش افشانی کے بھی زیادہ قائل نہیں تھے۔ اسی طرح ان کو نہ اسٹائل اور اسٹوڈنٹ کی پیوندکاری پسند تھی۔ اور نہ بادر ہوا اور نقش بر آب قسم کی ترکیبیں گوارا تھیں۔ یوں ان کو تراکیب کی کرسی نشینی کا خاص سلیقہ تھا۔ انھوں نے بہت سی استوار اور خوشنما ترکیبیں وضع کیں جو ادب کی جان ہیں۔

خمیازۂ شباب، مقیاس الشباب، قوم مختون، تموج ہوائی، زہرۂ شب، گرہ شب، محبت کا ثمر اولیں، ان کی ایسی معنی آفریں ترکیبیں ہیں جن کی مینا کاری سے انھوں نے اشارات وکنایات کا طلسم کھول دیا ہے۔

شبلی نے جب یہ لکھا تھا کہ مہدی کے یہاں نذیر احمد اور آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے تو حقیقتاً بہت بڑی صداقت بیان کر دی تھی۔ ان کی قلمی مخلوق میں "آزاد کی ادبی نفاست اور نذیر احمد کی چہل اور خوش طبعی یک جا ہوگئی ہے" ان کا طرز اس ادبِ لطیف کا کامیاب نمونہ ہے جس کے علم بردار نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم تھے۔ افسوس یہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے صرف چند خطوط جلیل قدوائی کے نام شائع ہوئے ہیں[۱] لیکن اس راکھ میں بھی دبی چنگاریاں ہیں۔ نیاز کے خطوط اس انشا پردازی کے صناعانہ کمال کے مظہر ہیں۔ لیکن ان میں وہ خلوص اور طہارت نہیں جو مہدی کے یہاں ہے۔ ان کی ایک ایک سطر ادب کی جان ہے۔ انشا ان کی بلائیں لیتی ہے۔ خطوط کتنے ہی دلچسپ ہوں لیکن کتابوں کے مقابلے پر وقتی اہمیت رکھتے ہیں۔ مہدی نے ان لمحات کو آب و رنگ دے کر جاوداں بنا دیا ہے۔ ان کے خطوط میں دوشیزگیِ خیال اور ندرت ادا کی شیشہ گری ہے۔ جدت آمیز تراش خراش نے ان کے خطوں کو معنی زار خوبی اور نگارستان محبوبی بنا دیا ہے۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اسی وجہ سے ان کے اسلوب میں یونان کے سنگ تراشوں کی سی نزاکت اور مصوری دیکھی تھی۔

مہدی اپنی اسلوبی نفاست اور شگفتہ متانت کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ یہی امتیازی وصف ان کو دوسرے مکتوب نگاروں سے الگ کرتا ہے۔ آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے۔

> "طرز بیان کی شوخی مہدی کو زندہ رکھنے میں بڑی معاون ہوگی۔ ممکن ہے کہ ادبیات میں جو نقطۂ نظر مہدی کا تھا وہ نہ رہے اور اسے رہنا بھی نہ چاہئے۔

---

۱ ہمایوں لاہور، ج ۴۴ - نمبر ۱ - ص ۲۶۶۔

اس لئے کہ ادب میں قوت بڑھنے اور پھیلنے ہی سے آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مہدی کی جو رائے بعض ادیبوں کے متعلق تھی وہ ہمیں بدلنی پڑے جنھیں وہ اوّل درجہ کا ادیب کہتے ہیں انھیں دوم درجہ میں بھی جگہ نہ ملے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ مکاتیب پھر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں وہ جوانی ہے جس پر عمر کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ مستی ہے جو شراب انگور کی ممنون نہیں۔ وہ بانکپن ہے جس پر سادگی قربان اور وہ سادگی ہے جس پر بانکپن نثار ہے۔ تحصیلوں اور قصبوں کی بے کیف زندگی میں رہ کر بھی یہ صاحب ذوق کا پرستار اور پجاری رہا۔ شمع انجمن ہو یا چراغ خانہ جہاں روشنی تھی اسے عزیز تھی اور جہاں روشنی کا پتہ نہ تھا وہاں بھی اپنی حرارت عشق سے شعلہ روشن کرلیتا ہے۔ اس نے کتنے مولویوں کو انسان بنانے کی کوشش کی۔ کتنے بدمذاقوں کی اصلاح کی ۔ کتنے بے راہ رووں کو ٹوکا۔ وہ اس میں کامیاب ہوا ہو یا نہیں لیکن اس کی کوشش کیا اس کی ادبی زندگی کی کافی ضمانت نہیں ہے[1]"

(ب) ریاض خیرآبادی اور نیاز فتح پوری

اس دور کے دو اہم رجحانات :

مکتوب نگاری کا یہ دور اپنی اسلوبی نفاست کے اعتبار سے بہت ہی قابلِ قدر ہے۔ سرسید کی شکست ریخت کے بعد آرائش و زیبائش کی طرف توجہ ہونے لگی تھی لیکن اس زمانے میں فی الحقیقت دو رجحان کارفرما ہیں۔ ایک وہ جو ماضی سے زیادہ قریب ہے اور جس کے علم بردار ریاض خیرآبادی (۱۸۵۳-۱۹۳۴ء) ہیں۔ دوسرا وہ جو ہمیں مستقبل کی طرف لے جاتا ہے اور جس کے آئینہ دار ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے خطوط ہیں۔ عبوری دور میں یہ دو رنگی عجیب نہیں ہے۔ شاعری میں بھی داغ کے

---

[1] : تنقیدی اشارے (دوسرا ایڈیشن) ص۔ ۱۷۶-۱۷۷

ساتھ حالی ہیں اور ریاض کے ساتھ اقبال۔ وہ توازن اور ہم آہنگی جو اعلیٰ مکتوباتی ادب کے لیے ضروری ہے وہ صرف شبلی اور مہدی کے حصے میں آئی ہے۔

ریاض کی شراب و شباب اور پازیب و ہیکل والی شاعری دنیائے اردو میں بڑی لطف انگیز اور مسرت خیز چیز ہے۔ فارسی کی تقلید میں رندی و شراب نوشی کا تذکرہ قدما نے بھی کیا ہے لیکن ریاض کے یہاں مسرت زائی و شیرینی سب سے زیادہ ہے۔ ان کی زندگی بڑی پریشانیوں میں گزری لیکن وہ طبعاً نشاط پسند تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری اور حسن کاری سے عیش و خرمی کی ایک دنیا بنائی۔ اسی میں زندہ رہے اور اسی میں مرے۔ وہ دراصل اس عہد کی یادگار تھے جب اودھ کی زندگی کا مفہوم باوجود تباہی و بربادی کے صرف مسرت و نشاط کا حصول تھا۔ محفل سخن صہبائے امیر سے جھوم رہی تھی اور شاعری، شوخی و شیرینی، سجاوٹ اور بانکپن کا دوسرا نام تھا۔

شاعری ہی میں نہیں نثر میں بھی ریاض کا مرتبہ بلند ہے۔ مہدی نے تو ان کو اُردوئے معلیٰ کا ہیرو قرار دیا ہے۔ اس زمانے میں جب سرسید کے "تہذیب الاخلاق" اور میر ناصر علی کے "چودھویں صدی"، کی دھوم تھی۔ ریاض نے ۱۸۸۱ء میں ریاض الاخبار گل کدۂ ریاض فتنہ، عطر فتنہ اور ۱۸۸۲ء میں روزانہ صلح کل کا اجرا کر کے نثر و نظم کی ایسی بڑی خدمت انجام دی اور اُردو کے دامن کو خوش رنگ پھولوں سے بھر دیا۔

ریاض کی نثر شاعری کی طرح اپنا الگ حسن رکھتی ہے لیکن وہ ابھی بادہ و ساغر اور دشنہ و خنجر کی قید سے باہر نہیں نکلی ہے۔ اس میں اپنا ذاتی حسن کم ہے اور شاعری کا ذاتی حسن زیادہ ہے لیکن اس زمانے میں جب ہر صحبت صحبتِ شعر و سخن تھی اور ہر بزم دائرہ شمع و لگن۔ یہ رنگ بہت مقبول تھا اور اسے اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔

۱۹۳۱ء میں ریاض نے نیاز فتح پوری کی فرمائش پر گزری ہوئی ادبی صحبتوں

کی ایک داستان لکھی تھی جو نگار میں بعنوان "حضرت ریاض آپ اپنے آئینے میں" باقساط شائع ہوئی[1] اس موقع پر ریاض نے جو خط نیاز صاحب کو لکھا تھا اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

"شوخ نگار ۔ مدیر نگار ۔ پیارے نیاز ۔ میرے لئے سرمایہ ناز برسوں نگار آیا ۔ مجھے فوراً بھولا ہوا زمانہ یاد آیا اور میں تعمیل ارشاد میں مصروف ہوا ۔ جاڑے کی لمبی راتیں کام آئیں اور میں یہ کہنے کے قابل ہوا

سپردم بتو نامۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

ناتمام مراسلہ بھیج رہا ہوں ۔ بد قسمت بھی ہوں بد خط بھی ۔ مجھ سے اپنا لکھا خود پڑھا نہیں جاتا ۔ حرف تحریر قسمت کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں ۔ خدا کرے آپ پڑھ لیں[2]"

تصویر کی فرمائش پر لکھتے ہیں ۔

"نیاز صاحب آپ میری تصویر کو بڑھاپے میں روشناس خلق یا رسوائے عالم کرنا چاہتے ہیں ۔

میں پھرا اس در سے تو خلقت تماشائی ہوئی
آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

میں خود اپنی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا ۔ اوروں کی نسبت کیا عرض کروں ۔ وہ دن گئے ۔

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا

یہ کہنے کا موقع کہاں ۔

تم جوانی کے مزے لوٹو ریاض
عیب بھی زیبا ہیں اس سن کے لئے

---

[1] نگار لکھنؤ ، ج ۱۹ ، ش ۲ و ۳ و ۴ ، ۱۹۳۱ء ۔　　[2] نگار ریاض نمبر ۱۹۳۴ء ، ص ۵۵

اب تو میرے لئے ہر ایک کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا۔ ع

جنّت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا

گو بڑھاپے کی بڑھتی ہوئی ہوس اس عمر میں بھی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

دے پیرِ مغاں دخترِ رز عمر رسیدہ

بوڑھا ہوں ملے نورِ نظر چرخِ کہن کی

وہ زمانہ بھی غنیمت تھا جب دھوپ چھاؤں یا نیم سپید ریش کسی کے دستِ حنائی سے رنگِ حنا کی خواستگار ہوتی تھی اور کسی موقع پر خان بہادر سید احمد حسین رضوی لکھنوی سے یہ سننا پڑا تھا۔

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گل رخوں میں ریاض

کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یا خداوند نعمت حضور مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ والیٔ محمود آباد اودھ صورت دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن

ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

..... آپ اس زمانہ میں تصویر شائع کر رہے ہیں جب ریش سفید پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا نہ ساون کی مہندی کام دیتی ہے نہ کسی شوخ کے لبِ نازک سے شراب کی کلیاں[1]"

نیاز نے ایک مضمون "دکن کی ایک دلنواز شام" لکھا تھا۔ اس کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

"محترمی نگار آتشیں آیا مگر سادہ لوح بن کر صورت پکار اٹھی پردۂ زنگاری میں جلوہ گر رہنے والا آ گیا۔

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

دکن کے متعلق جو کچھ لکھا اور جس طرح لکھا آپ کا حصہ ہے۔ ادائے بیان

---

[1] نگار۔ ریاض نمبر۔ مکاتیب ریاض۔ ص ۵۵ و ۵۶۔

پر یہ خداداد قدرت کسی سحر نگار کے بس کی بات نہیں۔" سرزمین دکن کی ایک دلنواز" یہ عنوان یہیں ختم ہوجانا چاہیئے تھا۔ نہ شام کی ضرورت تھی نہ شب کی۔ مجھ حسرت نصیب کو اپنا ایک شعر یاد آگیا۔

وہ رات مزے کی ہے جو ہو بات مزے کی
کلکتہ میں گزری نہ کوئی رات مزے کی

کاش آپ کے ساتھ دکن ہی میں ایک رات ایسی نصیب ہوجاتی۔ پیری شباب سے بدل جاتی۔ ایک بوتل میں سب کچھ ہوسکتا تھا۔

یہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی
راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی[1]

ریاض کی صحبت میں دنیا حسین معلوم ہونے لگتی ہے اور جوانی کی امنگیں ابھر آتی ہیں لیکن یہ ساتھ دیر تک نہیں رہتا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ سیمیاوی جلوے کافور ہوجاتے ہیں اور ہمارے دامن میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ شعریت یا تخئیل کی رنگینی بذات خود کوئی مستقل اثر پیدا نہیں کرسکتی۔ اگر اس میں جذبے کی گرمی اور فکر کی گہرائی شامل نہ ہو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا خارج کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔

شاد عظیم آبادی

اسی زمانے میں شاد عظیم آبادی (۱۹۲۷-۱۸۴۶ء) نے بھی خطوط لکھے ہیں۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مکتوبات شاد عظیم آبادی[2] کے نام سے شائع بھی ہوگیا ہے۔ ان کے وہ خطوط جو سید ہمایوں مرزا[3]، انجم نیشاپوری[4] اور حکیم سید عبدالحئی[5] کے نام ہیں اس اعتبار سے ضرور اہم ہیں کہ ان میں کہیں کہیں ایک زوال آمادہ طبقے کے حسرت و ارمان اور دیسی ریاستوں کے روح فرسا ماحول کی صحیح عکاسی

---

[1] نگار ریاض نمبر۔ مکاتیب ریاض، ص ۵۷۔ [2] مکاتیب شاد عظیم آبادی (حیدرآباد)۔ [3] ایضاً، ص ۸۔
[4] مرقع ادب، حصہ اوّل از صفدر مرزا پوری۔ [5] مشاہیر اردو کے خطوط، ص ۱۰۵ (مرتبہ مولوی مہیش پرشاد)۔

کی گئی ہے لیکن ان میں نہ شعر و شاعری کا وہ لطف ہے جو ریاض کے یہاں ہے اور نہ وہ ذہنی انبساط جو مہدی کے خطوں کی خصوصیت ہے بلکہ بعض جگہ غم و اندوہ کی کثرت اور وہ بھی بے لطف عبارت، پڑھنے والے پر سخت گراں گزرتی ہے۔ حکیم سید عبدالحئی کو لکھتے ہیں (موخرالذکر کو انھوں نے اپنا کلام بھیجا تھا لیکن ان کی کتاب گل رعنا میں ان کا ذکر تک نہیں)۔

> "پچاس برس انواع نظم و نثر لکھ کر جمع کرتا رہا۔ اب ایک بڑا دفتر ہو گیا ہے کہ دیکھ کر غم خفگی کرتا ہے۔"[۱]

عبارت کی یہ کہنگی اور بے نمکی بہت کم ان کا ساتھ چھوڑتی ہے۔ جہاں انھوں نے جدت برتنے کی کوشش کی ہے وہ ایجاد بندہ ہے اور سوقیت سے خالی نہیں۔ سید ہمایوں مرزا کو لکھتے ہیں:

> "وقت کم ہے ورنہ جو نصاب تعلیم اُردو و فارسی و عربی کا میں نے لکھا ہے .... صاف کرواتا۔ یہ سات کتابیں ہیں۔ پٹنہ کالج کے پروفیسروں نے مسودہ جانچ کر لکھا کہ مصنف نے علمی راستے میں ریل ایجاد کی ہے۔"[۲]

شاد کی شاعری میں لکھنویت اور دہلویت کا خوش نما امتزاج ہے جس نے کلام میں ایک نئی انفرادیت پیدا کر دی ہے لیکن ان کے خطوط بے لطفی کا ایک لق و دق صحرا ہیں جہاں ہمارا ذوقِ ادب ناآسودہ رہتا ہے۔ ریاض کی سی سعادت کہ نظم و نثر دونوں پر قابو ہو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ اسی طرح مہدی کی سی شوخ بیانی اور نکتہ آفرینی ہمیشہ عام دسترس سے باہر رہی ہے۔

مہدی نے اُردو مکتوبات کو فرسودہ اور پیچ در پیچ راستوں سے نکال کر انگریزی اسلوب نگارش سے آشنا کرانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اُردو کو یورپ کی بعض مستند ادبیات کی گرانمائیگی

۱؎ مشاہیر اُردو کے خطوط، ص ۱۰۵ (مرتبہ مہدی مہیش پرشاد)۔
۲؎ رسالہ ہمایوں لاہور، ج ۲۵، نمبر ۶، ص ۴۵۸۔

سے روشناس کرایا ہے۔ ان کا مقالہ محاسنِ کلامِ غالب داخلی تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں شناسانہ تعریف بھی تخلیق معلوم ہوتی ہے لیکن ان کے مکتوبات میں حسن اندیشی اور انشا پردازی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان میں مغربی سادگی اور فکر کاری کے نشانات موجود ہیں لیکن مہدی کی سی نازک کاری نہیں ہے۔ بعض جگہ عبارت بوجھل اور نامانوس ہے۔ کہیں وہ انگریزی کے شکنجے میں ہے اور کہیں فارسی کے۔ مجتہدانہ طرزِ نگارش میں ان عیوب کا ہونا ایسا حیرت انگیز بھی نہیں لیکن مہدی کی سلامت روی کی داد دینا چاہیئے کہ وہ اس بحرِ پُر آشوب سے صحیح سلامت گزر گئے۔

بجنوری مغرب کے دلدادہ ضرور تھے لیکن مشرقی وضع کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ وضع داری بڑی عزیز تھی۔ انھوں نے جو خطوط بزرگوں کو لکھے ہیں ان میں حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھا ہے۔ فرسودہ القاب استعمال کیے ہیں لیکن سچے دل سے۔ اسی لیے ان کے خطوں میں یہ الفاظ بے جان اور بے روح نہیں ہیں۔ بعض جگہ اسلوب انشا قدامت گزیں ہے لیکن معنوی اہمیت سے خالی نہیں۔ اپنے والد صاحب کو لکھتے ہیں :

" عالی حضور قبلہ و کعبہ دام ظلکم العالی

دست بستہ آداب گزارش ہے۔ صحیفہ سامی شرف صدور لایا اور احوال و کوائف مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ سلامتی مزاج وہاج دریافت ہو کر اور جملہ خورد و کلاں کی خیریت سُن کر اطمینان قلب حاصل ہوا اور مسرت ہوئی۔ الحمد اللہ میں مع الخیر ہوں.... بدرالدین کا روشن آرا کو ہمراہ لے جانے کا حال دریافت ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ و معاون ہو[1]"

وہ بعض دوستوں سے بھی اسی لب و لہجہ میں گفتگو کرتے ہیں ۔

" پیارے دوست محسن صاحب ۔ پس از ابلاغ مراسم نیازمندی و شرح آرزومندی صحیفہ گرامی دال بر عافیت مزاج وہاج اور سلامتی احباب صادر ہوا اور حصول اس کا باعث ابتہاج[2]"

---

[1] باقیات بجنوری، ص ۱۵۱۔ [2] ایضاً، ص ۲۲۵۔

شبلی کی طرح بجنوری بھی ترکوں کے عاشق تھے۔ بعض خط انھوں نے ان کی محبت میں سرشار ہو کر لکھے ہیں۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ترکوں میں شرافت، جسارت، دیانت، تقویٰ، غرض انسانیت کا ہر ایک جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان عیسائیوں کی رذالت، بزدلی، فریب دہی، فسق و فجور کی زندگی بہائم سے کسی درجہ کم نہیں۔ ترکوں کی خوبیوں کو ان کی اپنی عیسائی رعایا سے ہی یہ نسبت نہیں بلکہ تمام اہل یورپ سے بھی یہی نسبت ہے۔ ہندوستان ایران وغیرہ کے مسلمانوں میں جو اسلامی روح مفقود ہے وہ عثمانیوں کے سینہ میں موجود ہے۔ عربوں میں خواہ سرزمین مقدس کے ہوں یا سواحل افریقہ کے سوائے جسارت کے تمام اسلامی خوبیاں محو ہو چکی ہیں۔ ترک اسلام کے لق و دق صحرا میں ایک سرسبز نخلستان ہیں۔[1]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"مسلمانان عالم کا یہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک اور اپنی قوم تک کو بھول جاویں اور دولت عثمانیہ کی امداد کریں۔ اگر سلطنت عثمانیہ آج بچ رہی تو مسلمانوں کا مستقبل بہت عالی شان ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ یہ نہ ہوا تو مسلمان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاویں گے اور قعر ذلالت سے کبھی نہ ابھر سکیں گے۔[2]"

یہ اس زمانے کے خطوط ہیں جب یورپ کی حکومتیں ترکی کو ہضم کرنے کی فکر میں تھیں اور تمام عالم اسلامی پر ایک بحران کی سی کیفیت طاری تھی۔

بجنوری کے سب سے اچھے خط وہ ہیں جن میں انھوں نے اپنے بھائی کو زندگی کے اونچ نیچ، مطالعہ کے طریقے حفظان صحت کے اصول اور مذہب و اخلاق کے مطالبات بتائے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ان کی وسیع النظری اور کشادہ قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں وہ واعظانہ شان نہیں ہے جو نذیر احمد کے خطوں میں ہے۔ ان کا

---

[1] باقیات بجنوری، ص ۱۲۵۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۵۔

نفسیاتی لب و لہجہ بڑا لطف آمیز اور مہر انگیز ہے جو پند نصیحت سے زیادہ موثر اور دلنشین ہے۔ ایک خط میں لندن سے حفظانِ صحت کے متعلق لکھتے ہیں :

"سب سے پہلی بات اور غلطی جو مجھ کو اپنی تعلیم میں یہاں آکر معلوم ہوئی وہ مذکورہ ذیل تھی۔ میں تکرم دم شما عذر بکنید۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی تمہارے آئندہ راستہ میں اگر ممکن ہو تو راہ نما ہو۔ وہ غلطی یہ تھی کہ جہاں میں نے اپنے دماغ اور روح کو علم سے نشوونما دینے میں اپنی وسعت سے زیادہ کوشش کی وہیں اپنے جسم اور قویٰ پر ظلم کرتا رہا۔ حالانکہ حقیقی انسان اس وقت تک نہیں بنتا جب تک کہ نہ صرف روح تربیت یافتہ ہو بلکہ روح کا مسکن یعنی جسم بھی حالت صحیح میں ہو۔ یہاں جس قدر علماء فضلاء کو دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کا دماغ سکندر کے جسم میں مسکن پذیر ہے۔ یا موجودہ زمانہ کی مثال سے ہیگل کی روح سینڈو کے جسم میں موجود ہے[1]۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"میزان اور تعدیل کا خیال رہے۔ اگر صرف جسم بن گیا تو محض حیوان ہے اور جسم نحیف رہ گیا تو ناقص انسان ہے[2]۔"

بجنوری نے انگریزی اردو کی اچھی لیاقت پر زور دیا ہے۔ قصوں اور افسانوں کی ضرورت بھائی ہے اور ہر گوشہ سے تمتع حاصل کرنے پر اصرار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علم اور تخیل ہم آغوش ہوں تب ہی خوشگوار نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

"اگر صرف علوم صحیحہ کا مطالعہ کیا جائے تو طبیعت میں فشر، خیالات میں انجماد اور زندگی میں سردی پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔"

تاج محل کیا ہے۔ ایک خیال ہے جس نے ایک صاحبِ فن اور نیز صاحب تخیل انجینئر کے اعصاب دماغی سے رگ ہائے مرمریں میں گزر کیا ہے

---

[1] باقیات بجنوری، ص ۱۹۹-۲۰۰۔ [2] ایضاً، ص ۲۰۱۔

اور جامد بے جان پتھر کو صورت اور حیات آشنا کیا ہے۔ شاعری کیا ہے۔ اعلیٰ تخیئل اور صحیح علم کے اجتماع سعدین کا نام لیکن اگر صرف تخیئل ہی سے کام لیا جائے اور توجہ کو ضرورت سے زیادہ قصص اور افسانوں پر صرف کیا جائے تو طبیعت میں کاہلی اور خیالات میں انتشار اور زندگی میں بے جا حرارت پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔ چنانچہ طالب علم کا فرض ہے کہ قصص اور افسانوں میں پوری دلچسپی لے۔ ان سے تخیئل کی صفت حاصل کرے۔ مگر تخیئل کو اپنے فن خاص میں وسعت خیال حاصل کرنے کے لیے صرف کرے۔[1]

بجنوری مغربی ملکوں میں رہے۔ مغربی تعلیم حاصل کی۔ دوسروں کو اس کی رغبت بھی دلائی لیکن اس مغربیت میں ان کے پیر نہیں اکھڑے۔ وہ اس عبوری دور میں بقول رشید احمد صدیقی یادگار رونق محفل بھی ہیں اور نقیب سحر بھی۔[2] اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ بجنوری مرحوم کے سامنے کتنی صحیح اقدار تھیں۔

> "قومی حالت عجیب ہے۔ ہم اپنے لباس سے شرماتے ہیں۔ اپنی زبان سے شرماتے ہیں۔ اپنے رنگ سے شرماتے ہیں۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ اپنی چیزوں کے استعمال پر خود قادر اور ان کے فوائد سے خود واقف اور ان کی خوبیوں سے خود آگاہ نہیں۔ پھر اس کا علاج کیا ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تقلید مغربی کے سیلاب کو کس طاقت سے روکا جائے مگر جہاں تک افراد کا تعلق ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ ذاتی کوشش سے تمام مغربی علوم و حکمت کو ہندی بنانے کی کوشش کرے۔"

بجنوری اور نذیر احمد دونوں مغرب سے ایک حد تک متاثر ہیں لیکن دونوں کی اثر پذیری میں بڑا فرق ہے۔ نذیر احمد رندی اور جنت دونوں کو ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے حصول کے لیے جس توازن کی ضرورت ہے وہ ان میں نہیں تھا۔ بجنوری کو اپنی منزل کا احساس تھا اس لیے ان کے یہاں نفسیاتی کشمکش نمایاں

---

[1] ایضاً

[2] باقیات بجنوری۔ مقدمہ صفحہ ح

نہیں۔ دونوں کی نصیحتوں میں بھی فرق ہے ایک نے بیٹے کو مخاطب کیا ہے دوسرے نے بھائی کو۔ لیکن معنوی فرق سب سے بڑا ہے اور وہ دراصل ذہنی سازوسامان کا فرق ہے۔

بجنوری کے خطوط ادب وانشا کے اعتبار سے اہمیت نہیں رکھتے لیکن ان سے ان کی شخصیت پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔ علی گڑھ سے انھیں بڑی محبت تھی اور اسی محبت کی بنا پر انھیں کچھ شکائتیں بھی تھیں جن سے ان کی دل سوزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھلا کہیں یونی ورسٹیاں یوں جنبش قلم شاہی سے بنی ہیں۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا اور اپنی شعبدے بازی سے دنیا کو حیران کرنا اسی کو کہتے ہیں[1]۔"

برلن سے لکھتے ہیں:

"نگر کچھ ہے سچائی کہئے اخلاقی جرأت کہئے تو وقار الملک میں۔ اگر ان میں نہیں تو قوم میں نہیں۔ خدا سے دعا مانگئے کہ اس امت کو تباہ ہی کر دے[2]۔"

عورتوں کی تعلیم کے متعلق ان کا خیال ہے:

"پردہ میں تعلیم۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ کیا سینا پرونا شیخ عبداللہ اور مولوی سعید احمد دہلوی کے مجوزہ نصاب دیکھ لینا تعلیم ہے۔ تعلیم وہ شے ہے جو ہنوز یورپ میں بھی عورتوں کو پوری آزادی سے حاصل نہیں البتہ ہونے والی ہے۔ یعنی سیاست تمدن معاشرت صلح جنگ ہر بات میں ان کو حسب لیاقت مردوں کی مساوات اور ان سے فوق لے جانے کی اجازت ہو۔ قانون دونوں کے لئے ایک ہو[3]۔"

بجنوری کے خطوں میں انشا پردازی نہیں لیکن آگہی ہے۔ طعن وطنز، اندوہ و غم مسرت و بصیرت نے ان کو دلچسپ حیات آموز اور ذی روح بنا دیا ہے۔ ریاض اور شاد کا اسلوب نقش و نگار طاق نسیاں ہے لیکن بجنوری کی مفکرانہ سادگی اس

---

[1] باقیات بجنوری، ص ۲۲۰۔ [2] ایضاً، ص ۲۲۰۔ [3] ایضاً، ص ۲۲۳۔

برزخی دور میں جب اسالیب انشا محدود تھے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہی اس کی قدر و قیمت ہے لیکن مہدی کا فن کارانہ خلوص سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اسی لیے اس شوخ ادا کا قد بھی سب سے نکلتا ہوا ہے۔

نیاز فتح پوری

ادب لطیف کے ائمہ میں نیاز فتح پوری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ریاض خیرآبادی اور خلیق دہلوی نے جس چیز کو دلآویز بنا دیا تھا نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کر دی۔ سجاد حیدر یلدرم اور ل۔ احمد نے نثر میں شاعری کی اور انشا پردازی کو آتش سیال بنا دیا۔ انھوں نے زندگی کے حقائق پر غور نہیں کیا بلکہ اسے شراب و شعر اور نور و نغمہ سے معمور کر دیا۔ اس ادب کی سب سے بڑی خصوصیت طرح داری، خود پسندی اور صناعانہ پختگی ہے۔ یہ لوگ شاعر پہلے تھے اور نثر نگار بعد میں۔ اسی لیے انھوں نے نثر اور شعر کی حدوں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

نیاز کے خطوں کا عاقلانہ حزم و احتیاط

اس زمانے میں جو مکتوباتی ادب پیدا ہوا وہ فضا کے مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" ادب طرازی کا لائق رشک نمونہ ہیں لیکن وہ خطوط نہیں، خطوں کے پیرایہ میں مضامین ہیں۔ اسی طرح نیاز فتح پوری نے جو خط لکھے ہیں وہ ایک خاص قسم کی انشا پردازی کی بہترین مثال ہیں لیکن خط کی تعریف ان کے جسم پر چست نہیں آتی۔ اصلی خط تو وہ ہیں جن میں جذبۂ بے اختیار شوق ہو اور خیام کی زبان میں "چناں کہ می نمایم ہستم" پر زور ہو۔ اگر ان میں عاقلانہ حزم و احتیاط برتی گئی ہے یا علمیت کی نمائش روا رکھی گئی ہے یا اسلوب کی نوک پلک اور تراش خراش کا قدم قدم پر لحاظ رکھا گیا ہے تو وہ مضمون آفرینی سے زیادہ وقیع نہیں۔ نیاز کے مکتوبات کے تین مجموعے مکتوبات نیاز کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نہ مکتوب الیہ کا نام درج ہے نہ تاریخ نہ وقت نہ مقام، حالاں کہ ان چیزوں کی موجودگی سے ایک خاص قسم کی فضا تیار

ہوتی ہے اور جب پڑھنے والا اس "خلوت کدہ" میں داخل ہوتا ہے تو اس کی حیرت اور مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔ نیاز نے ہمیں اس لطف خاص سے یکسر محروم رکھا ہے جو غالب کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انھوں نے ایک جام بھر کر محفل میں تو رکھ دیا ہے لیکن ساقی کی اداؤں سے ہمیں لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔ حالاں کہ بعض اوقات اس کی دلربایانہ نیم نگاہی اور تجاہل تبسم فروشی اس جرعہ شراب سے زیادہ سرور انگیز ہوتی ہے۔

نیاز فتح پوری کے یہ خطوط ماہ بماہ رسالہ نگار لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد کتابی صورت میں منظر عام پر آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ شائع کیے جائیں اسی لیے ان میں "نگاہ سر راہم گرفت" کا لطف نہیں ہے۔ ان خطوں میں اسلوب کا اچھوتا پن، بیان کی ندرت، تخئیل کی بلندی، ظرافت کی بہار سب کچھ ہے لیکن خلوص کی گرمی نہیں ہے۔ ان تینوں مجموعوں کو پڑھتے وقت وہ خوشی ہوتی ہے جو چڑھتی ہوئی ہوائی کو دیکھ کر لیکن ختم کرنے کے بعد وہ کوفت بھی جو گرتی ہوئی ہوائی کے نظارے سے ہوتی ہے۔ ان مست ہواؤں اور گھنگور گھٹاؤں میں ہمارا اسفالینہ جام خالی ہی رہتا ہے۔ غالب کے خط پڑھ کر دوئی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ان کی بھر پور انسانیت اور ارضیت ہمیں غم گساری کے آداب سکھلاتی ہے۔ لیکن نیاز کے ساتھ یہ ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم ان کے ساتھ دور تک نہیں جا سکتے۔ وہ خضر کی طرح بہت سی شرطیں لگاتے ہیں جو ہمیں قبول نہیں ہوتیں۔ وہ شوق تو پیدا کرتے ہیں لیکن رخصت نظر نہیں دیتے۔ وہ خود نمائی اور خود پوشی کے درمیان جھولتے رہتے ہیں۔ ہم اگر چاہیں کہ ان کی پوری شخصیت دیکھ لیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ صرف ان ہی گوشوں کی نمائش روا رکھتے ہیں جن کی نمائش وہ چاہتے ہیں کہ ہو۔ ان کی شخصیت پر اس قدر دبیز اور تہہ بہ تہہ نقاب پڑے ہوئے ہیں کہ محرومیاں سر پٹک پٹک کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن ان کی بزم وصال میں ایک نگاہ سے زیادہ نظارہ میسر نہیں

آتا۔ نقاب شبلی کے یہاں بھی ہے ۔لیکن وہاں "نقاب نے خود جلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے۔" غالب، شبلی اور مہدی کے خطوں میں حسن اتفاق کی جلوہ گری ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دفعتاً ہرنوں کی ایک قطار کمیں گاہ سے نکل پڑی ہے۔ نیاز کے یہاں ہر بات پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی ہے۔ ان کے مکتوب الیہ سوچ سمجھ کر انتخاب کیے گئے ہیں۔ ان میں ہر ایک کا علم نیاز کے برابر ہے۔ ہر ایک کو شعر و سخن کا تھوڑا بہت ذوق ہے۔ انھوں نے اس مجموعے میں کوئی خط بھائی بہن بیوی ماں باپ ملازم یا متوسل کو نہیں لکھا اسی لیے ان خطوں سے نیاز کے متعلق کم اور ان کے مکتوب الیہم کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے۔ اور نیاز کے اس سے کس قسم کے اور کب سے مراسم ہیں۔ ان کی محفل میں رند، قلندر، شاعر، ادیب، صحافی، عالم سب موجود ہیں۔ لیکن ان سے ان ہی امور پر گفتگو کی گئی ہے جو ایک خوش مزاج اور شائستہ انسان کو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔

نیاز کے ہر خط میں رومان پسندی جاری و ساری ہے۔ انھوں نے کسی حقیقت کا ذکر رومانیت سے ہٹ کر نہیں کیا۔ یہ ہی ان کی انفرادیت ہے۔ یہ دنیا انھوں نے بڑے اہتمام اور کوشش سے سجائی ہے۔

<u>خود نمائی اور خود پوشی</u>

بارگاہ حسن۔ کارگاہ مے و مینا، صحبت رقص و نغمہ۔ اہتمامات رندی و سر مستی، شاہد و شعر، غرض دنیائے خرابات کا کوئی خلد فروش منظر ایسا نہیں ہے جو ان خطوں میں موجود نہ ہو۔ رندانہ خوش طبعی نے اس رومانی فضا کو اور چمکا دیا ہے۔ ان کے طنز میں تیکھا پن ہے۔ ہمدردی نہیں۔ ایک پندار تفوق ہے جو ہر جگہ نمایاں ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں :

> "حضرت آپ نے بالکل درست فرمایا۔ خوباں سے چھیڑ چلی جانے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے لیکن "وصل" آپ کے حصہ میں آئے اور حسرت میرے حصہ میں۔ اس پر مفاہمت دشوار ہے۔

محض آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ بحث میں نے چھیڑی تھی اس امید پر کہ آپ میرا ساتھ دیں گے۔ لیکن معاف فرمایئے گا کہ آپ نے بالکل خلافِ توقع وہی حرکت کی جو کوفیوں نے کی تھی۔ بہتر ہے۔ میں تو شہید ہوا جاتا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ آپ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یزید کی سی قسمت پانا آسان نہیں۔ اس کی ہستی کو تو حسین نے غیر فانی بنا دیا اور میں یہ مرتے مرتے کسی سے نہ کہوں گا کہ "آپ کا فریب خوردہ" ہوں[۱]۔"

ایک شیخ صاحب کو لکھتے ہیں :

"گرامی نامہ پہنچا۔ یقیناً نہ میں آپ کا سا تجربہ رکھتا ہوں نہ آپ کی سی عقل و فراست لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ناتجربہ کاری و حماقت دونوں بہت عزیز ہیں کیوں کہ وہ میری اپنی ہی ہیں[۲]۔" یہ مثال بھی ملاحظہ ہو۔" میں آپ سے زیادہ عقلمند ہونے کا مدعی نہیں ہوں لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ آپ کی "فکر بیدار" کی داد نہ دے سکوں۔ آپ نے جو کچھ کیا اسے آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو "خوب" کہہ دوں۔ ورنہ سچ پوچھئے تو میں اسے آپ کی ذہانت و فراست سے بہت فروتر سمجھتا ہوں[۳]۔"

یہ زخمِ تیغ بھی ملاحظہ ہو :

"جی ہاں دیکھا۔ کیا کہنا ہے آپ کے انتخاب کا۔ ماشاء اللہ

دو عالم از اثر شعلہ جمالش سوخت

دیکھئے کہیں آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔

سچ کہتا ہوں کہ میں نے ایسے مجرمانہ قیافہ کا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ ان میں آخر وہ کون سی بات ہے جس نے آپ کو اتنا گرویدہ کر لیا۔ صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا شاید اولیں نقش ناکام کچھ ایسا ہی رہا ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی گول گول

۱؎ مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۹۰۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۳۸۔ ۳؎ ایضاً، ص ۱۴۲۔

آنکھیں کہ کیا کوئی پرکار سے ایسا صحیح دائرہ کھینچ سکتا ہے۔ وہ "تنگی چشم حسود" رکھنے والی بھدی پیشانی۔ وہ رخسار اور ابرو کی ہڈیوں کا افقی ابھار وہ نیبل لینڈ قسم کی چوڑی چپٹی ناک۔ وہ کچی کلیجی کی طرح کالے کالے ہونٹ اور اس پر وہ دیمک خوردہ مونچھ اور ڈاڑھی۔

اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی[1]"

بعض جگہ نیاز فتح پوری واقعہ کا انتخاب اور جزئیات کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے اور طنز کی شگفتگی کم اور زہرناکی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک نواب صاحب کو جو عازم حج ہیں لکھتے ہیں:

"میرے لئے آپ جارجیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آئے گا اور یہ ناممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی لیکن خاک شفا اور زمزم کے پانی سے اسے علیحدہ ہی رکھئے گا ورنہ ممکن ہے خراب ہو جائے[2]"

یا ایک دوست کو جو میر صاحب کے ساتھ ان کے گھر مہمان ہونا چاہتے ہیں، لکھتے ہیں:

"آپ شوق سے میرے یہاں قیام فرما سکتے ہیں لیکن قبلہ میر صاحب کی مہماں داری ان کے شایان شان مجھ سے ممکن نہیں۔ ان کے زہد و تقدس کا مجھے اعتراف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت کھلے ڈلے انسان ہیں لیکن یہ رات بھر کی ہو حق میری برداشت سے باہر ہے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل میرے ایک دوست میرے ہی مکان پر رہتے ہیں اور بہت صبح اٹھ کر ریاض کرتے ہیں۔ ممکن ہو میر صاحب کی شب بیداریوں میں ان کی موسیقی حائل نہ ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے گانے میں کوئی ہرج واقع ہو اور یہ مجھے گوارا نہ ہو گا[3]"

---

[1] مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۱۴۳۔ [2] مکتوبات نیاز، ج ۱، مکتوب نمبر ۵۲۔ [3] مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۸۳۔

نیاز نے ایک خط میں جنّت کو ہدف ملامت بنایا ہے لیکن اس بیان میں غالب کی سی شگفتگی نہیں ہے۔ ابتذال اور سوقیت ہے۔

" حوروں کی آرزو کیا کروں۔ جانتا ہوں کہ من وسلویٰ کھانے والے بھی لہسن پیاز پر اُتر آئے تھے۔ سونے چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے جب کہ ان کی اینٹ بھی فروخت کرکے یورپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ رزرو نہیں کرا سکتا۔ رہ گئے پھل سو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں یوں ہی نزلہ کا زور رہتا ہے چہ جائے کہ اس پر پھلوں کی بھرمار۔ جو سریع الاستحالہ ہونے کی وجہ سے فوراً خلط غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں[1]"

نیاز فتح پوری جب زہد اور مولویت پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے طعن وطنز کا سارا ترکش ختم کر دیتے ہیں:

" آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی اور گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ "محراب دعا" سے حلقۂ دام تیار کرنے والے یہ باوجود "کوتاہ آستینی" کے انتہائی "درازدستی" سے کبھی نہ چوکنے والے اور یہ سب کچھ گزرنے والے جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنھیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہئے کہ جب تک آپ انھیں پھوڑ نہ ڈالیں راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں کو کھا لیا۔ قوموں کو ہضم کر لیا۔ مذہب کیا چیز ہے۔ یہ ملک وملت کے لئے بیماری ہے اور بیماری بھی دق کی۔ استسقا کی جس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اس لئے اگر اتنے طویل وتلخ تجربہ کے بعد اس سے کوئی توقع فلاح کی رکھئے تو اس کے "اہل جنّت" ہونے میں کوئی شک نہیں[2]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] مکتوبات نیاز، جلد ۲، ص ۲۰۰۔ [2] ایضاً، ص ۱۱۵ و ۱۱۶۔

"تم کہ لڑکپن میں ایک طرف حجام تمھاری سرتراشی کیا کرتے تھے اور دوسری طرف مولوی تمھاری دماغ خراشی۔ کیا سمجھ سکتے ہو کہ خدا اگر ہے تو وہ منطقی حدود سے بالاتر ہے[۱]۔"

نیازؔ کی بیزاری مولویوں سے مسلّم ہے لیکن حیرت ہے کہ ان کے دوستوں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ان ہی کے الفاظ میں القارعہ کی عین استفراغ کی حد تک نکالتے ہیں اور جن کے چہرے وضو کرتے کرتے اچھے خاصے کرخت بن گئے ہیں۔

نیازؔ کے خطوں میں ایسے مواقع بھی ہیں جب ان کی عبارت کو پڑھ کر ہمارے اندر شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے طنز میں زہرناکی نہیں لیکن تیزی باقی رہتی ہے۔ اپنے متعلق لکھتے ہیں:

"میں انیسویں صدی کی چیز ہوں جب خشک سالیوں میں بھی لوگ تردامنی کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے اور آپ بیسویں صدی کے پیداوار ہیں جب باوجود خوش حالی کے بھی عشق میں کسی کا برا حال دیکھنے میں نہیں آتا.....
ہمارے زمانہ میں دنیا اتنی عقلمند نہ تھی۔ حسن زیادہ دلکش رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ لیکن جوانی ضرور زیادہ اندھی تھی۔

دیدن ہمان و دل دادن ہمان[۲]"

نیازؔ کی یہ شوخیاں ان خطوں میں سب سے زیادہ ہیں جو انھوں نے عورتوں کو لکھے ہیں۔

"بارے آپ نے یاد تو کیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ برہم ہو گئیں اور اب کبھی نہ بولیں گی۔ میری سمجھی ہوئی کوئی بات بھی آج تک صحیح نکلی ہے جو یہ صحیح نکلتی۔ اور سچ پوچھئے تو اسی امید پر جی رہا تھا۔ ڈرتا ہوں اس وقت سے جب مجھے آپ کی محبت کا یقین آجائے کہ پھر تو آپ کی عداوت تو مسلّم ہے[۳]۔"

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

"عنایت نامہ پہنچا —— پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنام ناتمام کسے

---

[۱] نگار لکھنؤ، نومبر ۱۹۳۶ء، ص ۹۵۔ [۲] مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۱۹۱۔ [۳] ایضاً، ص ۱۸۴۔

جلی کٹی کا لطف اس وقت ہے جب شاہد و مشہود دونوں یک جا ہوں۔
آپ نے کوئی الزام قائم کیا۔ میں نے اسے رد کر دیا۔ آپ کو اس پر غصہ آیا۔
میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی پر آپ کی برہمی اور بڑھی، میں ہنس پڑا[1]۔"

اسلوب بیان

نیاز کو اسلوب بیان پر بڑی قدرت ہے۔ جدت طرازی کے جیسے اچھوتے نمونے ان کے یہاں ملیں گے۔ وہ مکتوباتی ادب کے گوہرِ نایاب ہیں۔
ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جب تک کسی خواہش کا اظہار صرف "آنکھوں" سے ہو رہا ہے وہ "تمنا" ہے لیکن زبان سے کہا اور اس نے گدائی کی صورت اختیار کر لی پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ جو اتنا شدید احمق ہو اس کو مجبور کرنا کہ وہ کہے اور بار بار کہے کتنی عظیم الشان دانائی کی ذمہ داری اس کی گردن پر رکھنا ہے[2]۔"

ایک دوست سے رنج پہنچا ہے ان کو لکھتے ہیں:

" "در توبہ کبھی بند نہیں ہوتا"۔ یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمہارے اعتراف کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ بت شکنی کا کفارہ "تعمیر کعبہ" سے بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے[3]۔"

نیاز کے قلم سے ڈھلے ہوئے جملے نکلتے ہیں۔ بیان کی ندرت اور شوخی اور طرزِ ادا کی صفائی اور شستگی ان کی بلائیں لیتی ہے۔ ان کے یہاں دورِ مغلیہ کے مصوروں کی سی نفاست اور نازک کاری اور قدیم انشا پردازوں کی سی مہارت اور صنع طرازی ہے۔ یہ انداز اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کلاسیکی ادب کا ذوق خوب رچا ہوا ہو اور نثر میں داخلہ شاعری کے دروازے سے ہوا ہو۔ اپنے مے کدے کے سب سے

---

[1] مکتوباتِ نیاز، ج ۲، ص ۱۸۸۔ [2] ایضاً، ص ۲۲۔ [3] ایضاً، ص ۳۲۸۔

پرانے " مغ " کے متعلق لکھتے ہیں :

" جس وقت وہ داڑھی صاف کرا کے بالوں میں خضاب لگا کر مونچھوں کو کاسمیٹک سے نوکیلا بنا کر بیٹھتے ہیں اس وقت دیکھو کیا عالم ہوتا ہے۔ وہی دلکشی و رعنائی وہی ولولہ و برنائی وہی دہکتا ہوا شباب وہی ٹپکتا ہوا شہاب [1] "

بعض جگہ تو وہ مصرعوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں ۔

" کیوں صاحب یہ کیا بات ہے کہ سوال عمر زید بکر کا آیا تو

" التفات کے دریا بہا دیئے "

اور " چوں تر بتے بماشد آتش بجام کردند "

ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی " [2]

ایک دوست کو لکھتے ہیں :

" اسے کیا پوچھتے ہو۔ کیا کر رہا ہوں۔ نہ یادِ رفتگاں کا مشغلہ ہے کہ کچھ دیر اسی سے جی بہلے ۔ نہ " عشق بتاں " کا حوصلہ کہ کچھ وقت سر ٹکرانے میں گزر جائے ۔ اب تو حال کی سوگواریاں ہیں یا مستقبل کی حوصلہ فرسائیاں۔ جیوں تو کیوں کر اور مروں تو کیوں کر۔ جب تک وہم اور خیال کی دنیا میں جیتا تھا " چشم وا کردن زمیں تا آسماں آغوش داشت " لیکن اب کہ تعینات و حقائق کے خبط میں مبتلا ہوں " سایۂ شاخِ گل " افعی نظر آتا ہے مجھے [3] "

ایک شاعر کو لکھتے ہیں جو مشاعروں میں مارے مارے پھرتے ہیں ۔

" ماشا اللہ کیا کہنا۔ جبیں سائی کا نام آپ نے قسمت آزمائی رکھا ہے۔ تدابیر انسانی کی ناکامی کوئی ایسا تجربہ نہیں جس پر حیرت کی جائے لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا عبد اور معبود دونوں کے لئے شرمناک ہے [4] "

---

[1] مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۸۲۔ [2] ایضاً، ص ۹۱۔ [3] ایضاً، ص ۱۰۱ و ۱۰۲۔ [4] ایضاً، ص ۲۲۳۔

یہ خط ملاحظہ ہو۔ نیاز کی انشا پردازی کا بڑا دلکش نمونہ ہے ۔

"اللہ اللہ آپ تشریف لا رہے ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ کی نظر نہ لگ جائے۔ حجرۂ فلک سے جھانکتی جھانکتی کہیں حوریں نہ زمین پر آ رہیں۔ کہیں کرّوبیاں عالمِ قدس میں تسبیح و تہلیل نہ بھول جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ آتے آتے رہ جائیں۔

اسے کیوں بے وقوف بناتے ہو۔ تم اور وعدہ پورا کرو۔ سچ کہتا ہوں جس دن ایسا ہو گا تو آسمان پھٹ جائے گا زمین شق ہو جائے گی اور ہم تم دونوں اس میں سما جائیں گے۔ آپ تو مہربانی فرما کر جیسے رہیئے جہاں آپ نصب کر دیئے گئے ہیں گلگشت کی ضرورت نہیں۔ چمن والے یوں ہی تباہ ہیں[1]۔"

نیاز نے بعض جگہ قافیہ پیمائی کی ہے اور اس طرح عبارت کے لطف کو بڑھا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

"میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ۔ ان کے جسم کا ریشہ ریشہ مریم پناہ[2]۔"

"(میں نے) نہ کبھی اپنے دعویٰ خلوص کو ذریعۂ افتخار سمجھا نہ اخلاقِ گرامی کو وسیلۂ کار۔"[3]

ان کی عبارت کا تانا بانا رومان و شعر سے بنا گیا ہے۔ اشعار کی کثرت بلاشبہ ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ مصرعے عبارت کا جزو بن گئے ہیں مثلاً :

"غارت گر ہوش۔ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی تم نے کیوں یاد دلایا کہ نہیں[4]۔"

یا "ماشاءاللہ کیا کہنا ہے۔ آپ اور مدارجِ خلط و محبت پر وعظ فرمائیں یعنی وہ "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے[5]"۔

یا "اگر آپ نے بے گناہ کے خون سے دامن آلودہ کرنے کا عزم ہی کر لیا ہے تو بسم اللہ شوق سے خنجر اٹھایئے۔ لہو پکارے گا آستیں کا[6]۔"

---

[1] مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۲۳۸ و ۲۳۹۔ [2] ایضاً، ص ۱۹۵۔ [3] ایضاً، ص ۱۲۹۔ [4] ایضاً، ص ۱۷۲۔
[5] نگار، اکتوبر ۱۹۶۳ء عنوان مکتوبات نیاز۔ [6] ایضاً، ص

نیاز کو بات میں بات پیدا کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ اس نکتہ یابی میں شوخی اور ذہانت نے گنگا جمنی لہریں پیدا کردی ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک عرصہ بعد آپ نے یاد فرمایا۔ میں نے تو اس خیال سے مراسلت میں تقدیم نہیں کی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں اور آپ نے اس لئے پرواہ نہیں کی کہ میں کبھی آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جو کبھی خفا ہونا نہ جانے اس کو پوچھنا ہی کیا۔ اللہ اللہ کیا فرق مراتب ہے[1]"

نیاز اپنے خطوں میں اشارہ وکنایہ سے خاص طور پر کام لیتے ہیں جس سے بھولی بسری یادیں تازہ ہوجاتی ہیں اور تخیئل کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ یہ اسلوب ایسی جگہ خاص طور پر کامیاب ہے جہاں انھوں نے تلمیحات کو برتا ہے۔

"باور کیجئے کہ میرا مقصود بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ مجھے بھلا نہ دیں۔ رہا یہ امر کہ جو طریقہ میں نے اختیار کیا وہ درست تھا یا نہیں۔ سو شوق و نیاز کی دنیا میں اس کا محاسبہ نہیں ہوتا۔ مصر کے بازار میں یوسف کی خریداری کے لئے ایک بڑھیا صرف سوت کی انٹی لے کر گئی تھی اور اگر یوسف کو خبر ہوجاتی تو شاید اسی کے ہاتھ بک بھی جاتے[2]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"آپ وہاں جارہے ہیں تو کس اہتمام کے ساتھ۔ اس کی خبر نہیں۔ (یوسف) تو خیر پیمبر تھے کہ الزام عائد ہوا تو صفائی میں قمیص کا پچھلا دامن پھٹا ہوا دکھا دیا اور لوگوں نے اسے مان بھی لیا۔ لیکن آپ اپنی چاکدامانی کو کیوں کر چھپائیں گے۔[3]"

ایک دوست کو لکھتے ہیں :

"اچھا ہوا تمھارا تبادلہ وہاں سے ہوگیا۔ لیکن بہیں کیا۔ دمشق میں قحط سالی ہو یا نہ ہو لیکن تمھاری فراموش کاری تو بہر حال قائم رہنا ہی ہے[4]"

---

[1] مکتوباتِ نیاز، ج ۲، ص ۹۴ و ۹۵۔ [2] ایضاً، ص ۲۱۹۔ [3] ایضاً، ص ۲۸۵۔ [4] ایضاً، ص ۳۰۲۔

نیاز اس گُر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ خطوں میں اگر بے تکلفی نہ ہو تو وہ بے مزہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے یہ بے تکلفی ہر ممکن ذریعے سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"اللہ اللہ یہ بہر ہمی خوبصورت پیشانی کی یہ خوبصورت شکنیں۔ پھولوں سے رخساروں کے نیچے یہ دہکتی ہوئی آتش گل۔ یہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے نکلنے والے شعلے۔ معاذ اللہ۔

آتشم نیز ست و دامان می زنم [1]

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

"بجا ارشاد ہوا۔ یہ سارا فتنہ میرا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ میں ہی ادھر سے دامن کشاں گزر جاتا ہوں اور میرے ہی لئے

غبار اٹھ اٹھ کے رہ جاتا ہے اکثر خاکِ بسمل کا

کیوں بنا بنایا گھر بگاڑتے ہو...... اور کیوں وہ بات کہتے ہو جو شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے [2]"

نیاز نے بعض جگہ چند لکیروں سے تصویریں کھینچی ہیں لیکن وہ بے ساختہ اور موثر ہیں۔

"بھئی مجھے کیا معلوم تھا کہ چاہوں گا اچھا اور ہو جائے گا بُرا۔ بخدا میری نیت صرف یہ تھی کہ کسی طرح ان دونوں میں صلح ہو جائے لیکن وہاں تو قیامت برپا ہو گئی۔ آستین چڑھ گئیں، منھ سے جھاگ اڑنے لگا اور اگر خان صاحب موجود نہ ہوتے تو شاید خون کے فوارے جاری ہو جاتے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کس قدر خفیف ہوا ہوں اور کتنی ملامت کی ہے میں نے اپنے آپ پر [3]"

ایک خط میں منشی امیر اللہ تسلیم کا نقشہ کھینچا ہے۔

"ہاں میں نے منشی امیر اللہ تسلیم کو دیکھا ہے۔ ان سے ملا بھی ہوں اور ان کی شاعری کا بھی معترف ہوں۔ میرا عنفوان شباب ہے اور ان کا

---

[1] مکتوباتِ نیاز، ج ۲، ص ۱۵۹۔ [2] ایضاً، ص ۱۶۱۔ [3] ایضاً، ص ۱۶۳۔

زمانۂ شیب یعنی پیری میں بھیک رہی ہیں اور وہ دور پُرافشانی سے گزر رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر جھریوں کا یہ عالم جیسے کپڑے پر اتو کر دیا ہو۔ یہ ہے ان کی ہیئت کذائی۔ بغیر عصا کے سہارے کے ایک قدم چلنا دشوار ہے۔ سماعت اور بینائی تقریباً مفقود۔ کمر جھکی ہوئی۔ ریش و بروت سب برف کے گالے کی طرح سفید۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ لیکن خوش دلی اور خوش مزاجی کا یہ عالم کہ گویا جوانی ابھی آئی ہے[1]۔"

ایک خط میں برسات کے خلد فروش موسم کا ذکر کیا ہے۔

"جانِ عالم۔ کیا بتاؤں کل شام سے کس عالم میں ہوں۔ بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں۔ کوندا لپک رہا ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ ہوائیں چل رہی ہیں اور رم جھم رم جھم میگھا برسے۔ دن میں سانولا پن تو دوپہر ہی سے تھا لیکن شام کو یہ شیام رنگ محفل ایسی جمی ایسی رچی کی اب کیا کہوں معلوم ہوتا ہے کہ کنور کنھیا پاؤں میں گھونگرو باندھے ہوئے بانسری بجا رہے ہیں۔ بے تابانہ رقص کر رہے ہیں۔ اور شاید پاؤں کی آخری ضرب گھونگرو کی آخری جھنکار اور بانسری کے آخری بول کے ساتھ بساطِ عالم بھی ہمیشہ کے لئے اُلٹ دی جانے والی ہے[2]۔"

شعریت و جمالیت

اردو کے انشا پردازوں میں نیاز کی حیثیت بہت ممتاز ہے۔ وہ شروع میں ادب لطیف کی طرف جھکے رہے لیکن اس لٹریچر کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ اس نے ہمیں ایک دلکش نقاد بھی دیا۔ ان کی تنقیدوں میں ماضی کا رس اور حال کا احساس ہے۔ ان کی شعریت اور جمالیت نے اس میں رعنائی و زیبائی پیدا کر دی ہے۔ ان کا ادبی شعور گہرا اور ان کی جمالی حس بہت نازک ہے۔ اس کا

---

[1] مکتوباتِ نیاز، ج ۲، ص ۱۵۔ [2] ایضاً، ص ۳۵۔

اندازہ ان تنقیدوں سے بآسانی ہوسکتا ہے جو انھوں نے مکتوبات کے پیرائے میں کی ہیں۔ انھوں نے تسلیم لکھنوی[1]۔ اردو میں طنز و مزاح[2]۔ اقبال[3]۔ ناسخ[4]۔ مومن[5]۔ جلال[6]۔ منظومات جدید[7]۔ اور انقلابی شاعری[8] کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں فنی گہرائی، شیرینی اور شگفتگی ہے۔

سیرت

نیاز کے خطوں سے ان کی سیرت اور معتقدات کے متعلق قطعی رائے قائم کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی "تعمیر" میں ایک صورت خرابی کی بھی مضمر ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ "سب سے دلچسپ خط وہ ہوتے ہیں جو تلف کر دیئے جائیں یا منظر عام پر نہ آئیں[9]" نیاز فتح پوری نے ان خطوں میں تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا ہے جو آئینے کی طرح دمکتا ہوا ہے۔ وہ زندہ رہنا اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا چاہتے ہیں۔ مشرب پروانہ رکھتے ہیں اور جرم محبت کی سزا میں دوزخ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ دوستی کے معاملے میں وہ سراپا رہن عشق ہیں اور ایک مرتبہ رہن محبت ہونے کے بعد انھوں نے کبھی اپنے آپ کو واگزاشت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں قومی دردمندی خودداری اور غیرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ عورت کی حمایت پر کمربستہ ہیں۔ ترقی پسند تحریکوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آزاد ملک آزاد فضا آزاد خیال لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ انھیں خیام کا فلسفہ اتنا عزیز نہیں جتنا اس کا عمل۔ وہ مخالفت کی پروا نہیں کرتے اور خزف ریزوں کو ٹھکراتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ظواہر و رسوم کو پسند نہیں کرتے اور انسانیت کو سب سے بڑا خدا سمجھتے ہیں۔

اصلی نیاز تک ہماری رسائی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ انھیں خود پوشی میں کمال حاصل ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ خطوط سیرت کا آئینہ ہوتے ہیں اور

---

[1] مکتوبات نیاز، ج ۲، ص ۱۲ و ۱۷۔ [2] ایضاً، ص ۱۱۳۔ [3] ایضاً، ص ۱۲۵۔ [4] ایضاً، ص ۱۳۱۔
[5] ایضاً، ص ۱۳۶۔ [6] ایضاً، ص ۱۵۰۔ [7] ایضاً، ص ۱۹۷۔ [8] ایضاً، ص ۳۱۲۔ [9] نگار لکھنؤ، ج ۲۸، ش ۱، ص ۱۹۔

انسان کے اصلی خیالات اور جذبات کا جتنا صحیح اظہار خطوں سے ہوتا ہے اتنا کسی اور ذریعے نہیں مگر بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ بات سب خطوں پر صادق نہیں آتی جسے پردہ داری منظور ہے اور اس کا سلیقہ بھی رکھتا ہے وہ خطوں کو بھی اپنی اور تحریروں کی طرح اخفائے حقیقت کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ بلکہ اکثر یہ ذریعہ اور ذرائع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والا پر تکلف سادگی اور ساختہ بے ساختہ پن کے پردے میں بات کو اس طرح چھپاتا ہے کہ پڑھنے والے کو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے[۱]"

نیاز کے خطوط بے لاگ نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ عشق و محبت کا سا معاملہ ہے۔ "جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اسی طور پر خط لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا[۲]" نیاز نے مصیبت کا علاج مسکرات سے کیا ہے اور حقائق سے آنکھ نہیں ملائی چرائی ہے۔ اسی لیے ان کے مکتوبات میں "غیر ذمہ دارانہ بشارتیں" اور "غفلت زا طرب انگیزیاں" ہیں۔ ان کی شہرت کا تمام تر انحصار ان کے شگفتہ اور ریختہ اسلوب پر ہے جس کی چمک دمک ابھی بہت دنوں تک قائم رہے گی۔

---

[۱] اُردو خطوط۔ تعارف ص ۳۔ کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی۔

[۲] نگار، ج ۳۸، ش ۱، ص ۱۹ و ۲۰۔

بابِ ششم

مولانا محمد علی اور مولانا حسین احمد مدنی

تاریخی ماحول

سرسید سے شبلی اور اقبال تک سیاسی زندگی میں جو رجحانات کارفرما ہیں ان کا زیادہ تر تعلق قومی تنظیم اور داخلی اصلاح سے ہے۔ سرسید نے تعلیم کی ترغیب دی اور دین میں اجتہاد کیا۔ شبلی نے اسلاف کی تاریخ دوبارہ مرتب کی۔ حالی نے سیاسی نظمیں اور غزلیں کہیں۔ نذیر احمد نے ایسے ناول لکھے جن کا مقصد معاشرت کی اصلاح تھی۔ یہ دراصل وہ موٹے موٹے عنوان تھے جن پر مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے کم از کم وہ شکست خوردگی دور ہو گئی جو غدر نے پیدا کر دی تھی اور گرد و پیش کے اندھیرے میں امید کی ایک نئی کرن روشن ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کا غدر عوامی انقلاب نہیں تھا بلکہ اسی پرانے نظام کی شمع تھی جو بھڑک کر خاموش ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس نے خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا اور غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات کو ابھارا۔

کانگریس کا قیام۔ تقسیم بنگال۔ جنگ بلقان۔ میثاق لکھنؤ۔ رولٹ ایکٹ

کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہو چکی تھی اور ۱۹۰۶ء میں اس نے رعایات و حقوق کے دائرے سے نکل کر سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۱۱ء تک تقسیم بنگال کا ہنگامہ گرم رہا۔

۱۹۱۳ء میں نواب سید محمد بہادر نے کانگریس کے اجلاس کراچی کی صدارت کرتے ہوئے بلقان کے خلاف برطانوی سامراج کے رویہ کی مذمت کی۔ انگریزوں نے منٹو مارلے اسکیم نافذ کرنا چاہی لیکن میثاق لکھنؤ نے فرقہ وارانہ نیابت کو طے کردیا اور باہمی اتحاد نے عمل اور جدوجہد کی نئی روایتیں پیدا کیں۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف سخت مظاہرے ہوئے۔ اور ہندو مسلمانوں نے مل کر انگریزوں کی گولیاں کھائیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ہندوستانیوں کو بین الاقوامی طرز فکر دیا اور ہمارے زعما کو محسوس ہوا کہ بیرونی طاقتیں داخلی تبدیلی پر بری طرح اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ جاپان کی ترقی چین کے انقلاب ایران کی مشروطی جدوجہد افغانستان کی بیداری اور ترکی کے تغیرات کو دیکھ اور سمجھ چکے تھے۔ اس وقت خلافت کی جانکنی اور عثمانیوں کی ابتلا و آزمائش نے ہندوستان کو اور زیادہ متاثر کیا۔ گھر گھر ——— بولی اماں محمد علی کی ——— جان بیٹا خلافت پہ دے دو کے نعرے لگنے لگے۔

تحریک عدم تعاون

۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور علی برادران نے عدم تعاون اور سودیشی کی تحریک شروع کی اور سارے ہندوستان میں ایک زلزلہ سا آگیا۔

اس متحدہ تحریک نے ہندوستان گیر قومی مسائل کو اہمیت دی اور یہ بتایا کہ قومیتوں کے حق ارادیت سے پہلے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کے باہر اور خاص طور پر روس میں زبردست عوامی انقلاب رونما ہوا۔ یہاں بھی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے انتہاپسندی بڑھنے لگی۔ بے روزگاری، تعلیم کی ناکامی، زمیں دار کسان کی کشمکش، سائمن کمیشن، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، سامراجی جوڑ توڑ، سول نافرمانی، غرض ان

تمام عناصر نے مل کر آزادی اور دیش بھگتی کو ترقی دی۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۴ء تک ہندوستان کی ادبی زندگی میں تقریباً وہی رجحانات کارفرما رہے جو سرسید کی عظیم الشان شخصیت کی بدولت وجود میں آئے تھے۔ اس دور کو ملکی رجحانات کے لحاظ سے پیش رو دور کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس عرصے میں اسلوب فکر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ شبلی نے طرزِ فکر میں جو آزادی پیدا کی تھی، وہ نئے حالات کی وجہ سے اور چمک گئی۔

مولانا محمد علی

مولانا آزاد کے مضامین حسرت موہانی کی غزلیں مولانا محمد علی کے خطوط اور مولانا حسین احمد مدنی کے مکتوبات اسی تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لکھنے والوں کی شعلہ بار آواز نے سارے ہندوستان کے نیستاں کو آتش کدہ بنا دیا ہے۔

سیرت

مولانا محمد علی صداقتِ مجسّم اور پیکرِ اخلاص تھے۔ حق گوئی و بیباکی کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ مولانا محمد علی کو نواب محسن الملک سے علی گڑھ کے معاملے میں شدید اختلاف تھا۔ اس اختلاف کو انھوں نے پوری ایمانداری کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ اور سچ بات کہنے میں ان کے مرتبے کا مطلق خیال نہیں کیا۔ اپنے اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اگر میں دیکھوں کہ میرا بھائی شوکت کوئی ایسا کام کرتا ہے جو میری قوم کے لئے مضر ہے میرے ملک کو نقصان کا باعث ہے یا میرے ہموطنوں کے لئے تباہ کن ہے تو واللہ باللہ مجھے اس میں دریغ نہ ہوگا کہ دو چھریاں تیز کر دوں اور ایک اس کے گلے پر دن کو یا رات کو چھپے چوری یا علانیہ زبردستی یا دھوکے سے پھیر دوں۔ پھر بہ تقاضائے محبت دوسری اپنے گلے پر بھی پھیر دوں۔ جو حرکت نابینا سیمسن نے فلسطینیوں کے ساتھ

کی تھی اور اپنے اوپر اور ساری قوم پر ایک عظیم الشان عمارت کو ڈھا دیا تھا اور جس آفت میں اوروں کو پھنسایا تھا اسی میں خود پھنس کر مر گیا تھا۔ وہی کام کرنا غیرت قومی کا تقاضا ہے اور وہی موت مرنا میری محبت ذاتی کے لئے موزوں ہے[1]۔"

اسی خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :

"اب آپ منزلِ عمر کے اس حصہ پر آگئے ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کر عالم جزا کی سیر بھی کر سکتے ہیں اور آپ کی نظر میں یہاں کے انعام اور صلے پنے اور جھوٹے سلے تارے سے زائد وقعت نہیں رکھتے ..... جو راستہ آپ نے لیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہنچائے گا ...... یہ کعبے کی راہ نہیں ہے۔ یہ ترکستان کا راستہ ہے۔ یہ غلطی آپ کے دل کی نہیں دماغ کی ہے[2]۔"

یہ اختلاف کالج کے یوروپین اسٹاف کے متعلق تھا۔ مولانا محمد علی کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر مسٹر آرچبولڈ اور ان کے ساتھی اپنی روش بدلنے کو آمادہ نہیں ہیں تو ٹرسٹیان کالج ان کو خیر باد کہیں۔

مولانا محمد علی ماضی کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔ شبلی کی اورنگ زیب عالم گیر کی تصنیف اور دار المصنفین کے قیام میں ان کا ہاتھ ہے۔ اقبال سے وہ اس درجہ متاثر ہیں کہ ان میں اور دوسرے شاعروں میں زمین آسمان کا فرق سمجھتے ہیں۔ ان کو خدا اور اس کے رسول سے عشق تھا۔ انھوں نے قرآن کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس معاملے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ

"قرآن پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان کاغذ کی پٹیاں بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے[3]۔"

---

[1] خطوط محمد علی، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، ص ۱۴۰۔ [2] ایضاً۔
[3] ایضاً، ص ۱۲۲ و ۱۲۳۔

اس سرچشمے سے ان کو سکون اور صبر حاصل ہوتا اور طبیعت میں بے خوفی بھی پیدا ہوتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے۔ میں تو صرف محبت کا بھوکا ہوں عالم اسلامی کے ساتھ ان کی شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ افریقہ میں کسی تلوے میں کانٹا چبھے اور وہ اس کی چبھن یہاں محسوس کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کی شخصیت کی تعمیر میں ان کی والدہ بی اماں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے ہاں جو سخت کوشی، خود اعتمادی اور صبر آزمائی ہے وہ بی اماں ہی کا فیضان ہے۔

مولانا محمد علی نے ایک خط میں مولوی محفوظ علی کو لکھا ہے:

"تم مرد ہو اور خدا کے فضل سے جوانی کی مدھیر بھاگ سے نکل گئے ہو اور صرف پانچ بچے ہیں۔ میری ماں کا حال تم سے بدتر تھا۔ عورت ذات اور بیوہ۔ اور سب سے چھوٹے کی یعنی میری عمر دو برس سے کم کی۔ نہ وہ غریب روئی نہ دھوئی۔ لوگ مردے کی تجہیز و تکفین میں لگے۔ وہ اپنے چھ بچوں کو لے کر علیحدہ بیٹھ گئی۔ لوگوں نے طعنے دئے۔ برا بھلا کہا۔ ہنسے اور پیشین گوئیاں کرنے لگے کہ یہ عورت اس گھر میں ایک سال بھی نہ رہے گی۔ اس نے کسی کے سننے کی پروا نہیں کی۔ اور اپنے بچوں کو اپنا خاوند سمجھ کر ساری محبت و فریفتگی جو اس مرحوم کے حصہ میں آئی تھی اسے ان چھ پر تقسیم کیا مگر لطف یہ کہ ہر ایک کے حصہ میں اتنا ہی آیا جتنا اس ایک مرحوم کو ملا تھا۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ تم پر عیاں ہے۔ ہماری بہتری کے سامان بھی نہ ہوئے بلکہ خدا نے اس کے بڑھاپے کو بھی جوانان حسین کی جوانی سے اچھا کر دیا۔"[۱]

مولانا محمد علی کی زندگی مہر و وفا اور جرأت و ہمت کا قابلِ رشک نمونہ ہے۔ ان کی بیٹیاں آمنہ اور حمیدہ سخت بیمار ہیں لیکن وہ اس عالم میں بھی قومی کاموں سے غافل نہیں رہے۔

---

[۱] خطوط محمد علی، ص ۲۵۶ و ۲۵۷۔

E
33

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو لکھتے ہیں :

" آمنہ مرحومہ کی علالت تشخیص ہو چکی تھی، علاج تجویز ہو چکا تھا۔ تیمارداری کے لئے اپنی بیوی کو چھوڑ کر کہاں نہیں گیا۔ جب اس کی آخری گھڑیاں گنی جا رہی تھیں اس وقت بھی مصطفیٰ کمال کو بھیجنے کے لئے ایک طول طویل تار کا مسودہ کر رہا تھا[1]"

حمیدہ کی بیماری کے متعلق لکھتے ہیں :

" اب بخار روز ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵ اور اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہر وقت متلی ہوتی ہے۔ نہ غذا تکتی ہے نہ دوا۔ نقاہت کا یہ حال ہے کہ دوا پینے کے لئے اٹھنا محال ہے۔ آج اس ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں کل دوسرے سے۔ پرسوں تیسرے سے۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر، حکیم، وید کوئی نہیں چھوٹا۔ ملیریا، دق Bacillus Coli نسوانی امراض ہر ایک کے متعلق امتحان ہو چکا۔ اور ایک چیز ثابت نہ ہوئی[2]"

اس حال میں بھی ان کا جی بمبئی میں پڑا ہے اور مختلف کمیٹیوں کا کام سنبھالنا چاہتے ہیں۔ اپنی بصارت اور اعصاب کی حالت بہت نازک ہے۔ بخار جاڑا آتا ہے۔ لیکن وہ سارڈا بل کے متعلق ۲۵ ٹائپ کے صفحات کا تحریری بیان تیار کرتے ہیں اور ساری رات خود ہی جاگ کر اور آرام کئے یا کھانا کھائے بغیر اسے ٹائپ کر کے وائسرائے کے سکریٹری کو دے آئے اور "مسلمان کی قوم میں ایک ٹائپسٹ بھی نہ ملا کہ اس کام کو کرتا[3]"

اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیدھی آنکھ کی حالت خطرناک ہو گئی۔ اسی خط میں لکھتے ہیں :

" یہاں تک ۱۱ را پریل کو لکھا جا چکا تھا مگر اتنا لکھنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ دوسرے دن کے لئے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے دن

---

[1] خطوط محمد علی، ص ۲۰۳۔ [2] ایضاً، ص ۲۰۴۔ [3] ایضاً، ص ۲۳۳۔

آنکھوں کے SPECIALIST کے پاس گیا اور اس نے بہت محنت کے ساتھ
آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ بائیں آنکھ کی حالت بھی نہایت خطرناک
ہے معلوم ہوتا ہے آپ نے حال ہی میں نگاہ پر زیادہ زور ڈالا ہے یا
جوش کی حالت میں کسی سے باتیں کی ہیں۔ اس لئے کہ خون کی ایک دو
پھٹکیں تازہ نظر آرہی ہیں[1]۔

ان کی دو بھتیجی اور جوان لڑکیاں ان کے سامنے مریں لیکن صبر وتحمل میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اور جیل میں بھی راضی بہ رضا رہے۔

تیری صحبت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

مولانا محمد علی کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ وہ ڈپلومیسی کے مفہوم سے ناآشنا تھے۔ جذبات سے بہت جلد مغلوب ہو جاتے تھے اور استقلال بالکل نہیں رکھتے تھے۔ ایک خط میں خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

"جو کچھ علم و عقل رکھتا بھی ہوں اس پر میرے جذبات کہیں زیادہ غالب ہیں[1]"

ترکوں سے انھیں اس قدر محبت تھی کہ ایک دفعہ ان کی محبت اور اپنی بیچارگی سے مجبور ہو کر خودکشی پر بھی آمادہ ہو گئے تھے[2]۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو ایک خط میں مولانا محمد علی کے متعلق لکھا ہے۔ وہ جملے ان کی سیرت کو سمجھنے کے لیے نقل کرنا بے محل نہ ہوں گے۔

"ایک دوسری بات جس سے میرے دل کو بے انتہا تکلیف ہوئی وہ یہ کہ
میں نے محمد علی اور شوکت علی کو ایک انتہا درجہ کا "ملاّ" پایا۔ اس لفظ
میں تعصب، توہم، سختی، عناد، ناروا داری، سب کچھ آگیا۔ میرے
حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ محمد علی کے خلوص، صداقت، جرأت،

---

[1] خطوط محمد علی، ص ۲۲۴۔ [2] ایضاً، ص ۱۱۴
[3] جوہر۔ عبدالحق نمبر۔ مارچ ۱۹۶۲ء، ص ۵۵ - ۶۳۔

بے نفسی، ایثار، اعلیٰ قابلیت کا اتنا ہی قائل ہوں جس قدر آپ۔ لیکن
ان کا ہر بات میں خدا کو لانا اور ہر حکم کو خدا اور اس کے رسول سے منسوب
کرنا اور ہر بات میں سختی اور غلو کے ساتھ تعصب برتنا ہر معقول آدمی کو
ناگوار گزرتا ہے .... میں موجودہ طرز تعلیم کا مخالف ہوں لیکن میں یہ بھی
نہیں چاہتا کہ محمد علی کی طرح علی گڑھ کالج کو "کفار اور منافقین کا کالج"
کہوں۔ ان لوگوں کو جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں کافر مردود و ملعون کہنا
کسی کو بھی اور خصوصاً ایک سردار قوم (لیڈر) کو ہرگز جائز نہیں ہے[1]۔

'چند ہم عصر' میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

"وہ (محمد علی) آزادی کا دل دادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا
لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد
ہوتا۔ وہ محبت اور مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے
لئے تیار رہتا۔ مگر بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا
تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی.... تکمیل کو پہنچانا اس
کی طبیعت ہی میں نہ تھا..... مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔
اس کے رفقا اور ہم عصر اس کے سامنے بودے تھے مگر افسوس اسے اپنے
اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی[2]۔"

اسلوب

یہی اندازہ مولانا محمد علی کے خطوں سے ہوتا ہے۔ ان میں اعتدال ضبط نفس
اور استقلال نہیں تھا۔ وہ اردو اور انگریزی کے بہت اچھے انشا پرداز تھے لیکن اعتدال
اور تناسب تحریر میں تھا اور نہ تقریر میں۔ ان کے خطوط جذبات کے ہیجان میں لکھے گئے
ہیں یا جیل کا وقت کاٹنے کے لیے۔ ان میں وہ ندرت ادا نہیں ہے جو شبلی کے یہاں
ہے۔ شبلی کی شخصیت ادیبانہ اور شاعرانہ پہلے ہے مذہبی اور سیاسی بعد میں۔ محمد علی

---
[1] چند ہم عصر۔ مولوی عبدالحق۔ دوسرا ایڈیشن (محمد علی)
[2] ایضاً۔

کی شخصیت مذہبی اور سیاسی پہلے ہے اور علمی و ادبی بعد میں ۔ لیکن ان کی شخصیت اتنی دیو پیکر ہے کہ ادب بھی ان کا خانہ زاد معلوم ہوتا ہے ۔ الفاظ اور جملے ان کے سامنے صف بستہ اور ان کے احکامات کے منتظر ہیں ۔ وہ خط اس طرح لکھتے ہیں جیسے تقریر کر رہے ہوں یا چیخ چیخ کے باتیں کر رہے ہوں ۔ ان میں پہاڑی ندیوں کا شور اور ہنگامہ ہے ۔ فقروں میں پُرجلال تناؤ ہے ۔ بیان میں اکڑ اور کس بل ہے ۔ ان کی شخصیت ڈرامائی ہے اس لیے خطوں میں بھی یہی رنگ ہے ۔ ایسے مقامات پر ان کا اسلوب اور شخصیت شیر و شکر ہو گئے ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

"سردار اقبال علی شاہ ۔ مولانا السّلام علیکم ۔ معاف فرمائیے گا ۔ میں نے آپ کو تکلیف دی ۔

محمد علی ۔ وعلیکم السّلام

س ا ع ش ۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ آپ کو اوپر سے نیچے آنا پڑے گا میں سمجھتا تھا کہ ٹیلیفون آپ ہی کے کمرے میں ہے ۔

م علی ۔ ارشاد فرمائیے ۔

س اع ش ۔ فرمائیے آپ کا مزاج تو اچھا ہے ۔

م علی ۔ جی نہیں ۔

س ا ع ش ۔ امید ہے کہ آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا ۔

م علی ۔ جی نہیں ۔

س اع ش ۔ آپ کا قلب تو نہایت وسیع ہے ۔

م علی ۔ مگر میرا دماغ تو بالکل تنگ نہیں ہے ۔

س اع ش ۔ کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں ۔

م علی ۔ جی نہیں ۔

س اع ش ۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ امید ہے آپ نے میرا قصور معاف کر دیا ہوگا ۔

م علی۔ اور میں بھی پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جی نہیں[1]۔"

لیکن جو چلا اٹھتا ہے تو وہ بھی اس غضب کا۔ محفوظ علی صاحب کو لکھتے ہیں۔

"ارے کم بخت آ اور جلد آ ع

بیا بیا کہ مرا طاقت جدائی نیست

خدایا وہ دن کب آئے گا کہ ایک جوان بھائی کے موٹے موٹے چلنے جیسے گھٹے ہوئے گال ایک بوڑھے بھائی کی چھٹی داڑھی سے وابستہ ہوں گے۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے

کہ یارے برخوردار از وصل یارے[2]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"ارے بھائی۔ کچھ تو اپنی خبر سنا۔ ڈاکیہ اخبار چرالے اور تو مجھے گالیاں دے۔ خیر مزا لینے والے مزا لے رہے ہیں[3]۔"

مولانا محمد علی بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور خلوص اور ہمدردی کا مجسمہ تھے۔ اور ان کی طبیعت میں تصنع اور تکلف کو دخل نہیں تھا۔ اسی لیے ان کی عبارت بھی اس عیب سے پاک ہے۔ ان کی شگفتگی، زندہ دلی، ان کی خودی اور خودداری، دلیری، وسعت ذوق اور جذبات کی شدت کا جتنا صحیح اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے اتنا کسی اور ذریعے سے نہیں۔ انھوں نے اپنی شگفتگی کو مصائب اور تکالیف میں بھی قائم رکھا ہے اور یہ ادنیٰ بات نہیں ہے۔ ان کے خطوں میں جا بجا مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ شاید اسی کی بدولت وہ زمانے کی عام افسردگی سے محفوظ رہے۔

مولانا عبد الماجد کو لکھتے ہیں۔

"آپ کی سائیکالوجی آف لیڈر شپ میرے پاس میری ہی فرمائش سے آئی ...... اخبارات میں میں نے پڑھا کہ آپ کی شادی ہوئی اور آپ کے بعد

---

[1] خطوط محمد علی، ص ۹۸۔ [2] ایضاً، ص ۲۵۹۔ [3] ایضاً، ص ۲۶۳۔

موٹر پر کہیں باہر جشنِ عرسی منانے روانہ ہو گئے اور میں نے خیال کیا کہ کم از کم "مادِ جشن" پھر تو "فلسفۂ محبت" کے آگے "فلسفۂ قیادت" کا تذکرہ بہت ہی بے محل و نامناسب ہوگا۔ اس لئے اب تک خاموش رہا۔ اُمید ہے کہ یہ عذر مقبول ٹھہرے گا۔"[1]

میر محفوظ علی کو لکھتے ہیں۔

" بیوی گھڑی کا تقاضا کرتی ہیں۔ گھڑی بھر چین نہیں۔ گھڑی بغیر چین نہیں۔ chain کا لحاظ رہے[2]۔"

<u>شاعری کا ذوق</u>

مولانا محمد علی کی شخصیت بے کیف اور بے رنگ نہیں ہے۔ ان کو شاعری کا بڑا اچھا موزوں ذوق تھا۔ ان کے تغزل میں آپ بیتی کا رنگ ہے اور سیاسی اور مذہبی رجحانات اور اسیری و نظر بندی کی زندگی نے ان کے کلام کو بے حد متاثر کیا ہے۔ ایک خط میں انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا کا ذکر کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

" آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف وابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا (کذا) رام پور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ امیر، تسلیم، جلال، عروج دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بار ہا مشاعرہ ہوا۔ پھر

---

[1] خطوط محمد علی، ص ۱۰۳۔ [2] ایضاً، ص ۲۴۷

داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورشِ سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا۔ تاکہ وظیفہ محض "کار بے کاراں" کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی۔ اور اب اس بذلہ سنج کا شعر کا لطف اُٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو۔

آیا دہلی سے ایک مشکی خر　　آ۔ تر ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے۔

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہو شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی۔ مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سُنا دیئے سُن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیئے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اسے ہاتھی بنا کر بیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر سخن کی شان میں نہ کی ہو[1]"

اس کے بعد انھوں نے اس کا ذکر کیا کہ مولانا شبلی ان کی شعر گوئی کے معترف تھے۔ سر چودھویں کو ایک مشاعرہ ان کی کوشش سے علی گڑھ کالج کے کرکٹ لان میں

---

[1] خطوط محمد علی، ص ۱۲۴ و ۱۲۵۔

ہوا کرتا تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو DINING HALL میں مشاعرہ ہوا۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے ایک شعر پڑھا تھا جو ضرب المثل ہے۔

فرشِ زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطفِ مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

جیل کی زندگی نے ان کی شاعری کو فروغ بخشا اور اس میں سوزِ عشق پیدا کر دیا۔

مولانا محمد علی کے خطوط سوانحی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے خط بہت لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ ان میں پیراگراف بہت کم ہوتا ہے جملے پیچیدہ اور طویل ہوتے ہیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے:

"مجھے خود طوالت کی لت پڑی ہوئی ہے۔ اور محض اپنا حال پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دینے پر بس نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح زبردستی اس کے دل کے اندر بھی اتار دوں"[1]

ان کے یہاں جو ادبی خوبیاں ہیں وہ بالکل اتفاقی اور ضمنی۔ ان کو ہیجانی زندگی میں "آرائش اور اہتمام" کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ خطوط ان کی اجتماعی زندگی کے آئینہ دار ہیں اور یہی پہلو حقیقتاً ان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

مولانا محمد علی نے لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جانے سے پہلے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو ایک خط لکھا تھا جس میں بعض جملے ایسے لکھے تھے جو بعد میں اتفاق سے حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئے۔

"ماہرِ علاج چشم نے پورا یقین دلادیا ہے کہ اگر میں سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک میں نہ چلا جاؤں جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے (تو اندھا ہو جانا یقینی ہے) لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آں کہ

---

[1] خطوط محمد علی ۔ ص ۱۰۵۔

اس کام میں مرجاؤں۔ اس لئے قرض دام لے کر بھیک مانگ کر اور جس
طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ
لے چلوں گا .... جب منزل مقصود کے لئے احرام سفر باندھوں تو چاہتا
ہوں کہ وہ موجود ہو[1]۔"

یہ دردناک پیشین گوئی لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہوئی اور انھوں نے لندن ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کی اور سرزمین مقدس میں قبلۂ اول کے قریب دفن ہوئے۔ اقبال نے کہا تھا:

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

مولانا محمد علی بالکل بے لاگ اور شمشیر برہنہ تھے۔ سرسید کی سی مصلحت اندیشی انھیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اثبات ذات کے جذبے نے ان کے لیے اور دقتیں پیدا کیں اور ان کے گرد اس طرح کے دوستوں اور جاں نثاروں کا مجمع نہ ہو سکا جیسے حالی محسن الملک اور وقار الملک تھے۔

مولانا حسین احمد مدنی

اسی طرح کی مخلص اور بے ریا ہستیوں میں مولانا حسین احمد مدنی ہیں جو آزادی کے میدان کے شہسواروں میں ہیں۔ ان کے خطوط "مکاتیب شیخ الاسلام"[2] کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔ ان سے ان کے سیاسی عقیدہ کی وفادارانہ استواری کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی عظیم الشان مذہبی شخصیت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاست ملیہ کے وہ پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں جن کا علاج مدنی فارمولا کے ذریعے تجویز کیا گیا تھا۔ ان خطوں میں ادب و انشا کا لطف نہیں ہے۔ یہ محض

---

[1] خطوط محمد علی۔ ص ۲۳۵۔

[2] مکاتیب شیخ الاسلام مرتبہ سید فرید الوحیدی (دیو بند) نیز مکتوبات شیخ الاسلام، حصہ اول۔ مرتبہ نجم الدین اصلاحی۔ مطبوعہ اعظم گڑھ

ایک جلیل القدر مذہبی اور سیاسی شخصیت کے سمجھنے میں مفید ہیں۔ ان میں نرم رو دریا کی روانی ہے۔ وہ بلند آہنگی نہیں ہے جو قاضی محمد سلیمان سلیمان منصور پوری مصنف رحمۃ اللعالمین کے علمی اور تبلیغی خطوطؓ میں ہے۔

قاضی محمد سلیمان

قاضی صاحب کے خطوط اور اس طرح کے دوسرے مجموعے جن کی تعداد اُردو میں کم نہیں ہے ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔

لہ مکاتیب سلیمان ۔ سلمان کمپنی ۔ لاہور۔

بابِ ہفتم

مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ

مولانا ابوالکلام آزاد

پہلی اور دوسری عالمی جنگ، ۱۹۲۱ء کی تحریک عدم تعاون، ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کا معاشی اضطراب، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۳ء کی سیاسی تحریکات، اشتراکیت کی نئی رو، اور جمہوریت کے نئے شعور نے اردو نثر کو بے حد متاثر کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، شبلی اور محمد علی دونوں سے کم عمر ہیں لیکن ان کی نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں۔ فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے۔ الفاظ میں نقارہ و دہل کا سا شور اور ہنگامہ ہے جو ہماری فطرت میں آگ سی لگا دیتا ہے۔ لیکن یہ شاندار اور عالمانہ نثر الہلال اور البلاغ تک ہی۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے موثرات خارجی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ان میں ادب اور لطافت کی جو گلکاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں۔

غبارِ خاطر کی شانِ نزول

مولانا آزاد کے خطوں کے دو مجموعے غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ غبارِ خاطر کی شانِ نزول یہ ہے کہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں مولانا کو دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی لیکن "مخاطبت" کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دامن گیر ہوئیں کہ وہ وقتاً فوقتاً "صدیق مکرم" کے نام خطوط لکھ کر

جمع کرتے رہے۔ اور رہائی کے بعد انھوں نے اس مجموعے کو چھپوا کر نواب صدر یار جنگ کے پاس بھیج دیا۔ مولانا نے ۱۰ راگست کے خط میں لکھا ہے :

"جو کچھ لکھ رہا ہوں کلپترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں۔ تاہم کیا کروں۔ افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوقِ خامہ فرسائی ستم زدگی سے تعبیر کیا ہے[۱]"

ایک اور خط میں لکھا ہے :

"وہی چار بجے صبح کا جاں فزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت دراز نفسی کے لئے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے[۲]"

کاروانِ خیال میں بھی انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"جی چاہتا ہے صحبت ختم نہ ہو ایک ذکر ختم ہو جائے تو دوسرا چھیڑ دیں۔ ع
قدرے بگریم و ہم بر سر افسانہ روم[۳]"

ان خطوں میں الفاظ کی شوکت و حشمت ہے۔ فارسی ترکیبوں کی استخواں بندی ہے۔ علمی و ادبی مباحث کی فراوانی ہے۔ شاعرانہ باتیں ہیں جن کا ایک ایک لفظ دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان مجموعوں میں ایک عجیب لیکن دلکش قسم کی احتیاط، کم آمیزی، پوشیدگی اور نازک مذاقی بھی پائی جاتی ہے جس کا کوئی خارجی سرچشمہ ڈھونڈھنا مشکل ہے۔ مولانا آزاد کے ان خطوں میں تمنا کی بے تابیوں اور دل کی حسرتوں کے بے تکلف اظہار کی تلاش عبث ہے۔ اس قسم کا غیر منصفانہ مطالبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے ہی آئینے میں دوسروں کا عکس دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ وہ تصویر جو ان خطوں سے مرتب ہوتی ہے وہ باعظمت ضرور ہے لیکن بے ساختہ اور بے تکلف نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ بے ساختہ اور بے تکلف ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ہم ان کے عادات و خصائل امیال و اذواق کا پتہ لگانے کے لیے اگر

---

[۱] غبارِ خاطر، طبع اول، ص ۱۸۔ [۲] ایضاً، ص ۶۷۔ [۳] کاروانِ خیال، ص ۷۹، ۸۰۔

کسی طرح تمام پڑے اشاد یں تب بھی ایک ہی جھلک نظر آتی ہے۔ پورا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اور ہماری تشنہ کامی اس سطح پر قائم رہتی ہے جس کا ذکر فارسی شاعر نے اس طرح کیا ہے ـــــ دہند شوق و لے رخصت نظر نہ دہند

التفات و تغافل کی عشوہ گری

لیکن کیا التفات و تغافل کی یہ عشوہ گری بذات خود دلچسپ نہیں ہے۔ دانش آرائی اور مرصع کاری کا جو حسین اہتمام ان خطوں میں ہے وہ اردو لٹریچر میں دوسری جگہ مشکل سے ملے گا۔ علم کے جن خزانوں تک مولانا کی دست رس ہے اور تخئیل کی جو دولت ان کو ملی ہے وہ سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ خود ان کے الفاظ میں "صورت و معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جس نے ان کی طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلوتہی کی ہو۔ اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہوگی جس کی پیمائش میں ان کے قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو[1]۔"

ان خطوں کا موضوع

ان حالات میں اگر ان کے خطوں میں قلعہ احمد نگر کی تاریخ، فلسفہ اور مذہب کے مباحث، مفاد پرعنصری کے نظریے، طلسم ہستی کے معمے، خدا کی وحدانیت، زندگی و حرکت کے مسائل، پانچویں صلیبی حملے کی سرگزشت، موسیقی کی داستان، یاسمن سفید کی کہانی، انانیتی ادبیات کا خاکہ، یاران سقف و محاریب، شیخ الوصی زادہ، اور مرزا کاظم رشتی کی محفلوں کا تذکرہ ملتا ہے تو ایسی حیرت کی بات نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے اور یہ حیرت بھی ایک عام آدمی کی حیرت ہے کہ انھوں نے زندگی کو جو مکمل اکائی ہے کس طرح خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ان مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بظاہر کوئی رشتۂ اشتراک نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ نواب صاحب کو جتنے خط لکھے گئے ہیں وہ سب احتیاط کی چھلنی میں چھانے گئے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی آمیزش باقی نہ رہے۔ ان ۳۲۴ صفحات میں صرف ایک جگہ یہ شراب پیمانے سے چھلک گئی ہے۔

---

[1] کاروان خیال، ص ۷۰۔

چھبیس برس کی ازدواجی زندگی کے اختتام پر چند جملے اس درد اور سوز کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے لگا ہے۔

"مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔ غافل نیم ز راہ والے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دل آگاہ می زنند"[۱]

لیکن اس بحث کو اسی جگہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ دشنہ و خنجر اور بادہ و ساغر کی زبان سمجھتے ہیں اور جو شعروں کے انتخاب سے دل کے معاملے تک پہنچ سکتے ہیں ان کو ان خطوں میں بھی بہت سی داستانیں مل جائیں گی۔ کیا داستان بے ستون و کوہ کن۔ حکایت بادۂ تریاک اور افسانۂ زاغ و بلبل میں قید و بند کی پوری زندگی آشکارا نہیں ہے۔ کیا اس حدیثِ دیگراں سے "سرِ دلبراں" نہیں معلوم ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ورائے شاعری چیزے دگر ہست۔

AUGUSTE COMTE نے صحیح لکھا ہے کہ قید خانے میں ماضی و مستقبل، حال میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ حال کا تصور ہی مٹ جاتا ہے۔ وقت کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور قید خانہ برا سہی لیکن ماضی کا زندان اور اس کی علامتیں بری نہیں معلوم ہوتیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ مولانا واردات و سوانح کے ذکر کو پسند ہی نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے اس باب کا ایک ورق الٹ دیا تھا تو مولانا نے لکھا تھا کہ

"اس باب میں تکلم و حکایت اصحاب درد و ذوق کا شیوہ نہیں"

لیکن باوجود "سر ایں تیشہ فرو بند" کے حکم کے کہیں کہیں یہ سے تند باہر آ گئی ہے۔ ایک خط میں اپنی طبیعت کی بے میل افتاد کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ وہ فکر و عمل

۱؎ غبارِ خاطر، ص ۲۸۳۔

کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے نہ چل سکی۔ ایک اور جگہ تحریر فرمایا ہے:

"جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"

اپنی تعلیم کے سلسلے میں لکھا ہے:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔"

مبدا فیاض کی یہ بخشش خاص بھی ملاحظہ ہو۔

"۲۴ برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں میں اپنی دشت نوردیاں طے کر کے تلوؤں کے کانٹے چن رہا تھا۔"

<u>انفرادیت</u>

مولانا کی انفرادیت زندگی کے ہر حصے اور شعبے میں نمایاں ہے۔ قید و بند کی زندگی بڑی اذیت رساں ہوتی ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے افسردگی کو دور کرنے کا ڈھنگ معلوم کر لیا ہے۔

"اگر کہوں اس ناگہانی صورت حال (قید و بند) سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہوئی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسب معمول علی الصباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو گیا اور افسردگی اور تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے

پر دستک دے رہی ہے ...... اب معلوم ہوا اگرچہ نگاہوں اور کانوں
کی ایک محدود دنیا کھو دی گئی ہے مگر فکر و تصور کی کتنی ہی دنیائیں اپنی
ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔
اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جا سکتے ہیں تو
کون ایسا زیاں عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو[1]۔"

قید و بند کی زندگی اور اس کا فلسفہ

اس معاملے میں ان کا ایک خاص فلسفہ ہے جس نے قید و بند میں بھی ان
کی شگفتہ روئی کو قائم رکھا ہے۔

"میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔
اس میں ایک جزو رواقیہ کا ہے اور ایک لذتیہ کا..... جہاں تک
حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے رواقیت سے ان زخموں پر مرہم لگاتا
ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں... جہاں تک
زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویہ نگاہ کام میں لاتا ہوں
اور خوش رہتا ہوں[2]۔"

اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :

"جس قید خانہ میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب
میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی
ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں۔ جہاں دوپہر
ہر روز چمکے شفق ہر روز نکھرے پرند ہر صبح و شام چہکیں۔ اسے قید خانہ ہونے
پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے[3]۔"

وہ دراصل اپنے دل کو مرنے نہیں دیتے۔ کوئی حالت ہو اس کی تڑپ دھیمی نہیں
ہوگی۔ وہ رنج و راحت کو اضافی چیز سمجھتے ہیں اور زندگی کو ایک ہی طرح کی

---

[1] غبار خاطر، ص ۷۹۔ [2] ایضاً، ص ۶۲ و ۶۳۔ [3] ایضاً، ص ۶۶۔

صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ:

"زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہئے۔"
زندگی بغیر مقصد اور مرکز کے نہیں گزرتی۔ مقصد بھی وہ جو اضطراب کے انگاروں سے دہکتا ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو مقصد کی خلش "نہ دامن تار تار کی خبر لینے دے گی اور نہ زخمی تلووں کی۔"

خوش رہنا اخلاقی ذمہ داری ہے

مولانا زندگی کے فریضے کو خندہ پیشانی کے ساتھ انجام دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔" دیکھیے اس نظریے کی کس خوبی کے ساتھ وضاحت کی ہے۔

"جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہیں، اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہوسکتے۔"[1]

مولانا زندگی کو خواہ مخواہ غلطیوں سے یکسر معصوم بنانا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے "وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کرسکے۔ وہ چال کیا ہوئی جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہوئی۔"

ان کے سامنے عمل کی کامرانی کا ایک خاص معیار اور ترک و اختیار کا ایک خاص اصول ہے۔

"..... ترک و اختیار ..... کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھایئے کہ آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن نہ پکڑ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا۔ دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری

---

[1] غبار خاطر، ص ۲۴۷۔

نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجئے۔ لیکن آپ کے دست بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہئے کہ جب چاہا اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند باقی نہ رہی۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[۱]"

چائے کا ذکر

مولانا "باغ وجود کے ثمر پیش رس" ہیں اور ان کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔ مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، معاشرت میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، کسی راہ میں بھی وہ وقت کے قافلوں کا ساتھ نہیں دے سکے۔

ایک ادنیٰ سی چیز چائے ہی کو لیجئے۔ اس معاملے میں مولانا کا مذاق سب سے الگ ہے اور سب سے پاکیزہ۔ مولانا نے ان خطوں میں چائے کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے کوئی دل گرفتہ اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے یا کوئی رند مے آشام اپنے بادۂ گلرنگ کا۔ SU TUNGP'O نے اسی لیے چاء کو ایک حسین دوشیزہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور ڈی کوئنزی DE QUINSEY نے اسے اہل فکر کی شراب طہور کہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا کی "یاسمن سفید" چاء میں مے و معشوق کا کیف اور حسن پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ قسم کی چینی چاء پیتے ہیں اور اس کے تقریباً وہی آداب بھی برتتے ہیں جو اعلیٰ چینی سوسائیٹی میں مروج ہیں۔ اس چاء کا ذکر بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا LU YU اور LIN YUTANG وغیرہ کے یہاں ہے لیکن مولانا کی شخصیت اور ان کا ماحول ان سب سے مختلف ہے۔ اس لیے ان کے بیان کی دلکشی بھی ان سب سے علیحدہ بالکل علیحدہ ہے ــــ یار ما این دارد و آن نیز ہم

[۱] غبار خاطر، ص ۴۴ و ۴۵۔

یہ اہتمام ملاحظہ ہو :

" میں اس وقت بادہ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چاء کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چاء دم دیتا ہوں اور پھر جام صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھئے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چاء کے اس دور صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لئے مہیا کرتا ہے ...... آپ کو معلوم ہے کہ میں چاء کے لئے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چاء کی معمولی پیالوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجئے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائے۔ مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا۔ میں جرعہ کشانِ کہنہ مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لئے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتداد کیف کے لئے جتنا طول دے سکتا ہوں دوں گا اور پھر دوسرے تیسرے کے لئے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کے اور اس کے سارے کارخانہ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔[1]"

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ مولانا کے خطوں میں غزل کے مقطعوں کی سی بلند آہنگی ہے لیکن اگر یہ میں کا سر جوشش ہے تو ایسا ہی ہے جیسا غالب کے جبیہ میں ہے جس پر ہزار عجز نمائیاں قربان ہیں۔

خواہم از بند بہ زندان سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

---

[1] غبار خاطر، ص ۶۸ و ۶۹۔

بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خونناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی بہ جہان مے کدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعوی اعجاز کنم
بے مشقت نہ بود قید بہ شعر آویزم
روزکے چند رسن تابی آواز کنم

آزاد اور غالب

جو لوگ مولانا کے خطوں کا غالب کے مکتوبات سے مقابلہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بھی بے انصافی کرتے ہیں اور آزاد اور غالب کے ساتھ بھی۔ رخ روشن کے آگے شمع رکھنا ممکن ہے محبوبانہ ادا ہو لیکن تنقید کی دنیا میں ظلم سے کم نہیں ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ غالب کے خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں جن میں بہت سے موضوعات پر گفتگو ہے اور مولانا کے خطوط صرف "صدیق مکرم" کے نام ہیں۔ جن سے تعلقات کے حدود متعین ہیں اور جو ایک خاص مدت میں اور خاص حالات کے تحت لکھے گئے ہیں لیکن جہاں تک خطوط کے ذریعے بزم آراستہ کرنے اور فراق میں وصال کے مزے لینے کا تعلق ہے آزاد غالب سے آگے ہیں اور بذلہ سنجی اور جدت طرازی میں ان سے کم نہیں۔

اسلوب

مولانا کے خطوں میں بائرن کی سی انانیت ہے۔ غالب کی سی سادگی و پرکاری نہیں ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مولانا کے خطوں کا امتیازی وصف یہی ہے کہ وہ غالب سے اس درجہ مختلف ہیں کیٹس (KEATS) کی طرح انھوں نے دل صد پارہ کی قاش فروشی نہیں کی۔ یہ خطوط ان کے ذہن کا دریچہ اور ان کی فکر کی زبان تو ہیں لیکن غالب کی طرح بہ حیثیت مجموعی واردات و کیفیات کا آئینہ نہیں۔ بعض خطوں کے متعلق اگر پہلے سے نہ معلوم ہو تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ

وہ شبستان میں لکھے گئے ہیں یا زندان میں لیکن بقول چسٹرٹن جن لوگوں کو تخیل کی بیش بہا دولت ملتی ہے ان کے لیے زندان و شبستان کے امتیازات اٹھ جاتے ہیں۔ مولانا تنہائی اور خود مشغولی کے قائل ہیں اور زندگی کی رونق سے کدۂ خلوت سے سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے۔ اسی لیے مولانا نے دماغ کے گوشے تو دکھلائے ہیں مگر دل کے نہاں خانے کے بیشتر حصوں کو بند ہی رکھا ہے۔ اس معاملے میں مولانا بڑی حد تک معذور ہیں۔ انھوں نے اپنے دماغ کو دل بنا لیا ہے۔ اس کے علاوہ جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی اس میں حزم و احتیاط۔ کم سخنی اور کم آمیزی۔ شرافت اور اعلیٰ نسبی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یہ کم گوئی شرفا کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ غالب نے بھی خطوں کے اشاعت سے ابتدا میں اسی وجہ سے پرہیز کیا تھا کہ آپس کے معاملات دوسروں پر کیوں ظاہر ہوں۔ HANNAH MOORE کو یہ ڈر تھا کہ کہیں باسول جانسن کی سوانح عمری کو زیادہ واقعیاتی نہ بنا دے۔ ٹینی سن سوانح عمری کو اس وجہ سے مہمل سمجھتا تھا کہ وہ حرم سرا میں ایک قسم کی دراندازی تھی۔ تھیکرے نے اسی ڈر سے اپنی سوانح عمری کے لکھنے کی ممانعت کر دی تھی یہی حال خطوں کا تھا۔ BUXTON FORMAN نے جب ۱۸۷۸ء میں KEATS کے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کیا تو تمام اخبارات نے اس کو ناروا جسارت اور بے جا ظلم سمجھا اور وہ خطوط جو آج انگریزی ادب میں عدیم النظیر حیثیت رکھتے ہیں، عزت، شرافت اور جوانمردی کے خلاف سمجھے گئے تھے۔

مولانا آزاد کے خطوں میں کوپر (COWPER) کی سی سنجیدگی، پختہ مزاجی غالب کی سی انجمن آرائی اور گرے کی سی نازک مذاقی اور وضع احتیاط ہے جس کو شاعرانہ اسلوب بیان " خمار چشم ساقی " کی آمیزش اور قید و بند کے ماحول نے نہایت دلکش بنا دیا ہے۔

مولانا آزاد کو ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو قید کیا گیا تھا جب کہ آمریت اور

جمہوریت میں آخری لڑائی ہو رہی تھی اور ہندوستان نے آزادی کامل کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اس قید و بند کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے انھوں نے مخاطبت کی خوش وقتی حاصل کی تھی۔ یہ بزم انس اس قدر طویل ہوئی کہ ایک مجلہ کا سامان بن گئی۔ قلعہ احمد نگر میں خطوں کو مکتوب الیہ تک بھیجنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ان خطوں کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ "کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم"۔

کاروان خیال

لیکن وہ خطوط جو کاروان خیال میں چھپے ہیں اور جو آزادی کی حالت میں لکھے گئے ہیں ان میں بھی یہی افسانہ سرائی اور اعجاز نگاری ہے۔ مولانا نے ذوق حضوری کے لیے بات میں بات اور کہانی سے کہانی پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے۔ وہ جملوں کو اس طرح سجاتے ہیں اور گزری ہوئی باتوں کو کچھ اس انداز سے چھیڑتے ہیں کہ ہم نشینی اور ہم زبانی کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ خطوں کا اصلی کمال بھی یہی ہے کہ باتوں کا مزہ آ جائے اور بُعدِ منزل باقی نہ رہے۔

مولانا آزاد کے متفرق خطوط

ہم نے مولانا آزاد کے وہ خطوط بھی دیکھے ہیں جو مختلف جگہ حکیم محمد علی مرحوم[1] پروفیسر رشید احمد صدیقی[2]، خواجہ حسن نظامی[3] اور نیاز فتح پوری[4] کے نام شائع ہوئے ہیں۔ ان میں وہ رنگینی، دراز نفسی اور ذوق کی یک جہتی نہیں ہے جو کاروانِ خیال اور غبار خاطر کی خصوصیت ہے لیکن جہاں تک طرز و اسلوب کا تعلق ہے وہ مضبوط پاکیزہ اور بامزہ ہے۔ خیالات میں بھی ارتقا ہے تضاد نہیں ہے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :

"ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ مرقع عالم ہردوئی بابت ماہ مئی ۱۹۰۲ء۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خط حکیم محمد علی ایڈیٹر مرقع عالم کے نام۔ ص ۴۰ تا ۴۲۔ [2] علی گڑھ میگزین، ج ۲۴۔ نمبر ۱۔ [3] نامی مسلمانوں کے خطوط، ص ۵۰۔۵۵۔ [4] ایضاً، ص ۷۹ تا ۸۰۔

دوسرے سے کسی قدر متضاد مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہد اور قبائے رندی
کو ایک ہی وقت میں اوڑھنے پہننے کا مجرم ہوں[1]۔"

غبارِ خاطر میں بھی ان ہی خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔

"انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی
زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی ایک اندر کی۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

دونوں زندگیوں کے مرقع کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی
ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو نہ پہچان سکیں[2]۔"

نواب صدر یار جنگ

مولانا آزاد اپنے خطوں کے ذریعے بارِ حیات کو ہلکا کرتے ہیں۔ ہمارے احساسات میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے ہیں اور جذبات کی گزرگاہوں کو اپنے قلم سے روشن کیا ہے۔ ان کے اسلوب کا شاعرانہ رجحان ان کے طریق فکر کی وجہ سے ہے جس قوت کے ماتحت ان کے الفاظ گنگناتے ہیں اور ان کے جملے رقص کرتے ہیں وہ ان کے خیالات ہیں لیکن "صدیق مکرم" نواب صدر یار جنگ مرحوم کے خطوں میں جو ہم نے جمع کیے ہیں[3] یا جو کاروانِ خیال میں شائع ہوئے ہیں، وہ فکر کاری نہیں ہے جو مولانا آزاد کے خطوں میں ہے۔ نواب صاحب مرحوم کے طرز میں صناعانہ پختگی ہے لیکن مولانا آزاد کی سی اعجاز نگاری اور کافر بیانی نہیں ہے۔ ان کے خطوط زمان و مکان سے گزر کر جاوداں ہونا چاہتے ہیں جو ادب عالیہ کی اولین شرط ہے لیکن "صدیق مکرم" عارضی لمحوں سے اوپر نہیں اٹھتے اور ستاروں سے آگے نہیں پہنچتے۔

---

[1] نامی مسلمانوں کے خطوط مرتبہ خواجہ حسن دہلوی، ص ۵۰۔ [2] غبارِ خاطر، ص ۶۰۔
[3] ملاحظہ ہو نواب صدر یار جنگ کے خطوط از خواجہ احمد فاروقی، 'آج کل' دہلی، جنوری ۱۹۵۲ء

پر دستک دے رہی ہے ...... اب معلوم ہوا اگرچہ نگاہوں اور کانوں
کی ایک محدود دنیا کھو دی گئی ہے مگر فکر و تصور کی کتنی ہی دنیائیں اپنی
ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔
اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جا سکتے ہیں تو
کون ایسا زیاں عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو[1]۔"

قید و بند کی زندگی اور اس کا فلسفہ

اس معاملے میں ان کا ایک خاص فلسفہ ہے جس نے قید و بند میں بھی ان کی شگفتہ روئی کو قائم رکھا ہے۔

"میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔
اس میں ایک جزو رواقیہ کا ہے اور ایک لذتیہ کا ..... جہاں تک
حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے رواقیت سے ان زخموں پر مرہم لگاتا
ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں ... جہاں تک
زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویہ نگاہ کام میں لاتا ہوں
اور خوش رہتا ہوں[2]"

اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :

"جس قید خانہ میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب
میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی
ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں۔ جہاں دوپہر
ہر روز چمکے شفق ہر روز نکھرے پرندہر صبح و شام چہکیں۔ اسے قید خانہ ہونے
پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے[3]۔"

وہ دراصل اپنے دل کو مرنے نہیں دیتے۔ کوئی حالت ہو اس کی تڑپ دھیمی نہیں
ہوگی۔ وہ رنج و راحت کو اضافی چیز سمجھتے ہیں اور زندگی کو ایک ہی طرح کی

---

[1] غبار خاطر، ص ۷۹۔ [2] ایضاً، ص ۶۲ و ۶۳۔ [3] ایضاً، ص ۶۶۔

E 34

صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ:
"زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہئے"
زندگی بغیر مقصد اور مرکز کے نہیں گزرتی۔ مقصد بھی وہ جو اضطراب کے انگاروں سے دہکتا ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو مقصد کی خلش "نہ دامن تار تار کی خبر لینے دے گی اور نہ زخمی تلووں کی"

خوش رہنا اخلاقی ذمہ داری ہے

مولانا زندگی کے فریضے کو خندہ پیشانی کے ساتھ انجام دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے" دیکھیے اس نظریے کی کس خوبی کے ساتھ وضاحت کی ہے۔

"جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، تاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہیں، اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے"[1]

مولانا زندگی کو خواہ مخواہ غلطیوں سے یکسر معصوم بنانا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے "وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے۔ وہ چال کیا ہوئی جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہوئی"

ان کے سامنے عمل کی کامرانی کا ایک خاص معیار اور ترک و اختیار کا ایک خاص اصول ہے۔

"..... ترک و اختیار .... کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن نہ پکڑ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا۔ دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری

---

[1] غبارِ خاطر، ص ۴۷۔

نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجئے۔ لیکن آپ کے دست بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہئے کہ جب چاہا اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند باقی نہ رہی۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[۱]"

چائے کا ذکر

مولانا "باغ وجود کے ثمر پیش رس" ہیں اور ان کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔ مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، معاشرت میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، کسی راہ میں بھی وہ وقت کے قافلوں کا ساتھ نہیں دے سکے۔

ایک ادنی سی چیز چائے ہی کو لیجئے۔ اس معاملے میں مولانا کا مذاق سب سے الگ ہے اور سب سے پاکیزہ۔ مولانا نے ان خطوں میں چائے کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے کوئی دل گرفتہ اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے یا کوئی رندِ آشام اپنے بادۂ گل رنگ کا۔ SU TUNGP'O نے اسی لیے چاء کو ایک حسین دوشیزہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور ڈی کوئنزی DE QUINSEY نے اسے اہل فکر کی شراب طہور کہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا کی "یاسمن سفید" چاء میں مے و معشوق کا کیف اور حسن پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ قسم کی چینی چاء پیتے ہیں اور اس کے تقریباً وہی آداب بھی برتتے ہیں جو اعلیٰ چینی سوسائٹی میں مروج ہیں۔ اس چاء کا ذکر بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا LU YU اور LIN YUTANG وغیرہ کے یہاں ہے لیکن مولانا کی شخصیت اور ان کا ماحول ان سب سے مختلف بالکل مختلف ہے۔ اس لیے ان کے بیان کی دلکشی بھی ان سب سے علیحدہ بالکل علیحدہ ہے ـــــ یار ما این دارد و آن نیز ہم

---

[۱] غبارِ خاطر، ص ۴۴ و ۴۵ ۔

یہ اہتمام ملاحظہ ہو :

" میں اس وقت بادہ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چاء کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چاء دم دیتا ہوں اور پھر جام صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چاء کے اس دور صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لئے مہیا کرتا ہے ...... آپ کو معلوم ہے کہ میں چاء کے لئے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چاء کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائے۔ مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا۔ میں جرعہ کشانِ کہنہ مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لئے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتداد کیف کے لئے جتنا طول دے سکتا ہوں دوں گا اور پھر دوسرے تیسرے کے لئے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کے اور اس کے سارے کارخانہ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔[۱] "

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ مولانا کے خطوں میں غزل کے مقطعوں کی سی بلند آہنگی ہے لیکن اگر یہ میں کا سر جوش ہے تو ایسا ہی ہے جیسا غالب کے جبسیہ میں ہے جس پر ہزار عجز نمائیاں قربان ہیں۔

خواہم از بند بہ زندان سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

---

[۱] غبار خاطر، ص ۶۸ و ۶۹۔

بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خوناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی بہ جہان مے کدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعوی اعجاز کنم
بے مشقت نہ بود قید بہ شعر آویزم
روز کے چند رسن تابی آواز کنم

آزاد اور غالب

جو لوگ مولانا کے خطوں کا غالب کے مکتوبات سے مقابلہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بھی بے انصافی کرتے ہیں اور آزاد اور غالب کے ساتھ بھی۔ رخ روشن کے آگے شمع رکھنا ممکن ہے محبوبانہ ادا ہو لیکن تنقید کی دنیا میں ظلم سے کم نہیں ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ غالب کے خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں جن میں بہت سے موضوعات پر گفتگو ہے اور مولانا کے خطوط صرف "صدیق مکرم" کے نام ہیں۔ جن سے تعلقات کے حدود متعین ہیں اور جو ایک خاص مدت میں اور خاص حالات کے تحت لکھے گئے ہیں لیکن جہاں تک خطوط کے ذریعے بزم آراستہ کرنے اور فراق میں وصال کے مزے لینے کا تعلق ہے آزاد غالب سے آگے ہیں اور بذلہ سنجی اور جدت طرازی میں ان سے کم نہیں۔

اسلوب

مولانا کے خطوں میں بائرن کی سی انانیت ہے۔ غالب کی سی سادگی و پرکاری نہیں ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مولانا کے خطوں کا امتیازی وصف یہی ہے کہ وہ غالب سے اس درجہ مختلف ہیں کیٹس (KEATS) کی طرح انھوں نے دل صد پارہ کی قاش فروشی نہیں کی۔ یہ خطوط ان کے ذہن کا دریچہ اور ان کی فکر کی زبان تو ہیں لیکن غالب کی طرح بہ حیثیت مجموعی واردات و کیفیات کا آئینہ نہیں۔ بعض خطوں کے متعلق اگر پہلے سے نہ معلوم ہو تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ

وہ شبستان میں لکھے گئے ہیں یا زندان میں۔ لیکن بقول چسٹرٹن جن لوگوں کو تخیل کی بیش بہا دولت ملتی ہے ان کے لیے زندان و شبستان کے امتیازات اُٹھ جاتے ہیں۔ مولانا تنہائی اور خود مشغولی کے قائل ہیں اور زندگی کی رونق سے کدۂ خلوت سے سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے۔ اسی لیے مولانا نے دماغ کے گوشے تو دکھلائے ہیں مگر دل کے نہاں خانے کے بیشتر حصّوں کو بند ہی رکھا ہے۔ اس معاملے میں مولانا بڑی حد تک معذور ہیں۔ انھوں نے اپنے دماغ کو دل بنا لیا ہے۔ اس کے علاوہ جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی اس میں حزم و احتیاط، کم سخنی اور کم آمیزی، شرافت اور اعلیٰ نسبی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یہ کم گوئی شرفا کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ غالب نے بھی خطوں کے اشاعت سے ابتدا میں اسی وجہ سے پرہیز کیا تھا کہ آپس کے معاملات دوسروں پر کیوں ظاہر ہوں۔ HANNAH MOORE کو یہ ڈر تھا کہ کہیں باسول جانسن کی سوانح عمری کو زیادہ واقعیاتی نہ بنا دے۔ ٹینی سن سوانح عمری کو اس وجہ سے مہمل سمجھتا تھا کہ وہ حرم سرا میں ایک قسم کی دراندازی تھی۔ تھیکرے نے اسی ڈر سے اپنی سوانح عمری کے لکھنے کی ممانعت کر دی تھی یہی حال خطوں کا تھا۔ BUXTON FORMAN نے جب ۱۸۷۸ء میں KEATS کے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کیا تو تمام اخبارات نے اس کو ناروا جسارت اور بے جا ظلم سمجھا اور وہ خطوط جو آج انگریزی ادب میں عدیم النظیر حیثیت رکھتے ہیں، عزت، شرافت اور جوانمردی کے خلاف سمجھے گئے تھے۔

مولانا آزاد کے خطوں میں کوپر (COWPER) کی سی سنجیدگی، پختہ مزاجی غالب کی سی انجمن آرائی اور گرے کی سی نازک مذاقی اور وضع احتیاط ہے جس کو شاعرانہ اسلوب بیان "خمارِ چشمِ ساقی" کی آمیزش اور قید و بند کے ماحول نے نہایت دلکش بنا دیا ہے۔

مولانا آزاد کو ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو قید کیا گیا تھا جب کہ آمریت اور

جمہوریت میں آخری لڑائی ہورہی تھی اور ہندوستان نے آزادی کامل کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اس قید و بند کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے انھوں نے مخاطبت کی خوش وقتی حاصل کی تھی۔ یہ بزم انس اس قدر طویل ہوئی کہ ایک مجلہ کا سامان بن گئی۔ قلعہ احمد نگر میں خطوں کو مکتوب الیہ تک بھیجنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ان خطوں کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ "کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم"۔

کاروانِ خیال

لیکن وہ خطوط جو کاروانِ خیال میں چھپے ہیں اور جو آزادی کی حالت میں لکھے گئے ہیں ان میں بھی یہی افسانہ سرائی اور اعجاز نگاری ہے۔ مولانا نے ذوقِ حضوری کے لیے بات میں بات اور کہانی سے کہانی پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے۔ وہ جملوں کو اس طرح سجاتے ہیں اور گزری ہوئی باتوں کو کچھ اس انداز سے چھیڑتے ہیں کہ ہم نشینی اور ہم زبانی کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ خطوں کا اصلی کمال بھی یہی ہے کہ باتوں کا مزہ آ جائے اور بُعدِ منزل باقی نہ رہے۔

مولانا آزاد کے متفرق خطوط

ہم نے مولانا آزاد کے وہ خطوط بھی دیکھے ہیں جو مختلف جگہ حکیم محمد علی مرحوم[1] پروفیسر رشید احمد صدیقی[2]، خواجہ حسن نظامی[3] اور نیاز فتح پوری[4] کے نام شائع ہوئے ہیں۔ ان میں وہ رنگینی، دراز نفسی اور ذوق کی یک جہتی نہیں ہے جو کاروانِ خیال اور غبارِ خاطر کی خصوصیت ہے لیکن جہاں تک طرز و اسلوب کا تعلق ہے وہ مضبوط پاکیزہ اور بامزہ ہے۔ خیالات میں بھی ارتقا ہے تضاد نہیں ہے۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :

"ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ مرقع عالم ہردوئی بابت ماہ مئی ۱۹۰۲ء۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خط حکیم محمد علی ایڈیٹر مرقع عالم کے نام۔ ص ۲۰ تا ۲۲۔ [2] علی گڑھ میگزین، ج ۲۴۔ نمبر ۱۔ [3] نامی مسلمانوں کے خطوط، ص ۵۰-۵۵۔ [4] ایضاً، ص ۷۹ تا ۸۰۔

دوسرے سے کسی قدر متضاد مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہاد اور قبائے رندی
کو ایک ہی وقت میں اوڑھنے پہننے کا مجرم ہوں[1]۔"

غبارِ خاطر میں بھی ان ہی خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔

"انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی
زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی ایک اندر کی۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

دونوں زندگیوں کے مرقع کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی
ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو نہ پہچان سکیں[2]۔"

نواب صدر یار جنگ

مولانا آزاد اپنے خطوں کے ذریعے بارِ حیات کو ہلکا کرتے ہیں۔ ہمارے احساسات میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے ہیں اور جذبات کی گزرگاہوں کو اپنے قلم سے روشن کیا ہے۔ ان کے اسلوب کا شاعرانہ رجحان ان کے طریق فکر کی وجہ سے ہے جس قوت کے ماتحت ان کے الفاظ گنگناتے ہیں اور ان کے جملے رقص کرتے ہیں وہ ان کے خیالات ہیں لیکن "صدیق مکرم" نواب صدر یار جنگ مرحوم کے خطوں میں جو ہم نے جمع کیے ہیں[3] یا جو کاروانِ خیال میں شائع ہوئے ہیں، وہ فکر کاری نہیں ہے جو مولانا آزاد کے خطوں میں ہے۔ نواب صاحب مرحوم کے طرز میں صناعانہ پختگی ہے لیکن مولانا آزاد کی سی اعجاز نگاری اور کافر بیانی نہیں ہے۔ ان کے خطوط زمان و مکان سے گزر کر جاوداں ہونا چاہتے ہیں جو ادب عالیہ کی اولین شرط ہے لیکن "صدیق مکرم" عارضی لمحوں سے اوپر نہیں اٹھتے اور ستاروں سے آگے نہیں پہنچتے۔

---

[1] نامی مسلمانوں کے خطوط مرتبہ خواجہ حسن نظامی، ص ۵۰۔ [2] غبارِ خاطر، ص ۶۰۔
[3] ملاحظہ ہو نواب صدر یار جنگ کے خطوط از خواجہ احمد فاروقی، آج کل، دہلی، جنوری ۱۹۵۲ء

ان کے خطوں کی اصلی چمک دمک پرتو خورشید سے ہے۔ ان کی تنک تابی کا احساس اس وقت بڑھ جاتا ہے جب ان کو علیحدہ پڑھا جائے۔ ان کی انشا میں راستی پختگی اور خوش سلیقگی ہے لیکن وہ بات نہیں کہ "حدیثے دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد"۔ مولانا آزاد کے طرز کے پیچھے جو ذہن کارفرما ہے وہ مفکرانہ اور فلسفیانہ ہے۔ اسی لیے اس میں دل اور نظر دونوں جذب ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان کا اسلوب ان کی پوری شخصیت کا جزو ہے۔ نواب صدر یار جنگ ادب سے غیر معمولی شغف رکھتے ہیں لیکن وہ پیالہ میں عکسِ رُخ نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے پہلو میں وہ "دل زندہ" نہیں ہے جس سے زندگی عبارت ہے۔ اسی لیے ان کے تخیئل میں رنگینی تو ہے لیکن جذبات میں گرمی نہیں۔ ان دونوں کا طرز و اسلوب بنیادی طور پر ایک سا ہے یعنی اپنی نثر کی شاعری کو شعرا کی نظم کی شاعری سے مخلوط و مربوط کرکے ترتیب دیا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کے مجتہدانہ انداز میں جدّت فکر کی ایسی نقش آرائی اور وسعت تخیئل کی ایسی کارفرمائی ہے کہ اس نے غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنا دیا ہے۔" ان کی فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔ نواب صدر یار جنگ کے یہاں حسن اور دلآویزی تو ہے لیکن بے خودی و ہشیاری نہیں۔ وہ نواہائے راز کے محرم نہیں ہیں اسی لیے "من و تو" کی دنیا سے نکل کر بے کراں فضا میں نہیں پہنچ سکتے۔

باب ہشتم

سجّاد ظہیر اور ڈاکٹر تاثیر

اردو میں جیل کے ادب کی کمی نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ لٹریچر ہے جو جیل کی چہار دیواری میں لکھا گیا ہے۔ مکتوبات میں مولانا ابو الکلام آزاد کی غبارِ خاطر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جو قید و بند کی حالت میں ترتیب دی گئی ہے۔ مولانا محمد علی کے بعض دلچسپ خطوط زمانۂ اسیری کی یادگار ہیں۔ انیسویں صدی میں بہادر شاہ ظفر اور نواب واجد علی شاہ کے تمام تر خطوط نظر بندی اور جلاوطنی میں لکھے گئے ہیں۔ جون ۱۹۵۱ء میں مشہور اشتراکی لیڈر سجاد ظہیر کے خطوط کا مجموعہ نقوشِ زنداں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ان کے وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے سنٹرل جیل لکھنؤ سے ۱۶ مارچ ۱۹۴۰ء اور ۱۸ مارچ ۱۹۴۲ء کے درمیان اپنی بیوی رضیہ دلشاد بیگم کے نام لکھے ہیں۔

انیسویں صدی کا مکتوباتی ادب اُس زمانے کی پیداوار ہے جب ہندوستان پر انگریزی حکومت مضبوطی کے ساتھ قائم ہو چکی تھی اور معاشی استحصال نے اقتصادی اور سیاسی غلامی کو مستحکم کر دیا تھا۔ اس سیاسی تبدیلی نے سماج کے ذہن پر بھی اثر ڈالا۔ ۱۸۵۷ء کا غدر کوئی عوامی انقلاب نہیں تھا لیکن اس نے آزادی کی لہر پیدا کر دی اور پرانے سماجی طبقوں کو نئے سرے سے ترتیب دے دیا۔ پرانی جاگیریں نئے وفاداروں کو تقسیم کر دی گئیں۔

امراء کی جگہ سرمایہ داروں اور کارخانہ والوں نے لے لی۔ علماء کی جگہ نئے عہدیدار یا انگریزی پڑھے کلرک وجود میں آگئے۔ یہی درمیانی طبقہ علم و ادب کی ترقی میں پیش پیش تھا۔ سرسید صدر امین تھے۔ نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر اور اکبر جج۔ خاندان کی یکجہتی اور یگانگت ختم ہوگئی۔ اس کے بجائے ایک قسم کی بے تعلقی آگئی۔ خاندانی آقاؤں اور بزرگوں کی سیادت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور آزادہ روی برابری اور خود مختاری کا احساس بڑھنے لگا۔ سائنس اور عقلیات کی روشنی پھیلنے لگی۔ آداب و رسوم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا اور اخلاق کی عمارت شخصی ضمیر پر قائم کی جانے لگی۔ رندی و زہد میں وہ تضاد پیدا ہوگیا جو عہد وسطیٰ میں نہیں تھا۔ جنسی تعلقات کو قوانین فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور عاشقانہ معاملہ بندیوں میں جو شدید منافقت تھی اس پر ضرب کاری لگائی گئی۔ انفرادیت اور اجتماعیت میں جنگ شروع ہوگئی۔ پرانے اصنام ٹوٹنے لگے۔ عقل اور مشاہدہ پر زور دیا جانے لگا۔ مغربی استعمار سے آزادی حاصل کرنے اور پیداوار اور تقسیم کے اصول بدلنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی عالمی لڑائیاں ۱۹۲۱ء کی تحریک عدم تعاون ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کی اقتصادی بے چینیاں۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۴۲ء کی سیاسی تحریکیں بین الاقوامی طرز فکر، اشتراکیت کی رو، جمہوریت کا شعور، آزادی کی تڑپ یہ واقعات ایسے معمولی نہ تھے کہ ہمارے ادب کو متاثر نہ کرتے۔ ان پیہم معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادیبوں کے دل بھی زلف گرہ گیر سے نکل کر زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کو محسوس کرنے لگے اور ادب انسانیت کی تنقید کا اہم فرض انجام دینے لگا۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز

۱۹۳۶ء سے ترقی پسندانہ تحریک ادب کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اس نے ہمیں نئی ادبی قدریں دیں اور ادب کو خارجی حقیقتوں کا آئینہ دار بنا دیا۔ اس میں ذاتی غم اور مسرتیں وسیع تر حقائق کا جزو معلوم ہونے لگیں اور ادب محض تفریح کی

چیز نہیں رہا بلکہ اس کا مقصد انسانیت کو سنوارنا اور ایک بہتر دنیا کا بنانا قرار پایا۔

دوسری عالمگیر جنگ

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا۔ اس وقت انگریزی حکومت نے ایک قابلِ ذکر کام یہ کیا کہ ہندوستان کے اشتراکی لیڈروں کو جنگی مصلحتوں کی بنا پر قید کر لیا۔ سجاد ظہیر بھی گرفتار کر لیے گئے لیکن ۱۹۴۱ء میں فسطائی طاقتوں نے روس پر بھی حملہ کر دیا اور امریکہ اور برطانیہ نے فسطائیت کی عالمگیر تنظیم کا مقابلہ کرنے کے لیے اشتراکی روس کا ساتھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی اشتراکی پارٹی قانونی قرار دے دی گئی اور اس نے اس جنگ کو قومی جنگ قرار دے دیا چنانچہ سجاد ظہیر بھی ۱۴ر مارچ ۱۹۴۲ء کو رہا کر دیئے گئے۔

رنجِ گراں نشیں کی شکایت

یہ ادبی اور سیاسی پس منظر ہے جس میں سجاد ظہیر نے خطوط لکھے ہیں۔ ان میں محبت کا نغمہ ہے۔ اس میں دھیمی دھیمی آنچ ہے جس میں زندگی نکھرتی ہے لیکن اسی کے ساتھ رنجِ گراں نشیں کی شکایت اور صبر گریز پا کی حکایت بھی ہے مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی[1] کی قید اس سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ اس کے تصور سے روح کانپتی ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے لیکن انھوں نے اپنی دکھتی ہوئی پیٹھ مذہب کی دیوار سے لگائی اور اس آگ کے دریا سے گزر گئے۔ سجاد ظہیر کی ذہنی فضا ان دونوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا تانا بانا فکر و عقل سے بنا گیا ہے۔ ان کے یہاں مذہب کی جذباتی تسکین نہیں ہے۔ محبت کا جذبہ ہے جو انھیں مشکلات میں سہارا دیتا ہے اور ان کے راستے کو آسان بنا دیتا ہے۔ یہ محبت اس عالمی پس منظر میں جب دنیا کی تقدیر بدل رہی تھی بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔

جیل کیسی ہی ہو گراں بار ہوتی ہے۔ سجاد ظہیر نے اس کی سختیوں کا جا بجا

---

[1] مشاہدات زنداں (۲۳ر جون ۱۹۰۸ء سے ۱۹ر جون ۱۹۰۹ء تک) از حسرت موہانی۔ نگار، ج ۶۱، ش ۶۔

ذکر کیا ہے سنٹرل جیل لکھنؤ میں آئے ہوئے پانچواں دن ہے۔ اس موقع پر "جان سے زیادہ عزیز رضیہ" کو لکھتے ہیں :

"اس وقت بڑی خوش گوار ہوا چل رہی ہے اور میں گردن کھڑکی کی طرف موڑتا ہوں تو آسمان پر وہ ستارہ چمکتا نظر آتا ہے جو میں نے ایک دفعہ تمھیں الہ آباد میں جمنا کے کنارے پر دکھایا تھا۔ یاد ہے۔ غالباً زہرہ ——— خوب چمکتا ہوا (یا خوب چمکتی ہوئی) ابھی تھوڑی دیر میں چاندنی بھی یہاں سے دکھائی دینے لگے گی۔ مگر چاند دکھائی نہ دے گا۔ اچھا ہی ہے۔ اس سے اور کوفت ہوتی ہے اور اکیلے پن کا احساس اور تیز ہوتا ہے۔ تمھاری یاد' تمھاری صورت' تمھاری ہنسی کی آواز' تمھاری سب باتیں' ایک ایک چیز' ہمارے کمرے' وہ صبحیں' وہ شام اور راتیں' یہ سب اتنی صاف دل و دماغ پر اپنی پرچھائیں ڈال رہی ہیں کہ میں دنیا کا نہیں بلکہ عالم خیال کا باشندہ بن گیا ہوں۔ ان سب کے ساتھ ایک ایسا شدید روحانی درد ہے جیسے کوئی دل کے نازک ترین احساسات کو بے دردی سے مسل دے۔ اس درد کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آئے اور درد بڑھتا ہی چلا جائے۔"[1]

یہ درد روحانی تضاد کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیل کی دنیا چھوٹی اور دل و دماغ کی دنیا بڑی۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"وہی کوٹھری۔ وہی زندگی دوسرے تیسرے کوئی ملنے آجاتا ہے اور ان لوگوں کا آنا اتنا اچھا معلوم ہوتا ہے جس کا اندازہ صرف ایک قیدی ہی کو ہو سکتا ہے۔ جیسے بڑی گرمی میں ٹھنڈی اور صاف ہوا کا ایک جھونکا آجائے اور ان کے چلے جانے کے بعد پھر وہی ساتھ کے قیدی اور ان کی لامتناہی گفتگو۔"[2]

---

[1] نقوش زنداں۔ مکتبۂ شاہراہ' دہلی' ص ۱۰۔
[2] ایضاً ' ص ۲۰۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

" پارسال سترہ ایجی ٹیشن قیدیوں کو باہر سونے کی اجازت تھی۔ میرا ارادہ اب دوسری درخواست دینے کا ہے۔ لیکن ان ذرا ذرا سی باتوں کے لئے کہتے ہوئے برا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری بارک میں کبوتر چڑیا مینا تو مستقل طور سے رہتے ہیں چنانچہ آج میری کوٹھری کی کھپریل میں اس قدر شور و شغب مچایا گیا اور اوپر سے گھاس پھوس کی وہ بارش ہوئی کہ کرسی میز پر بیٹھ کر پڑھنا دشوار ہوگیا ..... رات کو ایک بلی بھی نعمت خانہ کا جائزہ لینے آتی ہے لیکن بلی سے ہم لوگ خفا ہیں اسے بھگا دیتے ہیں۔ چڑیوں سے البتہ دوستی ہے اور وہ تکلیف بھی پہنچاتی ہیں تو سہہ لیتے ہیں "[1]

۱۶ر جون ۱۹۴۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" اب مجھے یہاں تین مہینے سے زیادہ ہوگئے۔ اب طبیعت بالکل دب گئی ہے کبھی کبھی تو وقت بالکل پہاڑ سا معلوم ہوتا ہے اور کاٹے نہیں کٹتا۔ اگر کتابیں نہ ہوتیں تو دماغ کی نہ معلوم کیا حالت ہوتی "[2]

" جیل کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں اور بڑی بڑی تکلیفیں بھی عجیب ہیں۔ ذرا سی بات پر بہت غصہ آجاتا ہے۔ ذرا سی اُلجھن معلوم ہوتا ہے دم گھونٹ دے گی۔ بات یہ ہے کہ زندگی اس قدر محدود ہوجانے سے دل و دماغ بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لو۔ آفاق صاحب کی عادت ہے کہ دن بھر ریں ریں ریں مناجات اور جگر کے بعض اشعار بار بار دُھرایا کریں۔ نقوی صاحب کی عادت ہے کہ رات دن پلنگ پر پڑے پڑے دس پندرہ کتابیں بیک وقت پڑھتے ہیں۔ برابر میں جو اینگلو انڈین لڑکا رہتا ہے وہ تو بیچارہ ایک لمبا سا بید لئے

---

[1] نقوش زنداں، مکتبۂ شاہراہ، دہلی۔ ص ۲۱۔ [2] ایضاً، ص ۳۳۔

تڑاتڑ مکھی اور مچھر مارا کرتا ہے۔ میں کس حماقت میں مبتلا ہوں معلوم نہیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی اس قسم کی مہمل عادت ضرور ہوگی جس کا اندازہ میرے ساتھ کے دوسرے قیدیوں کو ہوگا۔"[1]

بیوی کی محبت

اس روح فرسا ماحول میں جو چیز ان کو سہارا دیتی ہے وہ بیوی کی محبت ہے۔

"پیاری۔ کل شام کو جو آدمی کھانا لایا اس نے بتایا کہ تم چلی گئیں۔ حالانکہ مجھے یہ بات معلوم تھی لیکن اس کی تصدیق کے بعد دل جیسے سنسان سا ہوگیا۔ میری جان تم کیوں گئیں۔ تم تمھیں تو میرے لئے لکھنؤ میں روشنی تھی۔ اس قید خانے میں اُمید کی مہک آجاتی تھی اور اب یہ لق ودق فاصلہ تمھارے اور ہمارے بیچ میں۔ لیکن دل جیسے اور قریب ہوگئے ہیں۔ کون سا لمحہ ہے جب تمھارا خیال نہیں آتا۔ رات بھر پڑا پڑا سوچتا رہا کہ اب تم اناؤ پہنچی ہوگی۔ اب کانپور۔ اب وہاں سے چلی ہوگی۔ اب اور آگے اب اور آگے اور آخرکار صبح دہلی، اور اس وقت نو بج چکے ہیں تم اپنے گھر ہوگی۔"[2]

اسی خط میں کس محبت سے لکھتے ہیں:

"ممی کو میری طرف سے آداب عرض کرنا اور کہنا کہ برائے مہربانی تم کو (رضیہ کو) اچار چٹنی چاٹ مرچوں والے کباب اور دیگر مرچوں اور کھٹائی والے کھانے (جنھیں آپ چُرا چُرا کر کھایا کرتی ہیں) نہ کھانے دیں قطعی پرہیز کروائیں۔ اس اور ان معاملوں میں تمھاری بات ہرگز نہ مانیں۔ دیکھو ضرور کہہ دینا ورنہ میں خفا ہوجاؤں گا۔"[3]

یہ تاکید اس وجہ سے ہے کہ ولادت کی منزل قریب ہے۔

"میری جان میرے اتنی دور ہونے سے ایسے وقت میں جب کہ تمھارے

---

[1] نقوش زنداں، ص ۶۸۔ [2] ایضاً، ص ۳۲۔ [3] ایضاً، ص ۴۴۔

پاس ہونا میرا فرض تھا۔ تم گھبرانا مت۔ اس لئے کہ میرا خیال، یادیں اور صدہا محبتیں تمھارے پاس ہیں۔ تمھارے چاروں طرف لپٹی ہوئی ہیں تمھیں ہر طرف سے گھیرے ہیں۔[1]

یہ محبت محدود نہیں ہے اور نہ اجتماعی مسائل سے بے خبر ہے۔ بچّی کے نام کے متعلق لکھتے ہیں:

"ابھی جو نام مجھے سب سے زیادہ پسند آ رہا ہے وہ نجم السحر یا اگر فارسی کی ترکیب کر دو تو نجم سحر ہے۔ صبح کے ستارے سے بڑھ کر دلکش اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ بچی ایسے وقت میں پیدا ہوئی جب دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور تیسرے یہ کہ ہماری محبت کا مشترکہ زندگی کا ستارہ ہے۔ بتاؤ تم کو اور ڈیڈی ممی کو یہ نام پسند ہے یا نہیں۔"[2]

ذہنی اتحاد کی کمی

سجّاد ظہیر ان اجتماعی مسائل کی عقدہ کشائی کو ایک مبارک کام سمجھتے ہیں کس مضبوط ارادہ اور عزم کے ساتھ لکھتے ہیں:

"ابھی ہم تم اور ہماری مشترکہ پیداوار تو بہت بہت لمبی عمروں تک رہیں گی۔ اس لئے کہ ہمیں تو ابھی ایک دوسرے کو بہت سا پیار کرنا باقی ہے جس کے لئے یہ چند مہینے ۱۲ دسمبر سے لے کر آج تک بہت تھوڑے ہیں۔ یہ سمجھو کہ محبت کی زندگی کا مشکل سے ایک لمحہ پھر ایسے مبارک کام کو میں یا تم ادھورا چھوڑ سکتے ہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو فرض ناشناسی، کام چوری، وعدہ خلافی، بعید از شرافت الغرض سب کچھ ہے تم ایسی باتیں بھول کر بھی اپنے وہم و گمان میں نہ لانا۔"[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھانا چاہتے ہیں لیکن سمجھ نہیں پائے ہیں۔ سجّاد ظہیر کی محبت ماورائی نہیں حقیقی اور جنسی ہے جسم کی محبوس

1۔ نقوش زنداں، ص ۷۳۔ 2۔ ایضاً، 3۔ ایضاً، ص ۲۷، ۲۸۔

مجبوریوں نے اس میں شدت پیدا کر دی ہے لیکن پاکیزگی کو ختم نہیں کیا۔ مسز وجے لکشمی پنڈت نے پنڈت جواہر لال نہرو کے کہنے پر ایک کتاب راج ترنگنی کا انگریزی میں ترجمہ بھیجا ہے۔ یہ کشمیر کی منظوم تاریخ ہے۔ اس کو پڑھ کر لکھتے ہیں :

"جب اس خطۂ جنت نظیر کے سر بفلک برفتانوں، صنوبر کے درختوں، سرسبز مرغزاروں، مست ہواؤں کے حالات پڑھتا ہوں تو بار بار میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے کہ ہم تم بھی کبھی وہاں چلیں۔ انسانوں کی بستیوں سے دور اور خوب گھومیں سیر کریں یہاں تک کہ تھک کر چور ہو جائیں اور پھر رات کو عشق و محبت کے افسانے ایک دوسرے کو سناتے سناتے سو جائیں[۱]۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اس محبت کو کیسے ادا کروں جو میرے دل میں تمھارے لئے ہے۔ اس ٹھنڈے کاغذ پر اس روشنائی سے —— تم آؤ میرے سینے سے لگ کر دیکھو کہ وہاں تمھارے لئے کیسی کچھ آگ ہے۔ کتنی تمنا اور آرزو ہے جو اظہار کے لئے مضطرب ہے[۲]۔"

یہ خط ملاحظہ ہو۔ محبت، رنج والم کے گہوارہ میں پڑی مسکرا رہی ہے۔

"میری جان۔ اس ہفتہ مجھے تمھارے تین خط ملے۔ ایک میں پریشانی اور غصہ دوسرا بہت میٹھا اور پیارا۔ تیسرا رنج سے بھرا۔ اب جواب لکھنے بیٹھا تو بس تم مجسم میری نظروں کے سامنے پھرنے لگی ہو۔ جیسی تم اصل میں ہو بالکل ویسی ہی یعنی کبھی بڑے غصے میں۔ مجھ سے خفا اور میری طرف سے دل میں طرح طرح کے شکوک اور توہمات لئے اور کبھی بس کیا کہوں کیسی نرم اچھی میٹھی کومل رسیلی اور آج تمھاری یہی دل لبھانے والی باتیں میرے دل اور میری نظروں میں براج رہی ہیں لیکن اگر تم صرف

---

[۱] نقش ۰۰ ار، ص ۱۷۰۔ [۲] ایضاً، ص ۱۶۵۔

ایسی ہی ہوتیں تو مجھے کتنی مایوسی ہوتی بلکہ تمھاری مورت جو میرے دل میں رکھی ہے وہ تمام صفات رکھتی ہیں جو برہما وشنو اور شیو کی صفات ہیں۔ یعنی تخلیق۔ تحفظ اور تخریب۔ میرا من تم کو طرح طرح کے روپ میں دیکھتا ہے اور ہر طرح سے تمھاری پرستش کرنا چاہتا ہے اور کرتا ہے۔ صرف بیگم جان آپ سے یہ التجا ضرور ہے کہ اس الوہیت کے بلند مرتبے کو استعمال کر کے کہیں میرے ساتھ ایسا نہ کرنا جیسا شیوجی نے کام دیو کے ساتھ کیا تھا۔ جانتی ہو کیا ہوا تھا۔ شیوجی کسی بڑی تپسیا میں برسوں سے محو تھے۔ کام دیو یعنی عشق کے شریر دیوتا نے ان کے تپ کو توڑنا چاہا۔ بہار کی مست ہواؤں اور خوشبوؤں اور حسن کے تمام عشوؤں کے ساتھ ان کے سامنے آ کر کرشمے کرنے لگے۔ آخر شیوجی نے غصے میں آ کر تیسری آنکھ کھول دی۔ اور یہ بیچارے کام دیو جل کر خاک ہو گئے۔ لیکن کہیں یہ نہ سمجھنا کہ اس کے بعد کام دیو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ان کا جسم بیشک جل گیا مگر اب انھوں نے بے جسم ہو کر انسانوں کے دلوں میں جگہ کر لی تو جان من ذرا ہشیار اب آپ اپنی تحفظ اور تخلیق والی صفات زیادہ استعمال کیا کیجئے ورنہ اس طرح میری محبت بھی آپ کے دل کو چین نہ لینے دے گی۔

تم کہتی ہو گی کہ ان کو کیا ہو گیا جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، لیکن سچ مچ آج تو جیسے کچھ ہو ہی گیا ہے۔ یہ سال کا بہترین مہینہ، گلابی جاڑے، ٹھنڈی راتیں، خوشگوار دن، نیلا صاف آسمان، اور پھر یہ تنہائی، یہ جدائی، حسرتوں کا خون، تم اتنی دور کہ خیال بھی وہاں تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا ئے اور دل ہے کہ بس ہر وقت تم کو۔ تم کو اور بار بار تم کو چاہتا ہے۔ پکارتا ہے۔ ڈھونڈھتا ہے لیکن تمھاری آواز تک نہیں سن پاتا ہے۔ اس ہولناک سناٹے میں اسی کی آواز باز گشت

سُنائی دیتی ہے اور مایوسی کی تاریکی اور زیادہ گہری ہوتی جاتی ہے[۱]۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"یہاں چار دن خوب سردی رہی۔ پانی، اولے، ہوا، طوفان آج صبح سے مطلع صاف ہے۔ ابر کے کچھ ٹکڑے آسمان میں ادھر ادھر اُڑ رہے ہیں۔ کتنے آزاد، بے لگام آسمان پر ہلکوریاں لیتے ہوئے دھوپ سے آنکھ مچولی کھیلتے۔ کبھی تم اور ہم بھی اسی طرح آزاد ہوں گے اور خوش۔ اور ایک جان دو قالب یا قالب بھی ایک[۲]۔"

پچھلی صحبتوں کو یاد کر کے لکھتے ہیں :

"کل رات میں دیر تک پڑھتا رہا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے سے تیز بارش ہوئی۔ موسلا دھار۔ چاروں طرف بالکل خاموشی تھی۔ صرف پانی کی آواز تھی۔ وہ عجیب اور دلفریب آواز جو پانی کے برسنے سے نکلتی ہے تم نے کبھی غور سے سُنی ہے۔ رات کو جب سوتے ہیں بالکل اندھیرا ہو اور زور سے پانی برستا ہو۔ کون سا طلسم اس آواز میں ہوتا ہے۔ مجھے الہ آباد کی وہ شام یاد آگئی جب تم بڑی محویت کے عالم میں کھڑکی سے پانی برسنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں اور میں نے پیچھے سے آکر تمھیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ لیکن اس یاد کے آنے سے دل جیسے خون ہو گیا۔ کیوں کہ اُس شامِ محبت اور اِس شامِ غریباں میں کتنا فرق تھا .... یہ خواب و خیال کی دنیا کتنی جلد ٹوٹ جاتی ہے۔ سنتری کے پاؤں کی کھٹ کھٹ اور اس کی کنجیوں کی جھنجھناہٹ۔ یہ آواز بھی ہر آدھے گھنٹے پر یہاں زندگی کی حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ ہم انگریزی سرکار کی رعایا ہیں اور ایک نامعلوم مدت کے لئے نظربند اور مقید ہیں[۳]۔"

---

[۱] نقوش زنداں، ص ۱۹۸-۱۹۹۔ [۲] ایضاً، ص ۲۴۰۔ [۳] ایضاً، ص ۱۹۷۔

غمِ روزگار، محبت کے اس ہمہ گیر احساس میں گھل مل گیا ہے۔ یہ محبت جذباتیت کے گھروندے سے نکل کر خارجی حقیقتوں پر بھی چشمک زنی کر سکتی ہے۔ یہ خط ملاحظہ ہو۔

"میری ساری سیاسی تربیت اور میرے دماغ کی سرشت میں یہ چیز ہے کہ آج دنیا میں فاشزم کو شکست دینا اور جمہوریت اور حریت کی قوتوں کو کامیاب بنانا ہر سمجھ دار انسان کا فرض اولین ہونا چاہئے لیکن پھر بھی میں قید ہوں اور مجبور..... میری پیاری آج ۱۲ر دسمبر ہے اور اس وقت دن کا ڈیڑھ بجا ہے۔ تمھیں یاد ہے تین سال پہلے اس وقت تم کہاں تھیں، سرخ سرخ کپڑے سر سے پاؤں تک پہنے دانتوں میں مسی لگی (جو مجھے بری لگتی تھی) شرمائی سکڑی ریل کے ڈبہ میں ایک کھڑکی سے لگی دبکی بیٹھی تھیں۔ میں کبھی کبھی کن انکھیوں سے تم کو دیکھتا تھا۔ کچھ خوش کچھ حیران سوچتا تھا کہ ان گلرنگ اور گلفام دنوں کے بعد اب پھر کیسے دن آئیں گے۔ میرا دل ہزارہا امیدوں سے بھرا تھا۔ بے شمار منصوبے اور ارمان مسرت کے ہمہ گیر احساس میں گھل مل گئے تھے۔ پھر وہ شام اور پھر وہ رات اور اب۔ یہ تنہائی یہ جدائی کیسی سخت ہے کیسی تکلیف دہ۔ روح تک کا جیسے دم گھٹ گیا ہو۔ جسم کی مایوس پکار صرف اپنی بازگشت سنتی ہے مگر میرا دل میری جان اس میں اب بھی تمھاری محبت کے چراغ ہر گوشے میں جل رہے ہیں اور ارمانوں ولولوں کی دھوم پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ کیوں۔ اس لئے کہ اس وقت تو ایک انجان سی محبت کا ارمان تھا اور اب تو مجھے جس سے محبت ہے وہ مجھ سے اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہیں[1]"

یہ محبت حیات افروز ہے۔ اس سے ہمتیں جوان ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور آگ گلزار بن جاتی ہے۔ سجاد ظہیر کے ان خطوں میں محبت کی لہک اور

---

[1] نقوشِ زنداں، ص ۲۱۸ و ۲۱۹۔

مہک ہے سخت ہیجان اور تیزی ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی :

"ان خطوں میں وہ سب کچھ ہے جو عاشق و معشوق کے خطوں میں ہوا کرتا ہے۔ ان میں وہ حرارت، وہ ہلچل، وہ ہمہمہ اور وہ حیات پائی جاتی ہے جو ازدواج کے مرعوب صحن میں نہیں، معاشقے کے مہکتے سبزہ زاروں میں پائی جاتی ہے۔[۱]"

سجاد ظہیر کی محبت قید و بند کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو گئی ہے اور بعض بعض جگہ من و تو کے دائرہ سے نکل کر عام زندگی کے حقائق سے ٹکرانے لگی ہے۔ واجد علی شاہ کے خطوں میں جنسی اور شہوانی محبت کی جھلک ہے لیکن سجاد ظہیر کے مخلصانہ عشق کا سا والہانہ پن نہیں ہے اور نہ جذبات کی دلدل سے نکل کر غم دوراں کا ایسا معنی خیز احساس جو نقوش زنداں میں ہے اس کی سب سے بڑی وجہ حالات اور مزاج کا فرق ہے۔

سجاد ظہیر میں فطانت کے ساتھ معصومیت ہے اور ان کی بیگم میں محبت کے ساتھ تیکھا پن۔ اس کی جھلک ان کے خطوں میں بھی نظر آتی ہے جو واقعیت نگاری کے اعتبار سے یقیناً ممتاز ہیں۔ یہ دونوں لڑتے ہیں اور صلح کرتے ہیں۔ روٹھتے ہیں اور منتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا ملاپ کتنا دلکش ہوتا ہے۔

ایک قیدی کی دنیا بہت تنگ اور تاریک ہوتی ہے۔ وہ ماضی کی بھولی بسری یادوں سے لطف اٹھانا چاہتا ہے یا مستقبل کے خوش آیند خوابوں کے سہارے جینے کی کوشش کرتا ہے۔ حال کی سوگواریوں کو وہ موسم کی دلفریبی اور پرندوں کی خوش آوازی سے بھلانا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے افسانہ زاغ و بلبل اور داستان بے ستون و کوہ کن اور حکایت بادہ و تریاک لکھ کر ان معمولی واقعات کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ سجاد ظہیر کی ادب طرازیاں ان سے مختلف ہیں۔ ان کی واقعیت پسندی کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ تاہم یہ ذکر رعنائی خیال سے خالی نہیں ہے۔

۱؎ نقوش زنداں، ص ۷، ۸۔

"میں اپنی کوٹھری کے سامنے والے برآمدہ میں بیٹھا چا، پی رہا تھا۔ (جیسا کہ روز کا دستور ہے) کہ ایکبارگی سامنے والے جامن کے پیڑ سے کئی چڑیوں کے چہکنے کی آواز آئی۔ اس موسم میں پہلی مرتبہ بلبلوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ قید خانہ کے اس غم کدہ میں آپہنچا۔ کیسا آسمانی نغمہ تھا ان کا ــ یہاں موسیقی کی اجازت نہیں نہ گانے کی نہ کسی قسم کا کوئی باجہ رکھنے کی اور یہ تو جانتی ہی ہو کہ باہر کا کوئی ملنے والا ہماری شاندار کوٹھریوں میں آکر ہم سے مل نہیں سکتا۔ مگر یہاں تو ایک نہیں کئی مہمان تھے اور کتنے بے تکلف۔ کبھی گیندے کے سنہرے پھول سے لپٹ گئے تو کبھی گلاب کی ڈال پر جھولنے لگے۔ غرض جتنی دیر رہے خوب خوش رہے۔ اچھلتے رہے کودتے رہے، ہنستے اور بولتے رہے اور پھر تھوڑی دیر میں جس طرح آئے تھے جیل کی اونچی اونچی دیوار پھاند کر ویسے ہی نکل گئے۔ اور جاتے جاتے بھی گاتے گئے۔ اس دیدہ دلیری سے انھوں نے جیل کے ہر قاعدے کو توڑا کہ تھوڑی دیر کے لئے معلوم ہوا کہ ہم بھی قید نہیں بلکہ آزاد ہیں۔ جس سے چاہیں ملیں اور بے کھٹکے اور بے رکاوٹ گائیں سنیں[1]۔"

ان خطوں کی ایک خصوصیت وہ سنجیدہ شگفتگی ہے جو ایک شریف گھرانے کی روزمرہ کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ خلوت کے یہ رازونیاز سنجیدہ ظرافت اور شگفتہ متانت سے خالی نہیں ہیں بعض اوقات ہم اس ماحول میں پہنچ جاتے ہیں اور ان چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔

"اور ڈکلی بی بی کیسی ہیں؟ وہ تو اب ماشاءاللہ خوب بڑی اور مقطع ہوگئی ہوں گی۔ میں تو جب ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہی خیال آتا ہے کہ چھوٹی موٹی پھدکتی ہوئی میرے ساتھ اناسا گرداک کرنے جا رہی ہیں۔ ان کو میری طرف سے بہت سی دعائیں[2]۔"

---

[1] نقوش زنداں، ص ۱۱۰۔ [2] ایضاً، ص ۱۷۴۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"بھئی تم نجمہ کی تصویر آخر کب بھیجو گی۔ تمھارے آنے والے کا تو مجھے یقین نہیں ہے۔ یہ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔

تم کیسی ہو آخر اپنے بارے میں کیوں نہیں لکھتیں۔ یا مرچیں کھانے میں اتنی مگن ہو کہ اپنی صحت کا کچھ خیال نہیں کرتیں[۱]"

ان خطوں میں سجاد ظہیر نے اپنے علمی مشاغل کا ذکر کیا ہے۔ وہ فلسفہ مادیت ارتقا ارتقا بالضدین[۲] پر لکھنا چاہتے ہیں۔ سمترا نندن پنت کا مطالعہ[۳] کر رہے ہیں۔ حضرت حسین کی سوانح[۴] جدید نقطۂ نظر سے لکھنے کا ارادہ ہے۔ اردو شاعری[۵] ہندی ادب[۶] اور تاریخ[۷] پر لکھنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے نیاز فتح پوری[۸] پروفیسر کلیم الدین[۹] احمد جوش ملیح آبادی[۱۰] اقبال[۱۱] فیض احمد فیض[۱۲] اور اردو رسم الخط[۱۳] کے متعلق دلچسپ اشارے کیے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان بحثوں کو پھیلایا نہیں ہے۔

<u>ان خطوں کی قدر و قیمت</u>

خطوں کا آرٹ جامد نہیں ہے۔ وہ تغیر پذیری کا ایک حسین سلسلہ ہے۔ انسان کی یہ کوشش کہ وہ فطرت کو آئینہ دکھائے تسلسل سے خالی نہیں ہے۔ عہد بہ عہد کے لٹریچر میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ منجملہ اور وجوہات کے اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ ہم آئینہ کس رخ سے پکڑتے ہیں اور اس کے عکس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ان خطوں میں جس محبت کا ذکر کیا ہے وہ ابدی قدر ہے لیکن اس کا پرخلوص لب لہجہ اور اس کا شیریں گداز ان خطوں سے بالکل مختلف ہے جو اس سے پہلے "ہمدم و ہمراز" بیویوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ اجتماعی شعور کے پس منظر میں انھوں نے جنسی اور نفسیاتی واقعیت کو جس خوبی سے برتا ہے اس نے ہمیں انسانی زندگی کی اندرونی قدروں سے باخبر کر دیا ہے۔

---

۱ نقوش زنداں، ص ۲۴۴ ۔ ۲ ایضاً، ص ۲۵ ۔ ۳ ایضاً، ص ۱۲۷ ۔ ۴ ایضاً، ص ۲۳۲ ۔ ۵ ایضاً، ص ۲۵ ۔ ۶ ایضاً، ص ۱۳۲ ۔ ۷ ایضاً، ص ۲۹ ۔ ۸ ایضاً، ص ۹۱ ۔ ۹ ایضاً، ص ۱۳۹ ۔ ۱۰ ایضاً، ص ۲۰۴ ۔ ۱۱ ایضاً، ص ۱۵۵ ۔ ۱۲ ایضاً، ص ۲۴۴ ۔ ۱۳ ایضاً، ص ۱۶۳ ۔

پریم چند

ترقی پسند ادب میں اُردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کا نام کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ ان کے خطوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن ان کے متفرق خطوط جو ہماری نظر سے گزرے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانے ان کے خطوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان کا طرز سادہ اور پُرجوش ہے لیکن انھوں نے معمولی لمحات کو جاوداں نہیں بنایا۔

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی عصر حاضر کی "انقلابی شاعری" کے علمبردار ہیں اور انھوں نے نوجوان شاعروں پر بہت اثر ڈالا ہے۔ ان کے چند خطوط[1] شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کا ایک اچھا ذخیرہ حضرت عرش ملسیانی کے پاس ہے جو ابھی حلیہ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ جوش ملیح آبادی کے خطوں میں انوکھا پن، تیزی، چہل اور مذاق ہے لیکن وہ "سخن گرشتہ گفتن گلہ دراز کردن" والی رازداری کم ہے۔ بعض اوقات ان کا اعصابی ہیجان ان کے لب و لہجہ میں ترشی پیدا کر دیتا ہے[2]۔

پطرس

پروفیسر بخاری (پطرس) کے صرف چند خطوط شائع ہوئے ہیں[3] لیکن ان میں ان کی ذہانت نکتہ آفرینی اور شگفتگی اس طرح جھلکتی ہے جیسے صبح کے آئینے خانے میں شبنمستان جلوہ گر ہو۔

ڈاکٹر تاثیر

ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کے خطوط دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ کریسنٹ لاہور کے

---

[1] ملاحظہ ہو "روح مکاتیب" حصہ اول، مرتبہ ساغر نظامی، ص ۳۲ تا ۴۴۔ اور "ہم عصر شعرا کے خطوط" مرتبہ ضیاء الاسلام، ص ۹ تا ۲۹۔ نیز رسالہ "ہمایوں" لاہور۔ جلد ۴۱، شمارہ ۱ و جلد ۴۴ شمارہ ۳۔ [2] ہمایوں لاہور۔ سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء، ص ۷۷ و ۷۸۔ جوش ملیح آبادی کا خط حکیم آزاد انصاری کے نام فانی بدایونی کے متعلق (فانی بدایونی کے خطوں کے لئے ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین کا فانی نمبر مرتبہ مراد آبادی)۔ [3] رسالہ نقوش لاہور، نمبر ۱۵ و ۱۶، ص ۱۳ و ۱۶۔

تاثیر نمبر میں ان کے ۳۶ خط شائع ہوئے ہیں[1] جو زندگی کے ولولوں سے تابندہ ہیں۔ ان میں شعریت اور واقعیت کا حسین امتزاج ہے۔ جذبہ کی گرمی بھی ہے اور ذہن کی روشنی بھی۔ شگفتگی اور تبسم زیر لبی نے اس طرز میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالک کو نومبر ۱۹۴۱ء میں سری نگر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

"موسم اور منظر قیامت در قیامت۔ خزاں کے تابناک رنگ عجب بہار پر ہیں۔ چناروں کے آتشیں پتے جھڑ رہے ہیں اور سبز زمین تانبے کی جھیل بنی ہوئی ہے۔ پرسوں برف باری ہوئی۔ قبل از وقت آج سورج چمک رہا ہے اور چاروں طرف برف سے ڈھنپے ہوئے پہاڑ جگمگا رہے ہیں۔ چیڑ کے سیاہ مست درختوں پر سنہری روپہلی آفتابی جھلکیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ لفظاً ہمارا مکان تختِ سلیمان کی گود میں ہے۔ سامنے ڈل اور افق پر ہری پربت کا قلعہ ہے۔ اے کاش آپ کرسمس میں یا بہار میں آسکتے۔ گرمیوں میں تو محض تبدیل آب و ہوا ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں مکانیت کافی ہے۔ بقدر ذوق نہ سہی۔ ہوا کی مستی کا یہ عالم ہے کہ میرے چہرے پر بھی سُرخی دوڑ رہی ہے۔ سلمہ گل لالہ بنی ہوئی ہے۔ اور ام سلمہ باقاعدہ ٹماٹر۔ حفیظ ہوتا تو اس کا چھوٹا سا منہ کم از کم لومڑی کے پستانوں کی طرح چمک اُٹھتا۔ آپ کے متعلق تو کیا لکھوں[2]۔"

تاثیر کا مزاج ادبی لطف سے خالی نہیں ہے۔ کپتان عبدالبشیر آذری کو لکھتے ہیں:

"بھائی ہم تم سمجھتے تھے کہ "دیکھنا" کوئی گناہ نہیں۔ تم نے "سننا" تک حرام کر دیا۔ یہ چشم بند و گوش بند و لب بند کا عمل مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ آخر خوش آواز کہنا کہاں کا جرم ہے۔ مجھے تو تمھاری خوش فعلیاں بھی پسند ہیں[3]۔"

---

[1] کریسنٹ لاہور، نمبر ۵، جلد ۳۹، فروری اپریل ۱۹۵۱ء
[2] ایضاً، ص ۵۹۔ [3] ایضاً، ص ۷۸۔

عبدالرحمٰن چغتائی کو لکھتے ہیں :

"ہندوستان میں عام عمر بیس بائیس سال ہوتی ہے۔ہم دو زندگیاں ختم کر چکے ہیں تیسری شاید مکمل ہو یا نہ ہو۔ اور کام بہت ہے۔ رات گئی ہے بہت[۱]"

ان خطوں سے تاثیر کے ان خیالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو انھوں نے آرٹ اور سماج کے متعلق قائم کیے تھے۔ایک اور خط میں عبدالرحمٰن چغتائی ہی کو لکھتے ہیں :

"جب قوموں اور ملکوں کے متعلق تاریخ داں رائے لگاتے ہیں تو فنون جمیلہ کی عظمت سے قوم اور ملک کی عظمت کا اندازہ لگاتے ہیں لیکن ان فنون کی قدر و قیمت جو ہماری سماج میں ہے وہ محض اتفاقی ہے۔اس کا سماج کے عام کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔اس کے لئے کوئی بنیادی مقام نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آرٹسٹ کو اس سماجی غفلت کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اسے اس تمام کاروبار کی بنیادوں کو درست کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہئے اور اس کا عمل اس کا آرٹ ہی ہو سکتا ہے۔اس لئے اس کے آرٹ میں اس کے دماغ میں اس کے دل میں ان سماجی تعلقات کی کوئی جگہ ہونی چاہئے یا نہیں۔ اسے خبر ہونی چاہئے یا نہیں کہ زندگی جس کا وہ ترجمان ہے جس کی حقیقتوں کا وہ آئینہ دار ہے اور امین ہے، اس کی بنیادیں کیا ہیں[۲]۔"

تاثیر کے خطوں میں زندگی ہنستی کھیلتی، کلیلیں بھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے طرز میں دلربائی اور گیرائی دونوں ہیں۔ اس میں کلاسیکل طرز کی برائیاں نہیں ہیں۔ اس کی خوبیاں ہیں۔ جدید اسلوب کی وسعت ہے۔اس کا کچا پن نہیں ہے۔

رشید احمد صدیقی

عصر حاضر کے بعض مکتوب نگار ایسے ہیں جن کے مکاتیب شائع نہیں ہوئے لیکن شائع ہونا چاہئیں۔رشید احمد صدیقی مزاح نگار کی حیثیت سے بہت ممتاز ہیں لیکن ان کے بعض خطوط جو بے تکلف دوستوں کو لکھے گئے ہیں وہ ان کے مضامین سے بھی

۱؎ کریسنٹ تاثیر نمبر، ص ۱۱۲۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۱۴۔

زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان کا طنز یا تی لب و لہجہ تلوار سے زیادہ تیز ہے لیکن منزل مقصد سے بے نیاز نہیں ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو چبھ کے رہ جاتی ہے اور بے اختیار ان کی تیزی و طباعی کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ الفاظ کے اُلٹ پھیر، تخیئل کی گرمی، ظرافت کی سنجیدگی، خیالات کے وزن اور اشعار کے تصرف سے عجیب و غریب اثر پیدا کرتے ہیں جو عارضی نہیں، دیرپا ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں جاپانی ریشم کی چمک دمک نہیں ہے۔ ایسی بہار ہے جو خزاں آشنا نہیں۔ ان کے فتراک میں بقول نظیری آہو نہیں شیر ہیں جو ان کے "بازوئے چالاک" کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

عبدالماجد دریاآبادی

مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے خطوط دلچسپ ہیں۔ ان کا آرٹ رچا ہوا ہے لیکن اس میں قوسِ قزح کے رنگ نہیں ہیں۔

حامد حسن قادری

مولانا حامد حسن قادری کے خطوط زبان کی گھلاوٹ اور بیان کی شیرینی کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ جمع کیے جائیں۔ ان میں دریا کی روانی اور چاند کی ہلکی ہلکی روشنی کا لطف ہے۔ بعض جگہ بے لاگ تبصرے اور چٹکلے ہیں جو ان کے مضامین و مقالات میں اس شان سے اور کثرت سے نہیں ہیں۔

باب نہم

اُردو کے مکتوباتی ادب کا جائزہ

ہم نے گزشتہ صفحات میں اُردو نثر کے تاریخی پس منظر میں مکتوباتی ادب کا جائزہ لیا ہے اور غالب سے پہلے کا زمانہ جو اُردو انشا میں تاریکی کا دور سمجھا جاتا تھا اس کی تاریخی کڑیاں پہلے اور بعد کے زمانے سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح نثر کی تاریخ میں جو خلا نظر آتا تھا وہ بڑی حد تک بھر گیا ہے اور مکتوباتی ادب میں جو عہد بعہد ترقی ہوئی ہے وہ بھی ظاہر ہوگئی ہے۔ ہم نے خطوں کی تاریخی، سوانحی، فنی اور ادبی اہمیت بھی واضح کی ہے اور مکتوب سے کاتب کی نفسیات اور سیرت کا بھی اندازہ لگایا ہے۔ خطوں کا آرٹ جامد اور ساکن نہیں ہے۔ دنیا کی ہر چیز کے ساتھ یہ بھی بدلا ہے۔ ہم نے اس تبدیلی کو بھی خطوں کے مقصد، مزاج اور اسلوب سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔

خط نویسی کی ابتدا۔ احسن مارہروی کے نظریہ کی تردید

اُردو میں خط نویسی کی ابتدا کب ہوئی۔ یہ یقین کے ساتھ کہنا ناممکن ہے لیکن اُردو انشا کی تاریخ اتنی مختصر بھی نہیں ہے جتنی مولانا احسن مارہروی نے قرار دی ہے۔ انھوں نے تاریخ نثر اُردو میں لکھا ہے " اُردو زبان میں خط نویسی کی ابتدا مرزا غالب نے کی ہے"۔[1]

اُردو کے تشکیلی دور میں بارھویں صدی عیسوی کے دو پروانے

اُردو کے بالکل ابتدائی اور تشکیلی دور میں بھی جب شو رسینی اپ بھرنش کا ورثہ

[1] تاریخ نثر اُردو (نمونہ منشورات)، ص ۵۳۰

"زبان دہلوی" کو ایک نئی شکل میں مل رہا تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے پروانے مل جاتے ہیں جن میں کھڑی بولی کی آمیزش اور فارسی کا پیوند ہے۔ ان خطوں کی ادبی اہمیت نہیں لیکن لسانی ضرور ہے۔ اُردو اسی زبان کا دودھ پی کر پلی اور بڑھی ہے اور یہی اپ بھرنش لسانی روایات ہیں جو فقیروں، تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ دکن پہنچی ہیں۔ مجموعہ مکتوبی دکنی، منشآت منشی محمد شاکر اور مکتوبات شکوہ الملک ثانی جو ہماری تلاش کے مطابق دکنی انشا کے قدیم ترین نمونے ہیں ان میں اور ہریانی زبان کے نمونوں میں بڑی مماثلت ہے جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اُردو شمال سے دکن میں آئی۔ دکن سے شمال کو نہیں گئی۔

دکن میں اُردو

سلطان محمد تغلق کے زمانے میں دکن خود مختار ہو گیا تھا۔ سیاسی اور جغرافیائی بعد اور ذرائع حمل و نقل کی قلت کے باعث دکن نے فارسی کے زور اور اثر کو اس شدت سے محسوس نہیں کیا جتنا دہلی نے۔ دوسرے ان سلاطین دکن نے نہ صرف مقامی آبادی سے مخصوص تمدنی اور معاشی تعلقات قائم کیے بلکہ کئی بار اُردو کی حمایت میں باقاعدہ تحریک کی۔ داستان تاریخ اُردو میں لکھا ہے کہ "حسن بہمنی نے سلطنت کی دفتری و کاروباری زبان کے لیے بجائے فارسی کے ہندی کو پسند کیا"[1] ابراہیم عادل شاہ کے بارے میں فرشتہ کی شہادت موجود ہے کہ

" دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد و برہامنہ را صاحب دخل گردانید"[2]

ان تحریکوں نے اُردو کی عوامی مقبولیت کو ضرور مہمیز کیا ہوگا اور کچھ عجب نہیں کہ اُردو میں خطوط بھی لکھے گئے ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ چند فرضی اور تمثیلی خطوط کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی شہادت نہیں ہے۔ اس لیے شمس اللہ قادری صاحب "اُردوئے قدیم" کی طرح کوئی حکم قطعیت کے ساتھ نہیں لگایا جا سکتا[3] لیکن ان سے کم سے کم یہ ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر خطوط موجود ہوتے تو ان کا طرز و اسلوب کیا ہوتا۔

---

[1] داستان تاریخ اُردو، ص ۴۲۔ [2] تاریخ فرشتہ مطبوعہ ۱۲۸۱ھ، ص ۲۷۔
[3] اُردوئے قدیم، ص ۹۳۔

منشآتِ شاکر (قلمی) ۱۷۶۴ء سے قبل

انشا میں سب سے قدیم کتاب جو ہمیں دریافت ہوسکی ہے وہ منشآتِ شاکر (قلمی) ہے جو مسٹر بولس کی فرمائش سے ۱۷۶۴ء سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس سے سلطنتِ مغلیہ کی کمزوری اور امرا، کی خود غرضانہ زندگی کا حال اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے۔ اس وقت فارسی کا اقتدار گھٹ رہا تھا لیکن اُردو اس کے سائے میں جوان ہورہی تھی۔ اس مجموعہ کی دکنی زبان میں فارسیت غالب ہے اور اس کی جو کچھ اہمیت ہے وہ اس کی قدامت میں ہے۔

نوابِ شکوہ الملک ثانی کے اُردو خطوط (قلمی) (۱۸۲۲ء)

منشآتِ شاکر سے قطع نظر اس لیے کہ اس میں درباری تکلفات کا جابجا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دکنی ادب مجموعی حیثیت سے اردو کے ابتدائی رجحانات و فطانت کا مؤید رہا ہے اور اس نے یہ کبھی فراموش نہیں کیا کہ اُردو ہند آریائی زبان ہے اور اس کے خون میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کی خصوصیت گھل مل گئی ہے۔ اس کا سب سے قابلِ قدر نمونہ نوابِ شکوہ الملک ثانی کے اُردو خطوط (قلمی) ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھے۔ یہ خط باپ نے بیٹی کو اس ڈھنگ سے لکھے ہیں کہ گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ طرز و اسلوب تو گویا ہے ہی نہیں۔ صبحِ ازل کی سادگی ہے جو ہزار وضع طرازیوں پر قربان ہے۔ ان خطوں کو دیکھ کر مارگریٹ پیسٹن MARGARET PASTON کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس نے پندرھویں صدی عیسوی میں اپنی روزمرہ کی زندگی کے متعلق خطوط لکھ کر انگریزی ادبیات میں دلچسپ اضافہ کیا ہے۔ نوابِ شکوہ الملک ثانی کے خطوط کی تازگی اور بے ریائی حیرت انگیز ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ وہ درباری ماحول کی پیداوار ہیں۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوں میں جو ادب طرازیاں اور گل کاریاں ہیں وہ یہاں مفقود ہیں۔

راجدھانی کی تبدیلی کا اثر اُردو پر

شاہ جہاں کے زمانے میں زبان نے ترقی کر کے اُردوئے معلّٰی کا لقب اختیار

کر لیا تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں چوں کہ آگرہ دارالسلطنت تھا اس لیے برج بھاشا کو خوب ترقی کا موقع ملا۔ آگرہ راجپوتانہ سے قریب تھا اور یہاں راجپوتوں کا تہذیبی اثر دہلی سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں راجپوت خاندانوں سے ازدواجی تعلقات قائم ہو گئے تھے اس لیے برج بھاشا کا چرچا محلات شاہی میں بھی ہونے لگا۔ شاہ جہاں کی تو پرورش ہی برج کے ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ راجپوت ماں کے بطن سے تھا اور ترکی سے ناآشنائے محض تھا۔ اس نے آگرہ کو چھوڑ کر پھر دہلی کو بسایا۔ اس کا لسانی اثر یہ ہوا کہ امیر خسرو کی "زبان دہلوی" سے رشتہ پھر مضبوط ہو گیا لیکن برج بھاشا کی خصوصیات جو آگرہ سے ساتھ آئی تھیں وہ قائم رہیں بلکہ انھوں نے زبان میں رس اور لوچ پیدا کر دیا۔

شاہ جہاں کا شغفِ ہندی

ان حالات میں شاہ جہاں کو ہندی سے جو لگاؤ تھا وہ حیرت انگیز نہیں۔ دستور العمل آگہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شہزادہ شجاع کو "ہندی" میں خط بھی لکھا تھا۔ یہ ہندی وہ ہے جو قدیم اپ بھرنش کی لسانی روایات اور پنجابی اور ہریانی کے وقتی اثر سے آزاد ہو رہی تھی اور جس کی تزئین و تہذیب میں برج بھاشا نے کافی حصہ لیا تھا۔ اسی کو سید سلیمان ندوی نے اُردو یا ہندوستانی کہا ہے[1]۔

اورنگ زیب کی فتحِ دکن نے اُردو کی رفتارِ ترقی کو تیز کر دیا اور ولی کے دہلی پہنچنے سے قبل وہاں ادبی تخلیق کے لیے گنجائش پیدا کر دی[2]۔ اورنگ زیب کے مرنے کے بعد اُردو اتنی مقبول ہو گئی کہ فارسی اور برج بھاشا دونوں کی رونق اس کے سامنے کم ہو گئی۔

فارسی کا زوال

اس وقت مغلوں کا آفتابِ اقبال گہنا رہا تھا اور انگریزوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جمتے جا رہے تھے۔ اسی وجہ سے فارسی کا بھی وہ اقتدار باقی نہیں رہا تھا جو

[1] نقوشِ سلیمانی، مطبوعہ اعظم گڑھ۔ نیز بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری، ج اول، ص ۲۶۳ و ص ۲۹۳۔
[2] بقول بلوم ہارٹ ولی ۱۷۲۲ء میں دہلی پہنچا۔ نیز ولی گجراتی از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، ص ۶۹۔

پہلے تھا۔ ۱۸۲۹ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان قرار دیا جائے لیکن اس پر پورا عمل نہیں ہوسکا۔ ۱۸۴۲ء میں فارسی اس حیثیت سے بالکل محروم کردی گئی۔ ۱۸۰۰ء میں اُردو پڑھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ ۱۸۳۳ء میں اُردو کو سرکاری زبان مان لیا گیا اور ۱۸۳۵ء میں دیسی پریس کو آزادی مل گئی۔ یہ واقعات ایسے نہ تھے کہ اُردو انشا پر اثر انداز نہ ہوتے۔

تپش، راسخ، قتیل، یاس آروی اور تاثیر عظیم آبادی کے خطوط

اس زمانے میں اُردو میں خط لکھنے کا رواج تھا۔ اس کا اندازہ سودا، تپش اور انشا کے منظوم رقعات اور اُردو اخباروں کے مراسلات سے ہوسکتا ہے لیکن یہ خطوط ہمارے احاطۂ بحث سے باہر ہیں۔ البتہ ہمارے نقطۂ نظر سے مرزا جان تپش (متوفی ۱۸۱۴ء) راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۸۲۲ء) مرزا قتیل (متوفی ۱۸۲۴ء) یاس آروی (متوفی ۱۸۴۵ء) اور تاثیر عظیم آبادی (متوفی ۱۸۵۹ء) کے خطوط سب سے زیادہ اہم ہیں جن کے نمونے پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو انشا فارسی کے شکنجے سے نکلنا چاہتی ہے لیکن نکل نہیں چکی ہے۔ اس لیے اسلوبی نفاست سے بھی محروم ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا اثر بھی کم ہوا لیکن اُردو بہت دنوں تک فارسی کے اثر سے آزاد نہ ہوسکی۔ سرسیّد اُردو میں لکھتے لکھتے فارسی میں لکھنے لگتے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید اور اصغر اکبرآبادی کی مراسلت فارسی میں شرابور ہے۔ ان کی صنع طرازیاں ایسی ہیں جیسے کوئی کاغذ کا گلدستہ بنائے یا چنے کی دال پر قل ہو اللہ لکھے۔

سرور اور غالب سے پہلے مکتوباتی ادب

اُردو انشا کے سلسلے میں جو غیر مطبوعہ مواد ہمیں دستیاب ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرور اور غالب تاریخ ادب کا حادثہ نہیں ہیں اور نہ وہ خلا میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ ارتقا کی زنجیر کی ایک اہم کڑی ہیں جس میں شاکر، شکوہ الملک ثانی، تپش اور راسخ کے خطوط شامل ہیں۔ ان حالات میں تاریخ

نثر اُردو کے مصنف کے اس بیان سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے کہ "انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے اُردو خطوط نویسی کا وجود نہیں ملتا جس کی ابتدا مرزا غالب نے کی تھی[1]"۔ اسی طرح رجب علی بیگ سرور کے رقعوں کو اطفال دبستاں کے لئے فرض تمثیلی[2]" قرار دینا بھی کھلی ہوئی زیادتی ہے۔ ہم نے ان کی ایک عرضداشت کی تاریخ متعین کرکے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ سرور نے بے خبر اور غالب سے بھی پہلے ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان اُردو میں خطوط لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اس طرح سرور کو غالب کے مقابلے میں تاریخی اوّلیت حاصل ہو جاتی ہے۔

<u>رجب علی بیگ سرور</u>

رجب علی بیگ سرور وہ ستارۂ صبح ہیں جن کو غالب کے آفتاب کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ ان کی حیثیت ایک فرد کی نہیں، ادارے کی ہے۔ ان کے رنگین اور نادرہ کار اسلوب کا اثر شاہی مراسلات تک سرایت کر گیا تھا لیکن سرور کے یہاں تکلّفات کے ساتھ سادگی بھی ملتی ہے جو واجد علی شاہ کے یہاں جدّت طرازی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ سادگی عزیزوں اور دوستوں کے خطوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ ان میں غریبی اور پریشانی کا ذکر ہے۔ مٹتے ہوئے سماج کا ماتم ہے۔ دوستوں سے چھیڑ چھاڑ ہے۔ بیٹے سے محبت بھری باتیں ہیں۔ سرور کے خطوط تاریخی معلومات کا گنجینہ بھی ہیں۔ ان سے لکھنؤ کی زوال آمدہ تہذیب، فرقہ وارانہ فسادات، مولوی امیر علی کے حالات، ہنومان گڑھی کے واقعات، انگریزی کوٹھیوں کے لین دین، غلّے کی گرانی، بے روزگاری، تنخواہ کے ملنے میں دیر، سفر کے صعوبات کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

<u>واجد علی شاہ کے خطوں کے نو بیش قیمت مجموعے</u>

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوں کو بھی ایک خاص تہذیبی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ ہم نے ایسے نو بیش قیمت مجموعوں کا پتہ لگایا ہے۔ ان میں "رات اور زلف" کا افسانہ ہے۔ حسرتوں کی سرخی ہے۔ ہندوستانی عورت کے دل کی دھڑکنیں

---

[1] تاریخ نثر اُردو، ص ۶۰۹۔ [2] ایضاً، ص ۶۰۹۔

ہیں۔ سوکنوں کا جلایا ہے۔ ایک معزول بادشاہ کے ارمان ہیں۔ متعلقین اور رعایا کی ویرانی اور بے رونقی کا ذکر ہے۔ قید و بند کی مصیبتوں کا نوحہ ہے۔ غدر کی کہانی ہے۔ ان خطوں میں ندرت ادا کی جو شیشہ گری ہے وہ ایک خاص تمدن کی آفریدہ اور پروردہ ہے اور اردو لٹریچر میں ناپید ہے۔

بہادر شاہ ظفر

ہم نے بہادر شاہ ظفر کے بھی چند خطوط پیش کیے ہیں۔ ان میں دہلی کا سوز و گداز اور حسن معنی ہے۔ واجد علی شاہ کی سی طرح داری اور لذت کشی نہیں ہے۔ یہ دراصل دو تہذیبوں کا فرق ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں موجود تھا۔

اردو انشاپردازی ایک عرصہ تک فارسی کے تناور درخت سے ایک نرم و نازک بیل کی طرح چمٹی رہی ہے۔ اس زمانے کے خطوط اس رجحان کے ترجمان ہیں جس کو شاعرانہ زبان میں "خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو" کہا جا سکتا ہے۔

مؤلف انشائے راحتِ روح کا بیان

اُردو انشا کے اصلی خط و خال فارسی کے زوال کے بعد چمکے ہیں۔ انشائے راحتِ روح مرتبہ منشی کنج بہاری لال آثم میں لکھا ہے :

"جب ۱۲۷۲ھ میں حسب مشیت پروردگار ملک اودھ میں یک قلم سکہ حکومت انگریزی جاری ہوا اور ایک عالم پر عالم بیم و رجا طاری ہوا۔ خدام کیواں مقام، فلک احتشام، حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ بہ امید استرداد ملک، جانب کلکتہ رونق افزا ہوئے ..... وضع لکھنؤ بالکل تبدیل ہوئی۔ اردو کی عزت فارسی کی تذلیل ہوئی۔ ہر شخص ہزار دل سے اس کا شائق ہوا۔ وہ چند فارسی سے رتبہ فائق ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت سلطان عالم بھی اس زبان میں نامہ ہائے شوقیہ بیگمات یا اعزا کو تحریر فرمانے لگے اور یہاں سے بھی جوابات ان کے بعبارت اُردو جانے لگے۔ اس وقت سے زیادہ تر اس یوسف کی گرم بازاری

ہوئی۔ فارسی نامطبوع اور اُردو پیاری ہوئی۔[1]

فارسی ختم تو ہوگئی لیکن اس کے اثرات آج تک اُردو مکاتیب میں کارفرما ہیں۔ نیاز فتح پوری اور ابوالکلام آزاد کی زرنگار انشا میں اس کا اثر دور تک سرایت کرگیا ہے۔ یہ رنگ عام نہیں ہوسکا۔ اس لیے کہ تاریخی قوتیں اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ اُردو خطوں کا اپنا حسن جو غالب، سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ یا مرزا ابراہیم سلطان حزیں[2] دہلوی کے یہاں نظر آتا ہے اور جو اُردو نثر کے فطری رجحانات سے زیادہ قریب ہے بہت دیر میں نکھرا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُردو نثر ایک عرصے تک نظم کے پروں سے اُڑتی رہی ہے۔ اس میں شاعرانہ رنگینیاں اور مقررہ اشعار کی بھرمار ہوتی تھی۔ اس دور میں نثر میں شاعری کے علاوہ منظوم خطوط کی کثرت بھی اسی رجحان کو ظاہر کرتی ہے[3]

---

[1] دیباچہ الشائے راحت روح مطبوعہ مطبع اثنائے عشری لکھنؤ سنہ ۱۲۸۷ھ سنہ ۱۸۷۰ء۔

[2] ملاحظہ ہو رقعات نسواں معروف بہ غنچہ تہذیب از مرزا ابراہیم سلطان حزیں، مطبوعہ دہلی سنہ ۱۸۹۲ء مملوکہ برٹش میوزم۔

[3] نواب واجد علی شاہ۔ مرزا غالب۔ اکبر۔ شبلی۔ مضطر خیرآبادی وغیرہ نے منظوم خطوط لکھے ہیں۔ نواب علاؤالدین خاں علائی والیِ ریاست لوہارو نے مرزا غالب کو ایک منظوم خط بھیجا تھا جس میں انھیں لوہارو آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے — کہ باہم پئیں بادہ اور آم کھائیں
سر آغاز موسم بھی کیا خوب ہے — کہ دلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجیب لطف ہے یاں کی برسات کا — کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سر دلی کے وہ ڈالہ پر سبز آم — وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں .... الخ

غالب نے اس کے جواب میں معذرت پیش کی ہے۔

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم — کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوب جاں — نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت ہے بھیڑ کا ریشہ دار — کہو اس کو ہم کھا کے کیا حظ اُٹھائیں

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات نے بیسیوں منظوم خطوط لکھے ہیں۔ ذیل میں نواب شیدا بیگم (باقی صفحۂ آئندہ پر)

دہلی اُردو اخبار کا ایک خط ۱۸۴۱ء

اس زمانے کے اخبارات میں جو خطوط لکھے جارہے تھے ان کی زبان نسبتاً آسان تھی۔ اس قسم کے خطوط ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ اس لیے کہ ان میں خطوں کے فارم سے سیاسی خیالات کے اظہار کا کام لیا گیا ہے لیکن زبان و بیان کا ارتقا سمجھنے کے لیے یہاں ۲۳ مئی ۱۸۴۱ء کے دہلی اردو اخبار کے ایک خط کا نمونہ دینا بے محل نہ ہوگا جس میں قلعہ مبارک کی بدانتظامی پر تنقید کی گئی ہے۔

" صاحب سپرنٹنڈنٹ دہلی اُردو اخبار سلمہ

افواہ عام ہے کہ قلعہ مبارک میں عجیب طرح ہو رہی ہے۔ شہر میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں الغیاث و فریاد اہلکاران شاہی کا ذکر نہیں۔ تنخواہوں کا یہ حال کہ کسی کے پانچ مہینے کسی کے چار مہینے کسی کے تین مہینے چڑھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ حضور رس ہیں یا مختار سے یا حکیم معالج حضور والا سے سازش رکھتے ہیں البتہ وہ ماہ بماہ تنخواہ لے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مختار نو تجربہ کار اور بظاہر نام شاہزادہ مرزا شاہ رخ بہادر کا، لیکن ایک حکیم صاحب جو کہ اب معالج ہیں حضور والا کے اور دو ایک لڑکے راجہ جیکہ رائے کے اور کوئی ملازادہ جو حافظ کر کے مشہور ہے اور چند حواشی اسی قسم کے مجتمع ہیں جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں۔ امورات سلطنت میں اب یہ لوگ اختیار تام رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ طبیب نبض دیکھنی جانے قارورہ پہچانے۔ بنیا مہاجن کا دوکانداری جانے، ملازادہ لڑکے پڑھانے جانے، امورات مہمات سلطنت سے ان کو کیا نسبت۔ جب

(گزشتہ صفحے سے آگے) کے ایک منظوم خط کے دو شعر مخزن اسرار سلطانی سے نقل کیے جاتے ہیں۔

یہ ساون سب یوں ہی جاتا ہے خالی   جو ایسے میں تم آؤ تو مزا ہے
میں شیدا جان و دل سے ہوں تمہاری   تمہیں میری نہیں پروا ذرا ہے

(مخزن اسرار سلطانی قلمی، ص ۱۴۶ و ۱۴۷)

یہ لوگ مدار مہمات سلطنت ہوں تو کیا حال ہووے۔

الراقم محمد"[1]

<u>مرزا غالب</u>

فورٹ ولیم کالج اور اُردو صحافت کی تخم ریزی غالب کے خطوں میں برومند ہوئی۔ مرزا غالب پر اُردو انشا پردازی کا ایک دور ختم ہوجاتا ہے اور دوسرا شروع ہوتا ہے۔ شکوہ الملک ثانی سے غالب تک عشق کی ایک جست نہیں ہے اور نہ یہ جادۂ صد سالہ بآہستگا ہے طے ہوا ہے بلکہ انشاپردازی منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی غالب تک پہنچی ہے۔ ان کی حیثیت ایک منارہ کی ہے جس نے دور تک راستے کو منور کردیا۔ انھوں نے محمد شاہی روش، ماضی کی مردہ روایات اور قدیم لوازم نامہ نگاری پر ایک ضرب کاری لگائی اور بھرپور انسانیت کی ایسی نئی دنیا خلق کی جو باوجود حقیقت سے ہمکنار ہونے کے دائمی قوس قزح اور دائمی رنگ و بو کی دنیا ہے۔ ان کے یہاں وہ دروغ ہے جس سے فرہاد نے شہادت پائی اور وہ ترانہ بھی جس نے منصور کی مشکل آسان کردی۔ ان کی زمانہ شناس اور زنگارنگ شخصیت اور عصری و ادبی تاریخ ان خطوں میں اس طرح جھلکتی ہے جیسے آئینے میں جوہر۔ ایک مورخ جو اس دور کی تہذیبی تاریخ لکھنا چاہتا ہے کبھی بھی ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ غالب کے ایسے خطوط جن میں ادبی مباحث ہیں، اگر

---

[1] دہلی اُردو اخبار، ج ۴، نمبر ۲۲۲، مورخہ ۲۳ رمئی ۱۸۴۱ء۔ اسی طرح احمد علی شوق کے اخبار "آزاد" لکھنؤ میں ایک مستقل عنوان "صیغۂ مراسلات" ہوتا تھا جس میں تعلیم اور زراعت وغیرہ مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا تھا ملاحظہ ہوں۔ ۴ر جنوری ۱۸۹۵ء اور ۱۱ر جنوری ۱۸۹۵ء کے پرچے۔ عبدالرحمن اور "فلاحت پسند" کے مراسلات۔ نورالآفاق۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق کی مخالفت میں نکلا تھا۔ اس میں "بانیٔ مدرسۃ العلوم مسلمانان" کے مذہبی عقائد پر خطوں کی صورت میں بحث و تکرار کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو نورالآفاق، ج ۱، نمبر ۷، مورخہ ۲۲ر نومبر ۱۸۷۳ء و نمبر ۹، جلد ۱۔ "کشاف حقیقت" کے خطوط۔ اور جلد ۲، نمبر ۵ "طالب حق" کے خطوط۔ نیز ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق۔ جلد ۴، نمبر ۵، ص ۴۲۔

ان کو ایرانی ہندی نزاع کے بڑے نقشے میں دیکھا جائے تو غالب کی قتیل دشمنی کے بہت سے سربستہ راز کھل جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے جو خطوط غالب اور آزردہ سے متعلق پیش کیے ہیں ان سے غالب کی سیرت اور کردار کے بعض اہم اور مباحثہ انگیز پہلو پہلی مرتبہ سامنے آ گئے ہیں۔

غالب نے اُردو میں خطوط کب لکھنا شروع کیے یہ ہماری تاریخ انشا کا ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ حالی، عرشی اور حامد حسن قادری کا خیال ہے کہ مرزا غالب نے ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو میں خط لکھنا شروع کیے لیکن ۹ر مارچ ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا اُردو کا خط ملتا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے بھی اردو میں متفرق خطوط لکھے ہوں گے۔ اس لیے کہ غالب کا اسلوب خوب سے خوب تر کی منزلوں سے گزرا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ابتدا کا نہیں درمیان کا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی غالب کی مادری زبان نہیں تھی ضرور ہے کہ انھوں نے اُردو کے رقعے اس تاریخ سے پہلے بھی لکھے ہوں گے۔

غالب نے اُردو انشا میں ایک نیا اسلوب قائم کیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے لیکن یہ ان کی ایجاد نہیں ہے۔ اس کا سر رشتہ بھی شکوہ الملک اور سرور کے یہاں مل جاتا ہے۔ ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالہ "محب ہند" میں فارسی انشا کے تکلفات پر سخت اعتراضات کیے تھے اور خطوں میں باتیں کرنے پر زور دیا تھا۔ غالب نے اس رجحان کو جو پہلے سے موجود تھا ادبی کمال تک پہنچا دیا۔ خون جگر سے گل کاریاں کیں اور ادب کے دامن میں بلاغت کے موتی ٹانکے۔ مرزا غالب نے اُردو شاعری ہی کو نیا رنگ آہنگ نہیں دیا۔ جدید اُردو نثر کی خشت اول بھی اپنے بابرکت ہاتھوں سے رکھی۔ ان کے خطوں میں ان کی شخصیت اور روح عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہی شگفتگی بلند نظری اور تابناکی جو اُن کی شاعری کی خصوصیت ہے یہاں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح ان کی غزل حدیث دلبراں سے گزر کر حدیث زندگی بن گئی ہے۔ ایسے ہی

ان کے خطوں میں زندگی کا سونا پگھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

غالب کا اثر — مجروح۔ علائی۔ آزردہ۔ محمد عباس۔ قدر اور جنوں کے نادر خطوط

اُردو انشا پردازی غالب کے بار احسان سے گردن نہیں اٹھا سکتی۔ ہم نے میر مہدی مجروح، مرزا علاؤالدین خاں علائی، مفتی صدرالدین آزردہ، مفتی سید محمد عباس، سید غلام حسنین قدر بلگرامی اور قاضی عبدالجلیل جنوں کے نادر اور غیر مطبوعہ خطوط پیش کر کے غالب کے وسعت اثر کو نمایاں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے رنگ میں لکھنے کی سب نے کوشش کی لیکن کامیابی کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقلدین کا دامنِ نگاہ محدود تھا اور غالب کا گل حسن لامحدود۔

امیر مینائی

امیر مینائی کی حیثیت غالب اور سرسید کے درمیان برزخ کی سی ہے۔ وہ اقلیم سخن کے آخری تاجدار مانے گئے ہیں لیکن ان کی منشیانہ خدمات کا ابھی تک مناسب اعتراف نہیں ہوا تھا۔ ان کے طرز میں لکھنؤ کا تکلف نہیں لیکن اس کی خوبصورتی کی جھلک ہے۔ غالب کی شوخی نہیں لیکن ان کی سادگی کا میل ہے۔ یہ خطوط لفظی دقائق، عروضی نکات اور لغوی لسانی مباحث سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں امیر کی نیکو کرداری اور پاک مشربی کی جھلک ہے۔ داغ کی رنگینی اور خوش طبعی نہیں ہے۔

داغ

داغ نے کبھی دل لگا کر خط نہیں لکھے لیکن ان کے منی بائی حجاب کے نام جو خط ہیں انھوں نے حسن کی کرشمہ سازیوں، عشق کی جاں سوزیوں اور رقابت کی معرکہ آرائیوں کے عجیب و غریب مناظر ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ اس وقت عورت ہماری سوسائٹی سے غائب تھی۔ اس کا وجود حرم سرا کے اندر تھا اور بہو بیٹیاں جنسی محبت سے ناآشنائے محض تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں طوائف کے خط و خال پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت کی سوسائٹی کا ایک

ناگزیر اور خوش تمیز عنصر تھی۔ بھاگ متی، روپا، صاحب، درگابائی، امراؤ جان ادا، موران، لال کنور، حجاب، لیلیٰ اور مشتری ادب سے گزر کر تاریخ کا جزو بن گئی ہیں۔

مشتری کے خطوط

ہمارے پاس مشتری کے خطوط موجود ہیں جو اس نے نساخ کے نام لکھنو سے روانہ کیے تھے خطوں پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن ایک خط (نمبر ۲) صریحاً ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء کا ہے[1]

اب زمانہ بدل چکا تھا۔ انگریزی حکومت کا پرچم سارے ملک پر لہرا رہا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کی صرف کہانیاں باقی رہ گئی تھیں۔ سیاسی، معاشی اور تعلیمی تبدیلیوں کی وجہ سے ہندوستانی تمدن کا خرقۂ دیرینہ چاک ہو رہا تھا اور سرمایہ داری جاگیرداری کی جگہ لے رہی تھی۔

غدر اور انگریزی حکومت کا استحکام

۱۸۳۵ء میں فارسی دفتروں سے نکال دی گئی۔ لیکن میکالے کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اُردو کو بھی زیادہ فروغ کا موقع نہیں ملا۔ حالانکہ ایک جماعت ایسی بھی تھی جو تمام مغربی سرمایہ کو اُردو میں منتقل کر لینے کے حق میں تھی[2] ۱۸۵۶ء میں انگریزی زبان کا اقتدار چپہ چپہ میں قائم ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا جس نے پرانی بساط کو بالکل ہی اُلٹ دیا۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۶۹ء تک ۵۰۵۱ میل کے رقبے میں ریلوں کا جال بچھ گیا اور رسل و رسائل میں سہولتیں پیدا ہو گئیں ۱۸۵۸ء میں یونی ورسٹیاں تعمیر ہوئیں جن کی بدولت ملکی ادبیات میں انقلاب برپا ہو گیا۔

سائنسی ایجادات

پندرھویں اور سولہویں صدی نے طبعی دنیا میں تغیرات برپا کیے لیکن

---

[1] گارسن دتاسی کا بیان ہے کہ مشتری کی ایک غزل ۱۷ جولائی ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو دتاسی، جلد دوم، ص ۳۰۱۔

[2] دہلی اُردو اخبار، مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۴۱ء، جلد ۳، نمبر ۲۴۹، مراسلہ در باب علم۔

انیسویں صدی کی سائنسی ایجادات نے زندگی کی قدروں کو بدل دیا۔ نظریۂ ارتقا جس کی ایک گریز پا جھلک گوئٹے کے زمانے سے نظر آرہی تھی ڈارون کی بدولت حقیقت بن گیا۔ اس نظریے نے ہمیں فطرت اور مذہب کے اصولوں[1] کا دوبارہ

---

[1] یہاں مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر و علوم القرآن مرتبہ محمد عثمان مقبول مطبوعہ احمدی پریس، علی گڑھ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس میں سر سید اور محسن الملک کے وہ خطوط ہیں جو اول الذکر کی تفسیر کے متعلق ہیں۔ جس وقت سر سید کی تفسیر جو مغربی اصولوں کی روشنی میں لکھی گئی تھی، شائع ہوئی تو اسلامی حلقوں میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ مخالفت کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ جمہور اہل اسلام نے اس تفسیر کو مذہبی دائرے سے خارج کر دیا اور نواب محسن الملک بھی جو سر سید کے دست راست اور ان کی تحریک کے رکن رکین تھے مخالفت پر آمادہ ہوگئے اور لکھا کہ میں آپ کی تفسیر کے بعض مضامین کا مخالف ہوں اور مخالف بھی ایسا کہ نہ آپ کی وہ عظمت و وقعت جو میرے دل میں ہے روک سکی نہ وہ محبت و ارادت جو مجھے آپ سے ہے اس کی مانع ہوئی۔ نہ آپ کی جادو بھری تحریر نے اثر کیا اور نہ آپ کی پرزور تقریر نے۔ مرتب مکتوبات کا فیصلہ یہ ہے "ہمارا ادنی اور واقعی مقصد اس رسالے کی اشاعت سے یہی ہے کہ جو حضرات مغربی علوم کے زیور سے آراستہ ہیں ان غلط فہمیوں سے بچیں جو سر سید کے بعض مضامین سے عموماً اور تفسیر سے خصوصاً پیدا ہوتی ہیں اور اپنے حسن عقیدت کو حد اعتدال سے متجاوز نہ کریں جو سر سید کی نسبت رکھتے ہیں کیونکہ سر سید نہ علوم دینیہ کے عالم تھے نہ کوئی مذہبی پیشوا جن کی تقلید ہمارے لیے ضروری ہو۔"

اردو میں مذہبی خطوط کے ذیل میں مکتوبات عرفانی (از محمد بخش و مرزا احمد علی بیگ چشتی۔ سادات پریس شاہ جہاں پور۔ موضوع: تصوف) انشائے جدید سیفی (از محمد عظمت اللہ خاں سیف رامپوری۔ مطبع سعیدی رامپور۔ موضوع: مناظرہ) مکاتیب محمدیہ (از مولانا سید محمد علی مطبع مجیدی کانپور۔ موضوع: قرآن پاک کی ترتیب وحدت وجود اور وحدت شہود) مکاتیب رشیدیہ (از مولوی رشید احمد محدث گنگوہی۔ مطبع خزینۃ المطابع۔ میرٹھ۔ موضوع: تصوف) مکتوبات امجد حیدر آبادی (مطبوعہ شمس المطابع حیدر آباد دکن۔ موضوع: تصوف) مکاتیب سلمان (قاضی محمد سلمان سلمان منصور پوری کے مذہبی اور تبلیغی خطوط مرتبہ عبدالمجید خادم لاہور) مکاتیب شیخ الاسلام (مولانا حسین احمد مدنی کے خطوط مطبوعہ اعظم گڑھ) اور مکتوبات مولانا محمد الیاس (تبلیغی تحریک کے متعلق، مطبوعہ دہلی) وغیرہ پیش کیے جاسکتے ہیں۔

اردو میں خطوں کے فارم سے مذہب۔ سیاست۔ ادب اور سماج کی عقدہ کشائی کا بھی کام لیا گیا ہے۔ ادب میں گلزار نسیم کا سارا مباحثہ خطوں کے پیرایہ میں ہے۔ (اودھ پنچ، مطبوعہ ۲۰ر جولائی ۱۹۰۵ء تا ۱۶ر نومبر ۱۹۰۵ء)۔ موجودہ زمانے میں مجنوں گورکھپوری نے پردیسی کے خطوط میں بعض ادبی مسائل کو چھیڑا ہے۔ (رسالہ اُردو ادب، ج ۲۔ نمبر ۱)

جائزہ لینے پر مجبور کیا اور ہمیں تمام گزشتہ قرنوں اور زمانوں کا وارث قرار دیدیا۔

سر سید

یہ حالات تھے جب سر سید اُردو کے افق پر نمودار ہوئے۔ ان کے خطوں میں نئی تہذیب کی پذیرائی ہے۔ قومی درد ہے۔ عبرت اور موعظت ہے۔ حیرت اور تعجب ہے۔ ان کی شخصیت پیچیدہ یا پہلو دار نہیں ہے۔ ہر جگہ یکساں سی ہے۔ یہی انداز خطوں میں بھی نمایاں ہے۔ اسلوب ایسا سادہ اور سلیس ہے کہ انھیں بجا طور پر "آدم نثر جدید" کہا جا سکتا ہے۔

انگریزی کا اثر

اس دور میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو اختلاط و ارتباط قائم ہوا وہ پرتگالی اور فرانسیسی کے اثر کی بہ نسبت زیادہ دیرپا تھا۔ انگریزی کے صدہا الفاظ اُردو میں آ گئے۔ اور نئے خیالات کی ہوائیں چلنے لگیں۔ انگریزی کا اثر صرف ذخیرۂ الفاظ کی توسیع ہی سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اسالیب اور پیرایے تک بدل گئے۔ سر سید سے مہدی افادی تک اُردو انشا پردازی نے انگریزی کی مدد سے گل کاریاں کی ہیں لیکن اس کی زمین ہمیشہ اپنی ہی رہی ہے۔

غلام امام شہید اور اصغر اکبر آبادی

اس زمانے میں بعض رجحانات ایسے بھی ہیں جو زمانے کے عام مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ یہ نہریں اصل دریا سے کٹ کر الگ ہو گئی ہیں۔ مولوی مملوک علی فرنگی سے ہاتھ ملانے کے بعد اسے علیحدہ ہی رکھتے تھے۔ ایسے ہی ادب میں بعض لوگ نیا زاویۂ نگاہ پیدا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ ہی پرانی روایات چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ اس قسم کی مثالیں غلام امام شہید کی انشائے بہارِ بے خزاں اور اصغر اکبر آبادی کے رقعاتِ اصغر میں مل جائیں گی۔ یہ اگر مقفی اور دقیق نثر کو چھوڑ کر سلیس اور عاری کی طرف آتے ہیں تو محض ذائقہ بدلنے یا زورِ کمال دکھلانے کے لیے۔ یہ ان کا فطری رجحان نہیں ہے۔

محسن الملک، وقار الملک، حالی

سرسید کی حیثیت اُردو انشا میں سنگ میل کی سی ہے۔ یہاں آکر قدیم اور جدید راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقا یعنی محسن الملک وقار الملک اور حالی انشا پردازی میں ایک قومی اور پیامی نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نام عشق لیلی اور ذوق خامہ فرسا کی جگہ ایک شورش انگیز اصلاحی مقصد نے لے لی ہے۔ یہ ادبی شخصیتیں حقیقتاً بہت ہی غیر ادبی ہیں۔ حالی کے یہاں بھی سادگی اور بے ریائی تو ہے لیکن ادبی دلکشی کم ہے۔ ان کے یہاں خلوص کی ایک سیدھی لکیر ہے اور بس۔ ان خطوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ہم ان کے ذریعے اس زمانے کو اور اس شخصیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق

حالی کے ارادت مندوں اور مقلدوں میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی ہیں۔ جن کے نام نے پچاس سے زیادہ غیر مطبوعہ خطوط جمع کیے ہیں۔ ان کے یہاں چشمک ہے طنز ہے پندار ہے عزم ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ ادبی عشوہ طرازی اور دلربائی بھی ہے جو سرسید اور حالی کے یہاں کم نظر آتی ہے۔ یہ حالی کے رنگ کی ترقی یافتہ صورت ہے اور مستقبل کے رجحانات سے ہم آہنگ ہے۔

محمد حسین آزاد

اس زمانے میں کچھ انشا پرداز ایسے بھی تھے جن کے اسلوب کی بیشتر جڑیں ماضی میں پیوست ہیں۔ انھوں نے پرانی تعلیم کے زیر سایہ اور نئی روشنی کی صبح صادق میں پرورش پائی تھی لیکن وہ سرسید اور حالی کے روکھے پھیکے انداز سے مطمئن نہیں تھے۔ ان میں محمد حسین آزاد کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے بیشتر خطوط ضائع ہو گئے لیکن جو ہیں ان میں بوے یاسمن باقی ہے۔ ان سے جو شخصیت ظاہر ہوتی ہے وہ اس عالم کی نہیں ہے۔ ایک فرشتۂ ادب ہے جو آسمان سے زمین پر اُتر

آیا ہے۔ بیان میں غضب کی گھلاوٹ اور زبان میں بلا کا لوچ ہے۔

نذیر احمد

مولوی نذیر احمد کا رشتہ بھی ماضی سے اپنی بے مثل عربی دانی کی وجہ سے بہت مضبوط ہے۔ لیکن ان کا اسلوب حال کی ضرورتوں سے بیگانہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ سرسید کی طرح اکھڑا اکھڑا نہیں ہے بلکہ نہایت قوی موثر اور دلنشیں ہے۔ خطوں میں دہلی کے محاورے عبارت کو چمکا دیتے ہیں لیکن عربی اور انگریزی کے گراں اور مغلق الفاظ ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔

سرسید اور نذیر احمد کے خطوں سے ان کی طبیعتوں کا فرق بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ سرسید بہت آگے دیکھ رہے تھے اور نذیر احمد کی نظر حال کی چند ضرورتوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ خطوں میں ان کی ظرافت ان کی مولویت پر غالب نہیں آتی۔ اور وہ تدبیر و مصلحت کا ایک دفتر بن کر رہ گئے ہیں۔ نقطۂ نظر کا یہ فرق اکبر الہ آبادی کے یہاں اور زیادہ نمایاں ہے۔ سرسید کی تحریک بہت وسیع تھی۔ اس کو ایک "کامل سویلیزیشن" کہنا درست ہوگا۔ نذیر احمد مذہب اور معاشرت کو چھوڑ کر باقی اور معاملات میں سرسید کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے لیکن اکبر کسی قسم کی مصالحت کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ انھوں نے زمانے کا رخ بدلنے کے لیے طنز و تشنیع کا سارا ترکش ختم کر دیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اکبر کی حیثیت ایک ادارہ اور ایک تحریک کی ہے جو نئے اور نیم صنعتی دور کے تقاضوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

خطوں کے پیرایے میں تنقید

اس زمانے میں خطوں کو سماجی نکتہ چینی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اودھ پنچ کے بعض تمثیلی مراسلوں میں، خاص طور پر جو سجاد حسین اور سید محمد آزاد نے لکھے ہیں، مغربی تہذیب کا خوب خوب مذاق اڑایا گیا ہے۔ عصر حاضر میں قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط کے ذریعے نسوانی زندگی کے چند اہم مسائل کو چھیڑا ہے

اور پوری فنکارانہ لیاقت کے ساتھ اس بات کو ذہن نشیں کرایا ہے کہ اس عصمت فروش بیسوا کا ہر نقش فریادی ہے اور اس کا ہر تبسم ایک فوارۂ خون ہے۔ چراغ حسن حسرت نے "زررتیخ کے خطوط" لکھے ہیں۔ مریخ کا ایک باشندہ زررتیخ اپنی دنیا سے نکل کر کرۂ ارض پر پہنچ جاتا ہے اور یہاں جو کچھ دیکھتا ہے اس کا ذکر اپنے دوست توبیخ کے نام خطوں میں کرتا ہے۔ ان میں موجودہ زندگی کے بعض پہلوؤں کا مذاق اڑایا ہے اور طنز کے نشتر چبھوئے ہیں۔ یہاں طنز نگاروں اور سماجی زندگی کے نقادوں نے خطوں کے فارم سے فائدہ اٹھایا ہے[1] یہ وہی طریقہ ہے جو MONTESQIUEA نے LETTERS PERSANES میں برتا ہے۔ اس میں دو فرضی ایرانیوں نے اپنے وطن کو خطوط لکھے ہیں جن میں اٹھارھویں صدی کی فرانسیسی زندگی پر تنقید کی ہے۔ اسی طرح LOWES DICKINSON نے LETTER FROM JOHN CHINAMAN میں بیسویں صدی کی زندگی پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے لیکن اس طرح کے خطوط ہمارے دائرۂ بحث سے خارج رہے ہیں۔ ہم نے اپنی توجہ صرف اصلی اور حقیقی خطوط پر مرکوز کی ہے لیکن ان میں بھی سماج پر تنقید ہے۔ سرسید، حالی، محسن الملک، نذیر احمد ہر نئی چیز سے خفا نہیں ہیں۔ اکبر ابلق ایام کو پیچھے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور تاریخی قوتوں کے آگے مشرقیت اور خانقاہیت کے بند باندھنے کے خواہشمند ہیں۔ انھوں نے سرسید اور اقبال پر جو اعتراضات کیے ہیں ان سے ان کی مریضانہ جذباتیت کا اظہار ہوتا ہے۔ تندرست ذہن اور شعور کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ خطوط ان کی نفسیاتی حالت کے غماز اور انیسویں صدی کی تہذیبی کشمکش کے ترجمان ہیں۔

اقبال

ہم نے اقبال کا ذکر بھی اسی دور میں کیا ہے۔ حالی، اکبر اور اقبال تینوں

---

[1] اس قسم کے خطوط کی چند مثالیں یہ ہیں۔ صحرا نورد کے خطوط از مرزا ادیب۔ بار خاطر از شوکت تھانوی۔ پردیسی کے خطوط از مجنوں گورکھپوری۔ موخر الذکر مجموعہ میں ادبی تنقید کے کامیاب نمونے ہیں۔

ماضی سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ حالی نے ماضی کی عظمت کا ذکر کیا لیکن اس پر اعتراضات بھی کیے۔ اکبر نے ہمیں مشرقیت سے دوبارہ محبت کرنا سکھلائی لیکن انھوں نے اسے تنقید کی دھوپ نہیں دکھلائی۔ اقبال زمانہ سازی کے خلاف ہیں۔ وہ ماضی کی صالح روایات کی مدد سے بازمانہ ستیزد پر زور دیتے ہیں اور ایک روشن مستقبل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال کے خطوط ان کے ذوق علم اور فکری صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان سے ان کی شاعری کا پس منظر دل و دماغ کی سرگزشت، نظام فکر کا ارتقا، اور سیرت کے بعض خط و خال معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال تصوف کے ذوق سے آشنا تھے۔ لیکن گوسفندی طبیعت اور خانقاہی مزاج کے خلاف تھے۔ اکبر اور حسن نظامی سے ان کا اصلی اختلاف یہی تھا۔ وہ توازن جو اکبر کو نہ مل سکا اقبال کو مل گیا۔ لیکن عطیہ بیگم کے نام اقبال کے جو خطوط ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ گوہر یک دانہ آگ کے دریا سے گزر کر حاصل کیا تھا۔

شبلی

شبلی سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انشا کی تاریخ میں غالب کے بعد سب سے رنگین اور دلکش شخصیت ان ہی کی ہے۔ انھوں نے حکیمانہ شوخی اور جمالیاتی رنگ آمیزی سے انشا کا مرقع بہت اونچی محراب پر سجایا اور اپنے حسن تناسب اور ذہن متوازن سے خطوں کے لطف کو دوبالا کر دیا۔ ان کی پر پیچ مگر دل آویز شخصیت کا اندازہ ان کی تاریخوں سے نہیں خطوں سے ہوتا ہے۔ ان میں زندگی کے ایسے حسین اور بوقلموں پہلو آگئے ہیں جو اور کسی جگہ نہیں ملتے۔ ان کے یہاں ایک عام انسان کا پندار، حریفانہ چشمک اور بشری کمزوریاں ہیں۔ عطیہ اور زہرہ کے نام جو خطوط ہیں ان کی حیثیت "حنا بستی و من معنی رنگین بستم" کی زیادہ ہے لیکن ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شبلی زاہد خشک نہیں، رند غزل خواں تھے اور وہ سیاست میں، تعلیم میں، انشا میں، سوانح نگاری میں، تنقید میں پرانی لکیر کو چھوڑ کر "جدید" سے مفاہمت کرنے کے لیے تیار تھے۔

مہدی افادی

مہدی افادی کے یہاں شبلی کی سی بے ساختگی نہیں ہے لیکن ان کی شوخ اشاریت شگفتہ نگاری اور نازک کاری قدر اول کی چیز ہے اور اُردو میں گراں قدر اضافہ ہے۔ وہ نہ کہنے والی باتیں خوبصورتی سے کہہ جاتے ہیں اور چشم سخن سے ایسے اشارے کرتے ہیں کہ انشاپردازی بلائیں لیتی ہے۔ ان کی زندگی مختصر لیکن نفیس اور باوقار تھی۔ انھوں نے جو خطوط اپنی محبوب بیوی کو لکھے ہیں اور جن کو ہم نے پچھلے صفحات میں پیش کیا ہے ان میں عشق کی شوریدگی ہے اور وہ اپنی معطر صباحتوں کی وجہ سے یقیناً یادگار رہیں گے۔ مہدی نے اُردو انشا کو انگریزی اسلوب سے ہم آہنگ کرنے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

عبدالرحمٰن بجنوری نے بھی یہی کوشش کی ہے لیکن ان کے یہاں تخلیق کا وہ حسن نہیں ہے جو مہدی کے یہاں ہے۔

ریاض خیرآبادی۔ نیاز فتحپوری

اُردو انشا کا یہ دور جس کی محوری شخصیت مولانا شبلی ہیں اپنی اسلوبی نفاست کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کے بعد اور شبلی سے پہلے اس کے نمونے کم ملتے ہیں۔ سرسید اور حالی کی شکست و ریخت کا دور ختم ہو چکا تھا اور تزئین و آرائش کی طرف پھر توجہ ہونے لگی تھی۔ شبلی نے اور معاملات کی طرح اس میں بھی اعتدال برتا ہے۔ مہدی کی نامہ طرازی بھی ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے لیکن ریاض خیرآبادی اور نیاز فتح پوری نے تو آئینہ خانے میں رنگینیاں قید کی ہیں اور صابن کے بلبلے بنا کر ہوا میں چھوڑ رہے ہیں۔ ان کے سامنے وہ اعلیٰ مقاصد بھی نہیں ہیں جو غبارِ خاطر کے زرنگار مصنف کے سامنے ہیں۔ ریاض اور نیاز دونوں کا مطمح نظر یہ ہے۔ بازمی جویم دل افسردہ را۔ کچھ محرومیاں ہیں جن کو وہ شراب و شعر جیسی مستی اور گریز پا لذتوں میں چھپانا چاہتے ہیں۔ نیاز ہمارے سامنے

ایک مافوق الفطرت اور شعر و ادب میں ڈوبی ہوئی ذہنیت لے کر آئے ہیں۔ وہ جدیدیت کے نام نہاد لباس میں اپنی قدامت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کی انشا کو عقل کی پاسبانی سے کبھی نجات نہیں ملی۔ ان کے حسن کا یہ ناز کہ وہ خلوت میں بھی نقاب ڈال کر آئے اور عشق کی یہ احتیاط کہ بازار میں کبھی رسوا نہ ہو ناگوار ہوتا ہے۔

سیاسی تحریکیں

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی اور ۱۹۰۶ء میں اس نے سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ بھی پیش کر دیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں عالم گیر جنگ ہوئی۔ اس کے بعد سے ہماری آزادی کی تحریک بین الاقوامی بنیادوں پر شروع کی گئی اور سامراجی قوتوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ بن گیا جس کو بالآخر ۱۹۴۷ء میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس تحریک نے اردو کے مکتوباتی ادب میں چار چاند لگا دیئے۔

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی اس تحریک کے سپہ سالاروں میں ہیں۔ ان کے یہاں گہرے جذبات ہیں جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹے پڑتے ہیں۔ ان کی شخصیت خطوں میں حل ہو گئی ہے۔ جو اعتدال اور ضبط نفس ان کی زندگی میں نہیں تھا وہ خطوں میں بھی نہیں ہے۔ ان میں شور و ہنگامہ ہے۔ غیظ و غضب ہے۔ خطیبانہ بلند آہنگی ہے۔ لیکن وہ رازداری نہیں ہے جو اچھے خطوں کا امتیازی وصف ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کا ذکر شبلی کے ساتھ ہونا چاہیئے لیکن ان کی غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال عصر حاضر کی چیزیں ہیں اور بالکل دوسرے موثرات خارجی کا نتیجہ ہیں۔ دنیا کے بعض بڑے بڑے ادبی اور فنی کارناموں کی طرح یہ خطوط بھی قید خانے میں لکھے گئے ہیں۔ جہاں وقت کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ انھوں نے جیل کی یکسانیت پر اپنے دل کی رنگینی اور طبیعت کی رنگا رنگی سے قابو پانے کی

کوشش کی ہے۔ ان کا ذہن ستاروں سے آگے چلا جاتا ہے اور وہ فرشتوں سے نور و نغمہ لے کر ساری فضائے بسیط میں پھیلا دیتا ہے۔ وہ کوئی حالت ہو دل کو مرنے نہیں دیتے اور بادہ و تریاک اور زاغ و بلبل کی کہانی سے بھی زنداں کو شبستاں بنا لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دل کو ایسے حسین پیکروں سے آباد کر لیا ہے کہ گرد و پیش کی تکلیفوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ یہ خطوط محض ان کے ذہن کا دریچہ اور فکر کی زبان ہی نہیں بلکہ ان کی شرافت اور پاک مشربی کے بھی آئینہ دار ہیں۔

سجاد ظہیر۔ ڈاکٹر تاثیر

سجاد ظہیر اور ڈاکٹر تاثیر ترقی پسند نظریۂ ادب کے حامی ہیں۔ اس تحریک نے ہمیں نئی قدریں دیں اور ادب کو خارجی حقیقتوں سے ہمکنار کر دیا۔ اس میں ذاتی غم اور مسرتیں وسیع تر حقائق کا جزو معلوم ہوتی ہیں اور ادب کا مقصد تصویر جاناں نہیں بلکہ ایک بہتر دنیا کی تخلیق ہے۔ سجاد ظہیر اشتراکی ادیب ہیں۔ ان کو بھی دوسری عالمگیر جنگ میں قید کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے نقوشِ زنداں میں جو خطوط اپنی بیوی کو لکھے ہیں ان میں تشنہ کامی کا وہ گلوگیر احساس ہے جو غالب کے ان اشعار کی یاد دلاتا ہے۔

افقہا پر از ابر بہمن مہی
سفالینہ جام از مے تہی
جہان از گل و لالہ پر بوئے و رنگ
من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

ان میں رکھ رکھاؤ اور نگاہوں سے بات کہنے والی ادا نہیں ہے بعض جگہ تو جسم کی محبوس مجبوریوں کی آواز خلوت سے نکل کر جلوت تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ فریاد حدود شرع میں سہی لیکن بدترین مباہات میں سے ہے۔ ان خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھنا چاہتے ہیں لیکن سمجھ نہیں پائے ہیں۔ یہ مادی محبت ذہنی اتحاد کی سرحدوں تک نہیں پہنچی ہے لیکن ان میں بڑے مسائل کی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں جو ہمارے دلوں کو گرماتی ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کے خطوط تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن ان میں گلوں کی خوشبو اور زندگی کی چاندنی ہے۔ رشید احمد صدیقی پر کوئی لیبل لگانا مشکل ہے۔ بعض خطوں میں ان کی شراب شمشیر بن گئی ہے۔ اور یہ سعادت معمولی نہیں ہے۔

خطوں کی قدر و قیمت

شکوہ الملک ثانی سے ابوالکلام آزاد تک اُردو انشا نے وہ تمام مرحلے طے کیے ہیں جو قطرے پر گہر ہونے تک گزرتے ہیں۔ مکتوبات کی یہ دنیا زندگی سے معمور ہے۔ اور اس لیے بڑی دلچسپ ہے۔ یہ خط ہمیں دل کے نہاں خانوں تک لے جاتے ہیں اس لیے ان کی دلآویزی میں کلام نہیں۔ ان کی مدد سے تاریخ ادب اور نفسیات کے بہت سے گوشے روشن ہو سکتے ہیں لیکن ان کی امداد محدود ہے۔ خطوں کے ذریعے پوری شخصیت کے خط و خال نظر نہیں آتے لیکن وہ شخصیت کا ایک اہم جزو ضرور ہیں۔ ان میں گریزپا لمحوں کی داستان ہوتی ہے لیکن اگر ان کو کوئی جادو داں بنانے اور ان کی برکت کو عام کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے تو وہ ادب کا بیش قیمت سرمایہ بن سکتے ہیں اور ان سے تاریخ کے خشک واقعات میں جان پڑ سکتی ہے۔ یہی ان کی اصلی قدر و قیمت ہے۔

تمام شد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دستنبو

مترجم : خواجہ احمد فاروقی

صفحات: 88

قیمت : -/35 روپے

ارباب نثر اردو

مصنف : سید محمد

صفحات: 247

قیمت : -/77 روپے

عیار الشعراء

مصنف : خوب چند ذکا

صفحات: 805

قیمت : -/200

بنات النعش

مصنف : ڈپٹی نذیر احمد

صفحات: 151

قیمت : -/78 روپے

آبشار اور آتش فشاں

مصنف : فضیل جعفری

صفحات: 368

قیمت : -/160 روپے

دکن میں اردو

مصنف : نصیر الدین ہاشمی

صفحات: 948

قیمت : -/210 روپے

₹ 193.00

ISBN: 978-81-7587-875-4

9 788175 878754

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025